مئی 2014

دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

دو سلسلے وار تحریریں

لاوارث - چمگادڑ

اسلم راہی کی تاریخی کہانی

سمرقند کا ساحر

معاشرتی ناول

تکمیل آرزو

PP
پاکستانی پوائنٹ
ایک رابطہ اپنوں سے
www.pakistaniPoint.com

MEMBER APNS | رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی
CPNE | رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

بانی: محمود ریاض
مدیر اعلیٰ: عامر محمود
منتظم: محمد شفیع

سمرقند کا ساحر — اسلم راہی — 8
تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے دور میں سب سے زیادہ سازشیں ہوئی ہیں۔اس کا اہم سبب جہاں اختیارات، اقتدار اور دولت رہی ہے۔

رانگ نمبر — احمد صغیر صدیقی — 33
ایک فون جس کی ہر بجتی گھنٹی سننے والے کے لیے خوف و دہشت اور حیرانی میں اضافے کا باعث بنتی گئی

چراغ شب — ایم الیاس — 60
وہ جواپنے فن پاروں کو اپنا لخت جگر مانا کرتا تھا، حالات کی ستم ظریفی کے بعد ایک انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہوگیا

چمگادڑ — ایم اے راحت — 74
ایک شخص کی داستان جس نے زندگی کی حقیقتوں سے آشنا ہونے کے بعد اپنی نئی منزلوں کی تلاش شروع کردی، پرتجسس دل ہلا دینے والا سلسلہ

بالواسطہ — راجپوت اقبال احمد — 140
یادیں بڑی قاتل ہوتی ہیں۔۔۔زندگی کے آخری لمحوں تک انسان یادوں سے دامن نہیں بچا پاتا اور یہی یادیں بعض اوقات عذاب جان ثابت ہوتی ہیں۔

چوہے — احمد جاوید — 147
چوہے کو معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ ایسا بھی ہوگا۔اسے معلوم ہوتا تو شاید وہ آہستہ آہستہ سکتا

یہ کون بولا — زین مہدی — 151
قصہ ایک عیار، طرار اور شاطر قاتل کا جس کا چلایا ہوا ہر حربہ اپنے ٹھیک نشانے پر لگتا ہے۔لیکن اس کی ایک عادت۔۔۔اس کے ہر گناہ کا ثبوت بن جاتی ہے۔

تصفیہ — عبدالقیوم شاد — 220
ایک ایسے شخص کی کہانی جو معاملات کا "تصفیہ" کیا کرتا تھا

کھلونا — ثریا صفیہ صدیقی — 226
ایک ایسے شاطر نوجوان کا قصہ جو عورتوں ہی پر جال پھینکتا تھا

شمارہ 1 ❁ جلد 44 ❁ قیمت 40 روپے ❁ مئی 2014ء

رقابت — زبیر بٹ — ۷۸
...اور عبادت ہے اعتماد ہے لیکن اگر اس جذبہ میں ذرا سا ... عنصر شامل ہو جائے تو اس رشتے کی بنیادیں ریت کی دیوار کی مانند بیٹھ جاتی ہیں

تعاقب — نیرہ احتشام — 100
ممتا، شفقت اور محبت، یہ ایسے وسیع و عظیم الفاظ ہیں جن میں پوری کائنات سمائی ہوئی ہے۔ اولاد کے ضمن میں زن و شوہر کی چپقلش کا دلچسپ احوال

الہامی — شہزاد رفیع — 111
ایک مصنف کا قصہ وہ اپنی ہر کہانی کا انجام حقیقت سے قریب ترین لکھنے کا عادی تھا۔ ذہانت و فطانت سے بھرپور ایک مختصر لیکن خوب صورت تحریر

لاوارث — غزالہ جلیل راؤ — 116
انسان کسی بھی علاقے سے تعلق رکھتا ہو کسی بھی ملک میں رہتا ہو جہاں اس سے پیار کرنے والے ہوتے ہیں

تباہ کن — اسرار احمد — 156
ایک دیوانے کا قصہ وہ بلیک میلنگ اور دہشت گردی کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔

پہلی دراڑ — رضیہ فصیح احمد — 202
مادی محبت کی اینٹوں سے بنی اور مصنوعی خلوص کے گارے سے بنی دیوار میں پہلی دراڑ پڑنے کا سبق آموز قصہ

بیوی پرست — روشن آرا — 216
بیویوں کی بات ماننے میں حرج ہی کیا ہے۔ اس طرح ہماری ازدواجی زندگی پر خوش گوار اثرات مرتب ہوں گے۔ تین دوستوں کی مختصر مگر دلچسپ کہانی

تکمیل آرزو — آر۔ کے۔ شاکر — 232
ایک ایسے ڈاکٹر کا قصہ جسے پُراسرار باتوں اور پُراسرار علوم سے دلچسپی تھی

مسکراہٹیں

آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: 37 اردو بازار، کراچی

سمرقند کا ساجر

Pakistanipoint

اسلم راہی
Waqar Azeem

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے دور میں سب سے زیادہ سازشیں ہوئی ہیں، اس کا اہم سبب جہاں اختیارات، اقتدار اور دولت رہی ہے، وہیں عورت بھی ہے جو اس معاملے میں اہم حیثیت کی حامل ہے۔ اچھے برے ہر قوم، ہر مذہب اور ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ اسلامی مملکتوں کے استحکام کے لیے مذہب پر کاربند سپہ سالاروں اور جنگ جو سپاہیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ زیر نظر طویل تاریخی کہانی میں آپ کو جہاں جنگوں کا احوال ملے گا، وہیں محبت کی لازوال داستان بھی نظر آئے گی۔ مسلمان حکمرانوں نے اپنی مملکت کو مضبوط کرنے کے لیے کن کن امور پر توجہ دی اور راستے کمزور کرنے کے لیے سازشی عناصر نے کیا کیا جتن کیے۔

مسلمان حکمرانوں کا احوال، تاریخی حقائق، طویل داستان

چنانچہ علی بن ربیع جس وقت علی تقندری کی طرف جاتے ہوئے آدھا فاصلہ طے کر چکا تب اس کے مخبر اس کے پاس آئے انہیں دیکھتے ہی ایک جگہ علی بن ربیع نے اپنا لشکر روک دیا۔ وہ مخبر قریب آئے تب علی بن ربیع اور عبدالرزاق کی طرف دیکھتے ہوئے ان میں ایک کہنے لگا۔

''امیر ہم آپ کے لیے خبریں لے کر آئیں ہیں پہلی خبر جو میں سمجھتا ہوں ہمارے حق میں اچھی نہیں ہے وہ یہ کہ ہمارے لشکر کی نسبت علی تقندری کے لشکر کی تعداد بہت زیادہ ہے ہم خیال کرتے ہیں آپ کو ایک بڑا لشکر لے کر علی تقندری کی سرکوبی کے لیے آنا چاہیے تھا دوسری خبر یہ ہے کہ علی تقندری کے پاس جو اس وقت قلعے ہیں ان کے اندر جتنا بھی مال و دولت یا ضرورت کا سامان تھا سب اٹھا کر علی تقندری نے اپنے مرکزی قلعے میں منتقل کر لیا ہے۔''

''ایسا اس نے اس لیے کیا ہے کہ اس کا خیال ہے کہ اگر تو اسے فتح ہوئی تو اس کا کچھ نہیں جائے گا سامان اس کا محفوظ رہے گا اگر اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا تو وہ بھاگ کر اپنے مرکزی قلعے میں محصور ہو جائے گا جہاں اس کے پاس دولت کے انبار کے علاوہ ضروریات کی اشیا کے بھی ڈھیر لگے ہوئے ہیں چنانچہ وہ ایک لمبا عرصہ تک محصور رہ کر حملہ آوروں کا مقابلہ کر سکتا ہے اور حملہ آور محاصرہ طول پکڑنے کی وجہ سے ناکام و نامراد لوٹ جائیں گے۔''

یہاں تک کہنے کے بعد وہ مخبر خاموش ہو گیا۔ علی بن ربیع نے ان کی تعریف کی۔ دوبارہ انہیں اپنے کام میں لگ جانے کے لیے کہا جب مخبر وہاں سے ہٹ گئے تب علی بن ربیع نے ایک گہری نگاہ اپنے پہلو گھوڑے پر سوار عبدالرزاق پر ڈالی اور مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''عبدالرزاق میرے بھائی مخبروں نے جو ہمیں خبریں دی ہیں ہمارے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ علی تقندری کے پاس مال دولت کی کمی نہیں ہے ہمارے ساتھ جنگ سے پہلے اس نے اپنے لشکریوں کو خوب نوازا ہوگا تاکہ وہ اس سے خوش رہیں دوسری بات یہ کہ ایک عرصہ سے اس کے لشکری اِدھر اُدھر کے علاقوں میں لوٹ مار کر کے ایک طرح کے وحشی ہو چکے ہیں ان کے حوصلے بلند ہیں اور وہ یہ بھی عزم لیے ہوں گے کہ ہم پر حملہ آور ہو کر ہمیں شکست دیں گے ہمارے پاس جس قدر مال و اسباب ہے اس پر قبضہ کر لیں گے۔''

''دیکھ میرے عزیز بھائی! اس موقع پر ایک کام کرتے ہیں جو تجویز میں اس وقت تمہارے سامنے پیش کرنے لگا ہوں اگر تم اس سے اتفاق کرو تو اس پر عمل کیا جائے گا اور اگر تمہاری کوئی اور رائے ہوئی تو اسے اپنا لیں گے۔''

اس موقع پر عبدالرزاق نے گھورنے کے انداز میں علی بن ربیع کی طرف دیکھا تھا کچھ کہنا چاہتا تھا کہ علی بن ربیع کہنے لگا۔

''اب تم یہ کہو گے جو میں تجویز پیش کروں گا وہ تمہارے لیے آخری ہے عبدالرزاق میرے بھائی ایسی بات نہیں ہے، پہلے وہ سنو جو میں کہنا چاہتا ہوں اس کے بعد تم اپنی رائے بھی دینا۔''

جواب میں عبدالرزاق مسکرا دیا تھا۔ یہاں تک کہ علی بن ربیع نے کہنا شروع کیا۔

''عبدالرزاق میرے بھائی! جیسا کہ مخبر بتا چکے ہیں ہمارے مقابلہ میں علی تقندری کے لشکر کی تعداد بہت زیادہ ہے اس بنا پر ہم نے اس سے کسی حیلے کسی جتن کسی طریقے سے نمٹنا ہوگا۔

ہم لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں ایک حصہ تم اپنے پاس رکھو دوسرا میں لے کر تم سے جدا ہو جاؤں گا، لیکن میں تم سے دور نہیں رہوں گا آس پاس ہی رہوں گا تم سیدھا آگے جا کر علی تقندری کی راہ روکنا بلا تامل اس سے ٹکرا جانا جب وہ تم سے ٹکرا رہا ہوگا یاد رکھنا میں آس پاس ہوں گا اور میں بھی اس وقت علی تقندری کے لشکر کی پشت یا ایک پہلو پر ضرب لگاؤں گا۔ میرے خداوند قدوس کو منظور ہوا تو یہ ضرب ایسی ہوگی جسے علی تقندری اور اس کے لشکری برداشت

نہیں کرسکیں گے میں ان کے وسطی حصے میں گھستا چلا جاؤں گا اس کے بعد میں دیکھوں کہ وہ کس طرح ہمارا سامنا، ہمارا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ علی تقندری کو زندہ گرفتار کر کے سلطان کے سامنے سزا کے لیے پیش کیا جائے۔"

یہاں تک کہنے کے بعد علی بن ربیع خاموش ہوا۔ عبدالرزاق نے اپنی کوئی رائے، اپنا کوئی مشورہ نہ دیا۔ فوراً بولا اور علی بن ربیع کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"میرے عزیز بھائی! جو کچھ تم نے کہا ہے سو فیصد درست ہے اب وقت ضائع نہیں کرتے جلدی جلدی لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں اس کے بعد اپنے کام کی ابتدا کرتے ہیں۔"

کچھ دیر مسکراتے ہوئے علی بن ربیع نے عبدالرزاق کی طرف دیکھا۔ اپنی تجویز پر عمل شروع کیا۔ لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک حصہ لے کر علی بن ربیع علیحدہ ہو گیا دوسرے لشکر کو لے کر عبدالرزاق نے پہلے کی طرح پیش قدمی کرنا شروع کر دی تھی۔

علی تقندری جب عبدالرزاق کے لشکر کے سامنا آیا تو اس کی خوشی اس کی طمانیت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اسے جب یہ احساس ہوا کہ سلطان مسعود غزنوی کا چھوٹا سا ایک لشکر اس کا مقابلہ کرنے کے لیے آیا ہے تب وہ لومڑی سے شیر ہو گیا اس نے دم نہیں لیا بلکہ آتے ہی صفیں درست کیں۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے عبدالرزاق بھی اپنے کام کی تکمیل کر چکا تھا چنانچہ پہل علی تقندری کی طرف سے ہوئی۔ اپنے لشکر کو اس نے دھند میں لپٹی شاموں میں لفظوں کو پگھلا کر سیسہ کر دینے والے آگ و خون کے جوار بھاٹے اوہام کے اندیشوں اور ابہام کی لہروں کی طرح آگے بڑھایا۔ اس کے بعد وہ عبدالرزاق کے لشکر پر نفرت کے دانہ و دام کر و دھ کے سنگ الزام فریب کے جاہ و انعام حیلہ و مکر کی شام، اندھے بے روک خون آشام بربادی کے الام اک اذیت بے نام اور تعصب سیاہ فام کی طرح حملہ آور ہوا تھا۔

عبدالرزاق خود جنگ کا وسیع تجربہ رکھتا تھا۔ وہ علی تقندری اس طرح حملہ آور دیا نہیں بلکہ وہ بھی اپنے لشکر کو کالے قہر میں رقص کرتی تشنہ جراحتوں، گرستہ جذبوں کی اڑتی جھاگ، برق گراتی کالی روحوں، شام سے لپٹ کر روتی ہر بادلوں اور ارادوں کی اتھاہ سنگینیاں بھر دینے والے سرشام کی طرح حرکت میں لایا۔ اس کے بعد وہ علی تقندری کے لشکر پر آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والے موت کے خونی قہقہوں حزن و ملال کی حدت میں بے سود جستجو بے خواب تعبیروں غم دیر کے ویرانوں میں روتی مجبوریاں بھر دینے والے تشنگی کے ابلتے بحر کی طرح حملہ آور ہو گیا تھا۔

علی تقندری کو پختہ یقین تھا کہ سلطان مسعود غزنوی کا لشکر زیادہ دیر تک اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکے گا اور وہ اس کا قلع قمع کر دے گا اور جس قدر اس کے پاس سامان ہے اسے سمیٹ کر واپس اپنے مرکزی قلعہ کی طرف چلا جائے گا۔ اس بنا پر اس نے اپنے لشکر کے بیچ میں رہتے ہوئے اپنے لشکریوں کو جنگ تیز کرنے کے لیے انہیں ہلکارا۔ وہ بڑے سکون کے ساتھ اپنے لشکریوں کو اپنے دشمن سے ٹکرانے کا موقع فراہم کرنا چاہتا تھا تاکہ اس کے لشکر کا نقصان کم اور دشمن کے لشکر کا نقصان زیادہ ہو لیکن یہ اس کی ذاتی سوچ تھی اس لیے کہ وہ نہیں جانتا تھا عنقریب اس کے خلاف ایک نہ ٹلنے والا عذاب ایک نہ رکنے والی اذیت نمودار ہونے والی ہے۔

علی تقندری اور عبدالرزاق کو آپس میں ٹکرائے ابھی تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ اچانک ایک سمت سے علی بن ربیع اپنے لشکر کے ساتھ سرابوں کی مسافتوں میں انوکھے روحانی کرب دلوں کی ویران فضاؤں کے اندر جان سوز کراہیں کھڑی کرتی قہر شدید کی خونی جبلت اور آتش جبر کی پھیلتی لہروں کی طرح نمودار ہوا۔ اس کے بعد وہ علی تقندری کے لشکر کے ایک پہلو پر پاؤں میں زخموں کی زنجیریں، دکھ کے جلتے چڑھتے

قہر آگ وخون کی ہیجان خیزیاں، امیدوں کو لہولہو آرزوؤں کو شکستہ آگ اگلتے، خوف کے دشت نظروں کی بستیوں میں، ندامتوں کے اشک بھر دینے والی وحشی تند ہواؤں اور کھولتے لاوے کی اندھی یلغار کی طرح حملہ آور ہوا تھا۔

علی بن ربیع کا یہ حملہ ایسا زوردار، شدید اور جان لیوا تھا کہ وہ حملہ آور ہوتے ہوئے علی تقندری کے لشکر کے اندر تک گھستا چلا گیا تھا اور اس کے ایسا کرنے سے میدان جنگ کے اندر ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ زرم گاہ کے اندر ذرّہ ذرّہ طوفان ان لمحہ خونی بھنور کی صورت اختیار کرنے لگا تھا۔

دلوں کے کشکول لہولہو ہونا شروع ہو گئے تھے۔ گرسنہ میدان جنگ کی خشک شریانوں میں لہو کی نمی، آہوں کا کرب مایوسی کے اشک اور عذاب وکرب کی شکنیں اترنے لگی تھیں۔

اس موقع پر علی تقندری نے اپنے لشکریوں کو للکارا تاکہ وہ اپنے حملوں میں تیزی اور شدت پیدا کریں لیکن اب ایسا کرنا ممکن نہ رہا تھا اس لیے کہ علی بن ربیع اب قطرے کو گرداب، ذرے کو صحرا، بگولوں کو اندھیاؤ میں تبدیل کر دینے والی بے روک رقصاں لہروں کی طرح علی تقندری کے لشکر کے وسطی حصہ میں پہنچ کر وحشی بگولوں اور طلسم کے طوفانوں کی طرح موت کا ایک رقص شروع کر چکا تھا اور علی تقندری کو گرفتار کر لیا گیا۔ بڑی تیزی سے ابن رنّ نے علی تقندری کے لشکر کا قتل عام شروع کیا تھا۔ دوسری طرف یہی کھیل عبدالرزاق بھی کھیلنا شروع ہو چکا تھا اب تکبیریں بلند کرتے ہوئے علی بن ربیع اور عبدالرزاق دونوں نے ایک طرح سے علی تقندری کے لشکر کا گھیراؤ کر لیا تھا علی تقندری کے لشکریوں کو بھی خبر ہو چکی تھی کہ علی تقندری کو گرفتار کیا جا چکا ہے بڑی تیزی سے ان کا قتل عام ہو رہا ہے لہٰذا وہ بھاگنے کی راہیں تلاش کرنے لگے ہیں۔ اب بھاگنا بھی مشکل تھا اس لیے کہ ان کا مکمل طور پر گھیراؤ ہو چکا تھا۔ اب چاروں طرف سے ان کا قتل عام بڑی تیزی سے ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ علی تقندری کے جنگجوؤں کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس خاتمہ کے بعد علی بن ربیع اور عبدالرزاق دونوں نے مل کر پہلے اپنے لشکر کا جائزہ لیا زخمیوں کی خوب دیکھ بھال کی۔ اپنے لشکر کے اس محفوظ حصے کو جس نے جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا لشکریوں کے کھانا تیار کرنا کا حکم دیا لشکری ایک جگہ بیٹھ گئے اور اپنے کچھ چھوٹے سالاروں کو علی بن ربیع نے علی تقندری کو لانے کے لیے کہا تھا۔

چنانچہ علی تقندری کو اس جگہ لایا گیا جہاں علی بن ربیع، عبدالرزاق اپنے دوسروں ساتھی سالاروں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کچھ دیر تک نفرت بھرے انداز اور سخت غیض وغضب کی حالت میں علی بن ربیع علی تقندری کی طرف دیکھتا رہا پھر بڑے خشک لہجہ میں اسے مخاطب کر کے کہا کہنے لگا۔

”تو ایک عرصہ سے پھول پتیوں کو روندھتا رہا، قلوب کو خون آلود کرتا رہا، اپنی گندی خواہش اپنے ذلیل مقاصد کی تکمیل کے لیے خونی تقاضوں اور ہوس کا طلب گار رہا۔

علی تقندری تو ایک خودسر زہریلے سانپ کفرو عصیاں کی آندھی جرم وجہل کے طوفان کی طرح سبزہ زار وادیوں میں موت کا کھیل کھیلتا رہا، آگ تھوکتے دشت کی طرح حسین وادیوں کو جلاتا رہا، ان علاقوں کے لوگوں کے لیے مجبوریاں تراشتا رہا بلکہ ان کے خیالات کے دائرے تنگ کرتا رہا۔

کیا کبھی تو نے نہ سوچا کہ کبھی یہ کبھی سچے جذبوں کا کوئی جوہر بن کر وحشتوں کا رقص بن کر تیرے خلاف حرکت میں آئے گا، کیا تو نے اپنے ذہن میں کبھی یہ بات نہ بٹھائی کہ کوئی نہ کوئی روشنی کا سفر بن کر تیرے تن کو جلا دے گا۔ علی تقندری! کیا تو نے کبھی اپنے گریباں میں جھانک کے یہ خیال نہ کیا کوئی اماوس رتوں میں تیرے سپنوں کی تتلیاں تم سے چھین کر تیرے دامن ٹوٹے خوابوں، بکھرتی تعبیروں کا جال بن کر رکھ دے گا۔“

یہاں تک کہنے کے بعد علی بن ربیع دم لینے کے

لیے رکا وہ ابھی مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ بیچ میں علی تقندری بول پڑا۔ علی بن ربیع کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''میں نہیں جانتا تُو کون ہے، اس لشکر میں تیری کیا حیثیت ہے کہ تیرا کیا نام ہے پر میں تم سے یہ کہوں، میں نے اس سے پہلے موت کے مناظر کے پس منظر میں بے انت موت کی کڑوں داستانیں ریزہ ریزہ کرتے کرخت لہجے بے یقینی کے موسم بے گریان ہونے کے دکھ دیکھ رکھے ہیں ان باتوں کا مجھ پر اثر نہیں ہوتا۔ اگر کوئی مجھ سے یہ کہے کہ وہ مجھے عذاب رتوں زوال خیالوں میں تبدیل کر کے رکھ دے گا تو یہ اس کی بھول ہے مجھ سے مخاطب ہونے والے اگر میں بستیوں میں بارود ذہنوں میں آگ لفظوں میں جدت دلوں میں زہر بھر سکتا ہوں تو یاد رکھنا تیرے ہر چشم شعور کو وقت کے دھارے میں بے بصر کر سکتا ہوں۔ تیرے احساسات کو مستول کر سکتا ہوں تجھ سے تیرے دل کی یکسوئی تک چھین سکتا ہوں یاد رکھنا میں علی تقندری ہوں میں نہیں تو میرا کوئی نہ کوئی ساتھی تیری شادابی کو بے یقینی کے موسموں میں بدل دے گا اگر تو میرا خاتمہ بھی کر دے تب بھی تجھ سے کہوں کہ وقت کے دھواں دھواں ہواؤں غبار غبار فضاؤں میں میرا کوئی نہ کوئی ساتھی میرا کوئی نہ کوئی عزیز میرا کوئی نہ کوئی لشکر تیرے لیے کسی نہ کسی روز موت کے بند دروازے ضرور کھولے گا اور تیرے شعور ذات کے پیمانے میں موت کے کیمیائی لفظوں کا رقص بن کر داخل ہوگا۔'' علی تقندری کے ان لفظوں سے شاید علی بن ربیع تاؤ کھا گیا تھا ایک دم برق کے کوندے کی طرح اٹھ کھڑا ہوا دایاں ہاتھ اس کا حرکت میں آیا اور ایسا زوردار تھپڑ اس نے علی تقندری کے منہ پر مارا کہ علی تقندری لڑکھڑاتا ہوا زمین پر گر گیا تھا۔

نفرت کے انداز میں علی بن ربیع نے زمین پر تھوکا پھر اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''یہ ہے تمہاری قوتِ مدافعت۔ ایک طمانچہ کھا کر بری طرح زمین پر گر گئے ہو قسم خداوند قدوس کی اگر تجھے سلطان مسعود غزنوی کے سامنے زندہ پکڑ کر نہ لے جانا ہوتا تو میں یہیں میدان جنگ میں تمہیں انتہائی ذلت کی موت مارتا۔ تمہارا کوئی نہ کوئی ساتھی مجھ سے تمہاری موت کا انتقام لے گیا تو یاد رکھنا اس دن کے بعد تیرا کوئی ساتھی تیرا نام لینا بھی پسند نہیں کرے گا۔''

اس موقع پر علی بن ربیع نے اپنے ایک سالار کو ہاتھ کے اشارہ سے بلایا وہ قریب آیا اس کے کان میں علی بن ربیع نے کچھ کہا جسے سن کر وہ بھاگتا بھاگتا واپس گیا پھر وہ لوٹ کر آیا اور اس نے علی تقندری کو بیڑیاں پہنا دی تھیں دو دن تک علی بن ربیع نے اپنے لشکر کو وہاں ستانے کا موقع فراہم کیا اس کے بعد وہ اپنے لشکر کے ساتھ واپس گورگان کی طرف ہو لیا تھا۔

علی بن ربیع اور عبدالرزاق دونوں اپنے لشکر کو لے کر جب گورگان کے بالکل نواح میں پہنچے تب شہر کے بالکل پاس سلطان اپنے سالاروں اور امراء کے ساتھ کھڑا تھا، ہاتھ کے اشارے سے سلطان نے لشکر کو روک جانے حکم دیا جس پر علی بن ربیع نے لشکر کو روک دیا پھر علی بن ربیع اور عبدالرزاق اپنے گھوڑوں سے اتر کر سلطان کے پاس آئے سلطان نے ان سے بغل گیر ہوتے ہوئے انہیں ان کی کامیابی پر مبارک باد دی پھر سلطان علی بن ربیع کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''ابن ربیع پہلے تم دونوں کو میں اس کامیابی پر مبارک باد دیتا ہوں ساتھ مجھے یہ بھی خبر ملی ہے کہ تم نے علی تقندری کو زندہ گرفتار کر لیا ہے تم چاہتے تو اسے موت کے گھاٹ اتار سکتے تھے تمہاری بڑی دانشمندی ہے تم اسے زندہ پکڑ کر میرے پاس لائے ہو۔''

یہاں تک کہنے کے بعد سلطان رکا۔ اس کے بعد اپنی بات کو آگے بڑھاتا ہوا وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں شہر سے باہر اس لیے کھڑا ہوں کہ میں علی تقندری جیسے ذلیل اور شیطان صفت انسان کو اس شہر میں داخل ہونے نہیں دینا چاہتا شہر سے باہر ہی اس کے لیے سزا تجویز کرتا ہوں ذرا اسے میرے سامنے پیش کرو۔''

سلطان کے ان الفاظ کے بعد علی بن ربیع نے مخصوص اشارہ عبدالرزاق کو کیا جس پر اس نے اپنے ایک ساتھی کو حکم دیا کہ وہ علی تقندری کو لے کر آئے چنانچہ علی تقندری جو بیڑیوں میں جکڑا ہوا تھا اسے لاکر سلطان کے سامنے پیش کردیا گیا۔ اسے دیکھ کر غصے اور غضبناکی سلطان مسعود غزنوی کی حالت دہکتے انگاروں سلگتی چنگاریوں کی سی ہوکر رہ گئی تھی۔ کچھ دیر تک کھا جانے والے انداز میں سلطان اسے دیکھتا رہا پھر اسے مخاطب کیا۔ ''بدبخت انسان کیا تو ہوس کے سمندر میں ڈوب کر یہ بھول گیا تھا کہ روشنی کیا ہے، تاریکی کیا ہے، خدا کیا ہے، ابلیس کیا ہے، جرم کیا ہے، خیر کیا ہے، سزا کیا ہے، جزا کیا ہے، نیکی کیا ہے، بدی کیا ہے، تو لوگوں کے خوابوں کو کرچی کرچی کرتے ہوئے پرعذاب لمحوں اور جبر وجود کا لباس پہن کر ان پر جھپٹتا رہا، بدبخت انسان تو ظلمات کی جنگ کرتا ہے۔

سن شیطان صفت انسان! تو نے گلیاں ویران کیں، بستیاں تباہ کیں، رات کی سیاہی میں شیطانی رقص کرتا رہا۔ لکڑی کے تختوں کو چاٹ دینے والی خونی دیمک کی طرح تو دل وجان کی راحتوں کو پامال کرتا رہا۔

تو کیا سمجھ کر کیا جان کر لوگوں کی زیست کے پیمانوں میں زہر گھولتا رہا؟ کیا کبھی تو نے یہ نہ سوچا کسی نہ کسی روز تباہی کے تیز دھاروں تند طوفانوں کی یلغار کا رخ تمہاری طرف ہوجائے گا۔ کیا تو نے کبھی یہ نہ سوچا قصنا کے تیز نشتروں کی طرح کوئی تیرے خلاف بھی حرکت میں آئے گا اور تیری خودسری اور رستم پروری کو لہو کے ہولناک تلاطم کا شکار کردے گا۔''

یہاں تک کہنے کے بعد سلطان رکا دوبارہ اس نے غضبناک نگاہ علی تقندری پر ڈالی پھر کہنے لگا۔

''میں نہیں چاہتا تیرا جیسا شیطان اور ذلیل انسان اس شہر میں داخل ہو لہٰذا شہر سے باہر ہی میں چاہتا ہوں تجھے چیل کوؤں کی خوراک بنادیا جائے۔''

سلطان کے یہ الفاظ سن کر علی تقندری کا رنگ پیلا ہوگیا تھا۔ اس کے بعد سلطان نے اپنے کچھ ان سالاروں کو حکم دیا جو اس کے ساتھ گورگان شہر میں قیام کیے ہوئے تھے اور انہوں نے علی تقندری کو اپنے ساتھ لے جا کر اس کا خاتمہ کردیا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ سلطان نے علی تقندری کے قتل کا حکم جاری کرتے ہوئے اسے اس کے ہولناک انجام تک پہنچایا۔

☆☆☆

''اچھا ہوا تم آ گئی میرے پاس تمہارے لیے بھی اچھی خبر ہے۔''

اس طرح تینوں دیوان خانے میں داخل ہوئے معارا اور راحیل آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔ پھر گفتگو کا آغاز معارا نے کیا اور راحیل کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''پہلے تم بتاؤ کہ تمہارے پاس میرے لیے کیسی اچھی یا خوشی کی خبر ہے۔''

جواب میں راحیل مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

''یقیناً میرے پاس ایک خوشی کی خبر ہے، لیکن چونکہ اس خبر سے متعلق گفتگو کا آغاز تمہاری طرف سے ہوا ہے لہٰذا تم پہلے بتاؤ گی کون سی اچھی خبر لے کر آئی ہو پھر میں تم پر خبر کا انکشاف کروں۔'' معارا مان گئی۔ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اس کے بعد باری باری راحیل اور روبیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''میرے پاس تمہارے لیے خوشی کی خبر یہ ہے کہ سلطان اپنی مہم میں جہاں کامیاب رہتے ہیں وہاں بھائی علی بن ربیع عبدالرزاق دونوں نے علی تقندری ڈاکو کا بھی خاتمہ کردیا ہے۔ اس کے قلعہ پر قبضہ کرلیا ہے۔ سنا ہے کہ وہاں سے بڑا مال غنیمت اور دولت ہاتھ لگی ہے لشکر اس وقت گورگان میں قیام کیے ہوئے ہیں۔ امید ہے گورگان سے لشکر غزنی کی طرف کوچ کرے گا۔'' یہاں تک کہنے کے بعد معارا راحیل کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''اب تم کہو تمہارے پاس میرے لیے کیسی خوشی خبری ہے۔'' جواب میں راحیل مسکرائی۔ کہنے

لگی۔

''جو خبر میں تمہیں کہنا چاہتی تھی تم نے خود کہہ دی ہے اب میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا۔''

معارا نے غور سے راحیل کی طرف دیکھا پھر کہنے لگی۔

''تم دونوں بہن بھائی باغات کی طرف گئے تھے تمہیں کیسے خبر ہوگئی کہ سلطان کا لشکر اپنی مہم کو سر کر کے گورگان میں قیام کر گیا ہے۔''

اس پر راحیل بولی اور کہنے لگی۔

''باغات میں کام کرتے ہوئے روبیل نماز کے لیے شہر میں آیا مسجد میں اسے خبر ہوئی کہ سلطان اور ان کے سالار اپنی مہم میں کامیاب رہے ہیں۔ لشکر سے کچھ مخبر غزنوی شہر میں داخل ہوئے تھے جنہوں نے یہ خبریں دیں۔''

راحیل جب خاموش ہوئی تب معارا بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے پھر کہنے لگی۔

''راحیل اس کے بعد جب لشکر آئے گا تو ہم دوسرے لوگوں کے ساتھ بڑے انوکھے انداز میں استقبال کرنے والے لوگوں میں شامل ہوں گے۔''

راحیل نے اس سے اتفاق کیا تھا اس کے بعد معارا بولی اور کہنے لگی۔

''چلو آؤ میں تمہارے ساتھ مطبخ میں کام کرتی ہوں، آج میں کھانا بھی تم دونوں بہن بھائی کے ساتھ کھاؤں گی اس پر راحیل خوش ہوگئی تھی پھر دونوں اٹھ کر مطبخ کی طرف ہولی تھی۔

☆☆☆

سلطان مسعود غزنوی اپنے لشکر کے ساتھ گورگان سے واپس غزنی کا رخ کرنا چاہتا تھا جس روز اس نے گورگان سے نکل کر غزنوی کی طرف روانہ ہونا تھا اس سے دو روز پہلے اسے ناقابل برداشت خبریں ملی۔ پہلی خبر یہ تھی کچھ ترکمان اسلام قبول کر چکے ہیں وہ مرو شہر کے گرد و نواح میں جمع ہو رہے ہیں ان کے کیا ارادے ہیں کسی کو کچھ خبر نہ ہوئی تھی۔

یہ بھی سلطان کو خبریں ملی تھیں کہ یہ ترکمان اپنے سردار پیغو کی سرکردگی میں اجتماع کر رہے ہیں۔

دوسری بری خبر سلطان کو یہ ملی کہ غیر مسلم ترکمانوں کے کئی گروہ اور دستے ان شاہراہ پر جمع ہو رہے ہیں جو شاہراہ مرو سے ہرات کی طرف جاتی ہے اور یہ غیر مسلم ہیں اور کسی بھی وقت مسلمانوں کے خلاف خون ریزی اور چھاپہ مار جنگ کی ابتدا کر سکتے ہیں۔

تیسری بری خبر جو گورگان کے قیام کے دوران بقول مورخین سلطان کو ملی وہ یہ تھی کہ اس کے گرد و نواح میں بھی ان گنت ترکمانوں نے اجتماع شروع کر دیا ہے اور وہ کسی بھی وقت ان علاقوں کو روندنے کا کام کر سکتے ہیں۔

اور چوتھی خبر گورگان ہی میں سلطان مسعود غزنوی کو یہ بھی ملی کہ ماوراء النہر کا حکمران طغرل دریائے آمو کو عبور کرنے کے بعد سلطان کے علاقوں کو ہوس کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے وہ بھی کسی وقت کوئی کارروائی کر سکتا ہے یہ ساری خبریں سن کر سلطان کو بڑی تشویش ہوئی اس لیے کہ طغرل کے ساتھ جو پچھلی بار جنگ ہوئی تھی جس میں طغرل نے اچانک نمودار ہو کر سلطان کے لشکر پر حملہ کیا اس میں سلطان کے لشکر کی تعداد کافی کم ہوگئی تھی۔ اس بنا پر سلطان کسی بڑی جنگ کی ابتدا نہیں کرنا چاہتا تھا اور مؤرخین کے مطابق سلطان اپنی سلطنت میں امن اور نظم و نسق درست کر کے ہندوستان کا رخ کرنا چاہتا ہے تاکہ وہاں سے نئے لشکر بھرتی کر کے اپنے لشکر کی طاقت بڑھائے اور عسکری قوت کو اس قدر مستحکم کر دے کہ اگر اسے بیک وقت اپنے دشمنوں کے خلاف کئی محاذوں پر جنگ کرنی پڑے تو وہ بڑی آسانی کے ساتھ اپنے دشمنوں سے نمٹ سکے، لیکن حالات اچانک خراب ہوگئے تھے چنانچہ ہندوستان جانے کا معاملہ سلطان نے التوا میں ڈال دیا اور اب اس نے پوری طاقت جو اس وقت اس کے پاس تھی اسے استعمال کرتے ہوئے ترکمانوں کو نیچا دکھانے کا

عزم کرلیا تھا۔ ساتھ ہی اس کا یہ بھی ارادہ تھا کہ اپنی طاقت وقوت کو بڑھا کر ایک نہ ایک روز ماوراء النہر کے حکمران طغرل کے خلاف ضرور حرکت میں آئے۔

ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے سلطان اپنے لشکر کے ساتھ گورگان شہر سے نکلا اور مرو شہر کی طرف روانہ ہوا ان علاقوں میں جو اس وقت ترکمان جمع ہورہے تھے وہ مسلمان تھے ان کا سلطان کے علاقوں پر حملہ آور ہونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا وہ اپنے لیے ذرائع آمدنی بڑھانے کے چکر میں تھے چنانچہ انہیں جب خبر ہوئی کہ سلطان اپنے لشکر کے ساتھ مرو کی طرف کوچ کررہا ہے تو ان پر ضرور حملہ آور ہوگا چنانچہ مورخین کے مطابق انہوں نے ایک قاصد سلطان مسعود غزنوی کی طرف بھیجا۔ سلطان نے ابھی راستے میں ہی پڑاؤ کیا ہوا تھا جب سلطان کو اس کے آنے کی اطلاع دی گئی سلطان نے اسی وقت اسے اپنے خیمہ میں طلب کرلیا ساتھ ہی سارے سالاروں کو بھی بلالیا تھا۔

چنانچہ جب سارے سالار آگئے تب قاصد کو پیش کیا گیا سلطان نے اس کی عزت افزائی کی اس لیے کہ سلطان کو بتایا جاچکا تھا وہ مسلمان ہے۔ سلطان نے اسے اپنے سامنے بٹھایا پھر اسے مخاطب کرکے پوچھا۔

"پہلے یہ بتاؤ تمہیں کس نے بھیجا ہے۔"

اس پر وہ مخبر بولا اور کہنے لگا۔

"سلطان محترم مجھے ہمارے سردار پیغو نے روانہ کیا ہے۔"

سلطان نے غور سے اس کی طرف دیکھا پھر کہنے لگا۔

"پیغو نے میری طرف کیا پیغام بھیجا ہے۔"

اس پر قاصد بولا اور کہنے لگا۔

"سلطان محترم آپ جانتے ہیں ہم مسلمان ہیں۔ ہم مسلمان کے خلاف حرکت میں نہیں آنا چاہتے۔ پیغو نے میرے ذریعے آپ کی طرف یہ پیغام بھیجا ہے کہ ہماری قوم پوری طرح سلطان کی فرماں بردار اور اطاعت گزار ہے ہم نے جواب تک بداعمالیاں کیں ان کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے اگر سلطان ہمارے معاش کے لیے مدد فرمائیں اور ہمارے لیے اتنی جاگیر وقف کردیں کہ جس کی آمدنی سے ہمارے اہل و عیال اور جانوروں کی کفالت ہوسکے تو ہم سب آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی گزشتہ بداعمالیوں کے لیے معافی مانگ لیں گے۔"

یہاں تک کہنے کے بعد وہ قاصد پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتا ہوا کہہ رہا تھا۔

"سلطان محترم! ہمارے سردار پیغو نے یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ آئندہ کے لیے ہم کبھی کوئی شکایت کا موقع نہ دیں گے۔" مورخین مزید لکھتے ہیں سلطان مسعود غزنوی نے ان مسلمان ترکمانوں کی اس درخواست کو قبول کرلیا ان کے سردار پیغو کے پاس اپنا ایک قاصد بھیجا تاکہ ترکمانوں اپنے وعدے کی ضمانت دے کر سلطان مسعود کو آئندہ کے لیے نیک چلنی کا یقین دلادیں۔

ترکمانوں نے سلطان مسعود کی خواہش کے مطابق قول اور قسم دے کر وعدہ کو پورا کرنے کا یقین دلایا اور مورخین کہتے ہیں اس کے بعد سلطان مسعود غزنوی نے ان کی خواہش کو پورا کیا اور ان کی گزربسر کے لیے وسیع علاقے وقف کردیے۔

چنانچہ مسلمان ترکمانوں سے امن کی بات کرنے کے بعد سلطان نے اب مرو شہر جانے کے بجائے ہرات شہر کا رخ کیا تھا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ مرو سے ہرات کی طرف جاتے ہوئے سلطان مسعود غزنوی ابھی راستے میں ہی تھا کہ ترکمانوں کا ایک لشکر اچانک کوہستانی سلسلہ سے نمودار ہوا اور سلطان مسعود غزنوی پر حملہ آور ہوکر نہ صرف لشکر کے پچھلے حصہ کو نقصان پہنچایا بلکہ لشکر کے پچھلے حصے میں جو خوراک سے لدے بار برداری کے جانور تھے ان میں سے بہت سا سامان لے کر وہ

کوہستانی سلسلے میں روپوش ہوگئے۔

ان غیر مسلم ترکمانوں کی اس حرکت پر سلطان بڑا برہم اور غضب ناک ہوا چنانچہ اس نے اپنے لشکر کو وہیں روک دیا۔ اپنے سالاروں کے ساتھ پہلے لشکر کا جائزہ لیا۔ لشکر کے پچھلے حصے کو خاصا نقصان پہنچا تھا اور بار برداری کے جانوروں پر جو ضرورت کا سامان لدا تھا اس میں سے بھی کافی ترکمانی لے اڑے تھے یہ صورت حال دیکھتے ہوئے سلطان نے اپنے لشکر کو وہاں پڑاؤ کرنے کا حکم دیا شاید ترکمانوں سے نمٹے بغیر سلطان آگے نہیں بڑھنا چاہتا تھا۔

جب پڑاؤ قائم ہوگیا تب سلطان اپنے خیمہ میں نہیں گیا جہاں کھڑے ہوکر اپنے سالاروں کے ساتھ لشکر کو روکا تھا وہیں اپنے سالاروں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''غیر مسلم ترکمانوں نے ہم پر حملہ آور ہوکر غلطی کی ہے۔ ان لوگوں نے ہمارے لشکریوں کو موت گھاٹ اتارا، ہمارا سامان بھی لوٹا، میں نے ان کا قلع قمع کرنے کے لیے ایک منصوبہ بندی کی ہے مجھے امید ہے تم میری اس منصوبہ بندی سے اتفاق رائے رکھو گے۔

ہم نے وقت ضائع نہیں کرنا اس وقت جب کہ سورج کافی چڑھ آیا ہے تیز رفتار مخبر ان کوہستانی سلسلوں کے اندر بھیجتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ ہم پر حملہ آور ہونے والے ترکمانوں نے کہاں ٹھکانا بنا رکھا ہے اس کے بعد ان کے خلاف ہم اپنی کارروائی کی ابتدا کریں گے۔''

چنانچہ علی بن ربیع اور دیگر سالاروں نے اس سے اتفاق کیا تھا۔ اسی وقت کچھ مخبر وہاں سے روانہ کیے تھے جو کوہستانی سلسلوں میں گھس کر ترکمانوں کا محلہ وقوع جاننے کے لیے گئے تھے۔

دوپہر کے قریب وہ مخبر لوٹ کر آئے۔ سلطان اور سارے سالار ویسے ہی بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے چنانچہ وہ سلطان کے سامنے آئے۔ سلطان نے بڑی بے تابی سے انہیں مخاطب کیا۔ ''کیا تم ترکمانوں سے متعلق کوئی اچھی خبر لے کر آئے ہو۔''

اس پر آنے والوں میں سے ایک سلطان کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''سلطان محترم یہاں سے لگ بھگ دس سے پندرہ میل کے درمیانی علاقہ میں ترکمانوں نے قیام کر رکھی ہے۔ وہ جنگجو ہیں اور تعداد میں بھی کافی ہیں وہ ہماری پشت پر حملہ آور ہوئے اور ہمارے لشکر کو نقصان پہنچایا۔''

یہاں تک کہنے کے بعد وہ مخبر جب خاموش ہوا۔ تب سوالیہ انداز میں سلطان مسعود غزنوی نے علی بن ربیع کی طرف دیکھا کچھ کہنا چاہتا تھا علی بن ربیع پہلے ہی بول پڑا، کہنے لگا۔

''سلطان محترم! ایک کام کرتے ہیں لشکر کا ایک حصہ یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ آدھا حصہ آپ اپنے پاس رکھیں۔ آدھا میرے حوالے کردیں۔ عبدالرزاق میرے ساتھ ہوگا جو لشکر میرے حوالے کریں گے اس کو مزید دو حصوں میں تقسیم کروں گا ایک میرے تحت کام کرے گا دوسرا عبدالرزاق کی کمان داری میں۔ تھوڑی دیر میں ہم یہاں سے روانہ ہوں گے۔ روانگی سے پہلے ان کوہستانی سلسلوں کے اندر ہم اپنے چند دستے پھیلا دیں گے راستہ میں جو بھی ترکمانی نظر آئے گا انہیں موت کے گھاٹ اتارتے چلے جائیں گے تاکہ ترکمانوں تک یہ خبر نہ پہنچے کہ ہم وقت ضائع کیے بغیر ان کے خلاف حرکت میں آرہے ہیں۔ ہم سے کچھ سامان چھیننے اور ہمارے ساتھیوں کو قتل کرنے کے بعد وہ فتح کا جشن منا رہے ہوں گے جو سامان ہم سے لے کر گئے انہیں آپس میں تقسیم کر کے بڑی خوشی اور شادمانی کا اظہار کر رہے ہوں گے بس ان پر حملہ آور ہونے کا بہترین اور مناسب موقع یہی ہے۔''

سلطان مسعود غزنوی اور دیگر سالاروں نے بھی علی بن ربیع کی اس تجویز سے اتفاق کیا تھا۔ چنانچہ لشکر کی تقسیم سے پہلے کچھ دستے کوہستانی سلسلہ کے اندر

بھیجے گئے تاکہ کوہستانی سلسلہ میں جو بھی ترکمانی نظر آئے اس کا خاتمہ کرتے چلے جائیں تاکہ ترکمانی مخبر سلطان کے لشکر کی نقل وحرکت سے اپنے سالاروں کو آگاہ نہ کرسکیں۔

اس کے بعد لشکر کی تقسیم کو آخری شکل دی گئی آدھا لشکر سلطان نے اپنے پاس رکھ لیا تھا اور پھر تھوڑی دیر بعد علی بن ربیع اور عبدالرزاق بھی اپنے لشکر کو لے کر کوہستانی سلسلے میں داخل ہوئے تھے۔

وہ مخبر جو ترکمانیوں کا محل وقوع دیکھ کر آئے تھے وہ راہ نمائی کررہے تھے چنانچہ پانچ سے سات میل کوہستانی سلسلوں میں آگے جانے کے بعد علی بن ربیع نے اپنے لشکر کو روک لیا۔ لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ کچھ مخبر علی بن ربیع نے اپنے پاس رکھے کچھ عبدالرزاق کے حوالے کیے۔ پھر عبدالرزاق کو مخاطب کرتے ہوئے علی بن ربیع کہنے لگا۔

''عبدالرزاق میرے بھائی! مخبر ہمیں راستے میں بتا چکے ہیں جس جگہ ہمیں نقصان پہنچانے والے ترکمانیوں کے لشکر نے پڑاؤ کر رکھا ہے وہ ایک کھلی وادی ہے اور مختلف سمتوں سے کچھ درے اس وادی میں داخل ہوتے ہیں ہمارے وہ مخبر ہمارے ساتھ ہے جو ان کے محل وقوع سے واقف ہیں لہٰذا لشکر کو تو ہم نے تقسیم کردیا ہے، لیکن لشکر یکجا ہوکر اس وادی تک جائے گا۔ مخبروں کا کہنا ہے اگر ہم ایک ایسے درے میں داخل ہوں جو شمال مغرب کے رخ پر ہے تو اس کے بائیں جانب قدرے بلند پہاڑی سلسلہ ہے جس کے ساتھ بائیں ہاتھ جانب راستہ ہے جو آگے جاکے ایک درے کے سامنے سے گزرتا ہے۔

اس موقع پر میں چاہوں گا کہ وہ درہ جو شمال مغرب کی طرف پر کھلتا ہے اس کے قریب جاکر تم اپنے لشکر کے حصے کو لے کر مجھ سے الگ ہوجانا اور اس پہاڑی کی اوٹ میں ہوجانا جس کے ساتھ راستہ بائیں جانب جاکے ایک درے کے سامنے سے گزرتا ہے۔

میں شمال مشرق کے درہ سے داخل ہوں گا ظاہر ہے مجھے دیکھتے ہی ترکمان مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے لپکیں گے جب میں ان سے ٹکڑا جاؤں تو مجھے امید ہے کہ تم اتنی دیر تک اس چھوٹی پہاڑی کے ساتھ ساتھ بائیں جانب جاکر اس درے کے قریب پہنچ چکے ہوں گے اور پھر پشت کی جانب تم بھی ترکمانوں پر حملہ آور ہوجانا پھر میں دیکھوں گا ترکمان کیسے ہمارا مقابلہ کرتے ہیں اور کیسے دیر تک ہمارا سامنا کرسکتے ہیں۔''

عبدالرزاق اور چھوٹے سالار جوان دنوں ان کے تحت کام کرتے تھے سب نے اس سے اتفاق کیا تھا لہٰذا پیش قدمی پھر شروع کردی گئی۔ وادی کے اندر ترکمانوں نے پڑاؤ کر رکھا تھا اس وادی کے شمال مشرق درے کے پاس جاکر اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ عبدالرزاق علیحدہ ہوکر بائیں جانب بڑھا تھا اس کے علیحدہ ہونے کے تھوڑی دیر بعد شمال مغرب کے درے سے اپنے لشکر کے حصے کے ساتھ علی بن ربیع وادی میں داخل ہوگیا تھا۔

☆☆☆

علی بن ربیع اپنے لشکر کے ساتھ وادی میں داخل ہوا اس کے لشکر کو دیکھتے ہی ترکمان مسلح ہوکر بڑی تیزی سے اس کی طرف لپکے دوسری طرف علی بن ربیع بھی حملہ آور ہونے کے لیے پوری طرح تیار تھا چنانچہ طوفانی انداز میں اس نے اپنے لشکر کو فضا کے کوہ صحرا میں قاہر و جبروت عناصر موت کے دہشت و دریا بگولوں جیسی بے کل لہروں کی مستی کی طرح آگے بڑھا اور ان ترکمانوں پر شیاطینی پھندوں کی ہولناکی اور بدکاری کو خرافات بستیوں میں بدلتے مرگ کے سیل رواں جہل کے طوفانوں میں عذاب و برق کے گھواروں اور بھڑکتی آگ کے غضب کی طرح حملہ آور ہوگیا تھا۔

ترکمان اپنے سامنے علی بن ربیع کی کمان داری میں ایک چھوٹا سا لشکر دیکھ کر بپھر گئے تھے۔ وہ ارادہ کرچکے تھے کہ جلد اس لشکر کا خاتمہ کردیں گے چنانچہ وہ فوراً علی بن ربیع کے لشکر پر حرف وصوت کے جہاں

آدمیت کے وقار کو مجروح کرتی ظلمت کدوں کی ویرانیوں ،خوابوں کو کرچی کرچی کرتی فضا کی ہولناکیوں پر غضب برہم آسیبوں زیر بھرے سرابوں کی طرح حملہ آور ہوئے تھے یہ ٹکراؤ ہوا ہی تھا کہ پشت کی جانب سے تکبیریں بلند کرتا ہوا اپنے لشکر کے ساتھ عبدالرزاق بھی نمودار ہوا اور وہ ترکمانوں کی پشت پر رگ و پے میں خون ریزی بھر دینے والے بے چین شراروں کے خروش نظر نظر میں ویرانیاں کھڑی کر دینے والے نفرت کے سلگتے سایوں، ریزہ ریزہ کر دینے والی ستم گری کی یلغار اور فضا کی ہلاکت خیزیوں کی طرح حملہ آور ہوا تھا۔

اس طرح ان وادیوں میں لشکروں کے ٹکرانے سے میدانِ جنگ کے اندر نفس کی ذلت، روحوں کی رسوائیاں، آرزوؤں کی سنسانیاں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ کرب و ذلت کے بگولے رقص کرنے لگے تھے۔ لشکر ایک دوسرے پر اولوں کی طرح برسنے لگے تھے، فضاؤں کے نوحے، ہواؤں کے ماتم میدانِ جنگ پر خوف وحشت طاری کرنے لگے تھے۔

ترکمانوں کے لشکر کی تعداد زیادہ تھی ان کے مقابلے میں علی بن ریج اور عبدالرزاق کے لشکر کی تعداد بالکل مختصر تھی۔ اس بنا پر جنگ طول پکڑنے لگی تھی۔

اس کا اندازہ علی بن ریج نے بھی لگالیا تھا چنانچہ اس نے دیکھا کہ جنگ طول پکڑ رہی ہے اور ترکمان اپنی عددی فوقیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑھ چڑھ کر حملہ آور ہو رہے تب اس نے چند بار سمندر کے جلال میں ہیبتوں کے نزول اور مرگ کی اساس بنا کر متحیر و مبہوت کر دینے والے جھکڑوں کے محرموں کی طرح تکبیریں بلند کیں اس کے بعد اس نے اپنی لشکریوں کو للکارا، انہیں مخاطب کرتے ہوئے اسے پوری طاقت قوت کے ساتھ حملہ آور ہونے کے لیے کہا تاکہ جنگ طول نہ پکڑ سکے اور ترکمانوں کو بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑے۔

علی بن ریج کی ان تکبیروں اور اس کے اس طرح للکارنے پر اس کے لشکری جو اس کے اشاروں پر کام کرنے کے عادی ہو چکے تھے وہ کھولتے الاؤ کی طرح بھڑک اٹھے تھے لہٰذا سارے لشکری جو علی بن ریج اور عبدالرزاق کے تحت کام کر رہے تھے وہ دونوں طرف سے فطرت کے رجال غیب گشتگی کے ابلتے بحر پست و پامال کرتے آگ دخوں کے ہیجان عصیان کی ڈوریاں کاٹتے موت کے سوداگروں کی ہنرمندی کی طرح حملہ آور ہوتے ہوئے اپنے پیچھے ترکمانوں کی لاشوں کی بساط بچھاتے اور ایک طرح سے رنج و غم کے کھلیان کھڑے کرتے چلے گئے تھے۔

ترکمانوں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ حملہ آوروں کو وادی سے نکال باہر کریں لیکن ایسا نہیں ہوا وہ علی بن ریج، عبدالرزاق اور ان کے ساتھیوں کے پرجوش حملوں کا دفاع نہ کر سکے شکست اٹھائی اور بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس موقع پر علی بن ریج عبدالرزاق مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''عبدالرزاق تم اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ ان ترکمانوں کے پڑاؤ کی ہر چیز کو سمیٹو میں جنگ میں گرفتار ہونے والے ترکمانوں پر نگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ مستعد رہوں گا تاکہ ہمیں سامان سمیٹتے ہوئے دیکھ کر بھاگنے والے ترکمان پلٹ کر حملہ آور ہو کر ہماری فتح کو شکست میں نہ تبدیل کر دیں۔ عبدالرزاق نے اس سے اتفاق کیا تھا چنانچہ اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ اس نے سامان سمیٹا سامان کی دیکھ بھال بھی عبدالرزاق کے لشکر کے ذمے کی گئی۔ اس کو آگے رکھا گیا لیکن درمیان میں گرفتار ہونے والے ترکمانوں کو جن میں عورتیں، بچے بھی شامل تھے رکھا گیا اور پچھلے حصے میں حفاظت کی خاطر خود علی بن ریج اپنے حصے لشکر کے ساتھ رہا تاکہ ترکمان پشت کی جانب سے حملہ آور ہو کر نقصان نہ پہنچا سکیں اس حالت میں وہ کوہستانی سلسلے سے نکل کر سلطان مسعود غزنوی کے پاس پہنچے تھے۔

سلطان مسعود غزنوی نے علی بن ریج اور

عبدالرزاق کی اس کامیابی کو سراہا تھا۔

اس فہم سے متعلق مورخین لکھتے ہیں کہ اس ٹکراؤ کے دوران جو ترکمانی گرفتار ہوئے تھے ان کو ان کے اہل وعیال کو سلطان مسعود غزنوی نے گدھوں پر سوار کروا کے ترکمانوں کے بڑے سردار پیغو کی طرف روانہ کیا اور یہ پیغام دیا۔

''یہ دیکھو اور آئندہ کے لیے ہوشیار ہو جاؤ اس لیے جو وعدہ خلافی کرتا ہے اپنے عہد کو توڑتا ہے اس کا یہی حشر اور حال ہوتا ہے۔''

یہ گرفتار ہونے والے ترکمان جب پیغو کے پاس پہنچے تو پیغو نے سلطان مسعود کو پیغام بھجوایا۔

''میں خود بھی ان لوگوں سے بے زار تھا ان کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی میری ان میں سے کسی کے ساتھ رشتے داری یا گہرا تعلق ہے۔''

بہرحال مورخین کے مطابق پیغو نے ان لوگوں سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اور سلطان مسعود غزنوی کو یہ بھی کہلا بھیجا کہ میں خود ان لوگوں سے بے زار تھا اور میں خود ان کو سزا دینا چاہتا تھا انہیں خود بخود مل گئی ہے۔

مورخین لکھتے ہیں کہ ہرات کی طرف جاتے ہوئے جن ترکمانوں کا سلطان نے قلع قمع کیا تھا اس سے نمٹنے کے بعد سلطان ہرات شہر پہنچا لیکن اسے کہیں جم کر ٹھہرنے کا موقع نہ ملا ترکمانی جگہ جگہ بغاوتیں اور سرکش کھڑی کر رہے تھے چنانچہ ان ہی کی کارروائیوں کی وجہ سے سلطان زیادہ دن ہرات میں نہ ٹھہرا۔ ہرات سے نیشا پور پہنچا اور وہاں سے اس نے ترکمانوں سے نمٹنے کے لیے طوس شہر کا رخ کیا تھا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ طوس کے قرب وجوار میں بھی ترکمانوں کے ایک لشکر سے سلطان مسعود کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ سلطان نے ان پر حملہ آور ہو کر ان کی اکثریت کو موت گھاٹ اتار دیا اور طوس شہر میں داخل ہوا اس کے بعد سلطان کو یہ بھی خبر ملی کہ ماوراالنہر کا حکمران طغرل بیگ جو پیغو کی طرح ترکمانوں کا ایک بہت بڑا اور طاقتور لشکر رکھنے والا حکمران تھا وہ دریائے آموں کو عبور کرنے کے بعد قریبی علاقے میں قیام کیے ہوئے ہے اور آنے والے دنوں میں سلطان مسعود کے خلاف اپنی کارروائیوں کی ابتدا کرنا چاہتا ہے۔

سلطان مسعود نے بقول مورخین سردیوں کا موسم نیشا پور میں گزارا تھا اس کے بعد ہجری ۴۳۰ کے موسم بہار میں طغرل بیگ پر ضرب لگانے کے لیے نیشا پور سے نکلا تھا طغرل بیگ ایک خاصے بڑے لشکر کے ساتھ بادآورد شہر میں ٹھہرا ہوا تھا۔

دوسری طرف طغرل بیگ کو جب خبر ہوئی کہ سلطان مسعود غزنوی اس سے نمٹنے کے لیے نیشا پور سے روانہ ہو چکا ہے تو وہ خوف اور ڈر کے مارے اپنے علاقے کی طرف بھاگ گیا چنانچہ سلطان مسعود غزنوی طغرل بیگ کی فرار کی خبر سن کر راستے ہی میں اپنا فیصلہ بدل کر سرخس جا پہنچا۔ یہاں کی قوتوں نے بھی بغاوت پر آمادگی کا اظہار کر رکھا تھا خراج دینے سے انکار کر دیا تھا۔ سلطان مسعود نے وہاں کے باشندوں کو نافرمانی کا خوب مزا چکھایا اور سرخسی شہر اور اس کے قلعے کو اپنا مطیع بنا کر اس نے بقول مورخین دندان کان کے مقام پر جا قیام کیا تھا۔

سلطان مسعود غزنوی نے کیونکہ ترکمانیوں کو ان گنت مواقع پر بدترین شکستیں دی تھیں انہیں کافی نقصان پہنچایا اور انہیں اپنے علاقوں سے نکال باہر کیا تھا لہٰذا ترکمانی بھی اب ایک طرح سے ان کے خلاف انتقامی کارروائیوں پر اتر آئے تھے لہٰذا ترکمانوں نے آپس میں اتفاق کیا، سارے جمع ہوئے اور یہ فیصلہ کیا کہ سلطان مسعود کو گھیر کر اس کا خاتمہ کر دیا جائے تاکہ آنے والے دور میں ان کے راستے میں رکاوٹ کھڑی نہ کر سکے۔

چنانچہ مورخین لکھتے ہیں جس وقت سرخس سے نکل کر کھلے میدانوں میں سلطان مسعود غزنوی نے دندان کان کے قریب قیام کر رکھا تھا تب آٹھ رمضان کو ترکمانی حرکت میں آئے۔ بہت بڑا اور

جرار لشکر جس کا شمار نہیں کیا جا سکتا تھا اسے لے کر وہ سلطان مسعود غزنوی کی طرف بڑھے۔ چاروں طرف سے اسے گھیر لیا۔ ترکمانیوں کی اس یورش، اس حملے سے متعلق مورخین کچھ اس انداز میں لکھتے ہیں کہتے ہیں۔

آٹھ رمضان ہجری ۴۳۰ھ کو سلطان مسعود کو ایک بار پھر ترکمانیوں سے واسطہ پڑا۔ ایک زبردست لشکر نے سلطان مسعود کو چاروں طرف سے گھیر لیا بادل ناخواستہ سلطان مسعود نے اپنے لشکر کو مرتب کیا اور فریقین میں جنگ شروع ہوئی۔

لڑائی کے دوران سلطان مسعود کے لشکر کے کئی سالار اور سردار جو آئے دن کی جنگوں سے تنگ آ چکے تھے وہ میدانِ جنگ چھوڑ گئے۔ سلطان نے اپنے ساتھی سرداروں کی یہ نمک حرامی اور حالت دیکھی تو وہ خود میدان میں اپنے لشکر کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے اور ان کے آگے رہتے ہوئے جنگ کرنے لگا۔

مورخین یہ بھی لکھتے اس موقع پر سلطان مسعود نے ترکمانیوں کے بیشتر لشکریوں کو تلوار کے گھاٹ اتار کر سب پر اپنی دھاک بٹھا کر رکھ دی اور ایسی جوان مردی سے لڑا کہ شاید کسی حکمران نے میدانِ جنگ میں ایسی جرأت مندی اور بہادری کا مظاہرہ کیا ہوگا مگر اس کا کیا علاج کہ سلطان مسعود کے، بقول مورخین برے دن آ چکے تھے لشکر کا کچھ حصہ دشمنوں نے کاٹ مارا اور جو باقی بچے تھے ان میں کچھ نے فرار اختیار کر لیا تھا۔ سلطان مسعود اپنے چیدہ چیدہ سالاروں اور لشکریوں کے ساتھ رہ گیا تھا۔

چنانچہ اس ٹکراؤ کے متعلق مورخین مزید لکھتے ہیں جب سلطان مسعود نے دیکھا کہ اس کے آس پاس اس کے کوئی زیادہ ساتھی باقی نہیں رہے، مجبور ہو کر لڑائی سے ہاتھ اٹھایا اور اپنے کچھ سالاروں اور ساتھیوں کے ساتھ دشمن کی صفوں کو چیرتا ہوا میدان سے بھاگ نکلا۔

ساتھ ہی مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ دشمنوں نے اسے اپنے سامنے بھاگتے ہوئے دیکھا لیکن کسی کو جرأت نہ ہوئی اس کا تعاقب کرتا۔ سلطان مسعود اس طرح فرار اختیار کرتا ہوا مرو شہر پہنچا۔ وہاں اس سے پہلے ہی اس کے کچھ دستے جنگ سے فرار حاصل کر کے پہنچ چکے تھے چنانچہ مفرور لشکریوں کے دستے اس سے آ ملے تھے۔

راستے میں سلطان مسعود نے، بقول مورخین ان مفرور لشکریوں سے کسی قسم کی بات نہ کی اور ان کو ساتھ لے کر غزنی پہنچا یہاں اس نے مفرور لشکریوں کے مشہور سرداروں میں سے علی دایہ، بک تھدی اور ہاجب شیعبانی جو سرفہرست تھے ان کو گرفتار کر کے ہندوستان کے مختلف قلعوں میں قید کر دیا اور مورخین کہتے ہیں ان قیدیوں میں سے اکثر نے قید کی حالت میں ہی وفات پائی۔

غزنی کے لوگ بڑے شان دار انداز میں سلطان اور اس کے لشکر کا استقبال کرنا چاہتے تھے لیکن ایسا نہ ہو سکا اس لیے کہ سلطان اپنے لشکر کے ساتھ رات کے پچھلے حصے میں غزنی شہر میں داخل ہوا تھا چنانچہ سارے لشکری اپنے گھروں کو اور باقی متفرق کی طرف منتقل ہو گئے تھے۔

غزنی شہر میں جب دھوپ کافی چڑھ آئی تب علی بن ربیع کی حویلی پر روبیل نے دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا دروازہ علی بن ربیع نے کھولا تھا۔ روبیل پر جوش انداز میں پہلے بغلگیر ہوا پھر علی بن ربیع سے اس نے مصافحہ کیا، اس کے بعد مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

''بھائی! ہم ہی نہیں غزنی شہر کے سارے لوگ لشکر کا بہترین انداز میں استقبال کرنا چاہتے تھے لیکن جب آدھی رات تک بھی لشکر غزنی نہ پہنچا تو تب لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے۔''

یہاں تک کہنے کے بعد روبیل رکا پھر اپنی بات کو آگے بڑھانا چاہتا تھا کہ علی بن ربیع نے اس کا ہاتھ پکڑا دونوں دیوان خانے میں جا کے بیٹھ گئے گفتگو کا آغاز روبیل نے کیا اور کہنے لگا۔

''میں اور بہن بھی تقریباً آدھی رات تک

شاہراہ کے کنارے کھڑے رہے کہ آپ کا استقبال کریں گے، ناکام گھر لوٹ آئے بہرحال راحیل نے اپنے اور آپ کے لیے کھانا تیار کرلیا ہے۔ کچھ دیر تک کھانا یہیں لے کر آتی ہے، بھائی اس کی آمد سے پہلے میں ایک انتہائی اہم موضوع پر آپ سے گفتگو کرلینا چاہتا ہوں۔''

روبیل کے ان الفاظ پر چونک جانے کے انداز میں علی بن ربیع نے اس کی طرف دیکھا پھر پوچھ لیا۔ ''روبیل تم اپنی بہن راحیل کی غیر موجودگی میں مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو۔''

روبیل مسکرایا اور کہنے لگا۔ ''بھائی میں اپنی بہن کے مستقبل کے لیے آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں اب جب کہ آپ اپنی لمبی مہم سے لوٹ آئے ہیں میں چاہتا ہوں آپ اور راحیل کی شادی کا اہتمام کردیا جائے تاکہ راحیل اس حویلی میں منتقل ہوجائے اور اسے یہ احساس ہو کہ اس کا اپنا گھر بھی ہے۔ بھائی اس کے علاوہ میں آپ سے یہ بھی کہوں گا کہ محترم سامیارس اور ام میم بھی معارہ کی شادی عبدالرزاق سے کرنے کا فیصلہ کرچکے ہیں وہ دونوں میاں بیوی مجھے خود ملے اور اپنے اس فیصلے کا اظہار کیا۔ جونہی آپ اور بھائی عبدالرزاق لوٹیں گے تو معارہ اور عبدالرزاق کی شادی کا اہتمام کردیا جائے گا لہٰذا میں بھی چاہتا ہوں کہ اپنی بہن کی شادی کا اہتمام کردوں اس کے بعد میرے بھائی سارا معاملہ آپ کی مرضی پر ہوگا۔ شادی کے بعد اگر آپ کسی مہم پر نکلتے ہیں، اگر آپ چاہیں تو راحیل کو اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں اکثر اس لیے کہ میں نے دیکھا اکثر مہموں میں سالار اور لشکری اپنے اہل خانہ کو بھی اپنے ساتھ رکھتے ہیں اگر آپ راحیل کو کسی مہم پر اپنے ساتھ نہ لے جانا چاہیں تو راحیل میرے ساتھ رہ سکتی ہے۔ بھائی آپ دونوں کی شادی ہوجائے گی تو میں سمجھتا ہوں آپ کے لیے آسانیاں ہوجائیں گی۔ گھر کی دیکھ بھال راحیل خود کرے گی ابھی اسے کھانا پکا کر لانا پڑتا ہے پھر اس حویلی کا مطبخ گرم ہوجائے گا اس کے علاوہ بھائی میں سمجھتا ہوں راحیل کے یہاں آنے سے صحیح معنوں میں حویلی آباد ہوجائے گی۔

اب آپ بتائیں آپ کی کیا مرضی ہے؟''

جب تک روبیل بولتا رہا علی بن ربیع بڑے غور اور انہماک سے اس کی بات سنتا رہا۔ جب وہ خاموش ہوا تب علی بن ربیع بولا اور کہنے لگا۔ ''روبیل میرے بھائی جو تجویز تم نے پیش کی ہے وہ بڑی اچھی اور عمدہ ہے۔ شادی میں نے کرنی ہے وہ بھی راحیل سے کرنی ہے کہ میں راحیل کا ممنون اور شکر گزار ہوں اس نے مجھے اپنی محبت اور توجہ کا مرکز بنا کر رکھا ورنہ تم جانتے ہو میں سمرقند سے نکلا ہوا ایک دربدر ہونے والا شخص تھا۔ آپ دونوں بہن بھائی نے۔۔۔ میں سمجھتا ہوں یہاں غزنی میں اپنے پیار اور محبت سے میرے قدم جما کر رکھ دیئے ہیں۔

روبیل میرے بھائی! جہاں تک شادی کا تعلق ہے اس مہم کی واپسی کے بعد شادی نہیں ہوسکتی میرے بھائی جو کچھ میں کہنے لگا ہوں غور سے سننا۔ جس مہم سے ہم لوٹے ہیں اس مہم کے دوران ہمارے لشکر کی تعداد بہت کم ہوگئی ہے۔ ترکمانوں کے ساتھ جنگوں کے دوران ہمارے لشکری کم ہوتے رہے ہیں اس موقع پر ترکمان ہم پر شب خون مارتے رہتے ہیں کبھی دن کے وقت بھی اچانک حملہ آور ہوکر ہمیں نقصان پہنچاتے رہے ہیں جس کی بنا پر لشکر کی تعداد کم ہوگئی ہے۔ سلطان پکا پختہ ارادہ کئے ہوئے ہیں کہ ایک خاصا بڑا لشکر تیار کرکے ترکمانوں سے اپنی سلطنت کو محفوظ کردیا جائے۔

بھائی! میرے ترکمان دو سمتوں سے حملہ آور ہوتے ہیں ایک شمال مغرب کی طرف سے ان ترکمانوں کا سالار اور سردار پیغو ہے۔ دوسرے ترکمان دریائے آموں کے اس پار سے نمودار ہوتے ہیں اور سلطان کی مملکت پر حملہ آور ہوتے ہیں ان ترکمانوں کا سردار طغرل بیگ ہے۔ ان دونوں قوتوں سے لشکر کو خاصا نقصان پہنچا ہے لہٰذا ان سارے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے سلطان نے یہ فیصلہ کیا

ہے کہ اگر اسے ترکمانوں کا صحیح معنوں میں مقابلہ کرنا ہے اور ان کی قوت کو توڑ کر اپنے علاقوں کو محفوظ رکھنا ہے تو پھر ان کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک بہت بڑا لشکر تیار کرنا ہوگا۔

یہاں میں یہ بھی بتاتا چلوں جو لشکر اس وقت سلطان کے پاس ہے ان میں سے بہت سے لگاتار جنگ کرتے ہوئے نہ صرف جنگوں سے نالاں ہیں بلکہ کچھ عناصر سلطان سے بھی تنگ آچکے ہیں۔ سلطان انہیں ہمہ وقت جنگوں میں مصروف رکھے ہوئے ہیں تاہم فیصلہ یہ ہوا ہے کہ لشکر اب زیادہ سے زیادہ پانچ سات دن یہاں غزنوی میں قیام کرے گا اس کے بعد سلطان یہاں سے کوچ کریں گے۔ سلطان کے والد محترم سلطان محمود غزنوی ہندوستان سے جس قدر مال و دولت اور دوسرا سامان لائے تھے وہ سلطان مسعود غزنی اپنے ساتھ لے کر ہندوستان کا رخ کریں گے۔ کچھ عرصہ ہندوستان میں قیام کر کے جو رقم ساتھ لے کر جائیں گے اسے خرچ کر کے نئے لشکری بھرتی کریں گے۔ ان کی تربیت کا کام کیا جائے گا اس کے بعد جرار لشکر تیار کرنے کے بعد سلطان چاہتا ہے کہ لوٹیں اور پھر دونوں طرح کے ترکمانوں پر حملہ آور ہو کر ان کی طاقت اور قوت کا خاتمہ کر کے اپنی سرحدوں کو محفوظ کر دیں گے۔

اس وقت ترکمانوں کے دو گروہ ہیں دونوں ہی بڑے طاقت ور ہیں۔ چغو کے پاس بڑی سپاہ ہے طغرل بھی خاصا بڑا لشکر رکھتا ہے لہٰذا چھوٹے لشکر کے ساتھ مقابلہ کرنا اور لگاتار انہیں شکست سے دوچار کر کے اپنی سرحدوں کو محفوظ کرنا آسان کام نہیں ہے۔

اس بنا پر روبیل میرے بھائی! میں چاہوں گا کہ ہندوستان کی مہم سے واپس آنے کے بعد میں راحیل سے شادی کر لوں گا۔ اس طرح دونوں میاں بیوی کو چند ماہ غزنی میں رہنا بھی نصیب ہو جائے گا پھر بعد میں اگر کوئی مہم نکلتی ہے تو راحیل کو میں اس مہم میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا، لیکن شادی کرنے کے لیے میری دو شرائط ہیں اور اگر یہ دو شرائط پوری نہ کی گئیں تو میں شادی نہیں کروں گا۔''

علی بن ربیع کے یہ الفاظ سن کر روبیل چونکا تھا ایک گہری نگاہ جس میں استفسار ہی استفسار تھا اس نے علی بن ربیع پر ڈالی پھر کہنے لگا۔

''بھائی! آپ کی کون سی دو شرائط ہیں آپ نے مجھے شش پنج میں ڈال دیا ہے۔ خدا کے لیے کوئی ایسی شرط نہ رکھیے گا جس کو پورا کرنا میرے بس میں نہ ہو۔''

جواب میں علی بن ربیع مسکرایا اور کہنے لگا۔

''ایسی کوئی شرط نہ رکھوں گا جو تمہارے بس سے باہر ہو اور سنو بلکہ میں کہوں گا غور سے سنو۔

روبیل میرے بھائی! میری پہلی شرط یہ ہے جس وقت میری اور راحیل کی شادی ہوگی اس وقت تمہاری شادی کا اہتمام بھی کیا جائے گا۔

میرے عزیز بھائی! میری دوسری شرط یہ ہے کہ اس شادی کے موقع پر تم راحیل کو کچھ نہیں دو گے میرے بھائی جس قدر تمہارے باغات کھیت اور تمہاری زمین ہے سب تمہارے نام تمہارے پاس رہیں گے ان میں سے راحیل کچھ نہیں لے گی نہ راحیل مطالبہ کرے گی اور نہ تم اپنی مرضی کچھ دینے کی کوشش کرو گے۔ اس لیے کہ شادی کے بعد راحیل کی ہر ضرورت کا پورا کرنا میری ذمہ داری ہوگی ہاں اگر یہ دو شرائط مانتے ہو تو پھر ہندوستان سے واپسی کے بعد میں راحیل سے شادی کر لوں گا۔''

علی بن ربیع جب خاموش ہوا تب مسکراتے ہوئے روبیل کہنے لگا۔

''واہ! یہ کوئی شرائط ہیں۔ میرے بھائی! یہ تو مجھے منظور ہیں بلکہ اس میں تو ہماری ہی بہتری اور فلاح ہے لیکن۔۔۔''

جواب میں علی بن ربیع فوراً بول پڑا۔

''لیکن کیا ہو گیا؟''

علی بن ربیع کو رک جانا پڑا اس لیے کہ مسکراتے ہوئے روبیل بول پڑا۔

''میں چاہتا تو یہ تھا بھائی! زمین میں باغات کھیتوں میں جس قدر راحیل کا حصہ بنتا ہے وہ اسے ملے۔ اگر آپ یہ شرط رکھتے ہیں تو جیسا آپ کہیں گے ویسا ہی ہوگا۔ آپ بالکل بے فکر رہیں، میں اس کام میں اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش نہیں کروں گا۔''

اس کے ساتھ ہی روبیل اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا پھر علی بن ربیع کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''بھائی آپ بیٹھیں، بہن نے کھانا تیار کرلیا ہوگا وہ بے چینی سے میرا انتظار کررہی ہوگی لہٰذا میں اس کے ساتھ کھانا لاتا ہوں پھر تینوں اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔''

علی بن ربیع نے اس سے اتفاق کیا تھا لہٰذا روبیل اٹھ کر دیوان خانے سے نکل گیا تھا۔

روبیل جب اپنی حویلی میں داخل ہوا اس نے دیکھا دیوان خانے سے باہر ہی راحیل بڑی بے چینی سے شاید اس کی واپسی کا انتظار کررہی تھی۔ جب وہ حویلی میں داخل ہوا تو راحیل اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے لگی تھی۔ روبیل آگے بڑھا پھر راحیل کو مخاطب کرکے کہنے لگا۔

''میری بہن! جس موضوع پر گفتگو کرنے گیا تھا وہ گفتگو میں نے امیر کے ساتھ تفصیل سے کی ہے، میں نے امیر سے یہ بھی کہا کہ محترم سامیارس بھی اب معارہ اور بھائی عبدالرزاق کی شادی کا اہتمام کرنا چاہتے ہیں، لیکن وہ اہتمام بھی اب نہیں ہوگا۔''

یہاں تک کہنے کے بعد روبیل رکا تو راحیل کسی قدر پریشانی میں مبتلا ہوگئی تھی اور استفسار بھرے انداز میں وہ روبیل کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ روبیل اس کے اس طرح دیکھنے کا مطلب سمجھ گیا تھا لہٰذا مسکراتے ہوئے پھر بولا کہنے لگا۔ ''میری بہن تم فکرمند نہ ہو میں سارا معاملہ طے کرکے آرہا ہوں میری جو گفتگو امیر سے ہوئی ہے اس کے تحت وہ تم سے شادی کریں گے لیکن یہ شادی ذرا التوا میں جائے گی اس لیے امیر زیادہ سے زیادہ پانچ یا سات دن غزنی میں قیام کریں گے اس کے بعد سلطان کے ساتھ ہندوستان کی ایک نئی مہم پر روانہ ہوجائیں گے۔'' پھر وہاں کھڑے کھڑے روبیل نے اس گفتگو کی ساری تفصیل راحیل سے کہہ دی تھی جو گفتگو علی بن ربیع سے ہوئی تھی۔ سب کچھ جاننے کے بعد تھوڑی دیر تک راحیل گہری سوچوں میں ڈوبی رہی پھر اس نے سر کو جھٹکا پھر اس کے بعد اپنے بھائی روبیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''بھائی امیر کا فیصلہ درست ہے، میں اس سے اتفاق کرتی ہوں اگر سلطان کے لشکر کی تعداد کم ہوگئی ہے اور ترکمانی آئے دن سلطان کے علاقوں پر حملہ آور ہونے لگے ہیں تو یقیناً سلطان کو اپنے لشکر کی تعداد بڑھانی چاہیے۔ میرے خیال میں اب اس موضوع پر گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ دونوں بہن بھائی کھانا لے کر جاتے ہیں اور وہیں بیٹھ کے کھاتے ہیں۔''

راحیل کے ان الفاظ پر روبیل نے بھی خوشی کا اظہار کیا تھا پھر دونوں بہن بھائی نے کھانے کے برتن اٹھائے علی بن ربیع کی حویلی میں داخل ہوئے۔ علی بن ربیع دیوان خانے میں ہی بیٹھ کر ان کا انتظار کررہا تھا دونوں بہن بھائی دیوان خانے میں داخل ہوئے۔ علی بن ربیع اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس موقع پر راحیل نے ایک مسکراتی ہوئی نگاہ علی بن ربیع پر ڈالی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے خوش آمدید کہا۔ کھانے کے برتن اس کے سامنے رکھے پھر دونوں بہن بھائی بیٹھ گئے۔ اس موقع پر علی بن ربیع نے گہری نگاہ راحیل پر ڈالی۔ پھر پیار بھرے انداز میں اسے مخاطب کرکے کہنے لگا۔

''راحیل! کیسی ہو؟''

راحیل بھی مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ ٹھیک ہی ہوں، تو آپ کے سامنے بیٹھی ہوں ہم دونوں بہن بھائی کو تو آپ کی فکر رہتی ہے ان دنوں مہم پہ مہم نکل رہی ہے۔ اللہ کرے سلطان کو جو حالات پیش آرہے ہیں وہ خیر و عافیت کے ساتھ سلطان بہتر انجام تک پہنچادیں۔''

اس کے بعد راحیل نے کھانے کے برتنوں پر جو سفید رنگ کا جالی دار کپڑا ڈالا ہوا تھا وہ اس نے ہٹایا۔ اس موقع پر علی بن ربیع نے روبیل کی طرف دیکھا، کہنے لگا۔

''روبیل اس مہم کے دوران میرے حصہ میں مالِ غنیمت میں سے بہت کچھ آیا ہے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہو۔''

علی بن ربیع کے ان الفاظ پر راحیل نے چونک کر علی بن ربیع کی طرف دیکھا۔ پھر پیار بھرے انداز میں کہنے لگی۔

''یہ آپ کس قسم کی گفتگو کر رہے ہیں یہ تو ہمیں پوچھنا چاہیے کہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے کہ نہیں آپ کی تو ان مہموں کے علاوہ ذرائع آمدنی نہیں ہے، پھر جو جملہ آپ نے کہا ہے یہ جملہ تو ہمیں کہنا چاہیے تھا۔''

علی بن ربیع کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ روبیل کھل کے مسکرا دیا کہنے لگا۔

''امیر! میری بہن راحیل ٹھیک کہتی ہے آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے تو بلا جھجک ہم سے کہیں اس لیے کہ اب جب کہ آپ راحیل کی زندگی کے ساتھی بننے والے ہیں ہمارا آپ پر کم بلکہ آپ کا ہم پر زیادہ حق بنتا ہے۔''

اس پر علی بن ربیع بھی کھل کر مسکرا دیا کہنے لگا۔

''حق کی بات چھوڑو۔ اصل بات یہ ہے کہ مجھے بھوک لگی ہے پہلے کھانا کھائیں۔''

علی بن ربیع کے ان الفاظ پر راحیل اور روبیل دونوں خوش ہو گئے تھے۔ پھر تینوں مل کے کھانا کھانے لگے تھے۔

☆☆☆

تقریباً ایک ہفتہ بعد سلطان مسعود غزنوی نے اپنے بچے کھچے لشکر کے ساتھ غزنی سے ہندوستان کو کوچ کیا تھا۔ کوچ سے پہلے اس نے تین بہترین قسم کے انتظامات کیے تھے۔

اول یہ کہ اس نے اپنے بیٹے مودود کو بلخ کا حاکم مقرر کیا۔ اپنے دوسرے بیٹے محمود کو ملتان کا حاکم مقرر کیا۔ تیسرے بیٹے ایز دیار کو غزنی میں رکھا تا کہ وہاں کے حالات درست رکھے جن علاقوں کا سلطان نے جو اپنے بیٹوں کو حاکم مقرر کیا تھا مورخین کا کہنا ہے ایسا سلطان نے اپنی سلطنت کے استحکامات کی خاطر کیا تھا اس سلسلہ میں مورخین ان انتظامات کے متعلق کچھ اس طرح لکھتے ہیں ان کا کہنا ہے، ترکمانوں سے مفرور ہونے والے سالاروں اور لشکریوں کو سزا دینے کے بعد سلطان مسعود غزنوی ترکمانوں کو کچلنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ آخر کار اس نے ہندوستان جانے کا ارادہ کیا تا کہ وہاں اپنے لشکر میں نئے لشکریوں کو داخل کر کے اپنی قوت میں اضافہ کرے، پھر ترکمانوں سے معرکہ آرا ہو کر ان کی بداعمالیوں کی پوری پوری سزا دے۔

اس کے بعد سلطان مسعود نے اپنے بیٹے مودود کو بلخ کا حاکم مقرر کیا، خواجہ محمد بن عبدالصمد کو اس کے ہمراہ روانہ کیا ایک اور سالار تگین کو بھی مودود کا مصاحب بنایا گیا اور چار ہزار لشکریوں کا ایک لشکر دے کر اسے بلخ کی طرف روانہ کر دیا۔

مسعود نے اپنے دوسرے بیٹے امیر محمود کو جو اس وقت لاہور میں تھا اسے دو ہزار لشکریوں کے ساتھ ملتان روانہ کیا تھا تا کہ وہاں کے انتظام حکومت کو بہتر بنائے اور ابتری وانتشار نہ ہونے دے۔ جبکہ تیسرے بیٹے امیر ایز دیار کو سلطان مسعود غزنوی نے کوہ پایہ غزنی کی طرف روانہ کیا تا کہ وہاں کے سرکش افغانیوں کو قابو میں رکھا جائے اور اس طرح غزنی سلطنت کی سرحدیں انتشار سے محفوظ رہیں یہ سارے حفاظتی انتظامات کرنے کے بعد سلطان مسعود غزنوی نے اپنے باپ محمود غزنوی کی جمع کی ہوئی تمام دولت اونٹوں پر لادی اور اس خزانہ کو اپنے ساتھ لے کر وہ غزنی سے لاہور کی طرف روانہ ہوا تھا۔

سلطان مسعود غزنوی کی بدقسمتی کہ جس وقت وہ اپنے لشکر کے ساتھ مارگلہ کے کوہستانی سلسلہ میں پہنچا تو اس کے لشکر میں جو ہندو لشکری تھے انہوں نے اپنے

دو ہندو سالاروں رام دیو اور ناتھ سے مشورہ کرنے کے بعد سلطان کی جو اونٹوں پر لدی ہوئی دولت تھی اس میں سے کافی حصے پر قبضہ کرلیا جب وہ ایسا کر چکے تب انہیں احساس ہوا کہ اگر اس کی خبر سلطان کو ہوئی تو وہ انہیں کڑی سزا دے گا یہ کام کرنے سے پہلے انہوں نے سوچا نہ تھا جب کر چکے تب انہیں یہ احساس ہوا اگر وہ دولت لے کر ہندوستان کے کسی بھی دور افتادہ کونے میں بھی گئے تب بھی تعاقب کرے گا۔ کہیں بھی انہیں محفوظ نہیں رہنے دے گا ان پر گرفت کرے گا اور ہر صورت میں انہیں سزا دے کر رہے گا۔

جب اس کا انہیں احساس ہوا تب وہ بڑے فکر مند ہوئے چنانچہ سلطان کی دولت لوٹنے والے ان ہندوؤں نے اپنے دو سالاروں ناتھ اور رام دیو سے مشورہ کیا۔ وہ سارے ہندو جنہوں نے یہ دولت لوٹی تھی ناتھ اور رام دیو کے پاس جمع ہوئے اس وقت سلطان نے اپنے لشکر کے ساتھ مارگلہ کے کوہستانی سلسلے کے پاس پڑاؤ کر رکھا تھا چنانچہ یہ سب جمع ہوئے تب ناتھ نے گفتگو کا آغاز کیا اور کہنے لگا۔

"یاد رکھو جو حرکت ہم نے کی ہے اسے کرتے وقت ہم نے اس کے انجام پر نظر نہیں رکھی۔ دولت تو ہم نے لوٹ لی ہے اب لشکر پڑاؤ کر گیا ہے خزانے پر پہرہ لگا دیا گیا ہے جب اس دولت کے لوٹے جانے کی خبر ہوگی جسے ہم نے لوٹ کر اپنے خیموں میں رکھا ہے، یاد رکھنا سلطان ہم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا سب کی گردنیں کاٹ دے گا اس بنا پر ہمیں اس کا حل سوچنا چاہیے۔ میرے اپنے اندازے کے مطابق اس کا حل ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ سلطان مسعود غزنوی کو قتل کر دیا جائے، لیکن ہم اکیلے ایسا نہیں کر سکتے دوسری بات جو بڑی اہم ہے اور ہمارے حق میں جاتی ہے۔ وہ یہ کہ سلطان نے اپنے بھائی کو جسے اس نے نظر بند کیا تھا اسے بھی نظر بندی سے بلایا ہے اور میرے خیال میں اس کا بھائی محمد جلد یہاں پہنچ جائے گا۔ سلطان اسے نظر بندی سے نکال کر اس سے اچھا سلوک کرنا چاہتا ہے اب تک میں نے جو سوچا ہے وہ یہ کہ اگر خزانے کے لوٹے جانے کی خبر سلطان مسعود کو ہوگئی یاد رکھنا ہماری گردنوں پر ہمارے سر محفوظ نہیں رہیں گے اور اگر ہم نے اپنے سروں کو محفوظ رکھنا ہے تو پھر سلطان مسعود غزنوی کا خاتمہ کرنا ہوگا اور اس کا خاتمہ کرنے کے بعد اس کے بھائی محمد کو سلطان بنا دیا جائے تو پھر ہم محفوظ ہو سکتے ہیں، لیکن یہ کام ہم اکیلے نہیں کر سکتے اگر کریں گے تو سب مارے جائیں گے۔ ساتھ ہی سلطان اپنے چھوٹے بھائی محمد کا بھی خاتمہ کر دے گا ہاں اس مصیبت سے نکلنے کا ایک حل ہے۔"

یہاں تک کہنے کے بعد ناتھ جب رکا تب اس کے ساتھی رام دیو نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھ لیا۔ میرے بھائی اگر تمہارے پاس اس کا حل ہے تو پھر اتنی لمبی چوڑی اور طویل تمہید کی کیا ضرورت ہے کہو اس معاملہ کو ہم کیسے حل کر سکتے ہیں۔"

جواب میں اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ناتھ نے کچھ سوچا پھر کہنے لگا۔

"حل یہ ہے کہ سلطان مسعود غزنوی کے دو سالار سلمان بن یوسف اور علی خویشاوند شروع سے ہی سلطان مسعود کے خلاف ہیں بلکہ علی خویشاوند کا بیٹا بھی سلطان مسعود کے سخت خلاف ہے۔ اس مخالفت کی ایک وجہ علی بن ربیع بھی ہے۔ سلطان نے اپنے سارے بڑے سالاروں کو نظر انداز کر کے علی بن ربیع کو اہمیت دی ہے اسے اپنا سالار اعلا بنا کر رکھا ہے۔ جب کوئی مہم پیش آتی ہے تو بڑے بڑے سالاروں کو علی بن ربیع کے تحت کام کرنا پڑتا ہے اس بنا پر باقی تو نہیں لیکن سلمان بن یوسف اور علی خویشاوند ضرور نالاں ہیں۔ اب میں یہ چاہتا ہوں اگر ہم اس سلسلے میں سلمان بن یوسف اور خویشاوند کو اپنے ساتھ ملا لیں تو ہمارا کام آسان ہو سکتا ہے بلکہ دولت پر قبضہ کرنے کے بعد ہم سلطان مسعود کا خاتمہ کر کے

اس کے چھوٹے بھائی کو سلطان بنا سکتے ہیں جو دولت ہم نے لوٹی ہے وہ ہمارے پاس ہی رہے گی۔ اس کا کچھ حصہ سلمان بن یوسف اور علی خویشاوند کے حوالے کردیں گے۔ اس طرح ہم سزا سے بھی بچ جائیں گے اور سلطان کا کانٹا بھی نکل جائے گا اور ہمارا مستقبل بھی محفوظ ہوجائے گا۔''

یہاں تک کہنے بعد ناتھ خاموش ہوا تب دوسرا سالار رام دیو اور باقی ہندو کچھ دیر تک مشورہ کرتے رہے۔ آخر رام دیو بولا اور ناتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''ناتھ تمہارا مشورہ بہترین اور قابل عمل ہے۔ میرے خیال میں ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے اور اگر ہم نے دیر کردی اور مخبروں کے ذریعے سلطان کو ساری کارروائی کا علم ہوگیا تو میرے خیال میں آنے والی رات ہماری زندگی کی آخری رات ہوگی۔''

چنانچہ دم لینے کے بعد رام دیو بولا اور کہنے لگا۔

''ناتھ میں اور تم دونوں سلمان بن یوسف، علی خویشاوند کے پاس جاتے ہیں اور اس موضوع پر اس سے مشورہ کرتے ہیں مجھے قوی امید ہے اس سلسلے میں اگر ہم انہیں لوٹی ہوئی دولت کا ایک حصہ دے کر انہیں اپنے ساتھ ملالیں تو وہ ہمارا ساتھ دیں گے اور اگر وہ ہمارا ساتھ دیتے تو پھر کام ہوسکتا ہے لشکر میں بہت سے لشکری ان کے طرف دار ہیں اس کے علاوہ سالار کی حیثیت سے میں اپنے لشکر میں یہ بھی اندازہ لگا چکا ہوں کہ سلطان کی آئے دن کی مہموں اور لگاتار غزنی شہر سے دور رہنے کے بعد بہت سے لشکری اس سے نالاں ہیں لہٰذا اس موقع پر اگر سلطان مسعود کا خاتمہ کردیا جائے اور اس کے بھائی کو سلطان بنا دیا جائے تو میں تم لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ دو بڑے سالاروں اور چند لشکریوں کے سوا اس پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بڑے سالاروں میں سے جس کو اعتراض ہوگا تو وہ علی بن ربیع اور عبدالرزاق ہیں باقی بولنے کی جرأت اور جسارت نہیں کریں گے۔

میں جانتا ہوں علی بن ربیع کی بڑی اہم حیثیت ہے، جنگ کا بڑا وسیع تجربہ رکھتا ہے اس کے علاوہ اس کے ساتھ لشکری بھی ہیں۔ یہی حال عبدالرزاق کا بھی ہے، لیکن جب سلطان مسعود کو بے بس کردیا جائے گا وہ کچھ نہیں کرپائیں گے گرفتار کرکے کہیں قید اور نظر بند کردیئے جائیں گے۔''

رام دیو جب خاموش ہوا تب ناتھ نے کچھ سوچا پھر کہنے لگا۔ ''رام دیو تمہارا کہنا درست ہے پر سلطان مسعود غزنوی کو قتل نہیں کرنا چاہئے اگر ہم نے اسے قتل کردیا اور آج اس کا چھوٹا بھائی جو نظر بند تھا سلطان کے بلانے پر چلا آیا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ سلطان مسعود کو قتل کردیا جائے اور سب کو خبر ہوجائے کہ قتل ہم نے کرایا ہے تو اپنے بھائی کی محبت میں نیا سلطان محمد کہیں ہمارے قتل کا حکم نہ دے دے۔ اس بنا پر میں چاہتا ہوں کہ سلطان کو قتل نہ کیا جائے بس اسے چپکے سے گرفتار کرلیا جائے میرے خیال میں ہمارا فیصلہ آخری نہیں ہے۔ یہ سب یہیں بیٹھے ہیں ہم دونوں سلطان بن یوسف اور خویشاوند کے سامنے سارا معاملہ رکھتے ہیں، میرے خیال میں وہ کوئی مشورہ دیں۔''

اس کے ساتھ ہی ناتھ کھڑا ہوا اس کے بعد دونوں خیموں کے بیچ و بیچ ہوتے ہوئے علی خویشاوند کے خیمہ کا رخ کررہے تھے۔

رام، دیو ناتھ دونوں علی خویشاوند کے خیمے میں داخل ہوئے وہ اس وقت اپنے خیمے میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ ناتھ اور رام دیو کی آمد پر ایک طرح سے وہ چونکا تھا وہ آگے بڑھ کر جب اس کے سامنے بیٹھ گئے تب گفتگو کا آغاز علی خویشاوند نے کیا اور باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''تم دونوں کا یوں اس طرح میرے خیمے میں آنا کسی وجہ کسی علت کے بغیر نہیں ہے کیا تم اس کی کچھ تفصیل مجھ سے کہو گے۔''

علی خویشاوند کے اس استفسار پر ناتھ بولا اور اسے مخاطب کرکے کہنے لگا۔

''علی خویشاوند تمہارا کہنا درست ہے ہم کسی

ملت اور وجہ کے بغیر نہیں آئے جو کچھ ہم نے کہنا ہے اس میں تمہارے دست راست سلمان بن یوسف کا شامل ہونا بھی اہم اور ضروری ہے لہٰذا میں سمجھتا ہوں جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں اس سے پہلے سلمان بن یوسف کو اپنے خیمے میں بلاؤ۔'' اس پر علی خویشاوند اٹھ کھڑا ہوا خیمے سے نکل گیا تھوڑی دیر بعد اس کے ساتھ سلمان بن یوسف بھی اس کے خیمے میں داخل ہوا دونوں ناتھ اور رام دیو کے سامنے بیٹھ گئے پھر گفتگو کا آغاز علی خویشاوند نے کیا پھر ناتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''اب سلمان بن یوسف آ گیا ہے کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو۔''

ناتھ نے پہلے دونوں کا گہری نگاہوں سے جائزہ لیا پھر اس کی رازداری میں ڈوبی دھیمی اور مدھم سی آواز خیمے کی خاموشی میں ہلچل برپا کر گئی تھی۔

''علی خویشاوند اور سلمان بن یوسف معاملہ بڑا اہم بلکہ ایک طرح سے خطرناک بھی ہے۔ ہمارے کچھ ساتھیوں ہندوؤں اور چھوٹے سالاروں نے اس خزانے کو نقصان پہنچایا ہے جو سلطان اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہے اس کا ایک حصہ انہوں نے لوٹا ہے وہ ایسا کرنے کے بعد ہمارے پاس آئے اس لیے یہ سارا کام کرنے کے بعد انہیں یہ احساس ہوا کہ اگر اس بددیانتی اور خزانہ لوٹنے کا علم جس وقت سلطان مسعود غزنوی کو ہوا وہ سب کو کڑی سزا دے گا چنانچہ میں نے انہیں آخری جواب نہیں دیا ان سے ایک طرح سے سب کو خطرہ ہو سکتا ہے اس لیے کہ وہ پکڑے گئے تو وہ بہت سالاروں کا نام بھی لے سکتے ہیں کہ خزانے کو نقصان پہنچانے میں سالار بھی شامل ہیں اس میں وہ ہمیں بھی ملوث کر سکتے ہیں۔ اب یہ معاملہ میں اور رام دیو دونوں آپ کے پاس لے کر آئے ہیں تاکہ اس کا حل نکالا جائے ورنہ بہت سے لوگ اس کارروائی کی وجہ سے مارے جائیں گے۔''

یہاں تک کہنے کے بعد ناتھ رک گیا کچھ سوچا دوبارہ وہ انہیں مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''ویسے تمہاری طرف آنے سے پہلے میں نے ایک منصوبہ بندی کی تھی ہو سکتا ہے وہ غلط ہو اس پر سوچنا یا اسے سن کر غور کرنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔''

یہاں تک کہنے کے بعد ناتھ رکا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہتا چلا گیا تھا۔

''آپ دونوں جانتے ہیں کہ سلطان مسعود نے اپنے بھائی محمد کو نظر بند کر رکھا تھا۔ اب اس نے اپنے آدمی بھیجے ہوئے ہیں کہ اسے نظر بندی سے نکال کر لایا جائے شاید سلطان اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ آج سلطان کا چھوٹا بھائی لشکر میں پہنچ جائے گا اور اگر ہم نے فیصلہ کرنے میں تاخیر سے کام لیا تو بڑا نقصان اٹھائیں گے، میں نے خزانہ لوٹنے والے ہندو ساتھیوں اور رام دیو کے ساتھ مل کر جو مشورہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ آج ہی ایک انقلاب برپا کیا جائے۔ سلطان مسعود پر حملہ آور ہو کر اسے بے بس کر کے اسے قیدی بنا لیا جائے اور اس کے چھوٹے بھائی محمد کو سلطان بنا لیا جائے۔ ظاہر ہے جب سلطان مسعود نے محمد کو نظر بند کر رکھا تھا جوابی کارروائی کرتے ہوئے محمد بھی مسعود کو نظر بند کر دے گا۔

اگر ایسا ہو جاتا ہے تو جو خزانہ لوٹا گیا ہے وہ سب آپس میں تقسیم کر لیں گے۔ اس طرح ہمیں کافی دولت ملے گی اور ہمارے خلاف کوئی انتقامی کارروائی بھی نہیں ہو گی اور سلطان مسعود سے ہماری جان چھوٹ جائے گی۔ آپ جانتے ہیں گزشتہ جنگوں کے دوران اور اِدھر اُدھر سے چھوٹی چھوٹی مہموں سے نکلنے کی وجہ سے لشکری لگاتار جنگوں سے تنگ آ چکے ہیں اور وہ کچھ عرصہ اپنے گھروں میں آرام کرنا چاہتے ہیں۔ اس بنا پر وہ سلطان مسعود سے کس قدر نالاں ہیں اگر یہ کارروائی کی جائے تو میرے خیال میں چند لشکریوں اور دو سالاروں کے علاوہ کوئی سلطان مسعود کا ساتھ نہیں دے گا۔

سلطان مسعود کا ساتھ دینے میں اول تو سب انکار کر دیں گے۔ علی بن ریح اور عبدالرزاق سلطان کا

ساتھ دیں گے لہٰذا جس وقت ہم سلطان کو اپنا اسیر بنائیں گے علی بن ربیع اور عبدالرزاق پر بھی گرفت کی جائے گی۔ سلطان کے ساتھ انہیں بھی نظر بند کر دیا جائے گا اس لیے کہ ان دونوں کی وجہ سے سلمان بن یوسف، علی خویشاوند کے ساتھ بھی زیادتی ہوتی رہی ہے، میں اور رام دیو نے جو منصوبہ بندی کی ہے اس کی تفصیل ہم نے آپ سے کہہ دی ہے آخری فیصلہ آپ دونوں کے ذمہ لگایا جاتا ہے جو فیصلہ آپ دونوں کریں گے ہمارے لیے قابل قبول ہوگا۔''

ناتھ خاموش ہوا تب سلمان بن یوسف اور علی خویشاوند دونوں نے ایک دوسرے کی طرف غور سے دیکھا دونوں میں کوئی فیصلہ ہوا اس کے بعد ناتھ اور رام دیو کی طرف دیکھتے ہوئے علی خویشاوند کہنے لگا۔

''ناتھ اور رام دیو تم دونوں نے مل کے جو منصوبہ بندی کی ہے میں اور سلمان بن یوسف دونوں اس سے اتفاق کرتے ہیں اس لیے کہ سلطان مسعود نے ہم دونوں کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ان زیادتوں کا انتقام لیا جائے، لیکن پہلے اس کو کامیاب کرنے کے لیے ہمیں کچھ سدباب کی کارروائیاں بھی کرنی چاہیے۔''

علی خویشاوند کے ان الفاظ پر ناتھ رام دیو دونوں چونک تھے یہاں تک کہ ناتھ بول اٹھا۔

''کیسی کارروائیاں؟''

جواب میں اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے کے بعد علی خویشاوند کہنے لگا۔

''سنو! آج ہی ہمیں اپنے قریب ترین ساتھیوں کو آگاہ کر کے تیار رہنے کا مشورہ دے دینا چاہیے اس میں تم دونوں کے لشکری بھی ہوں گے وہ لشکری جو ہم پر اعتماد اور بھروسہ کرتے ہیں وہ بھی شامل ہوں گے، لیکن اس کارروائی کی ابتدا سے پہلے کچھ دستے اس شاہراہ پر متعین کر دیئے جائیں جو شاہراہ غزنی کی طرف جاتی ہے اور کچھ دستے بلخ جانے والے راستوں پر بھی متعین کیے جائیں۔ اس کے بعد میں سمجھتا ہوں ہم اپنی کارروائی کو مکمل طور پر کامیاب کر سکتے ہیں۔''

علی خویشاوند کے ان الفاظ کے جواب میں ناتھ اور رام نے دیو چونکنے والے انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ناتھ نے علی خویشاوند کو مخاطب کیا۔

''علی خویشاوند یہ غزنی اور بلخ جانے والی شاہراہ پر مسلح دستے متعین کرنے کی کیا وجہ ہے۔'' اس پر کچھ سوچتے ہوئے علی خویشاوند کہنے لگا۔

''میں جو کچھ کہنے لگا ہوں ذرا غور سے سننا سب سے پہلے سلطان مسعود پر گرفت کی جائے گی اس کے بعد علی بن ربیع اور عبدالرزاق پر بھی ہاتھ ڈالا جائے گا یہ بات اپنے ذہن میں بٹھا کے رکھنا کہ لشکر میں ان دونوں کے حامی بھی ہیں۔ اگر ٹکراؤ ہو گیا تو اس وقت تک ہم سلطان مسعود کو اپنی گرفت میں لے کر اپنا اسیر بنا چکے ہوں گے۔ لشکر میں یہ بات مشہور کر دی جائے گی کہ سلطان کو اسیر اور اسے معزول کر کے نظر بند کیا جا رہا ہے اور اس کے چھوٹے بھائی محمد کو سلطان بنا دیا گیا ہے۔

جب یہ صورت حال ہو گی تو یاد رکھنا لشکر کے اندر بددلی پھیل جائے گی۔ لشکر سلطان مسعود کا ساتھ دینے کے بجائے ہمارا ساتھ دیں گے ہاں کچھ لشکری علی بن ربیع اور عبدالرزاق کے ساتھ اٹھیں گے۔ اس لیے کہ علی بن ربیع ان دنوں سلطان کے لشکروں کا سالار اعلا ہے، لیکن اس منصوبہ بندی میں وہ دونوں رکاوٹ کھڑی نہ کر سکیں گے اس لیے کہ ہماری تعداد زیادہ ہو گی اس بنا پر اپنی جان بچانے کے لیے علی بن ربیع اور عبدالرزاق یہاں سے بھاگنے کی کوشش کریں گے۔

بھاگنے کے لیے وہ دونوں شاہراہ کا انتخاب کر سکتے ہیں اس کے علاوہ تیسرا راستہ ان کے پاس کوئی نہیں ہے۔

اول یہ کہ وہ غزنی کا رخ کریں گے اس لیے کہ وہ غزنی میں اس وقت سلطان مسعود کا چھوٹا بیٹا

ایزدیار حاکم ہے۔

اگر وہ غزنی کی طرف نہیں جاتے پھر بلخ کا رخ کریں گے اس لیے کہ بلخ میں سلطان کا بڑا بیٹا مودود حاکم ہے ان دو کے علاوہ وہ اور کہیں نہیں جائیں گے۔ ایک تیسرا راستہ ہے، لیکن تیسرا راستہ موت کا راستہ ہے۔ وہ راستہ لاہور کی طرف جاتا ہے۔ لاہور ان دونوں کے لیے اجنبی ہے چنانچہ اس شہر کا وہ رخ نہیں کریں گے۔ دونوں سمرقند کے رہنے والے ہیں غزنی یا بلخ جاسکتے ہیں لاہور نہیں جائیں گے اس بنا پر ہم ان دونوں شہروں کو جانے والی شاہراہوں کو محدود کردیں گے ہم پہلے ہی ان شاہراہوں پر اپنے وفادار لشکر کھڑے کردیں گے۔ جو دستے ہم نے پہلے مقرر کیے ہوں گے وہ انہیں گرفتار کرکے ہمارے پاس لے آئیں گے اس طرح سلطان مسعود کی اسیری کے بعد علی بن ربیع اور عبدالرزاق بھی ہمارے لیے خطرہ نہیں رہیں گے اور ہم جو چاہیں گے ان کے ساتھ سلوک کریں گے۔

یہ تو انقلاب کو کامیاب کرنے کا ایک پہلو ہے اس کے بعد دوسرے پہلو کی ابتدا ہوگی وہ یہ کہ محمد کو سلطان بنانے کے بعد لشکر آگے ہندوستان کا رخ نہیں کرے گا بلکہ واپس غزنی کا رخ کرے گا۔ غزنی میں ایزدیار ہوگا وہ ہمارے حملے کی تاب نہ لاسکے گا لہٰذا غزنی شہر پر ہمارا قبضہ ہوجائے گا۔ یاد رکھنا قوت و طاقت اور باقی سارے عوامل کی ڈوریاں ہمارے ہاتھ میں آجائیں گی تو پھر ہمارے خلاف کوئی حرکت میں نہیں آسکے گا۔''

یہاں تک کہنے کے بعد علی خویشاوند جب خاموش ہوا تب سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے ناتھ بول پڑا۔ ''محمد کو سلطان بنانے کے بعد ہمیں کیا ضرورت کہ ہم غزنی واپس جائیں اور ایزد یار سے الجھنے کی کوشش کریں ہمیں لاہور کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے۔''

علی خویشاوند نے تفکرات بھرے انداز میں ناتھ کی طرف دیکھا۔ پھر نفی میں گردن ہلائی۔ اس کے بعد وہ خدشات بھری آواز میں کہنے لگا۔ ''ناتھ تم پہلو پر نظر نہیں رکھ رہے اگر ہم لاہور کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں تو یاد رکھنا آگے سلطان مسعود کا بیٹا امیر محمد ود ہوگا اس کے پاس بھی خاصی عسکری طاقت ہے۔ امیر محمد ود ہمارے سے الجھے گا اگر ہمارے مقابلے میں اسے کامیابی ہوگی تو یاد رکھنا وہ ہم سب کو کاٹ کر رکھ دے گا۔ غزنی کی طرف پیش قدمی کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ اول تو مجھے امید ہے ہم غزنی ہی میں کامیاب رہیں گے۔ غزنی شہر کے اندر ہمارے بہت سے حامی ہیں ان کے ذریعے ہم شہر کے دروازے کھلوا کر ایزدیار پر حملہ آور ہوکر اس پر قابو پاسکتے ہیں۔

اور اگر ہم کامیاب نہیں بھی ہوئے تو غزنی کا محاصرہ کرنے کے بعد اگر غزنی ہمارے ہاتھ نہیں آتا تو کوئی بات نہیں ہم پیچھے ہٹ جائیں گے یہیں آجائیں گے۔ مارگلہ کے اردگرد کے کچھ علاقوں سے اپنے لیے لشکر جمع کرتے رہیں گے اپنی طاقت وقوت میں اضافہ کرکے پھر دیکھیں گے کہ ہم سے کون ٹکراتا ہے اور کون ہمیں روکتا ہے ہم سلطان کی حیثیت سے محمد کو غزنی میں بٹھائیں گے۔''

ناتھ رام دیو دونوں نے اس سے اتفاق کیا تھا لہٰذا چاروں نے مل کر ایک طرح سے اس منصوبہ بندی کو آخری سمجھا تھا۔ اس کے بعد علی خویشاوند کچھ دیر سوچ بچار کے بعد مسکراتے ہوئے بول اٹھا۔

''جو منصوبہ بندی ہم نے کی ہے وہ یقیناً کامیاب ہوگی۔ سلطان مسعود کو گرفتار کیا جائے گا۔ محمد کو سلطان بنا دیا جائے گا ہم سب کا مشترکہ فیصلہ اور متفقہ فیصلہ ہے، لیکن اب میں اپنے ذاتی کام کی طرف آتا ہوں ذاتی کام یہ ہے کہ میرا بیٹا غزنی کی ایک ایسی لڑکی کو پسند کرتا ہے جس لڑکی کو علی بن ربیع پسند کرتا ہے۔ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے اس لیے کہ غزنی کے مال دار یہودی رابان بن ناہر کی بیٹی راحیل جیسی کوئی خوب صورت، حسین اور پرکشش لڑکی کوئی نہیں ہوگی، میرا بیٹا اسے پسند کرتا ہے، لیکن

بعد میں یہ پتا چلا کہ وہ لڑکی جس کا نام راحیل ہے وہ علی بن ربیع کی طرف مائل ہو چکی ہے اور اسے دل کی گہرائیوں سے پسند کرتی ہے ساتھ ہی علی بن ربیع بھی اس میں دلچسپی لیتا ہے۔ میرے بیٹے کو بڑی مایوسی ہوئی لہٰذا اس انقلاب سے پہلے جو دستے ہم غزنی کی طرف روانہ کریں گے ان کے ساتھ کچھ ایسے لشکری بھی بھیجے جائیں گے جو شہر میں داخل ہونے کے بعد راحیل اور اس کے بھائی پر گرفت کریں گے اور دونوں بہن بھائی کو شہر سے باہر نکال کر ہمارے پاس لانے کی کوشش کریں گے کیا آپ لوگ میری اس منصوبہ بندی سے متفق ہیں یہ میرے بیٹے کی خوشی کا منصوبہ ہے۔"

سلمان بن یوسف کے علاوہ ناتھ، رام دیو نے بھی اتفاق کیا تھا۔ اس پر علی خویشاوند نے خوشی کا اظہار کیا اس کے بعد چاروں مل کر بڑی راز داری سے اس انقلاب کو کامیاب کرنے سے متعلق گفتگو کرنے لگے تھے۔

جس وقت سلطان مسعود کا چھوٹا بھائی محمد بھی اس کے پاس پہنچ گیا تب جو سازش تیار کی گئی تھی اس کی ابتدا ہوگئی۔ سازش اور باغی حرکت میں آئے۔ سلطان مسعود کو گرفتار کرلیا اس موقع پر ایک لشکری بھاگتا ہوا آیا۔ علی بن ربیع کے خیمے میں داخل ہوا تھا اس وقت علی بن ربیع اور عبدالرزاق دونوں بیٹھے ہوئے کسی موضوع پر گفتگو کررہے تھے کہ وہ لشکری چلایا اور کہنے لگا۔

"امیر علی بن ربیع اور عبدالرزاق! دونوں بھاگ کر اپنی جان بچائیں اس لیے کہ لشکر میں انقلاب برپا ہو چکا ہے۔ سالاروں نے بغاوت کردی ہے۔ باغی لشکر کی کمان داری علی خویشاوند، سلمان بن یوسف، ناتھ اور رام دیو کررہے ہیں۔ سلطان مسعود کو گرفتار کرلیا گیا ہے اور انہوں نے سلطان کے بھائی محمد کو سلطان بنا دیا ہے۔ اب بڑی تیزی سے کچھ لشکری آپ دونوں کو گرفتار کرنے کے لیے لپک رہے ہیں۔

ہمارے کچھ لشکری آپ کے خیمے کے پشت پر کھڑے ہیں انہوں نے آپ کے گھوڑوں پر زینیں ڈال لی ہوں گی۔ خدا کے لیے وقت ضائع نہ کریں یہاں سے بھاگنے والی بات کریں۔ ہم خود بھی آپ کے ساتھ بھاگنے کے لیے بالکل تیار ہیں۔" علی بن ربیع اور عبدالرزاق فوراً حرکت میں آئے اپنے خیمے کے پشتی حصے کی طرف گئے وہاں دونوں کے گھوڑے تیار تھے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور پھر اپنے حامی ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

سلطان مسعود غزنی کو گرفتار کرنے کے بعد باغی اور سرکش علی بن ربیع اور عبدالرزاق کے خیموں کی

یہ وقت بھی گزر جائے گا

سلطان محمود غزنوی نے اپنے غلام ایاز کو ایک انگوٹھی دی اور کہا کہ اس پر ایک ایسا جملہ لکھو جس کو میں اگر خوشی میں دیکھوں تو غمگین ہو جاؤں اور اگر غم میں دیکھوں تو خوش ہو جاؤں۔

غلام ایاز نے لکھا: "یہ وقت بھی گزر جائے گا۔"

غصہ کیا ہے؟

ایک دانشور سے پوچھا گیا کہ غصہ کیا ہے؟

بہت ہی خوب صورت جواب ملا۔

"کسی کی غلطی کی سزا خود کو دینا۔"

خطابِ سقراط

جب سقراط کی موت کا فیصلہ سنایا گیا تو اس نے ایک انتہائی پرتاثیر خطاب کیا جسے سن کر لوگ رونے لگے۔ سقراط نے پوچھا کیوں روتے ہو؟

لوگوں نے کہا۔ "آپ کی بے گناہی کی موت کا ہمیں سخت رنج اور افسوس ہے۔"

سقراط نے کہا۔ "تمہارے خیال میں کیا مجھے گنہگار ہو کر مرنا چاہیے تھا؟"

طرف آ گئے۔ انہیں وہاں نہ پا کر ان کو بڑی مایوسی ہوئی چنانچہ انہیں بتایا گیا کہ وہ دونوں اپنے خاصی لشکریوں کے ساتھ بھاگنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

اچانک رونما ہونے والے اس انقلاب سے متعلق مورخین لکھتے ہیں کہ سلطان مسعود غزنوی کے لشکر کا بڑا حصہ آئے دنوں کی جنگوں سے تنگ آ چکا تھا۔ وطن کی جدائی کی وجہ سے وہ بھی سب لوگ پریشان تھے اس بنا پر زیادہ لشکری مسعود کے خلاف ہو گئے۔ سلطان مسعود کو گرفتار کر کے اس کے بھائی محمد کے پاس گئے اور اسے سلطان بنا دیا اس موقع محمد نے اپنے بھائی سے کہا تھا۔

''میں نہیں چاہتا میں تمہیں قتل کروں، ہاں نظر بند ضرور کروں گا تم کوئی جگہ اپنے اور اپنے بچوں کے لیے منتخب کرو میں وہیں تمہیں قید کر دوں گا تا کہ اپنی زندگی کے باقی دن اطمینان اور آرام سے بسر کر سکو۔

مورخین مزید لکھتے ہیں کہ مسعود اب سلطان نہیں رہا تھا اس لیے قلعہ گیری میں رہنا پسند کیا اور وہاں کی تیاری کرنے لگا۔ گیری نام کا قلعہ دریائے سندھ کے کنارے واقع تھا۔

مورخین اس انقلاب کے متعلق مزید لکھتے ہیں کہ جس وقت مسعود روانہ ہوا اس وقت اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی لہٰذا اس نے اپنے بھائی محمد کے پاس ایک آدمی بھیجا کہ اخراجات کے لیے رقم لائے۔

محمد نے پانچ سو درہم بھجوائے یہ رقم مسعود کے سامنے آئی تو اسے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اسی عالم میں اس کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے۔

''سبحان اللہ! کل اس وقت میرے قبضے میں زرو جواہرات لدے ہوئے تین ہزار اونٹ تھے۔ آج میری بدقسمتی کا یہ عالم ہے کہ آخراجات کے لیے بھی کچھ نہیں ہے۔''

مورخین کہتے ہیں مسعود نے اسی وقت اپنے چند ساتھیوں سے کچھ دینار بطور قرض لیے اور وہ پانچ سو درہم جو اس کے بھائی محمد نے بھجوائے تھے وہ اس شخص کو بطور انعام دے دیے جو یہ رقم لے کر آیا تھا۔

دوسری طرف سلطان مسعود کے چھوٹے بھائی محمد کی بینائی کیونکہ جاتی رہی تھی اس لیے اس نے سلطنت کا کاروبار چلانے کے لیے اپنے بیٹے احمد کو ایک طرح سے سلطان بنا دیا تھا۔

مورخین مزید لکھتے ہیں کہ سلطان مسعود غزنوی بڑا بہادر، رحم دل اور ہنس مکھ انسان تھا۔ علماء اور اولیا سے بے حد عقیدت تھی اور وہ ہمیشہ ان کی صحبت میں بیٹھنا پسند کرتا تھا۔

اس کے زمانے کے بہت سے علماء نے کتابیں اس کے نام سے معنون کی تھیں۔ استاد خوارزمی اور ابو ریحان البیرونی اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم اور فن ریاضی کے ماہر تھے ان کی کتاب قانون مسعودی ایک اعلا درجے کی کتاب سمجھی جاتی ہے جو فنِ ریاضی کے متعلق ہے۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے سلطان مسعود ہی کے نام پر لکھی گئی تھی اس گراں بہا تصنیف کے سلسلے میں سلطان مسعود نے ابوریحان کو ایک ہاتھی کے وزن کے برابر چاندی دی تھی۔

قاضی ابو محمد نے اپنی عظیم الشان کتاب جو فقہ حنفی سے متعلق ہے سلطان مسعود ہی کے نام معنون کیا گیا تھا اس کا نام کتاب مسعودی رکھا تھا۔

اس کے علاوہ تاریخ روضہ الصفا میں بیان کیا گیا ہے کہ سلطان مسعود محتاجوں، غریبوں وغیرہ کا بہت خیال رکھتا تھا اور ہمیشہ ہی صدقہ اور خیرات کیا کرتا تھا چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ رمضان کے مہینہ میں سلطان مسعود نے صرف ایک دن میں ایک لاکھ درہم خیرات کیے تھے۔ سلطان مسعود کی حکومت کا زمانہ مختصر سا تھا اسے معزول کر کے اس کے چھوٹے بھائی محمد کو سلطان بنا دیا گیا جب کہ علی بن ریح اور عبدالرزاق جانیں بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

(جاری ہے)

رانگ نمبر

ایک فون جس کی ہر بجتی گھنٹی سننے والے کے لیے خوف و دہشت اور حیرانی میں اضافے کا باعث بنتی گئی، حرص و لالچ کے جال سے بُنا گیا ایک دل دہلا دینے والا منصوبہ

احمد صغیر صدیقی

ایک دلچسپ سسپنس کہانی جو آپ کے رونگٹھے کھڑے کر دے گی

اس نے ایک بار پھر نائٹ ٹیبل پر رکھے ٹیلی فون کی سمت ہاتھ بڑھایا اور ڈائل کو ضرورت سے زیادہ زور کے ساتھ گھمانے لگی۔ بیڈروم کی روشنی میں جو اس کمرے کی واحد روشنی تھی اس کے متحرک ہاتھ کے جڑاؤ اور قیمتی زیور خیرہ کن انداز میں چمک رہے تھے۔ اس کے دل کش چہرے پر لیمپ کی روشنی سے پڑنے والے سفید ہالے میں برہمی کی لکیریں صاف نظر آ رہی تھیں۔

ڈائل کر کے وہ بے چین انداز میں ریسیور کو کان سے لگا کر سننے لگی۔ وہ کسی سہارے کے بغیر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی کمر میں درد ہو رہا تھا۔ ایک بار پھر اس کے کانوں میں فون کے بزی ہونے کا سگنل سنائی دیا۔ وہ بلند آواز سے بولی۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔" پھر اس نے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔

وہ ایک بار پھر بستر پر دھرے تکیوں کے ابھار پر

گر گئی۔ اس نے ان میں اپنا منہ چھپا لیا تاکہ کھلی کھڑکی سے نظر آنے والی باہر پھیلی رات اسے نا دیکھ سکے۔ کمرے میں ہلکی ہلکی ہوا سرسرا رہی تھی۔ جس سے اس کا نائٹ گاؤن آہستہ آہستہ اڑ رہا تھا۔ اس کے کان اب بھی ان آوازوں کو سن رہے تھے جو قریبی واقع دریا اور سڑک سے ابھر رہی تھی۔

وہ گھنٹے بھر سے پریشان تھی۔ آخر یہ آدمی کہاں چلا گیا؟ آخر وہ آیا کیوں نہیں؟ اسے آج ہی رات میں غائب ہونا تھا بغیر بتائے۔ وہ یہاں بالکل اکیلی تھی۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ اسے اس سے اس کی توقع نہ تھی۔ کہیں وہ زخمی تو نہیں ہو گیا۔ اس کی پریشانی کی وجہ یہ ٹیلی فون بھی تھا۔ وہ آدھے گھنٹے سے اس کے آفس میں فون کر رہی تھی مگر اسے فون انگیج مل رہا تھا۔ کیا وہ کسی کو فون کر رہا ہے؟ یہ تو ممکن نہ تھا۔

وہ سوچنے لگی کہیں میری طویل بیماری سے عاجز آ کر وہ اکتا تو نہیں گیا ہے۔ بے شک وہ ایک جوشیلا مرد تھا مگر وہ یہ نہیں سوچ سکتی تھی کہ وہ کسی دوسری عورت کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بے حد محتاط آدمی ہے۔ وہ منصوبہ بندی کے بغیر کچھ نہیں کرتا۔ وہ خود کو خطرے میں نہیں جھونک سکتا تھا۔

وہ ایک جرأت مند آدمی تھا۔ وہ بہت بڑے پیمانے پر کام کا عادی تھا۔ سوچتے ہوئے اس کی نظریں میز پر جا رکیں۔ جہاں ان کی شادی کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ وہ ذرا مدھم سی نظر آ رہی تھی لیکن وہ اسے ذہن کی آنکھ سے صاف دیکھ رہی تھی۔ اس کا لمبا قد، چوڑے شانے، عقابی آنکھیں، تیکھے نقوش، دس برسوں سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

البتہ خود اس میں کچھ تبدیلیاں ضرور آئی تھیں اس میں اس کی عمر اور خراب صحت دونوں کا ہاتھ تھا۔ اس کی آنکھوں تلے جلد میں شکنیں پیدا ہو گئی تھیں۔ تھوڑی تلے گوشت بھی ڈھیلا ہو رہا تھا مگر ابھی اس میں جوانی باقی تھی۔

اس نے اپنی شادی کی منصوبہ بندی سوچ کر کی تھی۔ اسے خبر تھی اس کے باپ کی بے پناہ دولت میں ایسی قوت موجود ہے جسے چھوڑنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کارٹل خاندان کی لڑکی کو چھوڑنے کا مطلب ہوتا ہے زیادہ دولت کو ٹھکرانا۔

وہ مطمئن تھی۔ اس کی شادی محفوظ تھی۔ وہ خوش تھی۔ یکا یک اس کی نگاہیں فون پر جا رکیں۔ اس کا پارہ چڑھ گیا۔ وہ پھر سے سوچنے لگی آخر دوسری طرف سے بزی کا سگنل کیوں مل رہا ہے؟

اسے گمان ہوا شاید اس کے اپنے فون میں کوئی خرابی ہے۔ اس نے پھر سے ڈائل گھمایا۔ اس بار اس نے آپریٹر کو رنگ کیا تھا۔

جواب پر اس نے کہا۔ ''کیا تم میرے لیے مری ہل پر تین زیرو نوزیرو پر کال ملا دو گے؟''

''آپ خود کال کر لیں۔'' آپریٹر نے کہا۔

''نہیں ہو رہا ہے۔''

''کیوں؟''

''لائن بزی مل رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ کیا نمبر ہے؟ تھری زیرو نائن زیرو۔۔۔'' اس نے آپریٹر کو کال کرتے سنا۔ پھر آپریٹر کی آواز ابھری۔ اسے بزی کا سگنل سنائی دیا۔ جھلا کر وہ ریسیور کان سے ہٹانے والی ہی تھی کہ ایک آواز ابھری۔

''ہیلو۔''

وہ عجلت میں بولی۔ ''مسٹر اسٹیونسن!''

دوسری طرف سے کسی نے احمقانہ انداز سے کہا۔ ''ہیلو۔''

وہ جلدی سے بولی ''میں مسٹر اسٹیونسن سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ میں ان کی واقف ہوں۔''

مگر دوسری طرف سے کھڑکھڑاتی آواز نے کہا۔ ''ہیلو جارج!'' پھر ذرا جانے کدھر سے ایک اور آواز نے جواب دیا۔

''بول رہا ہوں۔'' یہ منمناتی سی آواز تھی۔

وہ پریشانی سے چلائی۔ ''آخر یہ کون سا نمبر ہے؟''

''جارج! مجھے تمہارا پیغام مل گیا ہے۔'' منمناتی

آواز نے ایک کہا۔ "کیا آج مطلع صاف ہے؟"
"بالکل۔ میں اپنے موکل کے ساتھ ہوں، وہ "اوکے" کہہ رہا ہے۔"
یہ بڑی عجیب سی گفتگو تھی۔ "معافی چاہتی ہوں، آخر یہ کیا ہو رہا ہے؟" بولنے کو تو اس نے بول دیا مگر صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی آواز نہیں سنی جا رہی تھی۔ نہ جارج نامی شخص اسے سن رہا تھا نہ اس کا منمناتی آواز والا ساتھی اسے سن رہا تھا۔ دراصل اس کے فون کے ساتھ اس وقت کراس وائر والا معاملہ تھا۔ اب یہی چارہ تھا کہ فون بند کر دے اور آپریٹر سے دوبارہ بات کرے۔ ادھر وہ دونوں مسلسل باتیں کیے جا رہے تھے۔ عجیب سی باتیں۔ جو کچھ وہ کہہ رہے تھے وہ خون جما دینے والی باتیں تھیں۔
"اوکے۔" منمناتی آواز کہہ رہی تھی۔ "گویا گیارہ بج کر پندرہ منٹ والا وقت بدستور طے ہے۔"
"بالکل۔۔۔ گیارہ پندرہ۔"
"ٹھیک گیارہ بجے وہاں کا پرائیویٹ کانسٹیبل سیکنڈ ایونیو پر قریبی کیفے میں چائے کے لیے جائے گا۔ میں عقبی کھڑکی سے کچن میں پہنچوں گا اور انتظار کروں گا کہ برج پر سے ٹرین گزرے تاکہ عورت کی آخری چیخ بھی کوئی نہ سن سکے۔"
"بالکل ٹھیک۔"
"تو جارج! یہ بتاؤ کیا چاقو استعمال کرنا ہوگا؟"
"ہاں۔" جارج کی کھڑکھڑاتی آواز سنائی دی۔ "مگر وار جچا تلا ہونا چاہیے۔ بے چاری کو زیادہ تکلیف نہ ہو۔"
"اور دیکھو، اس کی انگوٹھی اور کڑا ضرور اتار لینا تاکہ معاملہ چوری کا لگے۔ یہ ہدایت ہمارے موکل کی ہے۔"
"ٹھیک ہے۔"
"تمہیں پتا معلوم ہے؟"
"ہاں، ہاں۔" منمناتی کرخت آواز نے کہا۔
خوف سے سرد ہو کر اس نے ریسیور کان سے ہٹا لیا اور لائن ایک دم سے ڈیڈ ہو گئی۔ وہ خوف سے ہکلائی۔
"میرے خدا۔۔۔" ان کی باتوں سے وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ کسی قتل کا منصوبہ تھا۔ دونوں بے حد سفاک لوگ تھے جنہیں کسی عورت کی موت کی کوئی اہمیت نہ تھی۔
وہ فون کو اس طرح تک رہی تھی جیسے یہ کوئی خوف ناک چیز رہا ہو۔ یہ ساری باتیں کسی ڈراؤنے خواب جیسی تھیں۔
"کیا یہ سب اس کا واہمہ تھا؟ نہیں۔۔۔ جارج اور اس کے ساتھی کی آوازیں ابھی تک اس کے کانوں میں تھیں۔ یقیناً وہ دونوں قتل کا منصوبہ بنا رہے تھے اور کسی نے اس کے لیے ہدایت دی تھی۔ اس طرح جیسے کسی کو بازار سے سبزی لانے کے لیے کہا جائے۔
اب سوال یہ تھا کہ وہ کیا کرے؟ مگر وہ کیا کر سکتی تھی؟ اس نے مشین پر آوازیں سنی تھیں وہ کیا کہہ سکتی تھی یہ کون لوگ تھے مگر یہ معاملہ کسی عورت کا تھا جو اکیلی تھی۔ بے مددگار اس کی طرح۔ اگر کسی طرح وہ عورت آگاہ ہو جاتی۔۔۔؟ اس نے ٹھنڈی انگلیوں سے فون چھوا۔
اس نے آپریٹر سے کہا۔ "لائن پھر کٹ گئی ہے۔"
"اچھا کیا نمبر تھا؟"
اس نے کہا۔ "وائر کراس کر گئے تھے اور رابطہ کسی غلط نمبر سے ہو گیا۔ وہاں سے میں نے کچھ خطرناک قسم کی باتیں سنی ہیں۔ کسی عورت کو قتل۔۔۔"
اس نے آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔ "تم وہی نمبر دوبارہ ملاؤ۔"
"سوری میڈم! میں سمجھا نہیں آپ کی بات۔"
"اوہ۔" وہ بے صبری سے بولی۔ "میرا خیال ہے وہ نمبر غلط تھا۔ وہاں سے میں نے جو باتیں سنیں وہ ایک عورت کے قتل سے متعلق تھیں۔ عورت گھر میں اکیلی ہے کسی ایسی جگہ رہتی ہے جہاں پر کوئی پل ہے جس پر سے ٹرین گزرتی ہے۔ میں ان قاتلوں کو روکنا

چاہتی ہوں۔"

"وہ کون سا نمبر تھا میڈم!"

"میں نے کہا نا وہ کوئی غلط نمبر تھا جو تم نے غلطی سے ملا دیا تھا۔ میں وہی نمبر چاہتی ہوں اور فوراً۔۔۔"

"لیکن۔۔۔" آپریٹر ہکلایا۔

"تم احمق آدمی ہو۔" وہ جھلا کر بولی۔ "میں کہہ رہی ہوں تم نے بے خیالی میں کوئی غلط نمبر ملا دیا تھا۔ میں نے تم سے مری ہل پر تین زیرو نو زیرو کے لیے کہا تھا شاید ڈائل کرنے میں تم سے کوئی ہندسہ غلط ہو گیا تھا۔ اس طرح میں ان کی آواز سن رہی تھی۔ وہ میری آواز نہیں سن رہے تھے۔ تم پھر سے ٹرائی کرو۔"

آپریٹر نے کہا۔ "ایک منٹ۔۔ مری ہل تھری زیرو۔۔۔"

وہ انتظار کرنے لگی۔ اس کا ایک ہاتھ دوا کی شیشی پر پڑا۔ اس نے رومال نکال کر اپنا عرق آلود چہرہ صاف کیا۔ اسے آپریٹر کی آواز سنائی دی۔ "آپریٹر! میں نے تم سے غلط نمبر کو ٹرائی کرنے کے لیے کہا تھا۔ تم اس کال کو ٹریس کرو۔"

"ایک منٹ۔" آپریٹر نے سکون سے کہا۔ "میڈم! تم چیف آپریٹر سے بات کرو میں نمبر ملا رہا ہوں۔" دوسرے ہی لمحے اسے آواز سنائی دی۔ "چیف آپریٹر بول رہا ہوں۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"میں بیمار ہوں۔ مجھے ابھی ابھی فون پر ایک پریشان کن بات سنائی دی ہے۔ میں اس کال کو ٹریس کرانا چاہتی ہوں۔ یہ کسی عورت کے قتل سے متعلق ہے۔ قاتل اسے آج گیارہ بج کر پندرہ منٹ پر قتل کرنے والے ہیں۔ میں اپنے شوہر کے آفس فون کر رہی تھی۔ میں اکیلی ہوں، ملازمہ رخصت پر ہے۔ میرے شوہر نے چھ بجے آنے کو کہا تھا مگر اب ساڑھے نو بج رہے ہیں۔ نو بجے سے میں اس سے بات کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اس کا نمبر بزی مل رہا ہے۔ میں نے آپریٹر سے مدد لی تھی اس نے نمبر ملایا تو شاید وہ کسی غلط جگہ مل گیا۔ میں نے دو آدمیوں کو بولتے سنا۔ میری آواز وہ نہیں سن رہے تھے۔ وہ دونوں قاتل ہیں۔ کسی عورت کو مارنے کا پروگرام بنا رہے تھے پھر لائن کٹ گئی۔ میں اب وہ کال ٹریس کرانا چاہتی ہوں۔"

چیف آپریٹر نے کہا۔ "میڈم! اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ صرف جاری کال ہی ٹریس ہو سکتی ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو۔" وہ چیف پر برس پڑی۔ "میں نے کہا یہ دو قاتلوں کی بات تھی۔ وہ آج واردات کرنے۔۔۔"

چیف آپریٹر نے بات کاٹ دی۔ "محترمہ! آپ پولیس سے بات کر لیں۔ آپریٹر نمبر ملا دے گا۔" پھر اس نے فون بند کر دیا۔

تھوڑی دیر وہ فون تھامے گم صم بیٹھی رہی۔ باہر بہتے دریا کی آوازیں تھیں، کان میں ڈائل ٹون تھی۔ ہائی وے کی گاڑیوں کی آوازیں تھیں مگر اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے برج پر سے گزرتی ٹرین کی گڑگڑاہٹ نہیں سنی جس سے کھڑکیاں کانپ رہی تھیں۔

"میڈم! آپ کی کال ہے۔" اسے اچانک اپنے کان میں آپریٹر کی آواز سنائی دی۔

"ہاں، پولیس سے بات کراؤ۔" وہ چیخی۔ کچھ انتظار کے بعد ایک آواز سنائی دی۔

"پولیس اسٹیشن سیونتھ پریسنٹ سارجنٹ ڈونی بول رہا ہوں۔"

"میں میری اسٹیونسن بول رہی ہوں آف ۴۳ سوٹن پیلس۔ میں ایک قتل کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں۔"

"قتل۔۔۔؟"

"ہاں مگر یہ ابھی ہوا نہیں ہے البتہ۔۔۔ میں نے ان کا منصوبہ سن لیا ہے فون پر۔۔۔"

"فون پر؟"

"ہاں۔ وہ کوئی غلط نمبر مل گیا تھا آپریٹر سے۔"

"قتل کہاں ہونے والا ہے؟"

"دو آدمی باتیں کر رہے تھے آج گیارہ پندرہ پر

وہ کسی عورت کو قتل کرنے والے ہیں۔ وہ کسی ایسے گھر میں رہتی ہے جو کسی برج کے پاس ہے۔"

"جی۔۔۔"

"وہاں کوئی پرائیویٹ پولیس مین بھی ہے گلی میں۔ وہ سیکنڈ ایونیو پر کافی پینے جاتا ہے۔ اس وقت قاتل کھڑکی کے راستے مکان میں گھسے گا اور عورت کو چاقو سے ہلاک کرے گا۔"

"اچھا۔"

"ایک کوئی تیسرا آدمی بھی ہے۔ اس کا موکل، وہی قتل کا معاوضہ دے گا۔ وہ چاہتا ہے کہ عورت کے زیورات اڑا لیے جائیں تاکہ یہ واردات چوری کی لگے۔"

"ہوں۔"

"میں سخت متوحش ہوں، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"یہ کتنی دیر کی بات ہے؟"

"سات آٹھ منٹ پہلے کی۔"

"آپ کا نام؟"

"میری اسٹیونسن۔"

"پتا؟"

"۴۳ سوٹن پیلس، برج کے قریب ہے یہ عمارت، کوئن برج۔ ہماری گمیں ایک پرائیویٹ پولیس مین بھی ہے اور یہاں ایک سیکنڈ ایونیو بھی ہے۔"

"تم کون سا نمبر ملا رہی تھی؟"

"تھری زیرو نائن زیرو۔ مری ہل۔ لیکن میں نے یہ باتیں اس نمبر پر نہیں سنیں۔ یہ کوئی اور غلط نمبر تھا۔ میرا نمبر میرے شوہر کے آفس کا ہے۔ وہ گھر نہیں آیا ہے۔ مجھے اس کی تلاش ہے۔"

"ٹھیک ہے میڈم! میں دیکھتا ہوں۔"

"تم فوری قدم اٹھاؤ۔"

"ٹھیک ہے۔"

"تم میرے علاقے میں ایک ریڈیو کار روانہ کرو۔"

"محترمہ۔۔۔!" اسے سرجنٹ کی لمبی سانس سنائی دی۔

"کچھ پتا ہے آپ کو؟ سیکنڈ ایونیو کی لمبائی کیا ہے؟"

"ہاں۔۔۔ مگر۔۔۔"

"اور یہ بھی معلوم ہے کہ ادھر کتنے ایک سے برج ہیں۔"

"ہاں۔"

"تو پھر یہ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ یہ قتل تمہارے علاقے میں ہونے والا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ کوئی اور شہر کی بات ہو۔"

"میں سمجھی تھی تم کچھ کرو گے۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"سوری میڈم! شہر میں قتل ہوتے ہی رہتے ہیں۔ تمہارا دیا سراغ کافی نہیں۔ بہرحال میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ کیا کوئی شخص تمہیں قتل کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے؟"

"نہیں۔" وہ نروس ہو کر ہنسی۔ "میں تو ادھر ابھی آئی ہوں۔"

"پھر تمہیں کیا فکر ہے؟" اس نے فون بند کر دیا۔

اس نے لمبی سانس لی اور ریسیور رکھ دیا اور تکیے پر گر گئی۔ اسے احساس تھا کہ اس عورت کو آسانی سے تلاش نہیں کیا جا سکے گا۔ اسے اپنی تنہائی کا خیال آیا۔ اور اسے اسٹیونسن پر غصہ آنے لگا۔ ذہن منتشر ہونے لگا۔ کمرے کا سناٹا، دیوار کی تصویریں اسے یہ کمرا ایک قید خانہ لگا۔ اس نے دوبارہ فون اٹھایا اور آپریٹر کا نمبر ملایا۔

"ذرا پھر سے تھری زیرو نائن زیرو۔ مری ہل کو ملاؤ۔ آخر یہ ہنری کہاں ہے؟"

اس بار سگنل بزی نہیں تھا۔ لیکن فون کسی نے نہیں اٹھایا۔ "کوئی اٹھا نہیں رہا ہے۔" آپریٹر نے کہا۔

"لعنت ہو۔" اس نے بھنا کر فون رکھ دیا۔

بستر پر گر کر وہ سننے لگی۔ کوئی چاپ، کوئی آواز۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ اٹھ کر اس نے دراز کھولی۔ آئینہ اور کنگھا نکالا۔ بال سنوارتے ہوئے اس نے سوچنا شروع کر دیا۔ ہنری ہمیشہ سے مجھے سراہتا رہا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہاں گیا ہے۔ اس نے میز سے ایک سیاہ ڈائری نکالی۔ جس میں نمبر لکھے ہوئے تھے۔ معا فون بجا۔ اس نے بڑھ کر ریسیور اٹھایا۔

''ہیلو۔'' وہ چیخی۔

''یہ ایک لمبے فاصلے کی کال ہے، شکاگو سے مسز ہنری اسٹیونسن۔''

''ہاں بول رہی ہوں۔'' کچھ توقف سے اس نے اپنے باپ کی آواز سنی۔

''جی ڈیڈی! خیریت؟'' اس نے پوچھا۔

''تم بتاؤ کیا حال ہیں؟''

اسے اپنے باپ کی آواز اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ حاکمانہ ذہن کا آدمی تھا، جم کارٹل۔ اس کا بزنس پوری دنیا میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کا بلڈ فارمولا بے حد مشہور تھا۔ تیس سال قبل اس نے کسی ڈگسٹ کے پاس سے ایک ایسی گولی کا فارمولا ہتھیایا تھا جو دردِ سر کی بے حد موثر دوا تھی۔ آج پوری دنیا میں وہ دواؤں کا ایک بڑا تاجر تھا۔ وہ بہت سخت آدمی تھا۔ البتہ وہ لیونا سے دبتا تھا۔ اس کا علم صرف باپ اور بیٹی کو تھا۔

لیونا کی ماں اس کی پیدائش پر مر گئی تھی۔ بیوی کی موت کے بعد جم کارٹل پتھریلا ہو گیا تھا۔ وہ صرف اپنی بیٹی کے لیے نرم تھا اور بس۔

لیونا اپنی ماں کی طرح حسین تھی۔ وہ بڑی ہوتی گئی اور اس میں چالاکی پیدا ہوتی گئی۔ وہ کئی معاملوں میں اپنے باپ جیسی تھی۔ چالاک، سخت اور مغرور۔

اس کے باپ نے کبھی اسے بدلنے کی کوشش نہیں کی شاید وہ بھی یہی چاہتا تھا۔

لیونا اب تیس سال کی تھی، اس کی صحت خراب ہو رہی تھی۔ اس کا دل جواب دے رہا تھا۔

''میں بے حد اپ سیٹ ہوں۔''

''کیا۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔ ہنری غائب ہے اور میں نے فون پر ایک قتل کا منصوبہ سنا ہے۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟ میں سمجھا نہیں۔''

اس نے مختصراً اپنی روداد سنا دی۔

''کمال ہے ہنری نے تمہیں بتایا نہیں؟ وہ بوسٹن گیا ہوگا۔''

''بوسٹن؟ وہ کیوں؟''

''وہاں ڈرگسٹوں کی کانفرنس ہو رہی ہے۔ اسے تمہیں بتانا چاہئے تھا۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔''

''مگر۔۔۔ وہ قتل والی باتیں۔۔۔'' وہ ہکلائی۔

''تمہیں اس کی فکر کی ضرورت نہیں۔''

''مگر میں گھر میں تنہا ہوں۔''

''تم نے پولیس کو کیوں نہیں بتایا۔''

''بتایا۔۔۔ مگر وہ کچھ نہیں سن رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ تم سو جاؤ۔ میں صبح کو ہنری سے بات کروں گا۔'' جم کے لہجے میں غصہ تھا۔

''ٹھیک ہے۔''

میری لیونا نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ سوچ رہی تھی ہنری میرے باپ کی کالز سے کتنا چڑتا ہے۔ وہ کہتا نہ تھا مگر اسے اندازہ تھا کہ وہ اس کے باپ سے نفرت کرتا ہے۔ اسے امید تھی کہ اس کا باپ، ہنری کو صبح اچھی طرح جھاڑے گا۔ پھر بھی وہ بے آرام سی تھی۔ جارج کی باتیں اور چاقو کا ذکر اس کے دماغ میں تھے۔ کل کے اخبار سے پتا چلے گا کہ کسے مارا گیا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اگر کوئی مرا تو وہ اس سارجنٹ کی رپورٹ پولیس کمشنر کو کرے گی جس نے کیس میں دلچسپی نہیں لی تھی۔

آخر یہ ہنری کہاں گیا۔ اس کی توجہ بہکی۔ اس نے سننے کی کوشش کی۔ کوئی چاپ تو نہیں، کہیں ہوا سے کوئی کاغذ پھڑ پھڑایا، اس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ اب چپ چاپ لیٹی نہیں رہ سکتی تھی۔

اس نے سیاہ نوٹ بک اٹھالی۔ اس میں اس نے حرف ''ل'' کے انڈیکس کو دیکھا۔ پھر اس نے مس جیتنگ کے نمبر ڈائل کیے۔

☆☆☆

الزبتھ پریٹ نامی ہوٹل صرف عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں اس وقت میزوں پر تاش کھیلا جارہا تھا۔ قہقہے، باتوں کا ہلکا ہلکا شور پھیلا ہوا تھا۔

یہیں ایک کمرے کے آخر میں ایک موٹی عورت فون پر بیٹھی تھی۔ جوں ہی کوئی نمبر بورڈ پر ابھرتا وہ نگاہیں گھما کر ہال میں دیکھتی پھر تیز آواز میں نمبر کا اعلان کرتی تھی۔ یہ سلسلہ دیر سے چل رہا تھا۔ اسی لمحے اس نے مس جیتنگ کا نمبر پکارا۔

''تم سے کوئی مسز اسٹیونسن بات کرنا چاہتی ہیں۔''

''اچھا۔'' وہ اپنی میز سے اٹھی۔ ''میں ابھی آئی۔'' اس نے اپنی ساتھیوں سے کہا۔ ''یہ میرے باس کی بیٹی ہے۔''

''ہیلو مسز اسٹیونسن۔''

''جیتنگ تمہیں معلوم ہے ہنری کہاں ہے؟''

مس جیتنگ کے سوکھے چہرے پر ایک مکارسی مسکراہٹ ابھری۔ ''اچھا تو وہ ابھی تک گھر نہیں پہنچے؟''

''کیا وہ دیر تک آفس میں رکا تھا؟''

''نہیں میں تو چھ بجے نکلی تھی۔ اس وقت وہ آفس میں نہیں تھے۔'' رک کر اس نے کہا۔ ''وہ تو دن میں بس ذرا دیر ہی آفس میں رکے تھے۔ شاید بارہ تک۔ اس کے بعد وہ ایک عورت کے ساتھ چلے گئے تھے۔''

''عورت کے ساتھ؟''

''ہاں۔'' مس جیتنگ مسکرائی۔ ''وہ پہلے ہی سے مسٹر اسٹیونسن کی منتظر تھی۔ کچھ پریشان بھی تھی۔''

لیونا لمحہ بھر کے لیے متذبذب سی ہوگئی۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''کیا ہنری اسے جانتا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم مگر وہ پہلے کبھی آفس میں نہیں آئی۔''

''تمہیں اس کا نام معلوم ہے؟''

''شاید لارڈ تھا۔۔۔ سلی لارڈ۔''

''وہ کیوں آئی تھی؟''

جیتنگ نے چھت کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے اس کی آمد پر مسٹر اسٹیونسن کچھ گھبرا گئے تھے۔ انہوں نے عورت سے کہا تھا کہ وہ کچھ مصروف ہیں کیوں نا وہ کسی اور دن آئے مگر مسز لارڈ کا کہنا تھا کہ معاملہ بہت اہم ہے۔ پھر مسٹر اسٹیونسن اسے کھانے کے لیے لے کر چلے گئے تھے۔''

''پھر۔۔۔؟''

''چھ بجے تک وہ واپس نہیں آئے تھے۔ ان کا ایک پیغام ضرور آیا تھا۔''

''پیغام؟''

''ہاں۔۔۔ یہ کسی مسٹر ابوانز کی طرف سے تھا۔ یہ آدمی ہر ہفتے مسٹر اسٹیونسن سے ملنے آتا رہتا ہے۔''

''وہ بوسٹن تو نہیں گیا تھا؟''

''مجھے اس کا علم نہیں۔''

''ٹھیک ہے مس جیتنگ۔ گڈ بائے۔''

مس جیتنگ نے فون رکھ کر چھت کی سمت دیکھا اور سوچنے لگی۔ آخر یہ کہاں گیا ہے؟ وہ اس وجیہہ آدمی کو ہمیشہ سے خاصہ پراسرار محسوس کرتی رہی تھی۔

☆☆☆

لیونا ایک بار پھر تکیوں پر ڈھیر ہوگئی۔ جو نہیں ہونا چاہیے تھا وہ ہوا تھا۔ وہ احمق ایک بہت پرانی شناسا سے دوبارہ پینگیں بڑھا رہا تھا۔ لیونا اس کے لیے بالکل تیار نہ تھی۔ آج کی رات یہ سب کیا ہورہا ہے؟ اسے حیرت تھی۔

اسی لمحے اس کے دماغ میں ایک کھٹکا سا ہوا۔ ایک نام یاد آیا ''لارڈ'' یہ اس عورت کا نام تھا۔ کہاں دیکھا ہے یہ نام میں نے؟ شاید آج ہی یہ نام نظر سے گزرا ہے میرے۔ اس نے دماغ پر زور ڈالا۔ پھر جلدی سے بستر سے اتری، کھڑے ہوتے ہوئے وہ لڑکھڑائی اور دوسری میز تک گئی۔ اس نے لیمپ

چلایا۔ اس کی نظریں گل دان پر پڑے سفید کارڈ پر گئیں۔ کارڈ ان پھولوں کے ساتھ تھا جو ہنری لایا تھا۔ اس نے کارڈ اٹھایا اس کے ٹکڑے کر کے فرش پر ڈال دیے۔ وہیں پاس ہی ایک چٹ بھی تھی جس پر اس کی ملازمہ نے کچھ لکھا تھا۔ وہ سلپ اٹھا ہی رہی تھی کہ فون بجا وہ بستر کی طرف گئی اس نے فون اٹھایا۔

دوسری طرف کسی مرد کی آواز تھی۔ تھکی تھکی سی۔

"مسٹر اسٹیونسن؟"

"وہ گھر پر نہیں ہیں۔" لیونا نے کہا۔ "کون بول رہا ہے؟"

"میرا نام ایوان ہے۔ ایک بے حد اہم معاملہ ہے۔ میں نے ان کے آفس میں فون کیا تھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔"

"مجھے پتا نہیں وہ کہاں ہیں۔ تم بعد میں فون کر لینا۔"

"میرے پاس صرف پندرہ منٹ ہیں۔ میں اس شہر سے آدھی رات سے پہلے جا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم پندرہ منٹ بعد فون کر لینا۔"

"تم میرے بارے میں انہیں بتا دینا۔ یہ اہم معاملہ ہے۔" اس نے فون بند کر دیا۔ اس نے ملازمہ کی سلپ دیکھی۔ جس پر آنے والے فون کالوں کی تفصیل تھی۔

۳:۱۰۔ مسٹر ایوان کی کال۔ فون نمبر ۸۱۱۱۴۔

۴:۳۵۔ مسٹر ایوان۔

۴:۵۰۔ مسز لارڈ جیکسن۔ ۵۹۹۶۴۔

"اوہ تو یہ ہے وہ مسز لارڈ۔" اس نے لمبی سانس لی۔ "کمال ہے یہ عورت گھر پر فون کر رہی تھی۔"

اس نے فون پر جیکسن ہائٹس کے نمبر ڈائل کیے اس کا چہرہ حسد اور غصہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ اسے کسی بچے کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو! کون ہے؟"

"میں مسز لارڈ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"ایک منٹ۔" فون میں کچھ بھنبھناہٹیں ابھریں۔ آوازیں واضح نہ تھیں اسی دوران اسے اسٹیونسن نام سنائی دیا۔ پھر کسی نے کورٹلی کارپوریشن کا نام لیا۔ یکا یک صاف آواز سنائی دی۔

"ہیلو۔"

"مسز لارڈ؟" لیونا بڑی مشکل سے بولی۔

"ہاں! بول رہی ہوں۔"

"میں مسز ہیری اسٹیونسن بول رہی ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ میرا خیال ہے آج تم نے میرے شوہر سے ملاقات کی تھی؟"

"ہاں..... کیوں؟" لیونا کو اس کی آواز میں گھبراہٹ محسوس ہوئی تو وہ ذرا مضبوط ہو گئی۔

"میں تمہیں زحمت نہ دیتی مگر میرا شوہر ابھی تک گھر نہیں آیا ہے۔ کیا تم بتا سکتی ہو وہ کہاں ہوگا؟ مسز لارڈ۔۔۔" وہ کچھ سمجھ نہ سکی۔

"کیا کہہ رہی ہو؟"

"میں بعد میں فون کروں گی۔"

"کیا؟" عورت نے چونچال لہجے میں کہا۔

"کچھ نہیں۔ برج کا پروگرام ہے۔"

"کیا؟" لیونا گرم ہو گئی۔

"ہاں۔" بعد میں روٹن پوائنٹ بھی جائیں گے۔" عورت نے احمقانہ سا جواب دیا۔

"کیا تم مجھ سے مذاق کر رہی ہو؟" لیونا نے بھنا کر کہا۔

"نہیں۔ بس تین انڈوں سے کام چل جائے گا۔ دو کپ دودھ بھی درکار ہوگا....." یکا یک عورت رکی پھر سرگوشی میں بولی۔ "لیونا! میں سیلی ہنٹ ہوں۔ یاد آیا۔۔۔؟ کیا کرتی میرا شوہر قریب ہی کھڑا تھا۔ تم انتظار کرو میں خود رابطہ کروں گی۔" پھر فون بند ہو گیا۔

اپنے بستر پر گرتے ہوئے لیونا عالم حیرت میں تھی۔ عورت کا انکشاف ایسا ہی تھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ سیلی ایک بار پھر اس کی زندگی میں داخل ہو رہی تھی۔۔۔ سیلی ہنٹ۔

☆☆☆

کسی زمانے میں سیلی ہنٹ ہنری سے محبت

کرتی تھی۔ ہوسکتا ہے ابھی تک یہی کچھ ہو۔ لیکن اب وہ شادی شدہ تھی اور بچوں کی ماں بھی۔ ہنری کو یہ عورت اس روز سے جانتی تھی جب اس نے کالج میں رقص کے پروگرام میں اسے بلایا تھا۔ مگر یہ ایک پرانی بات تھی۔

اس نے ہنری کو سیلی کے ساتھ فلور پر رقص کرتے دیکھا تھا۔ اسے ہنری پہلی ہی نگاہ میں بھا گیا تھا۔ وہ خاصہ وجیہہ تھا۔ اس کا سوٹ عمدہ تھا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ کالج کا لڑکا نہیں ہے۔ سیلی اپنے ہم رقص سے بہت متاثر نظر آرہی تھی۔ پہلے پہل اس نے لیونا کو مجمع میں دیکھا تھا اور لیونا ایسی لڑکی نہ تھی کہ مجمع میں ابھر نہ سکتی۔ حسن سے لے کر لباس تک وہ سب سے ممتاز تھی۔ اس نے کچھ دیر تک ہنری کو سیلی کے ساتھ ناچنے دیا تھا۔ پھر اس نے سیلی کے پارٹنر کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا میں مداخلت کرسکتی ہوں؟" وہ ڈانس کرتے چونک اٹھے تھے۔

"اوہ۔۔۔ ہنری!" پھر سیلی نے کہا تھا۔ "تمہارے بھاگون چھینکا ٹوٹا ہے، مبارک ہو۔"

لیونا نے سیلی کے پارٹنر کو بھرپور نظروں سے دیکھا تھا۔

"میرا نام میری لیونا کارٹل ہے اور تمہارا۔۔۔؟" پھر سیلی نے تعارف کرایا تھا۔ "یہ ہنری ہے..... ہنری اسٹیونسن۔"

اس کے بعد کی داستان سادہ سی تھی۔ اسے ہنری پسند آگیا تھا۔ پھر اس نے اپنی دولت کے جال میں اسٹیونسن کو اچھی طرح پھنسا لیا تھا کیونکہ ہنری ان لوگوں میں سے تھا جو دولت مند بننا چاہتا تھا۔ اس روز لیونا نے اس سے کہا کہ وہ اس کی کار چلا کر اسے گھر تک پہنچا دے۔

راستے میں وہ مزید بے تکلف ہوگئے تھے۔ جب لیونا نے اس سے اس کے خاندان کے بارے پوچھا تھا۔

"یہ سادہ سی کہانی ہے۔" ہنری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم کہہ سکتی ہو کہ میں ایک غلط سی جگہ سے تعلق رکھتا ہوں، میرا باپ ایک قلی ہے وہ بہت شرابی بھی ہے۔ میری ماں کچھ پڑھی ہوئی ہے اور وہ چھ بچوں کی ماں ہے۔"

"تم اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"میں نے ہائی اسکول تک پڑھا ہے۔ کالج نہیں جاسکا۔ سیلی سے میری ملاقات اسکول میں ہوئی تھی۔ پھر میں اسی کے ساتھ اس کے گھر آگیا تھا۔ اس کا باپ مجھے پسند کرتا ہے۔ اس نے یہاں مجھے سب سے بڑے ڈرگ اسٹور میں ملازمت دلا دی ہے۔"

"اچھا۔"

"میں جانتا تھا تم ہنسو گی۔"

"نہیں۔۔۔ اور سیلی کے بارے میں کیا کہتے ہو؟" ہنری کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ اس نے کہا۔

"اچھی لڑکی ہے۔ ہم دونوں دوست ہیں۔ اس کے خاندان نے میری بڑی مدد کی ہے۔" وہ بول رہا تھا مگر اس کی آنکھیں کہیں اور کھلی ہوئی تھیں۔

"اور۔۔۔"

"نہ جانے کیا بات ہے۔ میں جو کچھ چاہتا ہوں آج تک نہیں کرسکا۔"

رخصت کے وقت لیونا نے اسے پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم میرے والد سے نہیں ملو گے؟"

"کیوں نہیں۔"

"مجھے یقین ہے وہ تمہیں پسند کریں گے، تمہارے اور ان کے درمیان کئی باتیں مشترک ہیں۔ وہ بھی زیادہ پڑھے ہوئے نہیں ہیں اور انہوں نے بھی نیچے سے اوپر کا سفر کیا ہے۔"

اس نے یہ جملے جان بوجھ کر کہے تھے۔ اس کو پتا تھا کہ ہنری ایک زنگ زدہ پستول جیسا ہے جسے آسانی سے نہیں چلایا جاسکتا۔ وہ ایک آزاد روح تھا اور ایک بڑے آدمی کی لڑکی سے مل کر وہ کچھ شے میں بھی تھا۔

اسے یاد ہے جب سیلی نے آ کر اس سے بات کی تھی۔ وہ تذبذب میں تھی۔ تاہم اس نے کہا تھا۔

"لیونا۔۔۔! مجھے معلوم ہے تم ہنری سے مسلسل مل رہی ہو۔۔۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"ضرور کہو، میں کچھ دیر بعد شکاگو جا رہی ہوں۔"

"ہنری تمہاری کلاس کا آدمی نہیں ہے تم اس سے مت کھیلو۔"

"تم سے کس نے کہا کہ میں اس سے کھیل رہی ہوں؟" اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"میں نے کہا کہ وہ تمہاری کلاس کا نہیں ہے تم۔۔۔"

لیونا نے درمیان میں بات کاٹ دی۔ "تم بار بار یہ کیوں کہہ رہی ہو۔"

"تم اسے نہیں جانتیں۔ تم پچھتاؤ گی۔ اس کی فطرت میں ایک ٹیڑھ ہے۔ وہ ایسی خواہشات رکھتا ہے جو کبھی پوری نہیں ہو سکتیں۔ تم اس کے ساتھ نہیں رہ سکتیں۔"

"خوب۔۔۔ اچھی نصیحت ہے تمہاری۔" لیونا نے تمسخر سے کہا۔

"تم فکر نہ کرو، میں نے اسے اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ بے شک وہ اس قصبے کے لیے موزوں آدمی نہیں۔ یہ معاملہ کہ میں اس سے شادی کرنے جا رہی ہوں تو یہ میرا معاملہ ہے۔"

"شادی۔۔۔؟" سیلی نے چونک کر کہا۔ "تم اس سے شادی کر رہی ہو؟"

"ہاں۔۔۔ اس میں کیا ہرج ہے؟"

☆☆☆

اس کے بعد سیلی نے خود کو پس منظر میں رکھا تھا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ بستر پر لیٹے لیٹے اس نے سوچا۔ خود جم کارٹل بھی کوئی مزاحمت نہیں کر سکا تھا۔ البتہ اس نے شادی کی بات پر لیونا کو سمجھایا ضرور تھا۔

"دیکھو یہ لڑکا بس یونہی سا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ تم اتنی پڑھی لکھی ہو کر کیوں اس طرح سوچ رہی ہو۔"

"میں اسے پسند کرتی ہوں۔" اس نے باپ سے ضدی لہجے میں کہا تھا۔ باپ نے بالآخر ہتھیار ڈال دیے تھے۔ بیوی کی موت کے بعد سے اسے صرف اپنی بیٹی سے پیار تھا۔ ورنہ سوائے دولت کے اسے کسی سے بھی دلچسپی نہ تھی۔

☆☆☆

اس کی شادی اس کے لیے ایک فتح جیسی تھی۔ ہنری اس کی توقعات کے عین مطابق تھا۔ یورپ کے طویل ہنی مون کے دوران اسے ہنری کی شخصی خوبیوں نے گرویدہ کر دیا۔"

پھر لیونا نے یہ بھی دیکھا ہنری نے اپنی نئی زندگی میں اپنے ماضی کو بالکل بھلا دیا تھا۔ بستر پر لیٹے لیٹے اس کے چہرے پر ایک چمک ابھری۔ اس کا ذہن ایک بار پھر سیلی کی طرف چلا گیا۔ اسے اسی لمحے میں ایک زور کی سیٹی سنائی دی جو قریبی دریا میں رواں کسی اسٹیمر نے نکالی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس نے میز کی طرف دیکھا، وہیں گھڑی بھی تھی۔ اس کی نظریں اس پر پڑیں۔ معاً فون بجنے لگا۔

یہ فون سیلی کا تھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ مجھے فون پر اداکاری کرنی پڑی۔ میرا شوہر قریب کھڑا تھا۔ میں اس وقت ایک قریبی بوتھ سے بول رہی ہوں۔"

"اچھا۔۔۔"

"تمہیں تو واقعی حیرت ہوئی ہوگی۔ لیکن ہنری سے میرا ملنا آج بہت ضروری تھا۔ معاملہ اہم تھا۔ اس کی وضاحت ذرا لمبی ہوگی مگر میں مختصراً بتاؤں گی۔"

"کیا۔۔۔؟"

"میرا شوہر فریڈ ایک سراغ رساں ہے۔ سرکاری تفتیش کار۔"

"اچھا۔"

''آج سے تین ہفتے قبل اس نے مجھے ایک اخباری تراشہ دکھایا تھا۔ یہ تمہارے اور ہنری سے متعلق تھا۔ سوسائٹی کے صفحات پر۔۔۔''

''ہاں۔۔۔ مجھے یاد ہے۔''

''یہ دیکھا کر اس نے پوچھا تھا۔ کیا یہ وہی ہنری ہے جس سے کبھی میرا تعلق رہا تھا۔ میں نے بتا دیا تھا تو فریڈ نے وہ تراشہ جیب میں رکھ لیا تھا اور مجھے بس اتنا بتایا تھا کہ معاملہ سرکاری ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''خفیہ کہہ لو۔۔۔ میں نے اصل بات کریدی تھی مگر وہ ٹال گیا تھا اور مجھ سے مذاق کرنے لگا تھا کہ میں شاید ابھی تک اس سے محبت کر رہی ہوں۔''

''اور تم نے اس سے کہہ دیا تھا کہ اب تمہارا اس سے کوئی سروکار نہیں۔''

''ہاں۔۔۔ پھر کچھ دیر بعد ناشتے کی میز پر ایک فون آیا تھا۔ یہ فون فریڈ کے آدمیوں میں سے کسی کا تھا۔ میں نے اس کی باتیں سن لی تھیں۔ وہ اسٹیونسن اور کسی ہارلوٹین کے بارے میں بول رہا تھا۔ اس نے کہا تھا، ہم بالکل جائیں گے ہارلوٹین کو بتا دو۔ جمعرات کو گیارہ بجے، ساؤتھ فری چینج بوتھ پر۔''

سیلی ذرا کی ذرا رکی، لیونا نے بھنا کر کہا۔

''دیکھو سیلی۔۔۔! وقت مت خراب کرو۔ ہوسکتا ہے ہنری مجھے فون کرے۔ میں زیادہ دیر فون انگیج نہیں رکھ سکتی۔''

''تم پوری بات جانے بغیر کچھ نہیں سمجھو گی۔ معاملہ بہت اہم تھا۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر میں نے فریڈرک کا پیچھا کیا جمعرات کے دن۔ مجھے ہنری کی فکر تھی۔''

''اسے چھوڑو آگے بتاؤ۔''

''میں بتا رہی ہوں۔ دیکھو بہت ممکن ہے آج اس کی غیر موجودگی کا کچھ تعلق ان ہی باتوں ہی سے ہو لیکن تم مجھے بات تو کرنے دو۔۔۔''

''ٹھیک ہے تم بولتی رہو۔''

''اس روز ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ میرے پاس ایک چھتری تھی۔ میں نے خود کو اس کے پیچھے چھپا لیا تھا۔ میں نے فریڈ کو دو آدمیوں سے ملتے دیکھا۔ ایک جم ہیرس تھا جو فریڈ کے ساتھ کام کرتا ہے۔ دوسرا ایک قوی الجثہ آدمی تھا۔ اس کے بال سفید تھے۔ غالباً یہی ہارلوٹین تھا۔ میں نے کچھ فاصلے پر اس کا انتظار کیا۔ پھر وہ لوگ اسٹیمر کے لیے چل دیے۔ میں نے بھی ٹکٹ لیا۔ اسٹیمر میں رش تھا۔ وہ اسٹیفن پر اترے۔ پھر ٹرین میں چڑھے۔ میں نے بھی ٹرین پکڑی۔ میں دوسرے ڈبے میں تھی۔''

''پھر۔۔۔؟''

''میں نے نگاہ رکھی ہوئی تھی جب وہ اترے تو میں بھی اتر گئی۔ وہ جگہ جہاں وہ گئے بیچ کالونی جیسی تھی۔ سنسان سی گلیوں میں لوگ بہت کم تھے۔ یہاں جگہ جگہ ریت تھی۔ مکانات بھی بس معمولی سے تھے۔ ان کے درمیان ایک کسینو ضرور تھا۔ فریڈ اور اس کے دونوں ساتھی بیچ کی طرف چلے گئے تو میں کسینو میں جا گھسی اور یہاں کے پورچ سے میں نے ان کو دیکھنا شروع کیا۔''

''تم عجیب باتیں سنا رہی ہو۔'' لیونا نے تمسخر سے کہا۔

''میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔ وہاں صرف ایک لڑکا اور تھا جو پانی کے کنارے کچھ کر رہا تھا۔ سفید بالوں والے نے رک کر لڑکے کی سمت دیکھا اور لڑکے نے گردن کے اشارے سے ایک طرف اشارہ کیا۔ اس کے بعد وہ تینوں دوبارہ واپس ہو کر ایک دکان میں چلے گئے جہاں ناشتا مل سکتا تھا۔''

لیونا بری طرح کسمسا رہی تھی۔ بھناتے ہوئے اس نے کہا۔ ''یہ تم نے کون سی شیطان کی آنت شروع کر دی۔ کیا تم میرا فون انگیج رکھنا چاہتی ہو؟''

''دیکھو۔۔۔ ان باتوں کو جانے بغیر تم کچھ نہیں سمجھ سکو گی۔'' سیلی نے جلدی سے کہا۔ ''یہاں میں خود بھی فون بوتھ میں انتظار کرنے والوں کا نشانہ بن رہی

ہوں۔'' اس نے دوبارہ اپنا قصہ شروع کرتے ہوئے کہا۔ ''گھنٹا بھر تک تو کچھ نہیں ہوا۔ میں خود بھی خود کو ملامت کر رہی تھی کہ میں یہاں کیوں آئی۔ پھر میں نے ایک حیرت ناک بات دیکھی۔ پانی کے پاس والے لڑکے نے ایک زور کی انگڑائی لی۔ پھر کسی موٹر بوٹ کی آواز سنائی دی جو ساحل کی طرف آرہی تھی۔ پھر یہ بوٹ ساحل پر اس جگہ رکی جہاں ایک پرانا شکستہ سا ہاؤس بنا ہوا تھا۔ لیونا۔۔۔! یہ قدرے ترچھا سا تھا۔ میرا خیال ہے پانی سے اس کی بنیادوں کو نقصان ہوا تھا۔''

''سلی! خدا کے لیے فضول باتوں سے گریز کرو۔''

''بوٹ رکی، اس میں سے ایک کبڑا سا آدمی باہر کودا۔ اس نے بوٹ کو ایک پتھر سے باندھ دیا تھا۔ پھر بوٹ سے ایک لمبے قد کا آدمی نمودار ہوا۔ اس کے جسم پر سیاہ سوٹ تھا۔ سر پر ہیٹ تھی۔ اس کی بغل میں ایک بریف کیس بھی دبا تھا۔ اس آدمی کے اترتے ہی کبڑے نے بوٹ کھولی اور اسے اسٹارٹ کر دیا اور پانیوں میں چلا گیا۔

سیاہ سوٹ والا مکان میں چلا گیا۔ ذرا دیر بعد ساحل والا لڑکا اپنے اوزار اٹھا کر دکان کی طرف چلا۔ اس نے ٹھوکر کھائی، اس کی بالٹی زور دار آواز سے گری۔ میرا خیال ہے یہ کوئی اشارہ تھا۔ میں نے فریڈ اور اس کے ساتھیوں کو دکان سے نکلتے دیکھا۔ وہ بھی اب پرانے مکان کی طرف جا رہے تھے۔ پھر سفید بالوں والے نے دستک دی اور وہ تینوں گھر میں چلے گئے۔''

لیونا۔۔۔! مجھے کچھ پتا نہیں وہ کون لوگ تھے اور مکان میں کیا ہو رہا تھا۔ پھر وہ باہر آ گئے۔ فریڈ کے پاس ایک بریف کیس تھا۔ یہ وہی بریف کیس تھا جو سیاہ سوٹ والے کے پاس تھا۔''

''آگے۔۔۔؟'' لیونا نے بے صبری سے کہا۔

''مجھے پتا نہیں۔'' سلی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پلٹنا بھی تھا فریڈ سے پہلے۔۔۔ میرا دل کہہ رہا تھا مجھے کچھ کرنا چاہیے۔۔۔ تم بتاؤ کیا کرنا چاہیے؟''

''مگر اس میں ہیری کہاں سے آتا ہے؟'' لیونا نے طنزاً پوچھا۔

''میں اسی لیے تو آج اس سے ملی تھی۔''

''اور کیا معلوم ہوا؟''

''مجھے موقع ہی نہیں ملا۔''

''کیوں؟ تم تو اس سے ملی تھیں۔''

''اس نے معاملے پہ توجہ ہی نہیں دی۔ وہ کسی اور سوچ میں تھا۔ وہ مجھے لنچ کے لیے ہوٹل لے گیا۔ وہاں جوں ہی ہم گھسنے لگے۔ ایک معمر آدمی آیا۔ اس کا نام فری مین تھا۔ اس نے اسٹاک ایکس چینج کی باتیں شروع کر دیں۔''

''فری مین؟'' لیونا نے کہا۔ ''میں تو اس نام سے واقف نہیں۔''

''ہنری اس سے بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا مگر یہ آدمی بولے جا رہا تھا۔ اس کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ اسٹاک ایکس چینج میں کوئی اہم معاملہ ہوا تھا۔ پھر ہنری نے کہا، ہوسکتا ہے کوئی غلطی ہوئی ہو۔ تب فری مین ہنسا اور بولا۔ میں تو غلطی بھگت لوں گا مگر تمہارے لیے یہ مسئلہ سنگین ہوگا۔ پھر ہنری نے کھانا بھی کم کھایا۔ میں فری مین کی گفتگو کا سر پیر تلاش کر رہی تھی اور چپ تھی۔ پھر فری مین چلا گیا۔ ہم بھی اٹھ گئے۔ لابی میں ہنری نے کہا کہ اسے کوئی اور کام ہے۔ اس وقت ہم کسی بروکر کی برانچ آفس کے سامنے تھے جو ہوٹل میں تھی۔

ہمیں ایک آواز سنائی دی۔ ''مسٹر اسٹیونسن! میں شدت سے تمہارا منتظر تھا۔'' ہنری نے چونک کر کہا۔ اوہ مسٹر منشا! میں تمہارے پاس خود آؤں گا۔ اس نے عجلت میں کہا۔ مجھے رخصت کیا اور اسی برانچ آفس میں چلا گیا۔ چیرٹی الیف منشا کی تختی لگی ہوئی تھی۔

''مگر ہنری کو تو بانڈز وغیرہ کا کوئی تجربہ نہیں۔'' لیونا نے کہا۔

''میں نے اس سے پوچھا تھا کہ تم موجودہ

حالات میں خوش ہو؟'' سیلی نے کہا۔ ''اس نے تلخ لہجے میں کہا، اب وہ وائس پریزیڈنٹ بن گیا ہے اور ہر وقت بٹن دباتا رہتا ہے۔''

''یہ بات تو نہیں، ہنری بالکل ٹھیک ہے۔''

اس وقت لیونا کو آپریٹر کی آواز سنائی دی۔ جو سیلی سے کہہ رہا تھا کہ اس کا وقت ختم ہو رہا ہے اور مزید بات کے لیے اسے پانچ سینٹ جمع کرانے ہوں گے۔ پھر شاید سیلی نے اپنا پرس دیکھا تھا اور کہا کہ اس کے پاس چینج نہیں ہے۔ اس نے کہا۔ ''لیونا! میں بعد میں فون کروں گی۔ میرا خیال ہے ہنری کسی مصیبت میں ہے۔ فریڈ آج رات اس کی رپورٹ پر کام کر رہا ہے۔ میں نے اس کے فون سنے ہیں۔ ان میں ہنری کا نام آتا رہا ہے۔ اس میں ایک نام کسی ایوان کا بھی تھا۔''

''میڈم! وقت ختم ہو گیا۔'' آپریٹر نے مداخلت کی۔

''والڈا ایوان۔'' سیلی نے عجلت سے کہا۔ ''میں نے یہ نام اسٹیشن آئی لینڈ والے مکان پر دیکھا تھا۔''

''میڈم فون بند کر دیں۔''

سیلی کے فون بند ہوتے ہی لیونا نے اس مڑے تڑے کاغذ کو اٹھا لیا جس پر سیلی کا نمبر لکھا تھا۔ اس پر ایوان کا نمبر بھی لکھا تھا۔ ''ایٹ ٹرپل ون ٹو'' اس نے احتیاط سے یہ نمبر ڈائل کیا۔

اسے فوراً آپریٹر کی آواز سنائی دی اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ پوچھ رہا تھا۔

''کیا آپ ڈبلیو ایوان کا نمبر ڈائل کر رہی ہیں۔''

''ہاں، کیوں؟''

''وہ نمبر ڈس کنیکٹ ہو چکا ہے۔''

وہ بستر میں سیدھی بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں خلا میں تھیں، وحشت زدہ سی۔ عجیب باتیں ہو رہی تھیں۔ ہنری کی گم شدگی، قاتلوں کی گفتگو، مس جینگ، سیلی کی عجیب غریب گفتگو۔ یہ ساری باتیں چکرا دینے والی تھیں۔ پھر بھی اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے معاملات

ہنسی علاج غم ہے

ایک صاحب کا قد نو فٹ تھا۔ وہ اپنے اس قد کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ کافی ڈاکٹروں، حکیموں کے پاس گئے پر کوئی حل نظر نہ آیا۔ پھر کسی نے مشورہ دیا کہ فلاں فلاں جگہ کسی جنگل میں ایک بابا ہیں ان کے پاس اس مسئلے کا حل ضرور ہوگا۔ کافی تگ و دو کے بعد وہ بابا کے پاس پہنچ گئے۔

بابا نے کہا۔ ''فلاں فلاں جگہ کسی سمندر کے کنارے ایک لڑکی ملے گی۔ تم اس سے کہنا مجھے تم سے شادی کرنی ہے۔ اگر اس کا جواب نہیں ہوگا تو تمہارا قد ایک فٹ چھوٹا ہو جائے گا۔'' اور وہ بابا کے پاس سے چلے آئے۔

پھر کافی تلاش کے بعد ان کو وہ لڑکی سمندر کے پاس نظر آ گئی۔ ان صاحب نے کہا مجھے آپ سے شادی کرنی ہے۔ لڑکی نے کہا ''نہیں۔'' صاحب کا قد ایک فٹ چھوٹا ہو گیا۔ اس نے سوچا ایک بار اور کہوں سات فٹ ہو جائے گا۔ لڑکی نے پھر کہا ''نہیں۔'' ان صاحب کا قد سات فٹ ہو گیا۔ ان کو ایک بار پھر لالچ ہوا۔ اگر ایک بار اور کہوں تو چھ فٹ آئیڈیل قد ہوگا۔ اس نے کہا مجھے آپ سے شادی کرنی ہے۔ جواب میں لڑکی نے غصے سے کہا۔ ''نہیں، نہیں، نہیں'' اور صاحب کا قد چار فٹ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

عارف (طارق سے): ''مجھے انگلش کے استاد بہت پسند ہیں۔''

طارق: ''وہ کیوں؟''

عارف: ''کلاس میں داخل ہوتے ہی وہ مجھے باہر نکال دیتے ہیں۔''

بگڑنے والے نہیں۔ شاید ہنری کسی مصیبت میں تھا۔ پھر اسے اپنی تنہائی کا خیال آیا اور اس پر خود رحمی کا دورہ پڑ گیا۔ کوئی ملازم بھی آس پاس نہ تھا۔ وہ بیمار تھی۔ اس کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔ اس نے لمبے فاصلے کی کال کے لیے فون اٹھایا۔ وہ اپنے باپ سے

بات کرنا چاہتی تھی جم کارٹل سیم جو شکاگو میں تھا۔ وہاں سے اسے پتا چلا کہ جم گھر پر نہیں ہے۔

اسے اپنے باپ پر غصہ آنے لگا۔ وہ راتوں میں کلبوں میں جانے کا عادی تھا۔ نیویارک اس کا کوئی نہ تھا جس سے وہ فون پر بات کرسکتی۔ آخر میں اس کے ذہن میں ڈاکٹر کا خیال آیا۔ ڈاکٹر الیگزینڈر وہ اس کے پاس گھبیار آچکا تھا۔ وہ آسکتا تھا۔ اس نے فون کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ معاً فضا میں کسی آتی ٹرین کی آواز ابھری۔ جو پل پر سے گزر رہی تھی۔ لیونا نے شور ختم ہونے کا انتظار کیا۔ وہ سوچ ہی رہی تھی ایسی پرشور جگہ پر قیام قطعی مناسب نہیں۔ پھر اسے ٹرین کا خیال آیا اور قاتل کی گفتگو یاد آئی۔ وہ کپکپائی۔

اس نے فون اٹھانا چاہا کہ اس کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف وہی آدمی ایوان بول رہا تھا۔

''کیا مسٹر اسٹیونسن موجود ہیں؟''

''نہیں۔ کیا تم مسٹر ایوان ہو؟''

''ہاں۔''

''سنو۔ یہ اسٹیشن آئی لینڈ والا معاملہ ہے کیا؟''

اس نے پوچھا۔ ''مجھے آج رات اس کا پتا چلا ہے اور میں پریشان ہوں۔ عجیب عجیب فون کالیں آرہی ہیں۔۔۔'' وہ ذرا سی رکی۔ اسے فون پر ایسی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جیسے دور پر کہیں فائر بریگیڈ یا پولیس کا سائرن بج رہے ہوں۔

اس نے کہا۔ ''مسٹر ایوان! تم آوازیں سن رہے ہوں؟'' یہ آوازیں اب تیز ہو رہی تھیں۔

اسے جواب نہیں ملا۔ اس نے پھر سوال دوہرایا مگر خاموشی رہی تو وہ گھبرا گئی۔ ''بولتے کیوں نہیں؟'' وہ چیخی۔ آوازیں تیز ہو چکی تھیں اس نے فون بند کردیا۔ اسی لمحے فون پھر بجا۔

''کون؟ مسٹر ایوان؟'' اس نے جلدی سے پوچھا۔

''نہیں۔ میں سیلی ہوں۔ اسٹیشن سے بول رہی ہوں۔ اس وقت سارے اسٹور بند ہیں۔ اس لیے یہاں سے بات کررہی ہوں۔''

''کیا بات ہے سیلی؟'' وہ جھلا کر بولی۔

''میں جب گھر پہنچی تھی تو وہاں ایک پولیس کار کھڑی تھی۔'' سیلی نے کہا۔ ''اسٹیشن آئی لینڈ والا مکان جلا دیا گیا ہے۔ پولیس نے وہاں سے تین آدمی پکڑے ہیں۔ لیکن ایک ایوان نامی شخص مفرور ہے۔''

''یہ ایوان ہے کون؟ اس کا ہنری سے کیا تعلق ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ مگر اس کا تعلق تمہارے باپ کی کمپنی سے ضرور ہے۔'' سیلی نے کہا۔

''وہ کیوں؟ میرے باپ نے تو کچھ نہیں کیا۔ یہ بتاؤ پکڑا کون گیا ہے؟''

''تین آدمی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم۔''

''کیا اس میں ہنری بھی ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ مگر میرا خیال ہے ہنری اس معاملے میں ملوث ہے۔''

''تو کیا تم سمجھتی ہو اسے گرفتار کیا جائے گا؟''

''میں کہہ نہیں سکتی۔''

''تو پھر یہ سب کیا بکواس ہے۔'' وہ چڑچڑائی۔

''کیا تم مجھے ڈرا رہی ہو۔ مجھے پہلے ہی فون پر دو قاتلوں کی باتیں سنائی دی ہیں۔''

''قاتلوں کی باتیں؟''

''ہاں۔۔۔ وہ کسی عورت کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ پھر ایک مسٹر ایوان کو فون آیا۔ وہ اس طرح بول رہا تھا جیسے قبر میں ہو۔ اوپر سے تم بھی تنگ کررہی ہو۔''

''سوری۔''

''آخر اس ساری بکواس کا جواز کیا ہے؟ کیا کہنا چاہتی ہو تم؟ کیا ہنری بے گناہ ہے؟'' پھر اس سے قبل کہ وہ کچھ اور کہتی فون بند ہوگیا۔

☆☆☆

وہ دوبارہ بستر پر پڑی سوچ رہی تھی۔ آخر سیلی کو کیا معلوم ہے کہ ہنری خطرے میں ہے؟ لیکن یہ

خطرہ کیا ہے؟ دولت کا یا جان کا؟ یا اسٹاک مارکیٹ کا؟ ہنری کو کمپنی سے صرف تنخواہ ملتی تھی۔ پھر ہنری ایک معزز آدمی تھا۔ اس کی ساری تنخواہ گھر پر ہی خرچ ہو جاتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ اس منحوس اپارٹمنٹ میں رہ رہی تھی۔ ان کے گھر کے بڑے اخراجات اس کا باپ جم کارنل اپنی جیب سے ادا کرتا تھا۔

ہنری کے پاس اتنی رقم نہ تھی کہ وہ اسٹاک وغیرہ کی سمت توجہ کر سکتا۔ لیونا کے پاس بڑی جائیداد موجود تھی مگر یہ جائیداد اس کی موت کے بعد ہی ہنری کو مل سکتی تھی۔ مگر سیلی کی کہانی بالکل بے معنی نہیں ہو سکتی تھی۔ ضرور اس میں کہیں نہ کہیں ہنری شامل تھا۔ اس کا دماغ سنسنانے لگا۔ سب باتیں دہشت زدہ کرنے والی تھیں۔ اس نے رومال ٹٹولا۔ ہنری کے بجائے اس نے اپنی حالت پر توجہ دی۔ اس کا سر آہستہ آہستہ چکرا رہا تھا۔ یکا یک فون نے بجنا شروع کر دیا۔

"کیا یہ پلازا کا نمبر نائن ڈبل ٹو سکس فائیو ہے؟"

"ہاں...... کون بول رہا ہے؟" لیونا نے پوچھا۔ اس کا لہجہ مرتعش سا تھا۔

"ہم ویسٹرن یونین سے بول رہے ہیں۔ مسز اسٹیونسن کے لیے پیغام ہے۔"

"میں مسز اسٹیونسن بول رہی ہوں۔"

"یہ ایک تار ہے۔ سن لیں۔

ڈارلنگ مجھے سخت افسوس ہے میں عجلت میں تمہیں بتا نہ سکا۔ میں بوسٹن کی میٹنگ میں تھا۔ اتوار کی صبح کو پلٹ رہا ہوں۔ فون کیا تھا مگر لائن انگیج تھی۔

ہنری۔"

دس بج کر پندرہ منٹ۔

وہ اب کسی گونگی عورت کی طرح بیٹھی تھی۔ تبھی اسے ایک بار پھر ٹرین کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ کھڑکیاں کپکپانے لگیں۔ وہ اٹھی اور ڈگمگاتی ہوئی کھڑکی کی سمت بڑھی۔ اس نے ایک ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھا اور باہر دیکھنے لگی۔ جہاں گاڑی پل سے گزر رہی تھی۔ گفتگو کے ٹکڑے اس کے ذہن میں ابھر رہے تھے۔ ہاں۔ میں اس وقت تک انتظار کروں گا جب تک ٹرین پل سے گزر نہیں جاتی۔ میرا موکل او کے کہہ رہا ہے۔ آخر یہ ہنری کہاں ہے؟ وہ ٹرین سے آرہا ہے۔ کراہتے ہوئے وہ پلٹی۔ اس نے فون پر ہاتھ ڈالا اور بے چینی سے نمبر ڈائل کیے۔

☆☆☆

"نہیں میڈم۔ ڈاکٹر صاحب موجود نہیں۔ کیا آپ اپنا نمبر دیں گی۔؟" ڈاکٹر کے آفس سے کہا گیا۔ اس نے فون نمبر اور پتا بتا دیا۔ اس سے کہا گیا۔

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب کو مطلع کر دیا جائے گا۔"

☆☆☆

ڈاکٹر الیگزینڈر نے اپنے ہاتھ کے پتے الٹ کر میز پر رکھ دیے اور پاس بیٹھی خوب صورت میزبان سے اس نے کہا۔ "میں ذرا ہسپتال فون کر کے معلوم کر لوں۔ میری ضرورت تو نہیں۔"

پھر وہ اٹھ گیا۔ اسے اس کی ساتھی عورت نے تحسینی نظروں سے دیکھا۔ وہ ایک وجیہہ آدمی تھا۔ درمیانی عمر کا وہ ڈاکٹر سے زیادہ فلمی ہیرو لگتا تھا۔ وہ اپنے پیشے میں بہت مشہور تھا اور بہت مہنگی فیس وصول کرتا تھا۔

ڈاکٹر کے فون کے جواب میں اسے بتایا گیا کہ کسی مسز اسٹیونسن نے فون کیا تھا۔ وہ خاصی پریشان تھیں وہ ہارٹ کی مریضہ ہیں۔

"کوئی اور بات؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں بس۔"

"ٹھیک ہے۔ اس نے فون بند کر دیا اور جیب سے ایک نوٹ بک نکالی۔ اس نے لیونا کا نمبر ڈائل کیا۔ پہلی ہی گھنٹی پر ریسیور اٹھا لیا گیا۔ ڈاکٹر کا نام سنتے ہی لیونا چیخی۔ "ڈاکٹر! میں بے حد خوف زدہ ہوں۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میں کانپ رہی ہوں۔"

"تم ہمت رکھو۔" ڈاکٹر نے دلاسا دیا۔

"تمہاری ملازمہ کہاں ہے؟"

''یہاں کوئی نہیں۔ میں اکیلی ہوں۔ تم فوراً آجاؤ۔ مجھے تمہاری بہت ضرورت ہے۔''

''مگر۔۔۔ میں آج نہیں آسکوں گا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''تم صرف اعصاب زدہ ہو رہی ہو اور بس۔ کچھ برومائڈ پی لو اور آرام کرو۔''

لیونا چیخی۔ ''میری طبیعت بے حد خراب ہے۔ تم کیسے ڈاکٹر ہو؟''

ڈاکٹر کے جبڑے بھنچ گئے۔ اس نے تیزی سے کہا۔

''تم میرے ساتھ اور اپنے شوہر کے ساتھ تعاون کرو۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''میں ہفتہ بھر قبل سب کچھ ہنری کو بتا چکا ہوں۔''

''کیا بتایا ہے اسے؟''

ڈاکٹر الیگزینڈر الجھن میں پڑ گیا۔ اس نے کہا۔ ''حیرت ہے کہ اس نے تمہیں کچھ نہیں بتایا۔''

''کون سی بات ہے آخر؟'' وہ چیخی۔

ڈاکٹر نے تذبذب سے کہا۔ ''تم سو جاؤ۔ صبح باتیں کریں گے۔''

''نہیں۔ تم ابھی بتاؤ مجھے۔ آخر کیا بات ہے۔''

ڈاکٹر الیگزینڈر نے شانے اچھالے۔ فون گھورا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے مسز اسٹیونسن! تم ذرا ہولڈ کرو۔ اس نے ریسیور میز پر رکھ دیا۔ دوسرے کمرے کی طرف چلا۔ جہاں اس کے ساتھی منتظر تھے۔ اس نے کہا۔ ''میں معافی چاہتا ہوں۔ مجھے ذرا تاخیر ہو سکتی ہے۔'' وہ دوبارہ کمرے میں لوٹا اس نے ریسیور اٹھایا۔

''مسز اسٹیونسن!'' اس نے کہا۔ تم دل کی مریضہ ہو تمہیں یہ مرض بچپن سے لاحق ہے۔ یہ بات ہنری کو شادی کے بعد معلوم ہوئی تھی۔'' رک کر اس نے کہا۔ ''مجھے ہنری سے معلوم ہوا تھا کہ تمہیں دورے غصے کی حالت میں پڑتا ہے۔ تمہیں پہلا دورہ اس وقت پڑا تھا جب ہنری نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ تمہارے باپ کی کمپنی کو چھوڑنے والا ہے۔''

''ہاں۔ وہ ترنگی آدمی ہے۔''

''نہیں۔ یہ ترنگ کی بات نہیں۔ اس کی جھڑپ تمہارے باپ سے ہوئی تھی۔ پھر تم بیمار ہو گئیں۔''

''ہاں۔''

''مجھے اندازہ ہوا تھا کہ جذباتیت تمہارے لیے مضر ہے۔ تمہارا شوہر جاننا چاہتا تھا کہ مستقبل میں تمہاری صحت کیا ہو سکتی ہے۔ فی الحال تو تم تقریباً مفلوج سی زندگی گزار رہی ہو۔''

''ہاں۔ مگر ہنری میرا خیال رکھتا ہے۔''

ڈاکٹر کھانسا۔ اس نے کہا۔ ''میں نے پوچھا تھا کیا وہ تمہیں چھوڑنا چاہتا ہے۔ مگر اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ مگر اس نے کہا کہ تمہاری جذباتیت کا ذمہ دار وہی ہے وہ نہ ہوتا تو تم صحت مند رہ سکتی تھیں۔''

''ڈاکٹر یہ تم کیا بتا رہے ہو؟'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔

''وہ سمجھ رہا تھا کہ کہیں تم اس طرح ختم ہی نہ ہو جاؤ۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ تمہارا دل خراب نہیں۔ مگر اعصابی تناؤ تمہارا ہنری کے سبب سے ہے۔''

''اچھا؟''

''ہاں۔ مسز اسٹیونس۔ تمہارا دل ٹھیک ہے۔ تمہاری بیمار جسمانی نہیں۔ ذہنی ہے۔''

''کیا میں پاگل ہوں؟'' وہ بھنا کر بولی۔

''برہمی کی ضرورت نہیں۔'' ڈاکٹر نے سکون سے کہا۔ ''تم یہ معاملہ اپنے شوہر سے ڈسکس کر سکتی ہو۔''

''مگر وہ نہیں ہے۔''

''وہ جب آجائے گا تب کر لینا۔'' ڈاکٹر نے کہا اور دوسری طرف ریسیور کو پٹخے جانے کی آواز سنی اور چکرا کر رہ گیا۔ پھر وہ پرخیال انداز میں چلتا ہوا اپنے ساتھیوں کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

لیونا جیسے پتھرا گئی تھی۔ وہ مسلسل فون کو گھورے جارہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے یہ آلہ اسے اذیت دینے کے لیے ایجاد ہوا تھا۔ اس کے اندر غصہ، انا، شکست اور خوف جیسے جذبے ابھر رہے تھے۔ وہ بے حد بیمار تھی اور یہ ڈاکٹر بے وقوف تھا۔ کہہ رہا تھا کہ اسے کوئی عارضہ نہیں اور ہنری کی ساری مصیبتوں کی جڑ وہی ہے۔ اس نے غصے سے سوچا مجھے اس کی شکایت ڈاکٹروں کی ایسوسی ایشن میں کرنی چاہیے۔

وہ ہنری کے بارے میں صریحاً جھوٹ بول رہا تھا۔ اس نے اپنے دل کو دبایا۔ جھوٹا۔۔۔!

ادھر فون پھر بجنے لگا۔

"میں کسی سے اب بات نہیں کروں گی۔"

مگر فون بجے جارہا تھا۔ پھر اسے کسی اور ٹرین کی آواز سنائی دی۔ جب وہ پل سے گزری تو مکان جیسے ہلنے لگا۔ اس کے بعد طویل خاموشی چھا گئی۔ فون بجے جارہا تھا۔ بالآخر اس نے ریسیور اٹھالیا۔

دس بج کر تیس منٹ۔

"ہیلو۔" اس نے لرزیدہ آواز میں کہا۔

"مسز اسٹیونس؟"

یہ وہی مردہ سی آواز تھی۔

"یس مسٹر ایوان۔"

"کیا مسٹر اسٹیونسن آگئے؟"

"نہیں۔ وہ کل آئیں گے۔" پھر وہ پھٹ پڑی۔

"مسٹر ایوان۔ آخر یہ کیا چکر ہے۔ یہ تم بار بار فون کیوں کررہے ہو؟"

ایوان نے معذرتی لہجے میں کہا۔ "میں معافی چاہتا ہوں۔ لیکن یہ لمحات مسٹر اسٹیونسن کے لیے بے حد اہم ہیں اگر تم انھیں بتا سکو۔"

"میں خود بے حد پریشان ہوں۔"

"دیکھو۔۔۔ مسٹر اسٹیونسن سے کہو۔" ایوان بولتا رہا۔ "ڈنہام والی ٹیرس جل چکی ہے۔ میں نے اسے خود جلایا ہے۔"

"کیا؟"

"اس سے کہنا میں مورینو پر بھروسہ نہیں کرسکتا تھا۔ مورینو۔ یہ نام یاد رکھنا اس نے ہماری مخبری پولیس میں کی ہے۔ یہ بھی گرفتار کرلیا گیا ہے۔ اب مزید رقم کے لیے ہاتھ پیر مارنے کی ضرورت نہیں۔"

"یہ مورینو کون ہے؟"

"ایوان نے سوال اَن سنا کردیا۔ تیسری بات اس سے کہنا کہ میں فرار ہوکر بچ گیا ہوں اور آپ کے مین ہٹن کے پتے پر ہوں۔ اگر وہ آدھی رات کے بعد فون کرنا چاہے تو مجھے کلڈونیا ڈبل ون ڈبل تھری پر فون کرلے اسے لکھ لو۔"

"مگر یہ سب معاملہ ہے کیا؟" وہ چیخی۔

"برائے کرم جو میں نے کہا وہ کرو۔"

"مسٹر ایوان..... میں بے حد بیمار ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ مجھے پہلے سے معلوم ہے یہ۔"

"کیا مطلب؟" لیونا نے غصے سے پوچھا۔

"یہ تمہارے شوہر کی غلطی ہے وہی مورد الزام گردانا جارہا ہے۔"

"تم صاف صاف کیوں نہیں بتاتے؟"

"میرا خیال ہے بتانا ہی ہوگا اس سے قبل کہ پولیس کو ساری باتیں معلوم ہوجائیں۔"

"پولیس؟"

"ہاں۔ تم پنسل کاغذ سنبھالو اور کچھ نام اور جگہیں لکھو۔ ضروری ہیں۔"

☆☆☆

"میں اب اس رات سے بات شروع کروں گا جب میری ملاقات پہلی بار مسٹر اسٹیونسن سے ہوئی تھی۔" ایوان نے ابتدا کی۔ "یہ دو اکتوبر کی بات ہے۔ مقام تھا سیسرو۔ ایلی نوے۔ جہاں تمہارے والد کی فیکٹری ہے۔ میں لیب میں کام کررہا تھا۔ مجھے دیر ہوچکی تھی۔ میں ایک فارمولے کا ریکارڈ دیکھ رہا تھا کہ کسی آواز نے مجھے چونکایا۔ میں نے دیکھا تو پتا چلا کہ کوئی دروازے کے شیشے سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ پھر ایک جوان العمر آدمی اندر آگیا۔

''گڈ ایوننگ'' اس نے سلام کیا اور بولا۔
''آج تمہیں دیر ہوگئی ہے۔ کیوں؟''
''ہاں مسٹر اسٹیونسن۔'' میں نے کہا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ میں عموماً دیر سے ہی جاتا ہوں۔ اس نے ادھر اُدھر ٹہلتے ہوئے کہا۔ میں یہاں آج پہلی بار آیا ہوں۔ مجھے اس کی آمد پر خوشی ہوئی تھی۔ میرے پاس بہت کم لوگ آتے تھے۔ پھر مسٹر اسٹیونسن تو مسٹر جم کارٹل کے داماد تھے۔ میری لیب جدید سامان سے لیس تھی۔ کمرا شاندار بنا ہوا تھا۔ کوئی چیز دیکھنا چاہتے ہو مسٹر اسٹیونسن، سے پوچھا۔ ''نہیں۔'' اس نے کہا۔ بس ذرا متجسس ہوں تم یہاں کیا کرتے ہو؟''
میں نے بتایا۔ میرا کام منشیات کی کیمسٹری سے متعلق ہے۔ منشیات ضرر رساں ہوتی ہیں۔ ان میں بعض ایسی بھی ہیں جو آدمی کے لیے رحمت ہوتی ہیں بہ شرط یہ کہ انہیں مناسب مقدار میں کھایا جائے۔ مسٹر کارٹل کی پروڈکٹس میں یہ شامل ہوتی ہیں۔
شاید اسے میری باتوں میں دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''مسٹر ایوان صاف صاف بتاؤ۔''
''یہاں لیب میں ہم خام افیون کو مختلف قسم کے اسکالائڈ میں تبدیل کرتے ہیں۔ افیون میں بیس اسکالائڈ ہوتے ہیں۔ مثلاً مورفین، کوڈین وغیرہ۔'' میں نے اسے بتایا تو اس نے پوچھا یہاں ان کی خاصی مقدار ضرور ہوگی۔ میں نے کہا۔ ہاں! یہ ایک ذمہ داری کا کام ہے۔ اس نے پوچھا تم ان کے ساتھ کیا کرتے ہو؟ میں نے بتایا کہ انہیں کارٹل کی پروڈکٹس میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس نے کہا میں یہ نہیں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ فیکٹری میں انہیں بھیجنے سے قبل تم ان کا کیا کرتے ہو۔ میں نے کہا یہ راز کی بات ہے۔ اس نے کہا ٹھیک ہے میں خود مسٹر کارٹل سے پوچھوں گا۔ میں نے کہا۔ تم ان کے داماد ہو۔ میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔ پھر میں سامنے کی دیوار کی طرف بڑھا، ٹیوب لائٹ کے پاس ایک مخفی بٹن تھا میں نے دبایا تو سامنے کی دیوار ہٹ گئی اس کے عقب میں ایک بڑی تجوری تھی۔ ہم اس میں منشیات اسٹور کرتے تھے۔
''تمہیں تو اس کی وجہ سے پریشانی ہوتی ہوگی؟'' اس نے پوچھا۔ میں نے کہا۔ بے شک مگر تجوری کا قفل ایک خاص قسم کے کمبی نیشن سے ہی کھلتا ہے۔ ''میں دوسری بات کہہ رہا ہوں۔'' مسٹر اسٹیونسن نے کہا۔ ''فرض کرو منشیات میں ان کی مقدار کی کوئی غلطی ہوجائے تو ادویات ضرر رساں بھی ہوسکتی ہیں۔''
اس کا امکان تقریباً نہیں۔ میں نے بتایا۔ ہمارے پاس مناسب پیمانے ہیں۔ میں یہاں پندرہ سال سے ہوں۔ آج تک کوئی ایسی غلطی نہیں ہوئی۔ پھر اس کے بعد وہ ایک بار میرا اس سے ملنا اور ہوا تھا۔ میں نے انہیں مختلف پروسیس دکھائے تھے۔ مسٹر اسٹیونسن نے اسے سمجھا بھی تھا کیونکہ ادویات سے انہیں تجربہ تھا۔''
''تم نے مجھے کوئی ایسی بات نہیں بتائی جو مجھے معلوم نہ ہو۔ ہنری متجسس آدمی ہے۔ ڈیڈی اسے پسند نہیں کرتے کہ کن سوئیاں لی جائیں سو ان دونوں میں اسی لیے کچھ اَن بن بھی رہتی ہے۔'' لیونا نے کہا تو مسٹر ایوان نے پھر کہا۔
''یہ ہماری ملاقات کے مہینے بھر بعد کی بات ہے۔ میں فیکٹری سے نکل کر بس کا انتظار کررہا تھا۔ یہ ایک سرد رات تھی۔ بارش بھی ہورہی تھی ایک سیاہ کار سیڈان میرے پاس آکر رکی۔ کسی نے پکارا۔ ''ایوان۔'' یہ مسٹر اسٹیونسن تھے۔ انہوں نے بلایا تو میں نے کہا۔ ''میں گھر جارہا ہوں۔''
انہوں نے کہا، میں تمہیں گھر پہنچادوں گا۔ میں نے کار کی تعریف کی تو انہوں نے کہا کہ یہ میری بیوی کی کار ہے۔ میں نے کہا۔ میں کار نہیں رکھتا۔ مجھے تو گھوڑا گاڑی پسند ہے۔ پھر میرے اس کے درمیان گھوڑوں کی بات چل نکلی۔ میں نے کہا میرا بس چلتا تو میں بہت سے گھوڑے پالتا۔ مسٹر اسٹیونسن نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا ہاں۔ مجھے گھوڑوں سے بڑی انسیت ہے۔ میرے پاس رقم

ہوتی تو میں انگلینڈ میں ایک اصطبل بناتا۔
انگلینڈ میں؟ انہوں نے پوچھا تو میں نے کہا
ہاں میں انگلینڈ میں رہنا چاہتا ہوں۔ مسٹر اسٹیونسن
نے کہا، خواہش کوئی عیب نہیں۔ عیب اس میں ہے کہ
خواہش تو کرے عمل نہ کرے۔ میں نے کہا۔ مسٹر یہ
معاملہ قسمت کا ہے۔ یہ آدمی کے مقدر میں نہیں ہوتا
کہ وہ اپنی خواہش پوری کر سکے۔ ''یہ بات تو ہے۔''
مسٹر اسٹیونسن نے کہا۔ تم صرف میرے سسر کے لیے
ہی کام کرتے ہو۔ اگر تم اسی میں ہڈیاں رگڑتے رہے
تو تمہارے خواب پورے نہیں ہوں گے۔ مسٹر
اسٹیونسن کے تبصرے نے مجھے ڈرا دیا۔ میں نے کھسیا
کر کہا۔ اس تنخواہ میں گھوڑے کہاں سے آسکتے ہیں۔
جواب میں مسٹر اسٹیونسن نے ایسی بات کہی کہ میں
چکرا کر رہ گیا۔ ایوان میرے اور تمہارے اندر کئی
باتیں یکساں ہیں۔''
''خوب۔'' لیونا نے سوچا۔ ''کیا بات ہے
کہاں ہنری، کہاں یہ قہر زدہ آواز والا ایوان۔ سمجھ میں
نہیں آتا ہنری نے اس سے تعلق کیوں پیدا کیا۔''
''میں نے جلدی سے تردید کی اور کہا، ''کہاں
آپ اور کہاں میں۔'' لیونا کو ایوان کی آواز سنائی
دی۔ جب میں اپنے مکان کے دروازے پر پہنچا اور
اترنے لگا تو مسٹر اسٹیونسن نے میرے کاندھے پر
ہاتھ دھرا اور کہا۔ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔
اس پر عمل کر کے تمہیں انگلینڈ میں گھر مل سکتا ہے۔ تم
گھوڑے بھی خرید سکو گے۔ رہی میری بات تو تم اس
کی پروا نہ کرو۔ بس یہ بتا دو تمہیں میرا آئیڈیا پسند ہے
یا نہیں۔ وہ اب مسکرا بھی نہیں رہا تھا۔ اس کی نظریں
میرے چہرے پر تھیں اور ہاتھ کاندھے پر۔ میں نے
کہا کیسا آئیڈیا؟ اس نے کہا یہ میں تمہارے گھر اور
گھوڑوں کے لیے کہہ رہا ہوں۔ تمہیں چند غلطیاں
کرنی ہوں گی۔ ''غلطیاں۔۔۔'' میں نے حیرت
سے پوچھا۔ ہاں۔ اس نے کہا۔ کارٹل پروڈکٹس میں
نشہ آور اجزا ملانے کی مقدار میں تھوڑی سی غلطیاں
کرنی ہوں گی۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ میرے
خدا۔۔۔ مسٹر اسٹیونسن یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس
نے کہا یہ راز کی بات ہے۔ میرے اور تمہارے
درمیان۔ اس سے کوئی نقصان نہیں کیونکہ تمہیں مقدار
بڑھانی نہیں کم کرنی ہوگی۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ اس
طرح جو نشہ آور اجزا تم بچالو گے ان کی قیمت سے
تمہیں انگلینڈ میں گھر اور گھوڑے مل سکتے ہیں۔''
''نہیں، نہیں۔'' لیونا اندر ہی اندر چیخ پڑی۔ یہ
آدمی بکواس کر رہا ہے۔ مجھے ورغلا رہا ہے۔
لیکن۔۔۔ ہوسکتا ہے ہنری نے کچھ کہا ہو۔ مس
جینگ نے بھی تو بتایا ہے کہ ایوان کئی بار ہنری سے مل
چکا ہے۔
''مسٹر اسٹیونسن کی تجویز میرے سر پر لٹھ کی
طرح پڑی تھی۔ میں نے پریشانی سے کہا۔ میں نہیں
سمجھتا کہ یہ آسانی سے ہوسکے گا۔'' لیونا کو ایوان کی
آواز سنائی دی۔ ''مسٹر اسٹیونسن نے تمسخر سے کہا۔
کسی کیمسٹ کے لیے اس میں کوئی مشکل نہیں اور پھر
تم جیسے اعلا کیمسٹ کے لیے۔۔۔'' مسٹر اسٹیونسن کی
تعریف نے مجھے پھلا دیا۔ مسٹر اسٹیونسن نے مزید کہا
کہا کہ انہوں نے میرا ریکارڈ دیکھا ہے اور وہ سمجھتے
ہیں کہ مجھے سستے داموں خریدا گیا ہے۔ یہ بڑی
ترغیب تھی۔ مجھے تذبذب میں دیکھ کر مسٹر اسٹیونسن
نے کہا۔ ایوان! کیا سوچ رہے ہو۔ احمق مت بنو۔
میں کسی اور سے بھی یہ کام کروالوں گا مگر میں نے
تمہیں پہلا موقع دیا ہے۔ میرا منہ کھل گیا۔ کسی اور
سے بات کر لی ہے؟ میں نے کہا۔ یہ کیا کیا تم نے؟ یہ
کوئی الجھن کی بات نہیں۔ مسٹر اسٹیونسن نے کہا۔
دیکھو مال تو بیچنا ہی ہوتا ہے یہ کام کوئی اور
کرلے گا۔ میں نے جس آدمی سے بات کی ہے اسے
مال بیچنا آتا ہے۔ اس کا نام مورینو ہے۔ وہ سارا مال
اٹھائے گا۔ پھر ہم اس کے تین حصے کریں گے۔''
پاگل پن۔ لیونا نے سوچا۔ یہ ایوان پاگل لگتا
ہے۔ یہ کیسی فلمی باتیں کر رہا ہے۔
ایوان بول رہا تھا۔ ''مسٹر اسٹیونسن کی تجویز
میرے لیے حیران کن تھی۔ مجھے اس کی اسکیم پر بے

حد حیرت تھی۔ ''مسٹر کیا تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔ یا میرا امتحان لے رہے ہو؟''

میری بات پر اسٹیونسن کے نقوش بگڑ گئے۔ اس نے کہا مسٹر ایوان! تمہیں گھر اور گھوڑا چاہیے یا نہیں لیکن میری بھی خواہشات ہیں اور میں انہیں پورا کروں گا۔ چلو مجھے گھر میں لے چلو تا کہ ہم اس موضوع پر بات کر سکیں۔ ایک سیکنڈ۔۔۔ میں نے کہا۔ اگر ہم پکڑے گئے تو؟ اس نے کہا ہم نہیں پکڑے جائیں گے۔ تم اندر چلو تو بتاؤں گا۔''

مسٹر اسٹیونسن کا خیال درست تھا۔ ہم پکڑے نہیں گئے۔ ایک سال تک کام ہوتا رہا۔ کسی کو معلوم نہیں ہوا۔ میں نے ادویات میں نشئی اجزا کی مقدار کم کر دی تھی۔ یہ کام میں رات میں کرتا تھا۔ جب اسٹاف چلا جاتا تھا۔ بچی ہوئی نشئی اشیا کو میں مسٹر اسٹیونسن کے حوالے کر دیتا تھا اور یہ مال مورینو تک پہنچ جاتا تھا۔ میں نے مورینو کو نہیں دیکھا۔ ایک سال کے عرصے ہی میں میرے پاس پندرہ ہزار ڈالر آ چکے تھے۔ یہ معقول رقم تھی اور میری خواہشات کے سلسلے میں معاون ہو سکتی تھی۔ پھر ایک روز کارٹل کمپنی سے اطلاع ملی کہ میرا تبادلہ بیارتو کہ علاقے میں کر دیا گیا ہے۔ جہاں ہمارا ایک پلانٹ نیو جرسی میں تھا۔ وہاں بھی میرے پاس یہی کام تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ میرا تبادلہ کیوں کیا گیا ہے۔ میں نے مسٹر اسٹیونسن سے ملاقات کی اور انہیں بتایا۔ اس نے کہا، کیا تم نے خود تبادلہ کرایا ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ میں تو اپ سیٹ ہو رہا ہوں۔ اس نے کہا تشویش کی ضرورت نہیں، ایسا ہوتا تو پولیس پکڑ چکی ہوتی۔ میں تبادلے کے بارے میں پتا کرتا ہوں۔ میں نے کہا احتیاطاً اب ہمیں اس جگہ کام بند کر دینا چاہیے۔ مسٹر اسٹیونسن نے کہا۔ وہ کیوں؟ میں نے کہا میں انگلینڈ جا سکتا ہوں اب؟ مگر مسٹر اسٹیونسن نے کڑے لہجے میں کہا۔ نہیں۔ تمہیں میرے مطابق عمل کرنا ہوگا۔ کام اسی وقت رکے گا جب میں چاہوں گا۔ تم تھوڑی سی رقم سے خوش ہو گئے ہو مگر میں نہیں۔ مجھے ابھی بہت کچھ چاہیے۔ ہمیں اپنی رفتار تیز کرنا ہوگی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے کہا۔ تمہارے تبادلے نے مجھے سمجھایا ہے کہ رفتار بڑھانا ہوگی۔ میں نے اسے سمجھایا مگر اس نے نہیں مانا تو میں نے پوچھا، آیا یہ مورینو قابل اعتماد آدمی ہے۔ مورینو کے نام پر مسٹر اسٹیونسن نے منہ بنایا اور بتایا کہ یہ آدمی کبھی کسی چھوٹے سے گینگ کا سربراہ تھا۔ میرے مال کا بڑا حصہ یہ آدمی ہضم کر رہا ہے۔ وہ کھڑکی تک گیا۔ اس نے کہا، میں اس آدمی کو تصویر سے باہر کرنے کی سوچ رہا ہوں۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مسٹر اسٹیونسن کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ جناب یہ شخص مورینو جس قبیل کا ہے اسے مشکل سے الگ کیا جا سکے گا۔ مسٹر اسٹیونسن نے کہا۔ میں اس سے نمٹ لوں گا۔ پھر وہ میرے پاس آ کر بولا۔ میں نے اس عرصے میں دیکھ لیا ہے منشیات کی سپلائی کا حلقہ بہت بڑا ہے۔ خود مورینو دوسروں سے رابطہ کرتا ہے۔ ہم یہاں کے معاملات ختم کر دیں گے اور مورینو سے رابطہ توڑ لیں گے۔ ہم نیو جرسی کے پلانٹ سے کام شروع کریں گے اور نیویارک کی مارکیٹ پکڑیں گے۔ ہمیں زیادہ نفع ہوگا۔ میں نے کہ مسٹر اسٹیونسن تم خریداروں سے رابطہ کرو گے؟ یہ ایک بہت پُرخطر کام ہوگا۔ مسٹر اسٹیونسن نے کہا۔ تم اس کی فکر مت کرو۔ میرا بچپن خرید و فروخت میں گزرا ہے۔ مجھے ایک بار پکڑ لیا گیا تھا مگر کسی نے مجھے بچا لیا تھا۔ غلطی میری تھی اور میں ہوشیار ہو چکا ہوں۔ بہت سے خریدار ملیں گے۔ یہ بزنس اب صرف میرا اور تمہارا ہوگا۔''

لیونا کو ساری باتیں بے حد عجیب لگ رہی تھیں۔ اسے اب اس میں بہرحال غلط بیانی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اسے ایوان کی آواز سنائی دی۔

''ڈیڑھ ماہ بعد ہم نے اسٹیشن آئی لینڈ سے اپنے بزنس کا دوبارہ آغاز کیا۔ ہمارا ہیڈ کوارٹر ڈنہام ٹیرس پر ہے، میں نے یہ عمارت خود خریدی تھی۔ پھر میں نے چند افراد کو ملازم رکھ لیا۔ ان کا خیال تھا کہ

میں کوئی سرکاری آدمی ہوں۔ ایک لڑکا دفتر کی صفائی کرتا تھا، ایک لانچ چلاتا تھا کہ میں سمندری راستے سے آتا جاتا تھا۔ یہ جگہ ڈسٹری بیوشن پوائنٹ تھی۔ ہمارا ویئر ہاؤس دوسری جگہ تھا۔ جو ایک کمرا تھا۔ میرا مکان کرائے کا تھا اور میں شرفا کی بستی میں رہتا تھا۔ میں کئی بار آئی لینڈ جاتا تھا۔ جہاں مسٹر اسٹیونسن کے گاہک آتے تھے۔ ان کی شناخت کے لیے کوڈ تھے۔ یہ ڈیلر ہوتے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے عورتیں بھی۔ ہمارے بینک میں رقمیں بڑھ رہی تھیں مگر مسٹر اسٹیونسن مطمئن نہ تھے۔ ایک روز انہوں نے اپنا تبادلہ بھی نیویارک کرالیا تا کہ زیادہ سے زیادہ مال نکال سکیں۔ وہ یہ سرمایہ اسٹاک مارکیٹ میں لگا رہے تھے۔ یہ ان کی غلطی تھی۔"

گویا سیلی نے بروکر والی بات ٹھیک بتائی تھی۔ لیونا نے سوچا۔ اور وہ آدمی فری مین۔۔۔ گویا ہنری کو نقصانات ہوئے تھے۔ اس طرح تو لگتا تھا کہ یہ ایوان سب کچھ درست بتا رہا ہے۔

"یہ ساری باتیں میرے لیے پریشان کن تھیں۔" اسے ایوان کی آواز سنائی دی۔ "مجھے راستہ نہیں مل رہا تھا۔ میں اب مسٹر اسٹیونسن سے جان چھڑانا چاہتا تھا مگر ان کے اندر لالچ اور انا در آئی تھی۔ کام کی بندش پر وہ تیار نہ تھے کیونکہ وہ اپنے نقصانات کو پورا کرنا چاہتے تھے۔ میں نے ان سے کہا آخر تم اتنی رقم اسٹاک مارکیٹ میں کیوں پھنسا رہے ہو؟ انہوں نے کہا تا کہ میری دولت جلدی سے بڑھ سکے اور کارٹل کو میرے اوپر شبہ بھی نہیں ہوگا۔ جیسا کہ تم جانتی ہو تمہارے شوہر خاصے مغرور شخص ہیں۔ وہ کم محنت سے زیادہ دولت کمانے کے متمنی بھی ہیں۔ آج میں یہ بات کہہ سکتا ہوں کیونکہ میں نے ان سے پیچھا چھڑا لیا ہے۔ بلاشبہ خود میرا کردار خراب رہا ہے لیکن میں ایک بوڑھا آدمی ہوں جبکہ مسٹر اسٹیونسن کے پاس خاصا وقت ہے۔ میں برا ہوں مگر مسٹر اسٹیونسن خطرناک ہیں۔ خیر۔۔۔ اس کہانی کا آخری باب یوں ہے کہ مسٹر اسٹیونسن جب اپنی کھپت بڑھانے کا پروگرام بنا رہے تھے ہمارے ہاں ایک ملاقاتی آیا۔"

دس بج کر چالیس منٹ۔۔۔

"ایک شام مجھے ڈنہام ٹیرس پہ مسٹر اسٹیونسن سے ملنا تھا۔ میں ذرا دیر سے پہنچا جب میں ملاقاتی کمرے میں گیا تو وہ وہاں موجود تھے اور لیمپ کی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ ان کا رنگ اڑا ہوا ہے۔ پہلے انہوں نے دروازے کی سمت دیکھا جسے میں نے کھولا تھا۔ جب میں اندر گیا اور دروازہ بند کیا تب مجھے وہ آدمی نظر آیا جو کونے میں کھڑا تھا۔ میں دھندلی روشنی میں اسے درست طرح نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ وہ کوئی اجنبی تھا۔ معمولی سی قد و قامت کا۔ تاہم اس کا لباس اچھا تھا۔ اس کے نقوش کرخت سے تھے۔ وہ کسی سانپ کی طرح مجھے گھور رہا تھا۔ "یہ کون ہے؟" اس نے مسٹر اسٹیونسن سے میرے بارے میں پوچھا۔

مسٹر اسٹیونسن نے تعارف کرایا اور کہا مسٹر ایوان! یہ مورینو ہیں، ہمارے پرانے ساتھی۔

مورینو نے مجھے بٹھا کر خود بھی نشست سنبھال لی۔

"مورینو ہم سے کچھ ناخوش ہیں۔" مسٹر اسٹیونسن نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔ "اسے رنج ہے کہ ہم نے اسے اپنے اندر سے کیوں نکال دیا۔" میں نے مورینو کو دیکھا وہ بے تاثر بیٹھا ہوا تھا۔ مسٹر اسٹیونسن نے کہا۔ میں نے اسے دوبارہ ساتھ لینے سے معذرت کر لی ہے۔

یکایک مورینو نے بولنا شروع کر دیا۔ اس کا لہجہ نامانوس سا تھا۔ تاہم بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ "بس، بس، اب میری سنو۔ شاید تمہیں عقل آجائے مسٹر اسٹیونسن! یہ ترکاری کا بزنس نہیں کہ اسے ہما شما چلا سکے۔ تم نے آرام سے مجھے نکال دیا ہے، کیا خیال ہے تمہارا میں بالکل احمق ہوں، آنکھیں نہیں رکھتا۔" مسٹر اسٹیونسن نے کہا۔ "میں سن رہا ہوں۔" اس نے کہا۔ "سب جانتے ہیں تم کیا کر رہے ہو، تمہیں بھی کا ختم کر دیا جاتا وہ تو میں تھا کہ رکاوٹ بن گیا تھا۔

اصل آدمی تو پروفیسر ہے۔ تمہاری ضرورت کسی کو نہ تھی۔ اب بھی میرا اشتراک تمہیں مل سکتا ہے اگر ساتھ ملالو۔'' مسٹر اسٹیونسن نے مسکرانا بند کردیا اور کہا۔ ''نہیں مورینو ہمیں اب تمہاری ضرورت نہیں۔ تم اپنے کو بس شکا گو تک ہی محدود رکھو۔'' اس پر مورینو بولا۔ ''اچھا۔۔۔ تم واقعی کم عقل آدمی ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ میں کچھ نہیں کرسکتا۔'' مسٹر اسٹیونسن نے کہا۔ ''تم کیا کرو گے؟'' اس نے کہا۔ ''میں راز طشت از بام کر دوں گا۔'' اس کی دھمکی پر مسٹر اسٹیونسن نے کہا۔ تم ایسا نہیں کرسکتے۔ ورنہ تم خود بھی پھنسو گے۔'' مورینو مسکرایا، اس نے کہا۔ ''واقعی تمہارے پاس عقل کم ہے۔ ارے میں تو یہ کام خود کو سامنے لائے بغیر بھی کرسکتا ہوں۔ پھر وہ ہوا جس کی توقع نہ تھی۔

مسٹر اسٹیونسن اچھلے تھے۔ انہوں نے مورینو کو دبالیا۔ لگتا تھا وہ اس کا گلا دبا کر ماردیں گے لیکن میرا اندازہ درست تھا۔ مورینو جیسے لوگ ترنوالہ نہیں ہوتے۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور دو مضبوط غنڈے اندر آگھسے۔ انہوں نے مسٹر اسٹیونسن پر حملہ کردیا۔ وہ ان کی ہڈی پسلی توڑ دیتے اگر مورینو نے غنڈوں کو روکا نہ ہوتا۔ اس نے کہا۔ ''اسے چھوڑ دو میں اس معاملے میں زیادہ ملوث نہیں ہونا چاہتا۔ جب غنڈے چلے گئے تب مورینو مسٹر اسٹیونسن کی طرف گیا اور بولا۔ ''سمجھ میں آگئی نا۔''

مسٹر اسٹیونسن نے بے چارگی سے سر ہلایا۔

''ٹھیک۔'' مورینو نے کہا۔ ''کام جاری رہے گا، میں تمہارا اور پروفیسر کا خیال رکھوں گا۔'' اس نے میری طرف مکاری سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''حصہ ففٹی ففٹی ہوگا۔ آدھا میرا اور باقی میں تم دونوں۔''

''یہ تو زیادتی ہے۔'' مسٹر اسٹیونسن ہکلائے۔

''یہی ٹھیک ہے۔'' مورینو نے کہا۔ ''گڑبڑ کرو گے تو میں بقیہ حصہ بھی پروفیسر کو دے دوں گا۔ وہ مجھ سے بولا۔ ''ٹھیک ہے نا؟'' بالآخر اس نے کہا اب صرف ایک معاملہ رہتا ہے۔ ''پچاس ہزار ڈالر کا۔''

''وہ کیا؟'' مسٹر اسٹیونسن نے پوچھا۔

''مجھے بزنس سے الگ کرنے سے آج تک کے منافع میں میرا حصہ۔۔۔؟''

''تمہارا دماغ خراب ہے۔'' مسٹر اسٹیونسن نے غصے سے کہا۔

''میں کچھ نہیں جانتا۔'' مورینو نے کہا۔ ''تم کو ایک ماہ کی مہلت ہے۔ رقم کا بندوبست کردو۔''

''اتنی رقم کہاں سے آئے گی۔'' مسٹر اسٹیونسن نے کہا۔ ''میری بیوی۔۔۔''

مورینو نے ان کی بات کاٹ دی۔

''اسے چھوڑو۔'' اس نے کہا۔ ''اس سے تمہیں کوئی کوڑی بھی نہیں ملے گی۔''

''تم میری بات نہیں سمجھے۔'' مسٹر اسٹیونسن نے کہا۔

''وہ بیمار ہے۔ اس کی موت پر مجھے ایک بڑی جائیداد ملے گی اس کے لیے تمہیں کچھ انتظار کرنا ہوگا۔''

''میرے پاس کسی کے مرنے کا انتظار یا وقت نہیں۔'' مورینو نے کہا۔

''تو پھر یہ رقم میرے بس کی نہیں۔'' مسٹر اسٹیونسن نے کہا۔

''دیکھو میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔'' مورینو نے نرمی سے کہا۔ ''تم میرے پاس آنا پھر بتاؤں گا۔ ان باتوں کے بعد سے نہ تو میں نے مسٹر اسٹیونسن کو دیکھا ہے نہ مورینو کو۔ میں نے ساری باتیں تمہیں بتادی ہیں۔

لیونا کے ہاتھ میں فون لرز رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ ''مگر میرا شوہر کہاں ہے؟''

''مجھے معلوم نہیں۔ تم کلینڈرینا کے نمبر سے معلوم کرو۔''

''کون سا نمبر؟''

''وہی جو میں نے تمہیں پیغام کے ساتھ دیا تھا۔

"مجھے کچھ یاد نہیں۔" وہ عجلت سے بولی۔

"میں دوہراتا ہوں، پیغام دینا ڈنہام ٹیرس آج جل چکی ہے۔ نمبر دو۔۔۔ ایوان بچ نکلا ہے۔ نمبر تین۔۔۔ موریینو پکڑا گیا ہے۔ نمبر چار۔۔۔ رقم کے لیے کوشش کی ضرورت نہیں۔ تم مجھے کلیڈونیا کا نمبر بتاؤ۔" لیونا چیخی۔

"نمبر پانچ۔۔۔ ایوان مین ہٹن کے پتے پر ہے۔ وہ کلیڈونیا جا رہا ہے۔ نمبر ہے فائیو ڈبل ون ڈبل تھری۔"

لیونا نے نمبر کاغذ پر لکھ لیا۔

"اچھا مسز اب رخصت۔" ایوان نے فون بند کر دیا۔

کچھ توقف کے بعد مشینی انداز سے اس نے کلیڈونیا کا نمبر ڈائل کیا۔ کسی نے جواب دیا۔ یہ ایک آدمی کی آواز تھی۔

"اوہ۔" لیونا چیخی۔ "کیا مسٹر اسٹیونسن ہیں؟"

"تم کون؟"

"میں ان کی وائف ہوں۔ مجھے یہ نمبر مسٹر ایوان سے ملا ہے۔"

"ایک منٹ۔۔۔"

سناٹا سا چھا گیا۔ پھر کہیں سے سیٹی کی آواز ابھری۔ یہ کسی کانسٹیبل نے بجائی تھی۔ یکایک فون والا آدمی آ گیا۔

"نہیں میڈم! وہ یہاں نہیں ہیں۔"

"کیا میرا میسج انہیں مل سکتا ہے؟"

"نہیں میڈم، ہم یہ نہیں کرتے۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟ وہ تمہارے یہاں متوقع ہے۔ تم پیغام دے سکتے ہو۔"

"میڈم۔۔۔!" آدمی نے حیرت زدہ آواز میں کہا۔ "کیا تمہیں نہیں معلوم کہ یہ جگہ سرکاری مردہ خانہ ہے۔"

☆☆☆

لیونا اب بستر پر سیدھی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ہونقی سی تھی۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا وہ کسی بھیانک خواب جیسا تھا۔ اس کی دہشت بڑھ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی آخر ہنری کے آفس میں اس کی عدم موجودگی میں اس کا فون کون استعمال کر رہا تھا۔ وہ مصروف کیوں تھا؟ آخر اس لائن پر یہ اوور لیپنگ کیوں ہوئی تھی؟ پھر اسے دو قاتلوں کی آواز سنائی دی تھی۔ اس کے علاوہ سیلی کی کہانی بھی تھی۔

اس کے مطابق سرکاری سطح پر ہنری کو تلاش کیا جا رہا تھا۔ ایوان کی باتوں سے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اسے رقم کی جستجو تھی مگر یہ رقم اسے کہیں نہیں مل سکتی تھی۔ وہ اس کے لیے اس کے باپ سے بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایک ہی بات سامنے تھی۔ جس کے ذریعے وہ رقم کا بندوبست کر سکتا تھا۔ اس کی طرف ایوان نے اشارہ بھی کر دیا تھا۔ اسے قاتلوں کی باتیں یاد آنے لگیں۔

"ہاں ہاں میں ٹرین کی آمد کا انتظار کروں گا۔ یہ کام اس شور میں کر لیا جائے گا۔"

اسے پھر سے دہشت نے آ گھیرا۔ اس نے جلدی آپریٹر کو ڈائل کیا۔ "جی۔"

"پولیس سے بات کراؤ۔" اس نے کہا۔

"سیونتھ پریسنٹ۔"

ذرا سی دیر میں اسے سارجنٹ ڈیفی کی آواز سنائی دی۔

"میں مسز اسٹیونسن بول رہی ہوں۔ تم سے کچھ دیر پہلے بات کی تھی۔"

"مجھے یاد ہے۔"

"تم نے اس ضمن میں کیا کیا؟"

"میں نے لکھ لیا ہے۔ کچھ ہوا تو حرکت میں آئیں گے۔"

"خوب۔۔۔ جب کچھ ہوگا تب حرکت میں آؤ گے؟"

"میں نے کہا نا کہ اطلاع نامکمل سی ہے۔"

"لیکن۔۔۔" وہ رک گئی۔ وہ کچھ بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ معاملہ کچھ اور نکلتا تو اطلاع اس کے خلاف جا نکلتی۔

"کم از کم تمہیں ریڈیو کار تو بھیجنی چاہیے تھی۔"

اس نے کہا۔

''میں نے ہیڈ کوارٹر کو بتا دیا ہے۔ وہ جو چاہے کریں۔۔۔'' اس نے فون بند کر دیا۔ اب کوئی دوسرا راستہ ضروری تھا۔ مگر کون سا؟ کیوں نہ کسی سراغ رساں ایجنسی سے بات کروں۔ وہ ایک آدمی متعین کر دیں گے۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ گیارہ بج رہے تھے۔

اس نے جلدی سے آپریٹر کا نمبر گھمایا۔ ''کسی سراغ رساں ایجنسی سے بات کراؤ۔''

''میڈم! ان کے نام ڈائریکٹر میں ہیں۔''

''میرے پاس ڈائریکٹری نہیں ہے۔ تم فوراً ملاؤ۔''

''میں تمہارا رابطہ انفارمیشن سے کرائے دیتا ہوں۔''

''دیکھو، میں سخت مشکل میں ہوں، میں مر سکتی ہوں۔''

''تم کسی ہسپتال سے بات کرو۔''

''کس سے؟''

''کسی سے بھی۔''

''ٹھیک ہے۔''

''ایک منٹ۔۔۔''

گیارہ بجے۔۔۔

انتظار کے لمحات پریشان کن تھے۔ فون جاگا تو اس نے کسی عورت سے کہا۔ ''بیلی ہسپتال۔''

''تم رجسٹری سے بات کراؤ۔''

''کس لیے؟''

''مجھے ایک نرس چاہیے فوراً، رات بھر کے لیے۔''

''کیس کیا ہے؟''

''میں مفلوج ہوں۔ مجھے کسی ساتھی کی ضرورت ہے۔''

''کیا یہ کال کسی ڈاکٹر کی ہدایت پر کی گئی ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے بھنا کر کہا۔ ''میں رقم ادا کر دوں گی۔''

''مگر میڈم! یہ ایک سرکاری ہسپتال ہے۔ کسی ڈاکٹر کی ہدایت کے بغیر کوئی کہیں نہیں جا سکتا۔ آپ کسی پرائیویٹ ہسپتال سے بات کریں۔''

''مجھے کسی کا پتا نہیں معلوم۔'' وہ چیخی۔

''آپ ٹو ون زیرو تھری سیون پر بات کریں۔''

اس نے عجلت میں یہ نمبر ڈائل کیا۔

''مجھے ایک نرس درکار ہے۔'' جواب پر وہ چلائی۔

''نام؟''

''مسز اسٹیونسن۔''

''پتا۔۔۔''

''فورٹی تھری سوٹن پیلس، یہ کافی ہے؟''

''کال کیا کسی ڈاکٹر کی ہدایت پر کی گئی ہے؟''

''نہیں۔'' وہ برہم ہو گئی۔ ''میں یہاں اجنبی ہوں، مفلوج ہوں، تنہا ہوں۔''

''محترمہ! نرسیں آج کل کم ہی ملتی ہیں جب تک ڈاکٹر نہ کہے۔''

''لیکن میرا معاملہ سیریس ہے۔ کچھ کریں۔۔۔''

''ٹھیک ہے میں مس فلپ کے لیے پیغام چھوڑ دیتی ہوں۔ وہ جونہی آئی ہم اسے آپ کے ہاں بھیجنے کی کوشش کریں گے۔''

''وہ کب آئے گی؟''

''یہی کوئی ساڑھے گیارہ تک یا۔۔۔''

اس کے ساتھ اس نے کلک کی آواز سنی۔ یہ ایک معمولی سی کلک تھی جو فون میں سے ابھری تھی۔

''یہ کیسی آواز تھی؟''

''آواز۔۔۔؟ میں نے تو نہیں سنی۔''

''یہ کلک۔۔۔ میں نے سنی تھی۔ لگتا ہے نچلی منزل پر کسی نے ایکسٹینشن فون کا ریسیور اٹھایا ہو۔'' اس نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ ''شاید مکان کے اندر کوئی ہے۔ نچلے حصے میں یا کچن میں۔۔۔ وہ۔۔۔'' خوف نے اسے جکڑ لیا۔ اس نے عجلت میں

فون رکھ دیا۔ اور آس پاس کے سناٹے کو سننے لگی۔ معاً اسے فرش پر سے ابھرتی کوئی بہت ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

''کون۔۔۔ کون ہے؟'' وہ دہشت سے چیخی۔

اس وقت اس کی حالت کسی بھاگتے جانور کی سی تھی جس کے عقب میں شکاری لگے ہوئے تھے۔ وہ دروازے پر نگاہ جمائے کسی کی منتظر تھی۔ معاً وہ گلا پھاڑ کر دہاڑی۔ ''ہنری۔۔۔ ہنری۔۔۔''

اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ دھمک غائب ہو چکی تھی۔ وہ بستر سے اٹھ گئی۔ وہ منجمد سی ہو رہی تھی۔ خوف نے اسے گھیر رکھا تھا۔ وہ وحشت سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یکا یک سڑک پر کوئی ٹرک گرجتا ہوا گزرا۔ پتا چلا کہ اسے چاپ کہاں سے سنائی دے رہی تھی۔ حقیقتاً ونڈو کا بھاری پردہ ہوا سے یہ آواز پیدا کر رہا تھا۔

ذرا کی ذرا اس کا دل ٹھہر گیا۔ اسے ڈاکٹر کی بات یاد آئی۔ واقعی اس کا دل خراب نہیں تھا۔ کچھ خوش ہوئی۔ آج رات اگر میں زندہ رہ گئی تو بستر پر اس طرح پڑی نہیں رہوں گی۔ میں خود کو طاقت ور بناؤں گی مگر فی الوقت تو اس کمرے میں خطرہ پھیلا ہوا تھا۔ وہ اس سے نکلنا چاہتی تھی۔ بلا ارادہ اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا پھر سوچا۔ آخر میں کس سے بات کروں؟ کون مدد کر سکتا ہے؟ وہ جو نیچے ہے، خاموشی سے اس کی باتیں پھر سنے گا۔ وہ اس کی موجودگی میں کیسے یہاں سے نکل سکتی ہے؟

وہ دوبارہ بستر پر گر گئی لیکن ہمیشہ کی طرح سناٹا پھر ٹوٹا، فون بجا تھا۔ اس نے جلدی سے ریسیور اٹھایا۔

''ہیلو۔۔۔'' ہکلائی۔

''اسے آپریٹر کی آواز سنائی دی۔ ''مسز اسٹیونسن کے لیے نیو ہیون سے کال آئی ہے۔''

''اچھا۔۔۔'' لیونا نے بات کی۔

''یہ کال مسٹر ہنری اسٹیونسن کی ہے۔''

لیونا پر جیسے بجلی گری۔

''اچھا تو یہ فون ہنری کا ہے؟''

''آپ بات کریں گی؟''

اسے لگا جیسے یہ سب کچھ کوئی خواب ہے۔ بھلا ہنری اس کا دشمن کیسے ہو سکتا تھا؟ لیکن یہ باتیں خواب نہ تھیں۔

''ہاں، ہاں۔ بات کراؤ۔''

وہ بے ترتیب سانسوں کے ساتھ انتظار کرنے لگی۔ پھر کسی نے کہا۔ ''بات کریں۔ نیو ہیون۔''

☆☆☆

گیارہ بج کر پانچ منٹ

نیو ہیون کا ریلوے اسٹیشن رات کے اس وقت قدرے سنسان سا تھا۔ بہت کم مسافر تھے۔ ایک گھڑی تلے فون بوتھ تھا۔ ایک بوتھ تلے ایک وجیہہ اور مضبوط سا آدمی موجود تھا۔

یہ ہنری اسٹیونسن تھا۔ اس کے نقوش سے عزائم پسندی کا پتا چلتا تھا۔ پھر اسے بات کرنے کا اشارہ ملا۔

''ہیلو ڈارلنگ!'' اس نے کہا۔

''ہنری۔۔۔ ہنری۔۔۔! یہ تم کہاں ہو؟'' لیونا کی آواز اسے سنائی دی۔

''میں نے بتایا ہے میں بوسٹن میں تھا اور نیو ہیون میں رک گیا ہوں۔ تمہیں میرا تار ملا؟''

''ہاں۔۔۔ مگر۔۔۔''

''تمہارا فون بزی تھا۔ تم ٹھیک تو ہو؟''

''نہیں، میں ٹھیک نہیں ہوں۔'' وہ وحشت سے بولنے لگی۔ ''گھر میں کوئی چھپا ہوا ہے۔۔۔''

وجیہہ آدمی کی آنکھوں میں ایک بدنما سی چمک ابھری۔ اس نے کہا۔ ''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ تم وہاں اکیلی تو نہیں ہو۔''

''میں اکیلی ہوں۔ کوئی نہیں ہے۔ تم نے لارسن کو تو پہلے ہی چھٹی دے دی تھی۔''

''اچھا۔۔۔''

''اور تم نے کہا تھا تم چھ بجے آجاؤ گے۔''

''اچھا۔۔۔''

''میں بے حد خوف زدہ ہوں۔ ہنری! تم پولیس کو فون کردو۔'' اسے اپنی بیوی پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ حد درجہ خوف زدہ تھی مگر کیوں؟ کیا اسے اصلیت کا علم تھا؟ مگر کیسے؟

''لیونا! تم اتنی خوف زدہ کیوں ہو؟''

''یہ تم پوچھ رہے ہو؟''

''ہاں، ہاں۔ ڈرنے کی کیا بات ہے؟''

''میں نے سنا ہے کسی نے نیچے سے کچن کا ایکسٹینشن اٹھایا تھا۔ وہ میری کال سن رہا تھا۔''

''نان سینس! مکان مقفل ہے۔ پھر باہر ایک چوکیدار بھی ہے اور تمہارے پاس فون بھی ہے۔''

''میں کہتی ہوں ہنری! تم پولیس کو میرے لیے فون کردو۔ میں نے کوشش کی تھی میری وہ نہیں سن رہے ہیں۔''

''دیکھو لیونا!'' اس نے رسانیت سے کہا۔ ''میں یہاں بہت دور نیو ہیون میں ہوں۔ میں یہاں سے تمہارے لیے کال کروں گا تو پولیس والے مجھے پاگل سمجھیں گے۔ تم ڈاکٹر کو فون کرلو۔''

وہ چاہتا تھا کہ وہ اس عورت کو اسی طرح الجھائے رکھے۔ اب بس تھوڑا سا وقت رہ گیا تھا۔ وہ کر ہی کیا سکتی تھی۔ اس کے وجیہہ چہرے سے شیطانیت جھلکی۔ فون کان سے لگائے وہ تھوڑا مڑا اور کھلے دروازے سے باہر دیکھا مگر وہ اس آدمی کو نہ دیکھ سکا جس کے بال سفید ہو رہے تھے اور جس کے بدن پر ایک سیاہ سوٹ تھا۔ جو پاس والے دوسرے بوتھ کی اوٹ میں تھا۔

''لیونا کیا کہہ رہی ہو؟''

''ہنری! یہ ایوان کون ہے؟''

''ایوان؟'' حیرت سے اس نے کہا۔

''ہاں، والڈ ایوان۔''

''میں نے یہ نام کبھی نہیں سنا۔ کیوں کیا بات ہے؟''

''آج رات اس نے مجھ سے کافی باتیں کی ہیں تمہارے بارے میں۔''

گیارہ بج کر دس منٹ۔۔۔

سفید بالوں والا آدمی جس کا چہرہ خاصا سنجیدہ سا تھا۔ بوتھ سے آگے چلا گیا۔ ورنہ وہ دیکھتا کہ ہنری کا رنگ زرد ہوگیا ہے۔ اسے ہنری کی کال سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ صرف ہنری کے چکر میں تھا۔ اس کا ہاتھ جیب میں تھا جہاں اس کا سرکاری بیج رکھا ہوا تھا۔

''میرے بارے میں باتیں کی تھیں۔۔۔ کیا کی تھیں؟''

''بڑی تکلیف دہ باتیں تھیں مگر یہ دل لگتی تھیں۔''

''وہ کوئی پاگل ہوگا، تم ایسے لوگوں کی سنتی کیوں ہو؟''

''اس نے بتایا تھا کہ تم ڈیڈی کی کمپنی کی منشیات چراتے رہے ہو، کیا وہ درست کہہ رہا تھا؟''

ہنری نے غصے کی آواز نکالی اور بولا۔ ''لیونا! بڑے افسوس کی بات ہے۔ تم میرے بارے میں اس طرح سوچ رہی ہو۔ کیا تم نے کوئی خواب دیکھا ہے؟''

''خواب نہیں۔'' لیونا نے کہا۔ ''اسی نے تمہارے لیے ایک پیغام بھی چھوڑا ہے۔ اس نے کہا تھا تمہیں بتادوں کہ انویشن آئی لینڈ کا گھر جلا دیا گیا ہے اور پولیس کو سب باتوں کا پتا چل گیا ہے اور کوئی مورینو نامی شخص پکڑ لیا گیا ہے۔۔۔''

''کیا۔۔۔؟'' ہنری نے بے چینی سے پوچھا۔

''مگر مجھے اس کی کسی بات کا یقین نہیں البتہ مسز لارڈ سیلی والی بات ضرور تھی، اس نے درست بتایا تھا وہ بھی یہی کہہ رہی تھی۔''

ہنری نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔ ''میں سن رہا ہوں۔''

''ان سب کا کہنا تھا کہ تم مجرم ہو۔ حریص ہو۔ ایوان تو یہ تک کہا تھا کہ تم مجھے مروانا چاہتے ہو۔''

''مگر میں۔۔۔'' اس نے بولنا چاہا مگر دوسری

طرف تو سیلاب تھا۔

''اور تمہیں تو پچاس ہزار کی رقم بھی کہیں سے حاصل کرنا تھی۔ تم نے مجھ سے کیوں نہیں مانگی؟''

بالآخر اسی نے کہا۔ ''اگر تم کہو تو میں یہ کام کر سکتی ہوں۔''

لیونا اب آنسوؤں سے رو رہی تھی۔ ''ہنری! میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔''

گیارہ بج کر گیارہ منٹ۔۔۔

ہنری کو خیال آیا کہ اس نے بوتھ کے پاس کسی کی ہلکی سی جھلک دیکھی تھی۔ اس نے باہر جھانکا، وہاں کوئی نہ تھا۔ مگر وہ کچھ فاصلہ پر رکا ہوا تھا۔ ہنری نے بوتھ کا کھلا دروازہ بند کر دیا اور بولا۔ ''لیونا! تم ایک کام کرو۔۔۔''

''تم نے مجھے معاف کر دیا ہے نا؟''

''یہ باتیں چھوڑو۔ تم بستر سے اٹھو۔''

''میں نڈھال ہو رہی ہوں۔''

''میں کہہ رہا ہوں اٹھو اور دروازے پر جاؤ۔ وہاں جو کھڑکی ہے وہاں رک کر جس قدر زور سے چیخ سکتی ہو چیخو۔ امید ہے تمہیں مدد مل جائے گی۔ یہ کھڑکی روڈ پر کھلتی ہے۔''

''میں تو ہل بھی نہیں پا رہی ہوں۔ میں کیا کروں؟''

''لیونا! کچھ کرو فوراً۔ تمہارے پاس بس تین منٹ ہیں اس کے بعد تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔''

گیارہ بج کر بارہ منٹ۔۔۔

''کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ چیخی۔

''لیونا! باتوں کا وقت نہیں۔'' اس کی اپنی آواز بھی کانپ رہی تھی۔ وہ بوتھ کی دیوار کے ساتھ ٹک گیا۔ ''بستر سے نکلو۔ میں بے حد مشکلات میں ہوں۔ میں نے آج رات کے لیے انتظام کیا تھا کہ تمہیں۔۔۔''

''اوہ ہنری۔۔۔!'' فون کے اندر ایک خوف ناک چیخ ابھری۔

''ہنری۔۔۔! کوئی سیڑھیاں چڑھ رہا ہے۔''

''بھاگو لیونا! کھڑکی کی طرف لپکو۔''

''نہیں۔ میرے پیر کام نہیں کر رہے ہیں۔''

''لیونا! بھاگو۔''

''ہنری۔۔۔! ہنری۔۔۔! مجھے بچاؤ۔''

''پلیز لیونا!'' وہ چیخا۔ ''وہ اب مجھے بھی پکڑ لیں گے۔ مورینو سب کچھ اگل دے گا۔'' اور پھر اس نے فون پر کسی آتی ٹرین کی آواز سنی۔ اسے گڑگڑاہٹ تلے لیونا کی دوسری چیخ سنائی دی۔

''ہنری۔۔۔ی۔۔۔ی۔۔۔''

گیارہ بج کر پندرہ منٹ۔۔۔

چیخنے کے بعد لیونا نے ریسیور مضبوطی سے تھام لیا۔ پھر اس نے اسے زور سے کریڈل پر پٹخا۔ اس کا دل اچھل کر سینے سے باہر آ رہا تھا۔ ٹرین کی گڑگڑاہٹ بڑھ رہی تھی۔ کراہتے ہوئے اس نے اپنے جسم کو گھسیٹا لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے رسیوں سے باندھ دیا گیا ہو۔ وہ ہل بھی نہیں پا رہی تھی۔ سناٹے کا سینہ ٹرین کی آواز سے شق ہو رہا تھا۔ اس آواز پر کوئی آواز بھاری نہ تھی۔ اس کی آخری سانس کسی نے نہیں سنی۔

پھر ٹرین گزر گئی۔۔۔

اب کمرے میں سناٹا تھا۔ صرف کسی کی بھاری سانسیں گونج رہی تھیں۔ پھر کوئی آہستہ سے بستر کے پاس سے ہٹا۔

یکا یک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ربر کے جوتے آہستہ سے فرش پر متحرک ہوئے۔ پھر ایک ہاتھ جس میں دستانہ تھا اور جس پر خون لگا تھا، بڑھا۔ اس نے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے ہنری کی کانپتی آواز ابھری۔

''لیونا۔۔۔ لیونا۔۔۔؟''

تھوڑا سا وقفہ دیا گیا پھر ایک بیٹھی بیٹھی آواز منمنائی اور جواباً بولی۔

''سوری۔۔۔ رانگ نمبر۔۔۔''

گیارہ بج کر سولہ منٹ۔۔۔

چراغ شب

ایم الیاس

وہ شخص جس کے پاس شہر کے زیادہ تر مصور آکر اپنے خونِ جگر سے تخلیق کیے ہوئے فن پارے فروخت کیا کرتے تھے، وہ جو اپنے فن پاروں کو اپنا لختِ جگر مانا کرتا تھا، حالات کی ستم ظریفی کے بعد ایک انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔

ایک آرٹسٹ کے عروج و زوال کی دلچسپ کہانی

وہ کسی تیز آندھی کی طرح اس انداز میں آئی تھی کہ جیسے وہ ہر چیز کو نہ صرف تاخت تاراج کر دے گی بلکہ تہس نہس۔۔۔اس نے دروازے پر دستک دینے کے بجائے بڑے زور سے دروازے کو اندر کی طرف دھکا دیا تھا کہ جیسے توڑ دینا چاہتی ہو۔ دروازہ ایک دھماکا کے ساتھ پورا کھل گیا تھا۔

شہزاد آج اندر سے چٹخنی لگانا بھول گیا تھا۔ پہلی مرتبہ تو ایسا ہوا تھا۔ وہ اس معاملے میں بڑا محتاط تھا۔

اس نے چونک کر دیکھا۔ ایک لڑکی اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔۔۔اسے ایسا لگا تھا کہ اس کی نظروں کے سامنے کوندا سا لپکا ہو۔

چند لمحوں کے لیے اس کی آنکھیں چندھیا سی گئی تھیں۔۔۔جب آنکھوں کے سامنے سے دھند چھٹی تو اس نے دیکھا کہ اس کے سامنے ایک خوب صورت سا مجسمہ کھڑا ہوا ہے۔۔۔وہ دل میں اس تراشیدہ مجسمے کو سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ اس شہابی چہرے کی دل کشی میں اس کے تیکھے تیکھے نقش و نگار بڑے سمپل اور دل فریب تھے جو اس کے دل کے نہاں خانے میں نقش ہو کر رہ گئے۔

لڑکی کے چہرے پر ایک دھندی غالب تھی اور انگاروں کی طرح دہکتے چہرے کے طول و عرض پر پسینے کی بوندیں کانپ سی رہی تھیں۔۔۔اس کے سینے میں سانسوں کا زیر و بم ہچکولے کھاتا ہوا ہیجان خیز بنا رہا تھا۔

وہ شہزاد کو بڑی پریشان اور متوحش سی نظر آئی تھی۔۔۔اس لمحے وہ شہزاد کو کسی بے بس ہرنی کی طرح نظر آئی جو چاروں طرف سے ناامید ہو کر اس کے کمرے میں پناہ لینے کے لیے آ کھڑی ہوگئی ہو۔ شہزاد کو وہ کسی درد بھرے گیت کی طرح لگ رہی تھی اور اس کے دل کا غم اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں افق تا افق کسی بدلی کی طرح چھایا ہوا تھا۔ آنکھوں کی چمک بھی گہری اداسی میں ڈوب گئی تھی۔ بظاہر نہ تو مسکراہٹ اور نہ ہی اس کی پرچھائیں۔۔۔ جیسے مسکرانا بھول گئی ہو۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے اس کی حسین مسکراہٹ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس طرح چھین لی ہو جس طرح عصمت چھین لی جاتی ہے۔۔۔اور پھر عورت تو مسکراہٹ کے بغیر کسی الم ناک نغمے کی طرح محسوس ہوتی ہے۔

شہزاد نے اس کی طرف حیرت اور سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ نوجوان اور حسین لڑکی اس کے پاس کیوں آئی ہو گی۔۔۔وہ خالی ہاتھ تھی۔ اس کے پاس کوئی تصویر

نہ تھی۔ جو اسے بیچنے کے لیے آئی ہو اور نہ ہی اس کی ظاہری حالت ایسی تھی کہ وہ کوئی تصویر خرید سکے۔ یہاں جو کوئی بھی آتا وہ تصویر بیچنے یا خریدنے کے لیے آتا تھا۔۔۔ وہ تو حسرت و افلاس کی ایک زندہ متحرک اور منہ بولتی تصویر تھی۔ شہزاد نے اس کے چہرے پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر کہا۔

''فرمایئے۔۔۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔۔۔'' اس کے لہجے میں مٹھاس سی تھی۔

لڑکی نے میز پر رکھی ہوئی کرسی کی طرف بڑھ کر اس کی پشت کو تھام لیا۔ جیسے وہ اس کا سہارا نہ لیتی تو یقیناً گر پڑتی۔

''میں ایک تصویر بیچنا چاہتی ہوں۔'' اس کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔

''تصویر کہاں ہے۔۔۔'' شہزاد نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھا، شاید تصویر لائی ہوگی۔ لیکن اس کا کوئی وجود نہ تھا۔

''تصویر میرے گھر پر رکھی ہوئی ہے۔۔۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو میرے ساتھ گھر چل کر اسے دیکھ لیں۔'' اس نے لجاجت سے التجا کی۔

''مگر وہ تصویر آپ اپنے ساتھ لے کر کیوں نہیں آئیں۔۔۔'' شہزاد کہنے لگا۔ ''بات یہ ہے کہ میرے لیے دفتر چھوڑ کر جانا ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ لوگ آتے رہتے ہیں۔ میرے دفتر میں کوئی ملازم نہیں جو میری غیر حاضری میں ان سے بات کر سکے۔''

''اس لیے کہ میرے پاس پیسے نہیں تھے کہ اسے رکشا میں رکھ کر لے آتی۔۔۔ اور پھر میرا گھر یہاں سے اتنی دور ہے کہ تصویر اٹھائے پیدل نہیں آ سکتی تھی۔'' شہزاد اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''آپ کا گھر کہاں ہے۔۔۔؟''

''سرجانی ٹاؤن میں۔۔۔'' اس نے دوپٹے سے اپنی گردن اور چہرے پر جمی گرد کی مہین تہہ کو پونچھا۔

''سرجانی ٹاؤن میں۔۔۔؟'' شہزاد کے چہرے پر ترحم کے جذبات پیدا ہوئے۔ ''آپ سرجانی ٹاؤن سے گلشن اقبال پیدل آئی ہیں؟''

''ایک مجبوری تھی جو مجھے یہاں تک لے آئی۔۔۔'' سینہ آواز کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

''کیا آپ میرے ساتھ گھر تک چلیں گے۔

''کیوں نہیں۔۔۔ ضرور چلوں گا۔'' وہ بولا۔

''کیا آپ کے والد یا بھائی میں سے کوئی یہاں تصویر لانے کے لیے تیار نہیں ہوا۔۔۔؟ حیرت کی بات ہے۔۔۔ انہیں اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ آپ اکیلی جا رہی ہیں اور وہ بھی پیدل۔''

''اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی زندہ ہوتا تو آج مجھے یہ دن دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔'' اس کی آواز بھرا سی گئی۔

''اوہ۔۔۔!'' شہزاد کو بہت افسوس ہوا تھا۔ اس نے اپنائیت کے لیے بھی کہا۔ ''آپ اس بھری دنیا میں اکیلی ہیں؟''

''نہیں۔۔۔ میں اکیلی نہیں ہوں۔'' لڑکی نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ ''میری ماں زندہ ہیں۔۔۔ وہی میری دنیا ہیں۔۔۔ میرا سہارا اور گھنا سایہ ہیں۔۔۔ میرا سب کچھ ہیں۔۔۔ بھائی بھی ہیں۔۔۔ باپ بھی۔۔۔ بہن اور سہیلی عزیز از جان بھی۔''

تھوڑی دیر کے بعد شہزاد اس لڑکی کے ساتھ اس کے گھر جا رہا تھا۔ اس نے ایک رکشا کر لیا تھا۔۔۔ رکشا اس کی ہدایت پر تیز رفتاری سے اپنا سفر طے کر رہا تھا۔ لڑکی رکشا کے دوسرے کونے میں دبکی اور سمٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔۔۔ کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ اس کے چہرے پر اس کے دل کا درد جاگ رہا تھا۔ تیز ہوا سے اس کی زلفیں اس کی طرح پریشان ہو رہی تھیں۔ دوپٹا ہوا سے اڑا اڑا جا رہا تھا جس کا اسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ دیکھنے والوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا لیکن وہ کہیں اور کھوئی ہوئی سی تھی۔ خیالوں میں پہنچی ہوئی اتنی دور چلی گئی تھی کہ دنیا و مافیہا کی خبریں

نہیں رہی تھی۔ اس کی جیل آنکھوں کی گہرائیوں میں دکھ کا گہرا سمندر نظر آیا تھا۔۔۔ آخر اس لڑکی کو کون سا دکھ ہے۔ آخر کس نے اسے حالات کے جہنم میں جھونک دیا ہوگا۔ اس کے پاس بس کے پیسے تک نہیں تھے۔۔۔ وہ میلوں پیدل چل کے اس کے پاس آئی تھی۔

اس نے بڑے کرب سے سوچا۔۔۔ ہمارے ملک کے فنکاروں کے لیے یہ کتنا بڑا المیہ ہے۔ شہزاد خود بھی ایک پایہ کا مصور تھا۔ اس کے وجود میں ایک فن بسا ہوا تھا۔ اس نے یوروپ کے طرز پر ایک آرٹ گیلری اپنے گھر میں قائم کی ہوئی تھی۔ وہ گمنام اور مفلوک الحال مصوروں سے تصویریں خرید کے اپنی گیلری میں ان کی نمائش کرتا تھا۔ اس طرح ایک طرف غریب مصوروں کی مالی اعانت ہوجاتی تھی اور انہیں سہارا مل جاتا تھا اور وہ بھوکے نہیں مرتے تھے۔ مگر اس نے کبھی بھی ان مصوروں کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ وہ چاہتا تو ان کی مجبوریوں سے بڑی آسانی سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ جیسا کہ اس شہر میں بہت سارے دکان دار مجبور مصوروں کا استحصال کررہے تھے۔ اس کے مزاج میں کاروباری بنیاپن، خودغرضی اور لوٹ کھسوٹ کا جذبہ نہیں تھا۔

اس کے برعکس اس کے وجود میں ایک فن کار کا گہرا جذبہ سویا ہوا تھا۔ یہ جذبہ اتنا گہرا تھا کہ کوئی اس کی گہرائی ناپ نہیں سکا تھا۔ اسی وجہ سے اس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ شہر کے زیادہ تر مصور اس کے پاس آکر اپنے خونِ جگر سے تخلیق کیے ہوئے فن پارے فروخت کرتے تھے۔ خریداروں کی بڑی تعداد بھی آتی رہتی تھی۔

فنونِ لطیفہ میں اعلا گھرانوں کی لڑکیاں عورتیں بھی دل چسپی لیتی تھیں۔ بطور فیشن اور نام ونمود کے لیے بھی۔۔۔ وہ فیشن پرست تھیں۔ ان کے پاس کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ اور پھر ان کا کوئی کردار بھی نہ تھا۔

''شہزاد صاحب۔۔۔! کیا یہ ممکن ہے کہ اس تصویر پر جو آپ کا نام ہے اسے مٹا کے میرا نام لکھ دیں۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔۔۔۔'' وہ حیرت سے جواب دیتا۔ ''یہ میری خونِ جگر سے بنائی ہوئی تخلیق ہے۔''

''میں اس کے لیے منہ مانگی رقم دے سکتی ہوں۔'' لڑکی کاروباری لہجے میں کہا۔ ''دس ہزار۔۔۔ بیس ہزار۔۔۔ چالیس۔۔۔''

''پلیز۔۔۔'' وہ درمیان میں کہتا۔ ''آپ دس لاکھ بھی دیں مجھے منظور نہیں۔۔۔ کیا کوئی اپنا بچہ بیچتا ہے؟''

اعلا اور اونچے طبقے کی نوجوان لڑکیوں، عورتوں نے جو نئے ماڈل کی بیش قیمت گاڑیوں میں گھومتی تھیں۔ ان کی بڑی سوشل لائف تھی اور ایسا بے حجابانہ لباس پہنتی تھیں کہ وہ بے لباس دکھائی دیتیں۔ انتہائی ماڈرن۔ ان پر امریکی یوروپی دوشیزاؤں کا دھوکا ہوتا تھا۔ یہ وہ لڑکیاں، عورتیں تھیں جن کے نزدیک عزت وآبرو کا کوئی تصور نہیں تھا۔ لڑکوں سے دوستی اور آزادانہ میل جول میں آلودہ ہوتی رہتی تھیں۔ وہ نہ صرف اپنی سہیلیوں بلکہ لڑکوں، مردوں کے ساتھ ممنوعہ فلمیں بھی دیکھتی تھیں۔ وہ اپنے نام کی خاطر نہ صرف بڑی رقم کی پیش کش کے ساتھ ساتھ خود کو مہربان کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن شہزاد پر ان کی رقم اور ان کی نوجوانی اور حسن وشباب کا جادو نہ چل سکا۔ وہ اپنے آپ کو آلودہ ہونے سے بال بال بچائے رکھا اور ان سے اس طرح دور بھاگتا تھا جیسے یہ خوب صورت چڑیلیں ہوں۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں جو شوبزنس میں بہت کچھ پانے کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کرتی رہتی تھیں کیوں کہ اس کے بغیر نہ تو انہیں ٹی وی، ڈراموں میں چانس ملتا اور نہ کمرشل ملتے تھے۔۔۔ بارہ اور تیرہ برس کی لڑکیاں بھی شہرت اور پیسے کے لیے اپنا سب کچھ بیچ دیتی تھیں۔ والدین اور بھائی بہنیں بھی انہیں پروڈیوسروں کے پاس لے جاتے تھے۔۔۔ اسی طرح مصوری کا لیبل بکتا تھا۔ بہت سے مصور ان سے ہر طرح فائدہ اٹھاتے تھے۔ جن

لڑکیوں اور عورتوں کی آرٹس کونسل میں تصویروں کی نمائش ہوتی تھیں۔ وہ فیاض سے مہربان ہونے پر ان کا نام تصویروں پر ہوتا تھا۔

لڑکی نے گھر پہنچ کر اسے دروازے پر کھڑا کیا اور بڑی متانت سے کہا۔

''میں ابھی آتی ہوں، پلیز ۔۔۔! کچھ خیال مت کیجیے گا۔'' پھر وہ اندر چلی گئی۔

پھر وہ چند لمحوں کے بعد دروازے پر نمودار ہوئی۔ پھر اس نے دروازہ اتنا کھول دیا کہ ایک طرف ہٹ کر شہزاد کو راستہ دے سکے۔ پھر اسے راستہ دیا تو شہزاد اندر داخل ہوا۔ لڑکی کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ایک سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک نے، جو لڑکی کے بدن سے پھوٹ رہی تھی اسے معطر کر دیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید اسے خود پر قابو پانا مشکل ہوتا اور بہک جاتا۔ لڑکی نے اس کے اندر آنے کے بعد دروازہ بھیڑ دیا۔

یہ لڑکی جو اس کے پاس آئی تھی اس کی شہرت سے متاثر ہو کر ۔۔۔ وہ اپنی کوئی تصویر مفلسی اور غربت کی وجہ سے بیچنا چاہتی تھی اور وہ کسی ان جانے احساس کے تحت اس کے ساتھ ساتھ کشاں کشاں چلا آیا تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ آنے کی ایک دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی زندگی میں یہ پہلی لڑکی تھی جس کی موہنی صورت اور دل کشی اور سنسنی خیز سراپا اس کے دل پر نقش ہو کے رہ گیا تھا۔ وہ خیالوں میں اس کا پیکر تراشتا رہا تھا۔

''آیئے ۔۔۔'' لڑکی نے ایک قدم آگے بڑھ کے بڑے اداس لہجے میں کہا اور اسے ساتھ لے کے ایک چھوٹے سے کمرے کی دہلیز پر لے آئی۔ دن کی روشنی میں یہ کمرا تنگ و تاریک تھا۔ شاید ہوا بھی ادھر کا رخ نہیں کرتی تھی۔ اس ملگجے اندھیرے میں ہی اس کا حسن نمایاں تھا۔

''مہینوں سے بجلی کا بل نہیں بھرا تو بجلی کاٹ دی گئی۔'' لڑکی نے بڑے سپاٹ لہجے میں صاف گوئی سے بتایا تھا۔

معاً اس کی نظر لڑکی کے دائیں ہاتھ پر پڑی تو دیکھا اس کے اس ہاتھ میں ماچس اور موم بتی بھی تھی۔ لڑکی نے کمرے میں داخل ہو کے دیا سلائی موم بتی کو دکھائی دی تو پہلے دیا سلائی اور پھر موم بتی کی زرد روشنی نے کمرے کی گھپ تاریکی کا سینہ چیر دیا۔ کمرا خالی روشن ہو گیا تھا۔ وہ موم بتی تھام کے اس چار فٹ مربع تصویر کے سامنے کھڑی ہو گئی جو ایک لکڑی کے خوب صورت اور عمدہ فریم میں آویزاں تھی۔ اس تصویر میں ایک خوب صورت جوان بھکارن، ایک شیر خوار بچے کو (جو بھوک سے بلبلاتا نظر آتا تھا) سینے سے لگائے کھڑی تھی۔ بھکارن کے چہرے پر بڑا ہی اذیت ناک کرب چھایا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے جو صاف شفاف موتی کی طرح دمک رہے تھے اور دو موتی اس کے رخساروں پر ڈھلکنے والے تھے۔ عورت خوب صورت تھی بچہ بھی ماں سے خوب صورت تھا۔

اس کمرے میں یہی ایک اکلوتی تصویر تھی۔ موم بتی کی زرد روشنی کا ہالہ اس تصویر پر پڑ رہا تھا۔

شہزاد اس تصویر کو دیکھتے ہی چونک پڑا تھا۔ فنِ مصوری کے ایسے نادر شاہکار دیکھنے میں نہیں آتے تھے۔ ایسے شاہکار تو صدیوں میں تخلیق ہوتے تھے۔ کرب و اذیت اور ممتا کے دکھ درد کی جو عکاسی کی گئی تھی وہ ایک مصور کے بس کی بات نہیں تھی۔

اس نے تصویر کے قریب ہو کے اور جھک کے تصویر کے کونے میں مصور کے دستخط دیکھے تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

یہ شاہکار ذکیہ خانم کا تھا۔ اس کی نظر میں ذکیہ خانم ایک عظیم فنکارہ تھی۔ ایسے فنکار بار بار پیدا نہیں ہوتے تھے۔ اس نے کئی سال پہلے آرٹ کونسل میں ذکیہ خانم کے تصویروں کی نمائش دیکھی تھی۔ وہ ان تصویروں سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ اس نے اس موقع پر ذکیہ خانم سے خاصی دیر تک فن کے موضوع پر باتیں بھی کی تھیں۔ ذکیہ خانم کی شخصیت نے اسے بے حد متاثر کیا تھا اور وہ ایک طرح سے وہ بھی اس

کے مداحوں میں ہو گیا تھا۔ وہ نہ صرف ایک عظیم فن کارہ بلکہ ایک عظیم عورت بھی تھی۔ اسے آج بھی وہ لمحات اس طرح یاد تھے جیسے کل کی بات ہو۔ مصوری کے دولت مند شائقین ذکیہ خانم کی تصویروں کو خریدنا چاہتے تھے مگر ذکیہ خانم نے ان تصویروں کو بیچنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ان کے اس انکار سے ان لوگوں کا اشتیاق اور بڑھ گیا تھا۔ جب ان لوگوں نے ذکیہ خانم کو بے حد مجبور کیا تھا اور بے حد اصرار کیا تو وہ بولی تھیں

''یہ ساری تصویریں میرے بچے ہیں۔۔۔ کیا کوئی ماں اپنے بچوں کو بیچ بھی سکتی ہے۔۔۔؟''

''کیا یہ تصویر آپ کے والد یا کسی عزیز نے خریدی تھی؟'' لڑکی سے اس نے پوچھا۔

''جی نہیں۔۔۔ یہ تصویر خریدی ہوئی نہیں بلکہ میری امی کی بنائی ہوئی تصویر ہے۔''

''ذکیہ خانم آپ کی امی ہیں؟'' شہزاد نے چونک کے حیرت سے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' ساکت پلکوں اور منجمد آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور سر ہلا دیا۔

''ان کی اور تصویریں کہاں ہیں۔'' شہزاد نے گھوم کے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ''مجھے یاد ہے کہ برسوں پہلے میں نے آرٹس کونسل میں ان کی تصویروں کی نمائش میں بہت ساری شاہکار تصویریں دیکھی تھیں۔''

''ان کی ساری تصویریں ایک ایک کر کے بیچ دی گئیں۔'' لڑکی کے سینے میں آواز اٹک گئی تھی۔ اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

''کیا ایک ماں اپنے بچوں کو بیچ دیتی ہے۔۔۔'' اس نے کہا۔ اسے ذکیہ خانم کی اس دن کی بات یاد آ گئی تھی۔

''ماں نے نہیں۔۔۔ بلکہ میں نے اپنی ماں کے ان بچوں کو بیچ دیا جو انہوں نے خونِ جگر سے تخلیق کیے تھے۔''

''وہ کس لیے۔۔۔؟ آخر اس کی کیا ضرورت تھی ماں کی ممتا سر بازار بیچنے کی۔۔۔؟''

''آپ میرے ساتھ آئیے میں آپ کو بتاتی ہوں کہ میں نے ایک ماں کی ممتا کیوں بیچ دی ہے۔'' لڑکی نے سرد سپاٹ لہجے میں کہا۔

شہزاد اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہ اسے لے کے ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوئی۔ شہزاد نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا اسے سنسنا دینے والا بجلی کا سا جھٹکا لگا۔ وہاں چارپائی پر ذکیہ خانم ویران کھنڈر کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ بیماری نے تو انہیں دیمک کی طرح اندر ہی اندر سے چاٹ لیا تھا۔ انہیں دیکھ کے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ملک کی عظیم مصورہ ذکیہ خانم ہیں۔ وہ منہ کھولے بستر پر پڑی تھیں۔ ان کے جسم کا گوشت سوکھ گیا تھا۔ جس میں سانس نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ بس اب وہ ہڈیوں کا پنجر تھیں۔ کمرے میں دواؤں کی بو بسی ہوئی تھی۔۔۔ کمرے میں میز پر دواؤں کی کتنی ساری شیشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کمرا صاف ستھرا روشن تھا مگر جا بجا چیزوں سے بھرا پڑا ہوا تھا۔ کمرے کی ہر چیز پر مردنی چھائی ہوئی تھی جو کسی خنجر کی نوک کی طرح اسے اپنے دل میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ذکیہ خانم اس حالت میں ہو سکتی ہیں۔

اس نے ذکیہ خانم سے بات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اب تو وہ کسی کی بات سننے اور کہنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ اسے یقین نہیں آیا وقت اور حالات نے ایک عظیم مصورہ کو معذور اور اپاہج بنا دیا ہے۔

وہ چند لمحوں کے بعد شہزاد کو پہلے والے کمرے میں لے آئی جہاں تصویریں تھیں۔

''آپ نے میری امی اور ان کی حالت دیکھ لی نا۔'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ''ان کی صحت یابی کے لیے میں ان کے ایک ایک بچے کو بیچتی رہی ہوں۔۔۔ بس اب یہ ان کا آخری بچہ بچا ہوا ہے۔ اس کے بعد بیچنے کے لیے کچھ نہیں رہ جاتا ہے۔۔۔ اس بچے کو بیچنے کے بعد کتنی رقم ملے گی اور کتنے دن چلے گی مجھے نہیں معلوم۔۔۔ اس رقم کے ختم ہو جانے کے بعد مجھے کیا

کرنا ہوگا۔۔۔ اور کیا کچھ بیچنا ہوگا۔۔۔ یہ میں بعد میں ہی سوچوں گی۔۔۔ کیوں کہ ماں کی دوائیں بہت ضروری ہیں۔ شاید فاقوں کی نوبت آ جائے۔ یہ بتائیے کہ آپ اس بچے کی کیا قیمت لگا رہے ہیں؟''

شہزاد نے اس کے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس تصویر کو خرید نہیں سکتا ہوں۔ اس شاہکار کی کوئی۔۔۔'' وہ درمیان میں اس کی بات کاٹ کے بولی۔ ''آپ اس تصویر کی جو قیمت دینا چاہتے ہیں دے دیں۔ میں کوئی مول تول نہیں کروں گی۔''

''میں تصویروں کی خریداری میں کوئی مول تول نہیں کرتا ہوں کیوں کہ میں کوئی کاروباری نہیں ہوں۔ یہ تصویروں کی اصل قیمت۔۔۔'' لڑکی نے پھر تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''آپ پانچ سو روپے تو دے سکتے ہیں؟''

''پانچ سو روپے۔۔۔؟'' شہزاد کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ کہیں یہ اس کا وہم تو نہیں ہے! لیکن لڑکی نے صرف پانچ سو روپے ہی کہا تھا۔ لڑکی کی ضرورت اور مجبوری ایسی تھی کہ وہ تصویر کو کوڑیوں کے مول بیچنے پر بھی تیار تھی۔ جبھی اس کے دل کے کسی کونے میں ایک آوارہ سا خیال آیا کہ۔۔۔ کیوں نہ وہ تصویر کو پانچ سو روپے میں خرید کے دو لاکھ روپے میں فروخت کر دے۔۔۔ دولت مند شائقین اس تصویر کے دو تین لاکھ با آسانی دے سکتے تھے۔ اس شہر میں تصویروں کے قدر دانوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ کچھ لوگ تو ایسے نادر شاہکار کوڑیوں کے مول خرید کے یورپ لے جا کے بیچ دیتے تھے جہاں انہیں بے پناہ منافع مل جاتا تھا۔ دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں تھا جہاں تصویروں کا کاروبار نہ ہوتا ہو۔ اس کے شائقین اور قدر دان موجود نہ ہوں۔ اس کاروبار میں لوگ راتوں رات امیر کبیر بن جاتے تھے۔

اس نے اپنے کاروباری خیال کو اس طرح جھٹک دیا جیسے کوئی کن کھجورر رینگ رہا ہو۔

اس لیے کہ وہ بالآخر ایک فن کار تھا۔ اس کی اپنی کتنی شاہکار تصویریں گھروں کی نشست گاہوں، ہوٹلوں اور دفتروں میں زینت بنی ہوئی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ ایک ایک تصویر کی تخلیق کے لیے کیسا پتا مارنا پڑتا ہے۔ خون جلانا پڑتا ہے۔۔۔ تب کہیں جا کے تخلیق جنم لیتی ہے۔

پھر اس نے جیب سے بٹوا نکال کے اس میں دو ہزار کی رقم نکال کے اس کی طرف بڑھائی۔ ''یہ لیجیے۔''

لڑکی نے رقم گنی اور پھر اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ ''یہ تو دو ہزار روپے ہیں۔''

''جی ہاں۔'' شہزاد نے جواب دیا۔ ''یہ پیشگی رقم ہے۔۔۔ میں اس شاہکار کو فروخت کے لیے اپنی دکان پر رکھوں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ اس شاہکار کی جو اصل قیمت مل جائے۔ اس کی جو بھی بڑی سے بڑی قیمت ملے گی وہ آپ کی نذر ہوگی۔ اس لیے کہ میں اس بچے کو کوڑیوں کے مول خرید کے ممتا کی تذلیل کرنا نہیں چاہتا ہوں۔''

''جی۔'' لڑکی کی خوب صورت بڑی بڑی آنکھیں بے اختیار چھلک پڑیں۔

☆☆☆

کوئی ایک مہینے بعد ذکیہ خانم کی بیٹی عطیہ اس کی زندگی میں بہار کے ایک جھونکے کی طرح آ گئی۔

ذکیہ خانم کی موت کے بعد اس نے عطیہ سے شادی کر لی تھی۔ وہ عطیہ کو پا کے اس طرح سے خوش تھا جیسے اس نے کوئی انمول اور نایاب ہیرا پا لیا ہو۔ اس کی زندگی میں جو خلا تھا اسے عطیہ نے پر کر دیا تھا۔ اسے یقین نہ آتا تھا کہ عطیہ اتنی بہترین ہم سفر ثابت ہوگی۔

محبت کا ایک دروازہ کیا کھلا خوش قسمتی کے در ایک ایک کر کے کھلتے گئے۔۔۔ اس کے دوست احباب اور ملنے والے ان کی بے مثال محبت پر رشک کرتے تھے۔ شہزاد سے کہتے تھے کہ تم دنیا کے خوش نصیب ترین آدمی ہو جو تمہیں دنیا کی حسین ترین عورت ملی۔ قدرت کے آرٹ شاہکار جس کی جنتی

تعریف کی جائے کم ہے۔

ان کی زندگی کا سفر جاری تھا اور لوگوں کی تعریفیں تھیں کہ کسی کی ان کو نظر لگ گئی۔

وہ سڑک پار کرتے ہوئے کار کے حادثے کی نذر ہوگیا۔ غلطی اس کی نہیں تھی۔

ہوا یہ تھا کہ ایک کار جس کے بریک فیل ہوگئے تھے وہ اس کی زد میں آ گیا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور ڈاکٹروں کی عدم توجہی اور غفلت کی وجہ سے زخم میں زہر پھیل گیا۔ اس کا صرف ایک علاج تھا کہ ٹانگ کاٹ دی جائے۔ وہ معذور ہو کے رہ گیا۔ اسے مکمل طور پر صحت مند ہو کے بیساکھیوں کے سہارے چلنے کے لیے ایک دو ماہ کا عرصہ درکار تھا۔

شہزاد کے علاج معالجے پر رقم پانی کی طرح بہہ گئی تھی کیوں کہ اسپتال ایک مذبح خانہ کی طرح ہوتا ہے۔۔۔ ڈاکٹر تو قصاب سے کہیں زیادہ سفاک اور درندہ صفت ہوتے ہیں۔ جو مریض اسپتال میں داخل ہوتا ہے اس کے گلے پر آہستہ آہستہ چھری پھیرتے ہیں اور ایک ایک قطرہ خون کا نچوڑ کے بدروحوں کی طرح پی جاتے ہیں۔۔۔ ایک قطرہ خون بھی رہنے نہیں دیتے ہیں۔ ٹیسٹ کے بہانے ان سے ہزاروں کی رقم لوٹ لی جاتی ہے۔۔۔ دوسری طرف انسانیت کا دعوا کرتے ہیں۔ میڈیا کو جو انٹرویو دیتے ہیں اس میں خوب جھوٹ بولتے، سننے والوں کو فریب دیتے اور جھوٹ بولتے ہیں۔

ادھر کاروبار بھی متاثر ہو رہا تھا۔ غریب عطیہ کیا کرتی۔۔۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ یہ ڈاکٹر لٹیرے، رہزن اور چور ہوتے ہیں۔ ٹیکس آٹے میں نمک کے برابر بھی ادا نہیں کرتے ہیں۔۔۔ مریضوں کو لوٹ کے ٹیکس نہ ادا کر کے لاکھوں کروڑوں کماتے ہیں۔ جدید ترین اسپتال اور کمپلیکس بناتے ہیں۔۔۔ سال میں دو مرتبہ گاڑیاں بدلتے ہیں۔۔۔ ان کی اولادیں جو حرام کمائی سے ڈاکٹر بن جاتی ہیں۔ ان کے دل بھی پتھر ہوتے ہیں۔۔۔ انہیں صرف اور صرف پیسہ چاہیے۔ ان کا ایمان پیسہ۔۔۔ خدا۔۔۔ مذہب ہوتا ہے۔۔۔ خیر کیا ہوتا ہے وہ جانتے نہیں ہیں۔۔۔ کیوں کہ وہ بے ضمیر ہوتے ہیں۔۔۔ ایک روز اس نے سرجن ڈاکٹر سے کہا۔ ”سر! میں دو ماہ سے آپ کے اسپتال میں اپنے شوہر کا علاج کروا رہی ہوں۔ آپ کی وجہ سے کیس بگڑ گیا۔ پھر آپ نے دوبارہ اس کیس کو لیا اور اس کے نام اخراجات بشمول ٹیسٹ وغیرہ مجھ سے ہی وصول کیے۔ مجھے اپنی ماں کا مکان فروخت کرنا پڑا اور آپ لوگ ہر سال عمرہ اور حج وغیرہ پر بھی جاتے ہیں۔۔۔ آپ کے دو اسپتال زیر تعمیر ہیں۔ اللہ آپ کو خوب نواز رہا ہے۔۔۔ آپ کے اکاؤنٹنٹ فرما رہے ہیں کہ میں پچاس ہزار روپے جمع کرواؤں ورنہ مریض کو لے کر جائیں۔۔۔ اب تو ہمارے پاس گزارہ کے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔“

عطیہ نے ڈاکٹر کو لاؤنج میں روک کے کہا تھا۔۔۔ ڈاکٹر کو ایسا لگا تھا کہ عطیہ نے اسے سرعام جوتے مارے ہوں۔ سب کے سامنے جوتے مارے ہوں۔۔۔ وہاں مریضوں کے لواحقین کھڑے سن رہے تھے۔ لیکن ڈاکٹر پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔۔۔ کیوں کہ وہ بے شرم اور بے غیرت تھا۔ نادم اور شرمسار ہونے کے بجائے رعونت سے بولا۔

”یہ خیراتی اسپتال نہیں ہے۔۔۔ کیس میری وجہ سے خراب نہیں ہوا ہے۔ زخم ہی ایسا تھا۔ آپ رقم جمع کرا دیں یا مریض کو لے جائیں۔۔۔ میں ایک روپے کی بھی رعایت نہیں کر سکتا۔۔۔ آپ چوں کہ ایک خاتون اور ایک آرٹسٹ کی اہلیہ ہیں اس لیے آپ کی بکواس سن لی۔ آپ نے میری توہین کی ہے اور ذلیل بھی کیا ہے۔“

یہ سچ ہے کہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ عطیہ شہزاد کو اسپتال سے ڈسچارج کروا کے لے آئی تھی۔

اس کے بعد دو واقعات پیش آئے۔ اس کے تیسرے دن اس ڈاکٹر کے بیٹے کے ایک اسپتال کا افتتاح ہونے والا تھا۔ جو انتہائی جدید ترین اور غیر ملکی

ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ یہ اسپتال اس کے باپ نے ایک سال کے اندر ایک تیرے کی طرح لوٹ کھسوٹ کے بنایا تھا۔ وہ اپنی گاڑی میں اپنی ماں ڈاکٹر اور بڑی بہن لیڈی ڈاکٹر کو اسپتال میں لا رہا تھا کیوں کہ اس اسپتال کا افتتاح تھا جس میں وزرا اور اراکین اسمبلی کی بھی شرکت تھی۔ وزیر اعلا اس کا افتتاح کرنے والے تھے۔ راستے میں ایک ڈمپر نے (جس کا ڈرائیور نشے میں تھا) اس گاڑی کو مار کے کچل دیا تھا۔ موقع پر جوان بیٹا ہلاک۔۔۔ ماں اور بہن شدید زخمی ہو گئیں لیکن وہ معذور اور اپاہج ہو گئیں۔

دوسرا واقعہ یہ تھا کہ اس اسپتال کے کچن میں گیس کے چولہے میں لیک ہو گئی۔ ایک ملازم نے گزرتے ہوئے سگریٹ کچن میں پھینکی تو ایک زبردست دھماکا ہوا۔ اسپتال میں آگ لگ گئی۔ اسپتال کی عمارت کا نصف حصہ اور جدید ساز و سامان آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔

عطیہ نے ان دونوں حادثوں کے بعد ڈاکٹر کو ایک خط لکھا۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ نے دیکھ لیا۔۔۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔۔۔ متاثرین مریضوں کی آہیں اور بددعائیں تھیں جس نے آپ کو ایک نہیں دو الم ناک حادثوں سے دوچار کیا۔۔۔ آپ کی فرعونیت اور ظالمانہ رویہ کا یہ صلہ ہے۔۔۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔۔۔ آپ نے نہ صرف میرا بلکہ نہ جانے کتنے مریضوں کا دل جلایا اس نے آپ کا دل اور اسپتال جلایا۔۔۔ اور پھر میں نے اسپتال میں اسٹاف سے سنا کہ آپ انہیں علاج معالجے کی کوئی سہولت نہیں دیتے ہیں اور تنخواہ بھی آٹے میں نمک کے برابر۔۔۔ آپ غم زدہ تھے اور اسٹاف اندر ہی اندر خوشی منا رہا تھا کہ قدرت نے آپ سے بھیانک اور عبرتناک انتقام لیا۔ آپ یہ سوچیں کہ آپ نے ہماری بددعائیں لے کے کیا پایا، کیا کھویا۔ آپ کبھی بھی خوش نہیں رہیں گے۔ آہیں آپ کو زہریلے سانپوں کی طرح ڈستی رہیں گی۔

☆☆☆

عطیہ نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ حالات سے لڑنا جانتی تھی۔ اس میں ایک عزم اور حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ شہزاد کی بیساکھی بن گئی تھی۔ اس نے گراؤنڈ فلور پر رہائش اور اوپر آرٹ گیلری قائم کر دی تھی۔ کوئی تصویر کی خرید و فروخت کے لیے آتا تو عطیہ نیچے پہنچ کر اس سے صلاح مشورا کرتی۔ تفصیل بتاتی، کیوں کہ اسے کاروبار کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ عطیہ کی دلچسپی اور توجہ سے کاروبار پھر سے جمنے لگا۔

انہی دنوں شیرازی بھی آیا اور نوآموز آرٹسٹوں کی تصویریں خرید کے لے گیا۔ اس روز سے شیرازی کی آمدورفت بڑھتی گئی تھی۔ شیرازی نہ صرف دولت مند شخص تھا بلکہ خوش پوش، وجیہہ اور اسمارٹ بھی تھا اور نفیس ذوق کا مالک بھی تھا۔ شیرازی نے دو ایک بار تصویریں خریدی تھیں وہ بے حد معمولی سی تصویریں تھیں۔ شیرازی عام تصویریں خریدنے کا سرے سے ہی قائل نہ تھا مگر اس نے یہ تصویریں خرید کے اسے شدید حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ شیرازی کی آمدورفت بڑھنے لگی اور وہ عام سی تصویریں خرید کے لے جانے لگا تو شیراز کا شک و شبہ یقین میں بدل گیا کہ شیرازی یہ سب کچھ اس کی حسین بیوی کے قریب آنے کے لیے کر رہا ہے۔ اس لیے بھی کہ اس کی بیوی عطیہ نہ صرف نہایت حسین اور پرشباب گداز بدن کی ہے بلکہ عطیہ کی دل فریب جوانی مردوں کو پہلی ہی نظر میں متوجہ کر لیتی ہے۔ اس کا دل کش اور ہیجان خیز سراپا آنکھوں کو متوجہ کرتا ہے اور پھر چھریرے اور متناسب جسم کے باعث وہ سولہ برس کی کنواری

دوشیزہ لگتی تھی۔

اس روز سے وہ عطیہ کی حرکات وسکنات کا غور سے جائزہ لینے لگا تھا۔

اس نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا تھا کہ عطیہ بھی تیزی سے شیرازی کی طرف جھکتی جارہی تھی اور مائل ہونے لگی ہے۔ وہ شیرازی کے آنے سے کچھ دیر پہلے خوب سج دھج کے اسے ساتھ لے کے اوپر چلی جاتی تھی۔ جب شیرازی آتا ہے تو اس سے خوب کھل مل کے باتیں کرتی ہے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے درمیان کوئی دیوار، رکاوٹ اور جھجک نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے بھی کہ ان دونوں کے سوا وہاں کوئی اور نہیں ہوتا ہے۔ تنہائی شاید انہیں بہکا دیتی ہوگی۔۔۔ اس کے دل کے کسی کونے میں شک کا زہریلا سانپ کنڈلی مار کے بیٹھ جاتا تھا۔ وہ چشم تصور میں دیکھتا تھا کہ شیرازی اس تنہائی سے خوب فائدہ اٹھاتا ہے۔ والہانہ پن اور وارفتگی سے عطیہ کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔۔۔ عطیہ خود سپردگی سے من مانیاں کرنے دیتی ہے۔۔۔ پھر دونوں بہکتے چہکتے اور۔۔۔ اور ان جانے راستے پر چلے جاتے ہیں۔۔۔ اس لیے بھی شیرازی کسی تصوراتی محبوب سے کم نہیں ہے کہ شیرازی جس طرح سے عطیہ کو خوش کرتا ہوگا وہ معذور ہونے کا سبب نہیں کرسکتا۔۔۔ گو کہ عطیہ اس پر بڑی فیاضی سے مہربان تو ہوتی ہے۔۔۔ لیکن شہزاد کا خیال تھا کہ وہ صرف اداکاری ہے تاکہ اسے شک نہ ہوجائے کہ وہ شیرازی سے ہر طرح سے پیش آتی ہے۔ عورت سے بڑی ریاکار اور اداکارہ کوئی نہیں ہے۔۔۔ یہ سب کچھ سوچ اور چشم تصور میں ان دونوں کو غلاظت کی دلدل میں دیکھ کے دل مسوس کے رہ جاتا۔

اسے اپنی بے بسی، معذوری اور بے چارگی پر نہ صرف غصہ آتا بلکہ احساس محرومی بڑھ جاتی۔۔۔ وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے وہ عطیہ کے رحم وکرم پر تھا۔ اس احساس سے کڑھتا بھی تھا کہ کہاں جائے۔ اس دنیا میں اس کا کوئی ایسا نہیں تھا کہ جو اسے سہارا دے سکے۔۔۔ وہ کاغذ قلم لے کے خاکے بناتا تھا۔ جب عطیہ گھر پر نہیں ہوتی اور سودا سلف لانے بازار جاتی تو وہ عطیہ کے بے پردہ خاکے بناتا۔۔۔ بستر پر آدھی ترچھی اور ٹیڑھی کے علاوہ ہیجان خیز زاویے۔۔۔ یا پھر کسی تصوراتی لڑکی یا عورت کے۔۔۔ جانے وہ کیوں ایسا کرتا ہے۔۔۔ اس بات کو سمجھنے سے وہ خود قاصر تھا۔۔۔ کبھی کبھی اس کے آلودہ خاکے بنا کے اس کے چہرے اور جسم پر تھوکتا۔۔۔ پھر وہ کاغذ کے پرزے پرزے کر کے کھڑکی سے گلی میں پھینک دیتا۔

شیرازی کو وہ رخصت کرنے دروازے تک آتی تھی۔ جب وہ شیرازی کے جانے کے بعد اس کے پاس آتی تو وہ غیر محسوس انداز سے تنقیدی نظر سے پہلے اس کے چہرے کا جائزہ لیتا۔۔۔ شاید شیرازی نے اسے دبوچ کے اس کے ہونٹوں کی مٹھاس اپنے لبوں میں تو جذب نہیں کی۔۔۔ لیکن لپ اسٹک کی تہ جوں کی توں ہوتی تھی۔۔۔ ایسا نہیں لگتا تھا کہ اس نے پھر نفاست سے جمالی ہو۔۔۔ وہ چھپ کے شیرازی کا چہرہ بھی دیکھ لیتا تھا۔ کیوں کہ من مانی کرنے کی صورت میں لپ اسٹک کا وجود کہیں نہ کہیں ضرور آجائے گا۔

پھر وہ عطیہ کے گلابی رخساروں کو بھی دیکھتا تھا۔۔۔ اس کے طول وعرض پر ایسا کوئی سرخ نشان نہیں ہوتا تھا جو مچھر کاٹنے اور ایک مرد کے جذباتی اور ہیجان کی کیفیت میں ابھر آتا تھا۔۔۔ اس کے رخسار صاف شفاف آئینے کی طرح چمکنے لگتے۔ اس پر لکیر تک نظر نہیں آتی۔ بال بھی بے ترتیب نہ ہوتے جو شیرازی کی حرکت کا ثبوت ہوتے۔

پھر وہ اسے اوپر سے نیچے تک اس کا لباس دیکھتا تھا کہ شاید جذباتی کیفیت میں بے ترتیب ہوگیا ہو۔ لیکن عطیہ کی بددیانتی اور ہرجائی کی بات ظاہر نہ ہوتی تھی۔ وہ اس تاک میں ہوتا تھا کہ اسے عطیہ کا ہرجائی پن کا ثبوت تو ملے۔

وہ بستر پر دراز ہو کے اس طرح لوٹتا رہتا تھا

جیسے انگاروں پر لوٹ رہا ہو۔

عطیہ کی مترنم ہنسی جو سات سروں کی طرح ہوتی تھی۔۔۔ سرگوشیوں کی بعض بھنبھناہٹ۔۔۔ مترنم قہقہے جو قہقہوں کی طرح ہوتے تھے اس کے کانوں میں گرم گرم سیسہ بن کے پگھل جاتے تھے۔ وہ خون کے گھونٹ پی کے رہ جاتا۔ کر بھی کیا سکتا تھا۔

عطیہ شاید محسوس کرنے لگی تھی کہ اسے شیرازی کی آمد و رفت ناگوار لگتی ہے۔۔۔ اوپر جانا زہر۔۔۔ وہ اس کے شک کے سانپ کا سر کچلنے کے لیے رات جب شہزاد بستر پر دراز ہونے کے لیے چلا جاتا تو وہ غسل خانے میں گھس جاتی۔ بڑی آزادی سے دیر تک نہاتی جس سے سارے دن کی تھکن اور کسل مندی دور ہو جاتی۔ بدن میں چستی، تر و تازگی اور فرحت سی اتر جاتی۔۔۔ نہانے میں اسے بڑی لذت سی محسوس ہوتی تھی۔ انگ انگ سے مستی ابل پڑتی اور بدن کی شادابیاں رعنائیاں بن جاتی تھیں۔ وہ غسل خانے کے ایک کونے میں جو قد آدم آئینہ تھا اس کے سامنے کھڑے ہو کے بدن اور بالوں کو خشک کرتی۔۔۔ شب خوابی کا لباس کھونٹی سے نکال کے پہنتی جو شہزاد نے اس کی گزشتہ سال گرہ پر لا کے تحفے میں دیا تھا۔ پھر اس میں سے اس کا بدن اس طرح چھلکتا جیسے کانچ کی صراحی میں شراب چھلکتی ہے۔ وہ اپنے جسم پر نہ تو کوئی خوشبو کا اسپرے کرتی نہ لوشن لگاتی۔

شہزاد اس سے کہتا تھا کہ وہ کسی خوشبو کی محتاج نہیں ہے بلکہ خود ایسی خوشبو ہے جو نہ صرف دل و دماغ معطر کر دیتی ہے بلکہ سارے جسم میں خون کی حرارت تیز ہو جاتی ہے اور سارے بدن میں خون رقص کرنے لگتا ہے۔ جب وہ بستر پر اس عالم میں جاتی تو اس کے بالوں اور بدن سے بھینی بھینی خوشبو جس میں سوندھی سوندھی سی مہک ہوتی اور شہزاد بے قابو ہو جاتا۔ لیکن ہر بات اس کے معذور ہونے سے قبل کی تھی۔۔۔ لیکن اب شہزاد اس کی گرم جوش وارفتگی اور والہانہ پن اور خود سپردگی کو ریاکاری سمجھتا تھا کہ وہ شیرازی سے اپنے تعلقات پر پردے ڈالنے کے لیے کرتی ہے۔ اس لیے وہ ایک سرد لاش بن جاتا تھا۔۔۔ جب کہ عطیہ اپنے گرم جوش بوسوں کی بوچھار سے چہرہ اور اس کا سارا جسم مہکا دیتی تھی۔ اس کی سرد مہری کے باوجود عطیہ نے اپنا معمول بنا لیا تھا۔ شہزاد بڑا دل گرفتہ ہو کے سوچتا تھا کہ عطیہ اب شیرازی کی ملکیت بن چکی ہے۔۔۔ اس کا پرشباب گداز بدن۔۔۔ اس محبت کو شیرازی آلودہ کر رہا ہے۔۔۔ کاش! اس دنیا میں اس کا کوئی سہارا ہوتا اور وہ عطیہ کے رحم و کرم پر نہ ہوتا تو وہ اپنی بیساکھی سے نیند کی حالت میں اس زہریلی ناگن کو ہلاک کر دیتا۔

آج اس نے عطیہ کو بہت خوش دیکھا تھا۔۔۔ اتنا مسرور اور سرشار کبھی نہ دیکھا تھا۔ شادی کی پہلی سہاگ رات بھی نہیں اس نے جو خصوصی سنگھار کیا تھا اس میں کوئی نئی نویلی دلہن دکھائی دی۔ عطیہ نے کبھی ایسا سنگھار نہیں کیا تھا۔ وہ بھورے رنگ کی ساڑھی میں ملبوس تھی۔۔۔ اس رنگ کا جو بلاؤز تھا وہ بغیر آستینوں کا تھا جس میں اس کی عریاں مرمریں گداز اور سڈول بانہیں بے نیام خنجروں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔۔۔ اور پھر مختصر سا بلاؤز تھا جس کا گریبان آگے اور پیچھے اتنا کھلا ہوا تھا کہ بے حجابی متوجہ کرنے والی تھی۔ جسم کا فراز اور پشت ہیجان خیز نظارہ بن گیا تھا۔ اس عالم میں اس کے حسن کی محبت بڑی قیامت خیز تھی۔ انگ انگ سے ابلتی مستی اور ہیجان خیز سراپا بڑے فتنے جگا رہا تھا۔ بڑی حشر سامانیاں واضح تھیں۔

شیرازی آیا تو عطیہ اسے لے کے اوپر چلی گئی تھی۔ وہ کچھ دیر کے بعد بیساکھیوں کے سہارے زینے کے پاس جا کے کھڑا ہو گیا۔ عطیہ اور شیرازی کی گفتگو سنائی دے رہی تھی۔ صاف اور واضح نہ تھیں۔ جملے ادھورے ادھورے سے تھے۔ عطیہ کہہ رہی تھی

"وہ پینٹنگ میری ماں کی ہے۔۔۔ آپ شوق سے لے جائیں۔۔۔ رات گیارہ بجے ساتھ چلوں

گی۔۔۔آپ آ کر مجھے لے جائیں۔۔۔آپ شہزاد کی فکر نہ کریں۔۔۔وہ رات دس بجے نیند کی گولیاں کھا کے سوتے ہیں تو۔۔۔ پینٹنگ کے بارے میں کہہ دوں گی کہ وہ چوری۔۔۔ میں بھی لندن چلوں گی۔''

شہزاد نے ذکیہ خانم کی تصویر اس لیے نہیں بیچی تھی کہ وہ ایک شاہکار تخلیق تھی۔۔۔ایسی تخلیق بار بار نہیں ہوتی تھی۔ اس تصویر کی وجہ سے ہی عطیہ اس کے قریب آ گئی تھی۔ شیرازی اور دوسرے شیدائیوں نے اس تصویر کو خریدنے کے لیے بڑے بڑے آفر دیے تھے۔ مگر اس نے محبت کی نشانی کو کسی قیمت پر دینا منظور نہیں کیا تھا۔۔۔مگر آج عطیہ شیرازی کی محبت میں گرفتار ہو کے اسے وہ شاہکار دے رہی تھی جو اسے اپنی جان سے کہیں زیادہ عزیز تھی۔ اب کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی کہ شیرازی اور عطیہ ان جانی راہ پر کتنی دور جا چکے ہیں۔

رات دس بجے عطیہ اس کے لیے نیند کی گولیاں لے کے آئی تو اس نے عطیہ کے چاند چہرے کو چودھویں کے چاند کی طرح دمکتے دیکھا تھا۔ اس کی خوب صورت بڑی بڑی گہری سیاہ آنکھوں میں افق تا افق چاندنی دیکھی۔ اس کی یہ کیفیت شادی کی پہلی سہاگ رات کی تھی۔ وہ رات جو اس کی زندگی کی یادگار اور ناقابل فراموش تھی، نفرت میں ڈھل چکی تھی جس کے متعلق وہ سوچتا بھی نہیں۔ عطیہ نے حسب معمول اس کے ہونٹ اور چہرے کو چوما تو ایسا لگا کہ وہ کسی زہریلی ناگن کا پھن ہے۔ شہزاد نے اس کے ہاتھ سے نیند کی گولیاں لے کے منہ میں رکھیں اور کلے میں ایک طرف کر لیں اور پانی کا گلاس لے لیا۔ اس وقت عطیہ کو کوئی بات یاد آ گئی تو وہ چلی گئی۔ اس نے فوراً ہی گولیاں منہ سے نکال کر تکیے کے نیچے رکھ لیں۔ پانی پی کے خالی گلاس تپائی پر رکھ دیا۔ وہ اس کے دراز ہونے کے بعد آئی تو شہزاد نے آنکھیں موند لیں اور اس کا ایک طویل بوسہ اس کے لبوں اور چہرے کا لیا تو اسے لگا کہ ناگن اپنا زہر اس کے لبوں میں جذب کر رہی ہے۔ اسے ناگوار لگا تو اس نے بے زاری سے ہونٹ چبا کے بولا۔

''بھئی سونے دو مجھے کہ میں دوپہر نہیں سویا تھا اس لیے بڑے زور کی نیند آ رہی ہے۔'' عطیہ نے اس کے جسم پر چادر ڈال دی۔ نائٹ بلب روشن کر کے دوسری بتیاں گل کر دیں۔ پھر گلاس لے کر باہر نکل گئی۔

رات گیارہ بجے شیرازی کی کار کے ہارن کی آواز سنائی دی تو عطیہ جو نشست گاہ میں بیٹھی تھی وہ لپک کے دروازے پر گئی۔ پھر اس آواز سے وہ چونک گیا۔ پھر اس نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔ چند لمحوں تک گہری خاموشی طاری رہی۔ اس نے محسوس کیا کہ عطیہ نے شاید شیرازی کا والہانہ انداز اور خود سپردگی سے استقبال کیا اور شیرازی اسے اپنی آغوش میں لے کے چہرے پر جھک گیا ہے۔ وہ دونوں بہک رہے ہیں۔ اس لیے یہ خاموشی طاری ہے۔ پھر اس نے عطیہ کو کہتے سنا۔

''آپ ایسا کریں کل رات آ کے تصویر لے جائیں تاکہ میں اسے نیچے اتار کے رکھ دوں، کیوں کہ اس وقت اسے اتارنے میں آدھا گھنٹہ لگ جائے گا۔۔۔ہم کیوں آج وقت ضائع کریں۔ چلیے۔۔۔ آج میرا دل قابو میں نہیں ہے۔'' عطیہ کے لہجے میں سرشاری تھی۔ کچھ دیر بعد عطیہ شیرازی کے ساتھ چلی گئی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ عطیہ اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ گئی ہے۔

کیا وہ دونوں کسی ہوٹل میں شب گزاری اور غلاظت کے دلدل میں گرنے گئے ہیں۔۔۔

لیکن وہ اس گھر میں بھی تو اپنے آپ کو آلودہ کر سکتے تھے۔ کیا چیز مانع تھی۔

لیکن ہوٹل کی بات اور ہوتی ہے۔ شیرازی نے شاید کسی فائیو اسٹارز میں رات بھر کے لیے کمرا لے لیا ہو گا۔۔۔ تاکہ سہاگ کی سی رات گزار سکے۔۔۔ گھر میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ ہوٹل کے کمرے کا سا ماحول میسر نہیں آ سکتا۔۔۔ جو کمرا اور

نرم و گداز بستر ہوتا ہے اس کے گھر کے کمرے میں کہاں۔۔۔اور پھر ہوٹل کے کمرے میں سکون اور ہر طرح کی آزادی ہوتی ہے۔

وہ بستر پر دراز چشم تصور میں ان دونوں کو ہم آغوشی کی حالت میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتا دیکھتا رہا اور جیسے انگاروں پر کروٹیں بدلتا رہا تھا۔۔۔ شیرازی اور عطیہ کے چہرے اسے بدروحوں کی طرح تصور میں ناچتے دکھائی دینے لگی۔ وہ بڑی دیر تک اپنا سینہ دبائے لیٹا رہا۔۔۔صرف آج ہی نہیں کچھ دنوں پہلے ہی اسے اندازہ اور احساس ہو گیا تھا کہ عورت کس قدر خودغرض اور کیسی مکار لومڑی کی طرح ہوتی ہے۔ اپنی خوشیوں کے حصول کے لیے اپنے آپ کو میلا بھی کر لیتی ہے۔

شدید حقارت اور نفرت کی مہریں اس کے دل و دماغ اور رگوں میں سنسنا رہی تھیں۔۔۔ایسا لگ رہا تھا کہ یہ زہریلے ڈنک ہیں جو اس کے وجود کو زخمی کر رہے ہیں اور اپنا زہر سرایت کر رہے ہیں ایسا دردناک عذاب جسے سہنا کتنا مشکل تھا۔ وہ کیا کرے۔۔۔ایسے گھپ اندھیرے میں کوئی کن بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس کے ذہن میں ایک خیال دفعتاً کوندا بن کے لپکا تو وہ اچھل سا پڑا تھا۔

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔۔۔اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔"

وہ کچن سے ایک بوتل میں کیروسین آئل لے کے آرٹ گیلری میں پہنچا۔۔۔ بیساکھیوں کے سہارے کچن میں جا کے تیل لینے اور اوپر پہنچنے میں اسے نصف گھنٹے سے زیادہ وقت لگ گیا تھا۔ وہ ابھی اس قابل نہیں ہوا تھا کہ زیادہ دیر تک بیساکھیوں کے سہارے چل سکے۔۔۔اور پھر سیڑھیاں چڑھنا اس کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ ایسا ہی تھا جیسے ہمالیہ کی چوٹی سر کرنا۔ لیکن اس نے ہمت کر ہی ڈالی تھی۔

اس نے سب سے پہلے ذکیہ خانم کی تصویر پر تیل چھڑکا جو اسے عطیہ کے قریب لے آئی تھی اور آج اس سے دور کر رہی تھی۔

اس نے اپنی تصویروں پر بھی تیل چھڑک دیا جو اس نے مہینوں اور برسوں کی محنت سے بنائی تھیں۔ عطیہ نے کڑے وقت میں بھی ان تصویروں کو بیچنے نہیں دیا تھا۔ وہ تصویریں آرٹ گیلری کی زینت بنی ہوئی تھیں۔ شائقین مرد، لڑکیاں، عورتیں تصویریں کو دیکھ کے عش عش کرتی تھیں اور منہ مانگی قیمتیں بھی دینے کے لیے تیار ہوتی تھیں۔

اس نے جیب سے ماچس نکالی۔ اس نے دیا سلائی نکالی اور جلانے کے لیے ڈبیا کے کنارے رگڑ رہا تھا کہ اس نے زینے پر قدموں کی چاپیں سنیں یہ مانوس چاپیں عطیہ کی تھیں۔ عطیہ آ رہی ہے! اس نے ایک پل کے ہزارویں حصے میں سب کچھ سوچا کہ وہ اتنی جلدی اپنا سب کچھ نچھاور کر کے آ گئی۔۔۔۔ شاید اپنی ماں کی تصویر لینے آئی ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ عطیہ کے اوپر پہنچنے سے پہلے ذکیہ خانم کی تصویر جل کے خاک ہو جائے۔ پہلی دیا سلائی اس نے عطیہ خانم کی تصویر کو لگائی پھر دوسری دیا سلائی وہ اپنی بنائی ہوئی تصویروں کو لگا دیں۔ تیسری دیا سلائی نکال رہا تھا کہ عطیہ داخل ہوئی۔ اس نے جو یہ منظر دیکھا تو بھونچکی سی ہو گئی۔ جیسے تصویریں نہیں اس کے بچے جل رہے ہوں۔ دوسرے لمحے وہ پاگلوں کی طرح دوڑتی ہوئی اپنی ماں کی تصویر کے پاس پہنچی جس کے فریم کو آگ پکڑ رہی تھی۔ تصویر کے کینوس پر ابھی آگ نہیں پہنچی تھی۔ وہ سوتی ساڑھی پہنی ہوئی تھی اس نے ساڑھی کے پلو سے کسی نہ کسی طرح آگ بجھا دی۔ آگ بجھ گئی تھی۔ اس کی جگہ دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس نے پلٹ کے دیکھا۔ شیراز کی تینوں تصویریں آگ کی لپیٹ میں آنے ہی والی تھیں۔ شہزاد اپنی چوتھی تصویر کو آگ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے لپک کے ساڑھی نکال کے تصویروں کی آگ کسی نہ کسی طرح بجھا دی۔ صرف ایک تصویر کا فریم متاثر ہوا تھا۔ باقی تصویروں کے صرف فریم جل گئے تھے۔

اس نے شہزاد کے پاس جا کے ماچس چھین لی

''یہ کیا پاگل پن ہے شہزاد۔۔۔! معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا دماغ ٹھکانے نہیں ہے۔۔۔ تم اپنے لختِ جگروں کو جلا رہے ہو۔۔۔ انہیں بھسم کر رہے ہو۔۔۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

''میرا دماغ ٹھکانے نہیں ہے۔'' شہزاد نے استہزائیہ انداز سے اپنے آپ سے سوال کیا اور پھر وہ عطیہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تم میری اس حرکت کو پاگل پن کہہ رہی ہو۔۔۔ اگر یہ پاگل ہے تو پاگل پن ہی سہی۔۔۔ مجھے مت روکو۔۔۔ میں ایک ایک تصویر کو نذرِ آتش کرنا چاہتا ہوں۔ لاؤ ماچس مجھے دے دو۔''

''آخر کیوں شہزاد۔۔۔! یہ تمہیں بیٹھے بٹھائے اچانک کیا ہو گیا ہے۔ یہ تم پر کیا دورہ پڑا ہے۔۔۔'' عطیہ حیران پریشان ہو رہی تھی

''مجھے کچھ نہیں ہوا ہے بلکہ آج میری نظروں کے سامنے سے اچانک پردہ ہٹ گیا ہے۔۔۔ اب مجھے تمہارا اصل چہرہ نظر آ گیا ہے جو نہایت گھناؤنا، مکروہ اور قبیح ہے۔'' شہزاد نے تھک کے جواب دیا۔

عطیہ چکرا سی گئی۔ اس کے لیے شہزاد کا روپ بالکل نیا تھا۔ اس کے لہجے سے نفرت اور حقارت ٹپک رہی تھی۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ شہزاد ایسی باتیں بھی کہہ سکتا ہے جو اس کا دل چیر دیں گی۔ وہ حیرت، خوف اور صدمے سے کھڑی شہزاد کو دیکھ رہی تھی۔

''میں نے تم دونوں کی ساری گفتگو سن لی تھی۔'' شہزاد نفرت بھرے لہجے میں کہنے لگا۔ ''تم رختِ سفر باندھ رہی ہو نا شیرازی کے ساتھ اور تم اسے اپنی ماں کی تصویر دے رہی ہو نا۔۔۔ اب تمہارے دل کے کونے میں شیرازی کی شخصیت نے پناہ لے لی ہے نا۔۔۔ تم دونوں کئی دنوں سے محبت کا ڈرامہ رچا رہے ہو۔ تم اپنے حسن و شباب اور اپنی بجلی بھری بھرپور جوانی سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہو نا اس لیے کہ آج میں معذور ہوں۔ تمہارا دل مجھ سے بھر چکا ہے۔ اب تم یہ نہیں چاہتیں کیونکہ ایک لنگڑے لولے کے ساتھ۔۔۔'' اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ اس کی عجیب سی جذباتی کیفیت ہو رہی تھی۔

''اوہ شہزاد۔۔۔!'' وہ تڑپ کے اس کے روبرو آ کھڑی ہوئی۔ ''تم میری محبت پر بہتان لگا رہے ہو۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ تم نے مجھے اور ہماری باتوں کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ میں نے شیرازی سے تمہاری مصنوعی ٹانگ اور علاج کے بارے میں بات کی تھی۔ اس نے ایک روز آ کے بتایا تھا کہ تمہارا علاج لندن میں ہو سکتا ہے۔ ٹانگ، علاج، ڈاکٹر اور سفر کے اخراجات پر دو ڈھائی لاکھ روپے کے اخراجات آئیں گے۔ میں یہ بات سن کے بہت خوش ہوئی تھی اور جھوم جھوم جاتی تھی کہ تم مصنوعی ٹانگ کے لگ جانے سے آسانی سے چل پھر سکو گے۔ پھر میں نے اپنی ماں کی بنائی ہوئی تصویر تین لاکھ میں شیرازی کے ہاتھ بیچ دی۔

شہزاد! اس لیے کہ ایک عورت اور بیوی کے لیے شوہر سے زیادہ دنیا کی کوئی قیمتی سے قیمتی شے بھی عزیز نہیں ہو سکتی ہے نہ ہوتی ہے۔۔۔ یہ تصویر کیا چیز ہے شہزاد! ایسی ہزاروں تصویریں تم پر قربان کر سکتی ہوں۔ کیا ہوا تم معذور ہو گئے۔۔۔ تم آج بھی میرے لیے دنیا کے سب سے خوب صورت اور سب سے پیارے مرد ہو۔''

ہنسی علاج غم ہے

ایک ماہر نفسیات بہت زور و شور سے اپنی خوبیاں بیان کر رہا تھا۔

''میں کسی بھی شخص پر صرف ایک نظر ڈال کر یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔''

''لیکن یہ جان لینے کے بعد آپ کو شرمندگی تو ہوتی ہو گی۔'' ایک آدمی بولا۔

☆☆☆

سواری (تانگے والے سے): ''اسٹیشن کے کتنے لو گے؟''

تانگے والا: ''بھائی! اسٹیشن میری ملکیت نہیں جو اس کے پیسے لوں۔''

پہلی قسط

چمگادڑ

ایم اے راحت

ایک شخص کی داستان جس نے زندگی کی حقیقتوں سے آشکار ہونے کے بعد اپنی نئی منزلوں کی تلاش شروع کر دی۔ وہ جو رشتوں پر یقین رکھتا تھا۔ اپنوں کی لالچ کا شکار بنا۔ اس کے خلاف بنی سازشوں نے اسے ایک مختلف انسان بنا دیا۔ وہ ہر مشکل کے سامنے سینہ سپر تھا۔

زندگی کے نشیب و فراز اور عروج و زوال کی ایک انوکھی داستان جو لمحہ بہ لمحہ آپ کو تجسس کے سحر میں جکڑ لے گی۔

عمران ڈائجسٹ کا نیا پر تجسس دل ہلا دینے والا سلسلہ

ملکہ ہانس اپنے نام کی طرح خوب صورت۔ ہرے بھرے پنجاب کی ایک حسین روایت میرے اجداد کی سرزمین ہے۔ ہم صدیوں سے یہاں آباد ہیں۔ بے شمار روایتیں ہمارے خاندان سے منسوب ہیں۔ میں وہاں سے دور لاہور میں تعلیم حاصل کررہا تھا لیکن جب بھی میں ملکہ ہانس کا تذکرہ کرتا میرا سر فخر سے اونچا ہوجاتا۔

ایک دن میں اپنے کاموں میں مصروف تھا کہ بڑے بھائی عارف علی کا فون موصول ہوا۔

''شہزاد۔۔۔! فوراً گھر پہنچو۔'' یہ کہہ کر انہوں نے موبائل بند کردیا۔ میں پریشان ہوگیا۔ میرا ذہن گھر کے مسائل کے بارے میں سوچنے لگا۔ دونوں بڑے بھائی سارا نظام سنبھالے ہوئے تھے۔ چھوٹا ہونے کی وجہ سے میرے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی تھی۔ میرا تعلق ایک زمین دار گھرانے سے تھا۔ پشتوں کی زمینیں تھیں جو نہ جانے کب سے ہمارے خاندان کی خدمت کررہی تھیں۔ ہمارے خاندان کے ہر بزرگ نے ان زمینوں میں اضافہ کیا تھا، چنانچہ یہ کافی پھیل گئی تھیں اور اب اطراف کے بہت سے باغات اور کھیت ہماری ملکیت بن چکے تھے۔ قدیم طریقۂ زراعت بھی تبدیل ہوچکا تھا۔ اسی طرح آبائی حویلی جو کسی دور میں کچی حویلی کے نام سے مشہور ہوچکی تھی اور اب تک کچی حویلی ہی کہلاتی تھی۔ علاقے کی سب سے خوب صورت عمارت بن گئی تھی جس میں ضروریاتِ زندگی کے جدید ترین لوازمات موجود تھے۔

میرے دونوں بڑے بھائی ان زمینوں کے نگراں تھے۔ سخت محنتی اور جفاکش تھے یہ دونوں۔ اب تک ان میں زمین داری کی شان نہ پیدا ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ اب بھی ٹریکٹر لے کر کھیڑی کرنے نکل جاتے اور زمین کو دھن کر رکھ دیتے تھے۔ والد صاحب کی عمر گو ساٹھ سال سے تجاوز کرچکی تھی، لیکن اب بھی وہ سو جوانوں کے جوان تھے۔ کوئی کام کرنے پر آتے تو جوانوں کو پیچھے چھوڑ دیتے۔ خدا نے کوئی بہن نہیں دی تھی ہمیں بلکہ خاندان بھر میں کوئی لڑکی نہیں تھی۔ میرے والد کی بھی کوئی بہن نہیں تھی، ہم بھی صرف تین بھائی تھے۔ تعلیم کا زیادہ رواج نہیں تھا ہمارے خاندان میں۔ میرے بھائیوں نے ہائی اسکول پاس کیا تھا اور زمینیں سنبھال لی تھیں۔ خدا بھلا کرے استاد محترم احمد علی کا جنہوں نے حصولِ تعلیم میں میری مدد کی تھی۔ پوری بستی میں صرف وہی ایسے تھے جن پر والد صاحب قبلہ آنکھیں بند کرکے اعتماد کرتے تھے اور ان کی کوئی بات نہیں ٹالتے تھے۔ ہائی اسکول کے بعد والد صاحب کے حساب سے میری تعلیم پوری ہوچکی تھی لیکن احمد علی صاحب نے انہیں مشورہ دیا کہ مجھے مزید تعلیم کے لیے لاہور بھیج دیا جائے۔

''میاں! یہ مزید تعلیم کیا ہوتی ہے؟'' والد صاحب نے پوچھا۔

''ستاروں سے آگے کی بات کررہا ہوں محسن میاں!''

''برادرِ من بچوں کو ستاروں سے پیچھے ہی رہنے دو، آگے بڑھ گئے تو ہاتھ سے نکل جائیں گے۔''

''گویا تمہیں اپنی تربیت پر بھروسا نہیں؟''

''یہ بات نہیں، خاندان کی روایت ختم ہوجائے گی، پڑھ لکھ کر یہ سُسرے زمینوں کا پیار بھول جائیں گے۔''

''معاف کرنا میاں محسن! یہ روایت تو تم انہیں دسویں پاس کرا کر توڑ چکے ہو۔''

''سمجھا کرو احمد علی! نئی تعلیم صرف ''بابو'' جنم دے رہی ہے۔ زمینیں اپنے رکھوالوں سے محروم ہوتی جارہی ہیں۔ بیوہ ہوگئی ہیں یہ۔ تم نہیں سمجھتے زمین کو، مرد کے پسینے سے یہ جوان ہوتی ہے اور۔۔۔''

''بس، بس۔۔۔ خوب قدر کررہے ہو، ان محبوباؤں کی، ان میں ہل چلا کر تم انہیں اپنے پسینے سے جوان کرتے تھے۔ اب ان میں ٹریکٹر کیوں گھسیٹتے پھرتے ہو، پسینے کی جگہ موبل آئل کیوں گراتے ہو؟''

''یہ کیا اول فول بک رہے ہو احمد علی؟''

"شہزاد تمہاری سفارش سے پاس نہیں ہوا ہے۔ پورے ضلع میں اول آیا ہے۔ اس کے راستے مت روکو۔ ایگری کلچرسٹ بناؤ اس کو۔ تمہاری زمینوں پر سونا اُگا دے گا۔ سنو محسن میاں! استاد ہوں اس کا میں، یہ شہر جائے گا اور تم کچھ نہیں بولو گے اس معاملے میں۔"

احمد علی صاحب اتنے مخلص، اتنے سچے، اتنے نیک نفس تھے کہ والد صاحب اس کے بعد کچھ نہیں بولے اور مجھے لاہور بھیج دیا گیا۔ میرے لیے تمام ضروری انتظامات کر دیے گئے اور میں تعلیم حاصل کرنے لگا۔ والدہ صاحبہ اس وقت انتقال کر گئی تھیں جب میں صرف دو سال کا تھا۔ ان کی تو شکل بھی یاد نہیں تھی مجھے، لیکن بڑے بھائی اور بابا جی بہت دن تک یاد آتے رہے۔ پھر میں شہر کے ماحول کا عادی ہو گیا۔ میری تعلیم کے دوران ہی میرے دونوں بھائیوں کی شادی ہو گئی اور دو شہری بھابھیوں نے گھر کا نظام سنبھال لیا۔ میں مطمئن اور مسرور تھا۔ ہائی اسکول کا معیار برقرار رکھا تھا میں نے اور ہر کلاس میں بہترین پوزیشن لیتا رہا اور یونیورسٹی پہنچ گیا اور اب ایم اے فائنل کے بعد یونیورسٹی آف ایگری کلچر میں داخلہ لینے کا ارادہ تھا تا کہ زمینوں پر سونا اگانے کا فن سیکھ سکوں۔

لیکن بڑے بھائی کا فون موصول ہوا تو تمام تیاریاں کیں اور چل پڑا۔ دوست بُرا بھلا کہتے رہ گئے لیکن میں اپنے بڑے بھائی کے فون کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ راستے بھر ذہن الجھا رہا۔ سفر بے حد طویل محسوس ہو رہا تھا۔ نجانے کیوں ذہن و دل میں اداسیاں گھر کر رہی تھیں۔ گھر پہنچنے کی کوئی اطلاع نہیں دی تھی، اس لیے جیپ مجھے لینے اسٹیشن نہیں پہنچی، چنانچہ تانگہ کر کے بستی چل پڑا۔ تانگے والا میری ہی بستی کا آدمی تھا۔ میں تو اسے نہیں پہچانتا تھا لیکن وہ مجھے جانتا تھا۔ کئی بار میں نے محسوس کیا جیسے وہ کچھ بولنا چاہتا ہے لیکن ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

"کیا بات ہے تانگے والے! کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"کوئی بات نہیں چھوٹے مالک!" اس نے کہا۔

"چھوٹے مالک۔۔۔! مجھے جانتے ہو کیا؟"

"ہم رمضان خان ہیں جی۔۔۔ آپ ہی کی بستی کے ہیں۔"

"اوہ، اچھا۔ بھئی مجھے تم لوگوں سے اتنی دور زندگی گزارنی پڑتی ہے کہ اپنی بستی والے بھی یاد نہیں رہے۔"

"ہم بھی اسکول میں پڑھتے تھے چھوٹے مالک! آپ بڑی جماعت میں تھے۔"

"کمال ہے، یا تو تم بدل گئے ہو یا پھر میری یادداشت اتنی خراب ہے کہ میں تمہاری شکل بھول گیا ہوں۔" میں نے کہا اور رمضان خان ہنسنے لگا۔ دفعتاً میرے ذہن میں حویلی کا خیال آیا اور میں نے پوچھا۔

"حویلی کے حالات کیسے چل رہے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں مالک! پر وہ بات کہاں جو بڑے مالک کے دور میں تھی۔ حویلی پر بڑی اداسی چھا گئی ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے اس کے الفاظ پر متعجب ہو کر پوچھا۔

"بڑے مالک کے دور سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میرے یہ الفاظ شاید رمضان خان کے لیے بھی تعجب خیز تھے۔ وہ اتنا بوکھلایا کہ اس نے تانگہ روک دیا اور گردن گھما کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"بڑے مالک کو کیا ہوا رمضان خان؟" میں نے بے چینی سے سوال کیا اور وہ حیرت سے بولا۔

"تو کیا آپ کو نہیں معلوم مالک؟"

"کیا نہیں معلوم؟"

"یہی کہ۔۔۔ یہی کہ۔۔۔ بڑے مالک اس دنیا میں نہیں ہیں۔" رمضان خان نے کہا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے تانگہ الٹ گیا ہو۔ زمین اوپر آ گئی ہو اور میں اس کے نیچے دب گیا ہوں۔

''ہمیں افسوس ہے مالک! مگر ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ آپ کو۔۔۔''

رمضان خان نے تانگہ آگے بڑھایا لیکن میرا دل سینے میں ڈوبا جارہا تھا۔ کانوں کے پردے پھٹے جارہے تھے۔ دماغ پر ہتھوڑے پڑرہے تھے۔ یہ کیسے ہوگیا۔۔۔ کب ہوگیا۔۔۔ ناقابلِ یقین بات تھی۔ کیا وہ بیمار تھے۔ مجھے ان کی بیماری کی خبر کیوں نہ دی گئی۔ ان کا انتقال کب ہوا۔ کہیں یہ پاگل دیہاتی بکواس تو نہیں کررہا۔ سچ بول رہا ہے تو یقین کیسے کروں۔ بات ہی ایسی تھی۔

''رمضان خان۔۔۔!'' میں نے بمشکل اسے پکارا۔

''جی مالک۔۔۔!''

''تُو کون سی بستی کا ہے۔ مجھے جانتا بھی ہے یا بس یونہی۔۔۔''

''ہم سے بھول ہوگئی مالک! ہمیں یہ بات کب معلوم تھی۔ ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ آپ کو خبر نہ ہوگی۔ یہ خبر ہمیں نہیں سنانی چاہیے تھی۔'' رمضان خان نے کہا۔

''تُو کون سی بستی کا ہے رمضان خان؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''آپ کی بستی کے ہیں مالک! گڑھی خدا بخش کے۔''

''بڑے مالک کا نام معلوم ہے تجھے؟''

''کیوں نہیں مالک! ہمارے باپ نے بھی ان کا نمک کھایا ہے۔'' رمضان خان نے کہا اور مجھے میرے والد کا نام بتایا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ راستہ ہزاروں میل لمبا لگنے لگا۔ آنکھوں میں نمی اُتر آئی، حلق بند ہوا جارہا تھا۔ میں نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔

''کب انتقال ہوا ان کا؟''

''اب تو مہینے سے بھی اوپر ہوگیا مالک! چالیسواں ہونے والا ہے۔'' رمضان خان نے جواب دیا۔

''بیمار ہوگئے تھے؟''

''لُو لگی تھی سرکار! زمین سے آرہے تھے۔ راستے میں کنویں پر پانی پیا، بس لُو لگ گئی۔ دو گھنٹے میں چٹ پٹ ہوگئے۔ پوری بستی تین دن سوگ میں ڈوبی رہی تھی۔'' رمضان خان نے کہا۔

میں خاموش ہوگیا۔ کائنات تاریک ہوگئی تھی، دل و دماغ میں جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا۔ خدا خدا کرکے بستی آئی، حویلی پہنچا۔ ملازم مجھے دیکھ کر دہاڑے مارنے لگے۔ بڑے بھائی موجود تھے۔ مجھے سینے سے لگا کر رونے لگے۔ لیکن میں نہیں رویا تھا۔

''مجھے اطلاع کیوں نہیں دی گئی؟''

''مرحوم نے خاص طور پر حکم دیا تھا کہ جب تک تمہارے امتحانات نہ ہوجائیں تمہیں اطلاع نہ دی جائے۔ انہیں اپنی موت کا یقین ہوگیا تھا۔''

''یہ اچھا نہ ہوا۔ مجھے ان کی آخری بار صورت دیکھنے سے بھی محروم کردیا گیا۔''

''ان کی وصیت تھی۔ میں نے چچا احمد علی سے بھی مشورہ کیا تھا۔ انہوں نے بھی یہی رائے دی کہ تمہارا مستقبل خراب نہ کیا جائے۔''

''لیکن آپ لوگوں نے مجھے ساری زندگی کے کرب میں جو مبتلا کردیا اُس کا ذمہ دار کون ہوگا؟''

''تمہاری شکایت بجا ہے شہزاد! لیکن ہماری مجبوریاں بھی تھیں۔'' پھر منجھلے بھائی عارف علی بھی آگئے اور کافی دیر تک آنسو اور آہیں ابھرتی رہیں۔ میں گم صم بیٹھا رہا تھا۔ یادیں ذہن میں ابھر رہی تھیں۔ ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔ میرے والد مثالی باپ تھے۔ ایسے باپ جن کی اولادوں کو کبھی ان سے کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی۔ بعد میں قبر پر گیا، پھول چڑھائے، فاتحہ پڑھی لیکن حویلی اجنبی، اجنبی لگ رہی تھی، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس سے سارے تعلق ختم ہوگئے ہوں حالانکہ بھائی تھے، بھابھیاں تھیں، لیکن وہ بات نہ رہی تھی جو باپ کی موجودگی میں تھی۔

شہری بھابھیاں شروع ہی سے الگ تھلگ رہتی

تھیں۔ لاہور سے چند روز کے لیے آتا تھا، زیادہ گھلنے ملنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کے علاوہ بارہا اُن میں ایک بات محسوس کی تھی لیکن ایسی چھچھوری اور عامیانہ بات تھی کہ ذہن میں آتی تو لاحول پڑھنا شروع کر دیتا۔

میرے دونوں بھائی واجبی سی شکل و صورت کے مالک تھے۔ ان کے تن و توش بھی غالباً ذمہ داریوں کی نذر ہو گئے تھے جبکہ میں چھ فٹ کا سرخ و سفید جوان تھا۔ میرے رخساروں پر خون کی سرخی موجزن تھی اور بدن چیتے کے بدن کی طرح سڈول اور چست تھا۔ جدید شہری لباس میری شان اور بڑھا دیتے تھے اور میں نے بھابھیوں کی آنکھوں میں حسد کے جذبات محسوس کیے تھے۔ دو چار جملے بھی ان کے منہ سے سنے تھے جو میرے اس احساس کو ہوا دیتے تھے لیکن وہ میری بھابھیاں تھیں۔ ایک طرح سے ماں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ کسی فضول بات کو میں اپنے ذہن میں کبھی جگہ نہ دے سکتا تھا۔ لیکن یہ احساس ضرور بارہا میرے دل میں پیدا ہوا تھا کہ انہوں نے مجھے وہ اپنائیت نہیں دی تھی جو دیوروں اور بھابھیوں کے درمیان ہوتی ہے۔

اب بھی ان کا وہی رویہ تھا۔ سب لوگ مجھ سے ملے تھے، تسلیاں دی تھیں لیکن دونوں بھابھیاں دور دور رہی تھیں۔ وہ رسم نبھانے بھی نہیں آئی تھیں۔

کئی دن گزر گئے۔ چالیسواں قریب تھا۔ ایک شام اس سلسلے میں صلاح مشورے ہوئے، بھابھیاں بھی شریک تھیں۔

''چالیسویں کی فاتحہ کے بارے میں طے کرنا ہے شہزاد! تمہارا کیا خیال ہے۔''

''کیا جائے، خیال کیا معنی رکھتا ہے۔''

''میرا مطلب ہے کس پیمانے پر۔ سادگی سے فاتحہ کرا دی جائے یا رشتہ داروں کو بلایا جائے۔''

''کیوں؟ سادگی کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔'' میں نے پوچھا۔

''صاف بات کیوں نہیں کرتے عارف! شہزاد بھی گھر کے ذمہ دار ہیں۔ گھر کے حالات کب تک چھپاؤ گے ان سے۔'' چھوٹی بھابھی نے کہا۔

''کیا حالات ہیں گھر کے بھابھی! کیا بات ہے عارف بھائی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

دونوں بھائی گردن جھکائے بیٹھے تھے۔ پھر بڑے بھائی نے کہا۔

''یہ بات تازہ نہیں شہزاد! سالہا سال سے ہم پریشانی کے شکار ہیں۔ لاکھوں روپے کے مقروض ہو چکے ہیں ہم لوگ، چاروں باغ رہن ہیں۔ نئی بستی والی زمین بھی فروخت ہو چکی ہے۔ کئی مہاجنوں کو سود جاتا ہے۔ ان دنوں بڑی پریشانی سے گزر بسر ہو رہی ہے۔''

''مگر کیوں۔۔۔؟ ایسا کیوں ہوا؟''

''بابا صاحب سے حساب پوچھنے کی ہمت کس میں تھی۔''

''ناممکن، مجھے تو کبھی اس کی بھنک بھی نہیں ملی۔''

''تمہیں تو آزاد چھوڑ دیا گیا تھا۔ بابا صاحب تمہارے ذہن پر برا اثر نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔''

''لیکن آپ لوگوں نے تحقیقات تو کی ہوتی۔ میں تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔''

''جب تک بابا صاحب نے سارے حساب ہمارے حوالے نہیں کیے تھے۔ ہم بھی نہیں سوچ سکتے تھے۔ ہم مقابلے میں تباہ ہوئے۔ بنجر زمین صرف اس لیے خریدی گئیں کہ زمینداروں سے مقابلہ چل رہا تھا۔ انہیں آباد کرنے کے لیے لاکھوں روپے قرض لے کر لگائے گئے لیکن زمینیں کچھ نہ دے سکیں۔ یوں بوجھ بڑھتے گئے۔''

میں پریشانی سے ان کی شکلیں دیکھتا رہا تھا۔

''یہ تو۔۔۔ یہ تو بہت برا ہوا بھائی! یہ تو بہت افسوس ناک حالات ہیں۔'' میں نے رندھی آواز میں کہا۔

''جب تک بابا صاحب زندہ رہے ساکھ بنی رہی۔ لیکن اب عزت سنبھالنی مشکل ہو گئی ہے۔''

عارف بھائی نے کہا۔

''چالیسواں تو ہونا ہی چاہیے اشرف بھائی! ان سارے حالات کے بارے میں بعد میں سوچیں گے۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ میں انتظام کرلوں گا۔ تم فکر مت کرو۔'' عارف بھائی نے کہا۔ طے یہ ہوا کہ چالیسواں دھوم دھام سے ہوگا۔ لیکن اس نئے شوشے نے میری رات کی نیند حرام کر دی۔ ناقابلِ یقین بات تھی۔ ایسا کیسے ہوگیا۔ ہمارے ہاں تو دولت کی ریل پیل تھی۔ اس موضوع پر کبھی بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ واقعی ہمارے خاندان کی مالی حالت پر کبھی شک نہیں کیا جاسکتا تھا۔ رات بھر میں شدید خلفشار کا شکار رہا۔ دوسری صبح بے چین ہوکر احمد علی چچا کے پاس پہنچ گیا۔ وہ میرے استاد بھی تھے اور مشفق بھی۔ بڑے پیار سے مجھ سے پیش آتے تھے۔

''میں اپنی بستی میں اجنبی ہوگیا ہوں چچا! وہ سننے کو ملا ہے جس کے بارے میں خواب میں بھی سوچا نہیں تھا۔''

''کیا ہوا بیٹے؟''

''میں جانتا ہوں چچا کہ میرے والد اس پوری بستی میں صرف آپ کے پرستار تھے۔ بہت محبت کرتے تھے وہ آپ سے۔''

''یہ حقیقت ہے بیٹے! میں بھی اپنے بھائی سے محروم ہوگیا۔'' احمد علی چچا آبدیدہ ہوگئے۔۔۔ پھر بولے۔

''لیکن کیا سنا ہے تم نے؟'' انہوں نے کہا اور میں نے پوری تفصیل انہیں سنادی۔ دوسروں کے لیے وہ ایک عام آدمی ہوں گے لیکن میرے مستقبل کی تعمیر میں انہوں نے بہت بڑا کردار ادا کیا تھا۔

احمد علی چچا بھی بہت حیران رہ گئے۔ پھر انہوں نے کہا۔

''باخدا مجھے ان معاملات کی ذرّہ برابر ہوا نہیں لگی، حیرت کی بات ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''مجھے کیا کرنا چاہیے چچا! میری راہنمائی کیجیے۔''

''خدا تمہاری راہنمائی کرے بیٹے! میری التجا ہے کہ تم مجھے اس آزمائش میں نہ ڈالو۔ یہاں میں خود کو بے بس پاتا ہوں۔ عارف اور اشرف سے بات کرو، تحقیقات کرو ان معاملات کی۔ اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔''

میں یہاں سے بھی مایوس ہوگیا۔ بھائیوں پر شک کرنا گناہ تھا لیکن کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

چالیسویں کا دن آگیا۔ کوئی کمی نہیں چھوڑی گئی تھی۔ نزدیک کی بستی سے ماموں احتشام احمد بھی چالیسویں میں شریک ہوئے تھے۔ احتشام احمد میری والدہ کے سگے بھائی نہیں تھے، دور کے رشتہ کے تھے۔ لیکن میرے والد کے ان کے ساتھ تعلقات بہتر نہیں تھے۔ پتا نہیں کیوں۔ بہرحال ان سے زندگی میں بس دو چار بار ہی ملاقات ہوئی تھی۔ بھائیوں کی شادی میں یا اب۔ میں نے ان کے ساتھ دوسروں کی بے اعتنائی محسوس کی اور خود انہیں سنبھال لیا۔ میں نے بڑی اپنائیت کا سلوک کیا ان کے ساتھ۔

فاتحہ ہوگئی۔ مہمانوں نے بڑے بڑے شامیانوں کے نیچے کھانا کھایا اور رخصت ہوگئے۔ بہت سے مہمان ابھی موجود تھے۔ جن میں ماموں صاحب بھی تھے۔ اسی وقت اندر سے بلاوا آیا اور میں اندر چلا گیا۔ مہمانوں کے بڑے ہال میں میرے دونوں بھائی دو آدمیوں کے ساتھ موجود تھے۔ نو وارد شکلوں ہی سے نمبردار نظر آتے تھے۔

''یہ چوہدری فضل اور ان کے منیجر ہیں شہزاد! چوہدری فضل نمبردار ہیں اور ہماری عزت نیلام کرنے آئے ہیں۔'' بڑے بھائی نے کہا۔

''ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ کیسی باتیں کررہے ہیں۔ بچہ کیا سوچے گا۔'' چوہدری فضل بولے۔

''میں نہیں سمجھا بھائی صاحب!'' میں نے پریشانی سے کہا۔

''انہیں کسی طرح پتا چل گیا کہ آج بابا صاحب

کا چالیسواں ہے اور مہمان آئے ہوں گے۔ یہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے آئے ہیں۔''

''کیسا فائدہ؟''

''ہم بتاتے ہیں تمہیں، بھائی! خدا کی قسم ہمیں نہیں معلوم تھا کہ آج بڑے چوہدری کا چالیسواں ہے۔ ہم تو کئی دن سے یہاں آنے کے لیے پریشان تھے۔ چھوٹی موٹی بات نہیں بھائی! پورے پچیس لاکھ کی بات ہے۔ ہم چپ رہتے پر پورا سال گزر گیا ہمیں سود بھی نہیں ملا۔ ہمارا کاروبار اس سے چلتا ہے اور پھر اسلام میں تو یہ بات خاص ہے کہ مرنے والے کے سارے قرضے ادا کر دیے جاتے ہیں۔ ہماری مشکل بھی حل کر دو۔''

''کیسے پچیس لاکھ، کیا بکواس کر رہے ہو تم؟''

''کاغذ موجود ہیں بھائی! بڑے چوہدری نے دستخط کیے ہیں جن پر۔ ہمارا کام کر دو بھائی! کیا فائدہ ہم تمہاری بستی کی پنچائیت بلائیں۔''

''دفعان ہو جاؤ یہاں سے۔ بعد میں بات کریں گے تم سے۔'' میں نے گرج کر کہا۔

''ادھار مانگنے نہیں آئے بھائی! بہت سوں کی عزت ہماری تجوری میں چھپی ہوئی ہے۔ تجوری نہ کھلواؤ تو ٹھیک ہے۔ اس وقت جا رہے ہیں۔ پر جلدی بات کر لینا ہاں۔۔۔'' چوہدری فضل نے کہا اور منیجر کو اشارہ کر کے باہر نکل گیا۔

''پچیس لاکھ ہیں اس کے۔ کیا بابا صاحب! نے کبھی اس کا اشارہ کیا تھا۔'' میں نے پریشانی سے پوچھا۔

''صاف بات تو نہیں بتائی تھی، لیکن میں نے سود کی رقم کئی بار دی تھی اسے۔'' عارف بھائی نے بتایا۔

''نجانے۔۔۔ نجانے یہاں کیا ہو رہا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔''

''اس وقت جانے دو۔ رات کو بات کریں گے۔'' اشرف بھائی نے کہا اور میں باہر نکل آیا۔ مہمان رخصت ہو رہے تھے۔ احتشام احمد ماموں میرے پاس آئے۔

''ہمیں بھی اجازت دو شہزادو میاں! اور کسی کو تو شاید ہمارے آنے کی خبر بھی نہیں ہے۔ بہر حال بہنوئی ہمارے لیے بڑی وقعت رکھتا تھا۔ بالکل ہی غیر بھی نہیں ہیں۔''

''معذرت خواہ ہوں ماموں جان! دراصل مصروفیت۔۔۔''

''کوئی بات نہیں ہے بیٹے! ایک سوال دل میں مچل رہا ہے۔ اجازت ہو تو پوچھ لوں۔۔۔؟''

''ضرور۔''

''ابھی میں نے چوہدری فضل کو یہاں دیکھا تھا۔ میری ہی بستی کا نمبردار ہے۔ بے حد کمینہ صفت انسان ہے بلکہ جانور ہے۔ کوئی خاص بات تو نہیں تھی؟''

''یہ آپ کی بستی کا رہنے والا ہے۔''

''میں رگ رگ سے واقف ہوں اس کی۔ بلا وجہ کہیں نہیں جاتا۔''

''یہاں بھی یہ بلاوجہ نہیں آیا۔ ماموں! میں آپ کے پاس آؤں گا کسی وقت، پھر آپ سے بات کروں گا۔''

''جب کہو گاڑی بھیج دوں۔ ہم تو تمہاری محبت کو ترسے ہوئے ہیں بیٹے۔۔۔! بچیاں بڑی حسرت سے کہتی ہیں کہ ان کے تین تین بھائی ہیں لیکن کوئی کبھی انہیں نہیں پوچھتا۔''

''میں خود حاضر ہو جاؤں گا ماموں جان! آپ مطمئن رہیں۔''

''انتظار کریں گے ہم سب!'' احتشام احمد نے کہا اور پھر وہ چلے گئے۔ ایک عمدہ سی جیپ میں آئے تھے، اس کا مطلب تھا کہ ان کے حالات خاصے اچھے ہیں۔

رات کو ایک خصوصی نشست ہوئی۔ عارف بھائی نے آج کا حساب پیش کر دیا۔ دونوں بھابھیاں بھی موجود تھیں۔

''یہ پیسے میں نے اس چوہدری فضل کے سود

کے لیے جمع کیے تھے۔ یہ سچ ہے کہ اسے ایک سال سے پیسے نہیں گئے۔ کچھ عجیب سی بات تھی۔ بابا صاحب زندہ تھے تو ہمیں ان معاملات کی کوئی فکر نہ تھی، اب یہ سب کچھ براہِ راست ہم پر آپڑا ہے۔''

''سسر جی ورثے میں قرضے چھوڑ گئے ہیں دیور جی! انہیں آپس میں تقسیم کرلو، سوچا تو یہ ہوگا کہ جائیداد کے حصے ہوں گے پر یہ تو تقدیر کی بات ہے۔'' چھوٹی بھابھی نے کہا۔

''کیا بکواس کررہی ہو رابعہ! تمہیں ان فضول باتوں کی کیا ضرورت ہے۔'' عارف بھائی بولے۔

''کیوں؟ کنیز ہوں اس گھر کی؟ ملازمہ بن کر آئی ہوں یہاں؟ ماں باپ نے بہت بڑے گھر میں شادی کی تھی کہ بیٹی عیش کرے گی۔ یہ عیش ہیں یہاں، عزت نیلامی پر رکھی ہے، ہائی اسکول پاس نہیں ہوں، بی اے کیا ہے میں نے۔ جاہل عورتوں کی طرح خاموش نہیں رہ سکتی۔ لوگ اسے میرا گھر کہتے ہیں، کیا یہی ہے میرا گھر۔''

میں خاموش رہا۔ غصے سے خون کھول اٹھا تھا لیکن مصلحت اسی میں تھی کہ خاموش رہوں۔ بڑی بھابھی کے چہرے پر بھی کچھ ایسے ہی تاثرات تھے۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اگر کچھ پریشانیاں ہیں بھائی! تو فکر نہ کریں، سب مل کر ان کا ازالہ کریں گے۔ کچھ سوچیں گے۔''

پھر میں باہر نکل آیا۔ ہوش اڑے جارہے تھے۔ بابا صاحب نے آخر دولت کہاں اُڑادی۔ یہ سب کیا ہے؟ تقسیم وغیرہ کے بارے میں تو میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ لیکن والد صاحب کے نام کو یوں بٹہ لگتے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کم از کم کچھ معلوم تو ہو۔ حالات معلوم کیے بغیر میں بھی سکون سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ بھائیوں سے پوچھ گچھ بھی ممکن نہیں تھی۔ لیکن جو کچھ ہورہا تھا اس پر گردن جھکائے رکھنا بے حسی تھی اور میں بے حس نہیں تھا۔

دو تین دن گزر گئے۔ اس کے بعد کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ دونوں بھائی بھی خاموش تھے۔ بھابھیاں تو خیر میرے سامنے بھی کم ہی آتی تھیں۔ مستقبل کے سارے خواب چکنا چور ہوگئے تھے۔ میں اس گھر سے بے دخل کردیا گیا تھا۔ بالکل ہی اجنبی محسوس کررہا تھا۔ لیکن تحقیقات ضروری تھی۔ احمد علی صاحب کے یہاں چلا جاتا تھا۔ وہ بزرگ ایسے نیک نیت تھے کہ ایک بار بھی انہوں نے میرے گھریلو حالات نہ کریدے۔ پھر ایک دن میں گھوڑا تیار کرکے چل پڑا۔ جیپ موجود تھی لیکن جان بوجھ کر نہ لی، کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا لیکن میرا رخ بستی جمال گڑھی کی طرف تھا جہاں احتشام احمد رہتے تھے۔ راستے میں میرا ذہن خیالات میں الجھا رہا تھا۔ بڑے فاصلے پیدا ہوگئے تھے ہم بھائیوں میں نہ جانے کیوں؟ میرے دل میں تو کسی کے لیے کوئی بات نہیں تھی۔ یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ احتشام احمد کو اس سلسلے میں سب کچھ بتادوں گا۔ آخر کوئی تو ہو جو کوئی مشورہ دے سکے۔ اتنا بے وقوف بھی نہیں تھا کہ لوگوں کی حقیقت نہ جان سکوں۔

ماموں صاحب کے مکان کی تلاش میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ بستی کے پہلے ہی آدمی سے پوچھا، تو وہ میرے گھوڑے کی لگام پکڑ کر چل پڑا اور اس نے مجھے ماموں صاحب کے مکان پر چھوڑ دیا۔ بہت عمدہ مکان بنا ہوا تھا۔ احاطے میں جیپ کھڑی ہوئی تھی، میری اس گھر میں آمد گویا عید کی آمد تھی۔ ممانی صاحبہ، تین بہنیں اور دو نوجوان اس طرح لپٹ گئے کہ مجھے اب تک یہاں نہ آنے پر شرمندگی ہونے لگی۔ خود ماموں صاحب بچھے جارہے تھے۔ میرے گھوڑے تک کا احترام کیا جارہا تھا۔ غرض وہ اپنائیت ملی تھی یہاں کہ کبھی اپنے گھر میں بھی ایسا نہ ہوا تھا۔ متاثر تو ہونا ہی تھا۔

پہلا دن ایسا گزر گیا کہ احساس بھی نہ ہوسکا۔ ماموں صاحب نے بہت سے دوستوں سے ملوایا۔ اچھے تعلقات تھے ان کے لوگوں سے۔ رات کو دسترخوان پر بھی کئی خاندان تھے، لڑکے اور لڑکیاں چھلیں کررہے تھے۔ ہمارے گھر کی نسبت ماموں

جان کا گھرانہ بہت جدید تھا۔ نمایاں فرق محسوس ہوا تھا۔ ماموں زاد بہنیں شرارتیں کرتی رہی تھیں، اچھی شکل وصورت کی لڑکیاں تھیں، تعلیم زیادہ نہ تھی لیکن سلیقہ تھا۔ میں بھی ان سے کھل مل گیا۔

رات کو ماموں جان کے ساتھ تنہا نشست ہوئی۔

''تم ان لوگوں کے لیے متبرک ہو شہزاد! ہمیشہ آرزو کرتی رہی تھیں، اب آرزو پوری ہوئی ہے تو بے قرار ہوگئی ہیں۔''

''مجھے افسوس ہے کہ اس سے قبل یہاں کیوں نہ آیا۔ ویسے میں یہ سوال بھی کرنا چاہتا تھا آپ سے ماموں جان!''

''کیسا سوال؟''

''آپ ہمارے خاصے قریبی عزیز ہیں لیکن تعلقات واجبی سے رہے، جبکہ بابا صاحب بھی ایسے بداخلاق نہ تھے۔ اس کشیدگی کی کوئی خاص وجہ تھی؟''

میرے اس سوال پر ماموں جان پہلے خاموش ہوگئے پھر مسکرانے لگے۔ پھر بولے۔

''بڑا مشکل سوال کر ڈالا ہے تم نے۔ جواب ضروری سمجھتے ہو؟''

''جی ہاں، جاننا چاہتا ہوں۔''

''تو تمہیں سچ بتانے کے لیے ذرا سا بے تکلف ہونا پڑے گا، محسوس تو نہ کرو گے؟''

''نہیں۔۔۔ فرمائیے۔''

''بھئی انیقہ مرحومہ میری پھوپی زاد بہن تھی اور بچپن سے میری منگیتر تھی، ہمارے والدین نے بڑی چاہ سے ہمارا رشتہ بچپن ہی میں طے کر دیا تھا اور میں اسے اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔ زمینداری کی زندگی تھی، میں برے دوستوں کی صحبت میں پڑ کر رنگین مزاج ہوگیا اور یہ بات عام ہوگئی کہ میرے رنگ ڈھنگ ٹھیک نہیں ہیں۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ لیکن اس وقت مجھے یہ احساس نہ تھا کہ میں اتنے بڑے خسارے سے دوچار ہوں گا۔ تمہارے نانا نے یہ رشتہ توڑ دیا اور مرحوم محسن علی خان سے نسبت طے کر ڈالی۔ میں برداشت نہ کر سکا، میں نے بڑے ہنگامے کیے یہاں تک کہ بندوق لے کر تمہارے والد کے گھر جا پہنچا اور دھمکیاں دیں کہ اگر انہوں نے عظیم صاحب کے یہاں رشتہ کیا تو میں خون کی ندیاں بہادوں گا لیکن وہ لوگ بھی بزدل نہ تھے۔ محسن علی نے بھی بندوق سنبھال لی۔ بزرگوں نے معاملہ برابر کیا اور بہر حال انیقہ کی شادی محسن مرحوم سے ہوگئی۔ بعد میں ہم بھی پہاڑ کے نیچے آگئے اور اس کے بعد پھر سب ٹھیک ہوگیا۔ میں نے محسن مرحوم سے معافی بھی مانگ لی لیکن اس خاندان سے دوبارہ تعلقات استوار نہ ہوسکے۔ تمہاری پیدائش کے دو سال بعد انیقہ اللہ کو پیاری ہوگئی۔ خدا کی قسم میں ایک بہن کے رشتے سے اس کے لیے بہت رویا تھا۔ بعد کی ساری کوششیں ناکام رہیں اور وہ ماحول پیدا نہ ہوسکا جو ہونا چاہیے تھا۔ یہ تھی ہماری کشیدگی کی وجہ جس کی زد میں بچے بھی آگئے۔''

''اوہ۔۔۔!'' میں نے گہری سانس لی۔

''گزری ہوئی داستانیں ہیں۔ یہ بتاؤ گھر کہہ کر آئے ہو؟''

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''تشویش نہیں ہوگی کسی کو؟''

''شاید کسی کو ہو۔ میں دعوے سے نہیں کہہ سکتا۔'' میں نے جواب دیا۔ میرے اس جواب پر ماموں صاحب کچھ سوچتے رہے پھر بولے۔

''گویا میرا اندازہ درست تھا۔''

''کیسا اندازہ ماموں صاحب؟''

''بھئی بدنام انسان ہوں۔ اس گھرانے کے لوگ مجھے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے نہ سہی لیکن جو کچھ ہو رہا ہے اس پر خاموش تماشائی بن کر نہیں رہ سکتا۔ پہلے اپنی نیت تم پر واضح کر دوں شہزاد میاں! خدا کا دیا سب کچھ موجود ہے۔ بیٹیوں کا جہیز تیار کر چکا ہوں۔ بیٹے پڑھ رہے ہیں۔ انہیں صحیح تعلیم دے دوں تو سوچوں گا سب کچھ دے دیا۔ خود کمائیں گے کھائیں گے۔ اتنا ضرور چھوڑ دوں گا ان کے لیے کہ

انہیں ابتدائی زندگی میں مشکل نہ ہو، چنانچہ یہ سمجھ لو کہ جو کچھ کہوں گا بے لوث ہوگا اور صرف حق کا ساتھ دینے کی بات ہوگی۔ جس کا صلہ کسی انسان سے نہیں خدا سے چاہوں گا۔ تم سے اگر کچھ مانگوں تو یقین کر لینا کہ صرف لالچی اور خودغرض انسان ہوں، بس یہ خواہش ہے کہ جو کچھ کہوں اس پر یقین کر لینا۔"

"میں آپ کی بے حد عزت کرتا ہوں ماموں جان! ایسی بات نہ کہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے تو محسن بھائی کی موت کی اطلاع بھی نہیں دی گئی تھی لیکن میرے دوست احباب تمہاری بستی جاتے رہتے ہیں۔ چنانچہ مجھے وہاں کی خیریت ملتی رہتی ہے۔ انہیں میں سے کسی نے مجھے محسن بھائی کی اچانک موت کی اطلاع دی تھی۔ بچہ بچہ اس موت میں شرکت کے لیے بے چین تھا لیکن میں ہمت نہ کر سکا۔ میری بات دوسری تھی۔ سب کچھ برداشت کرنے کے لیے تیار تھا لیکن عورتیں، عورتیں ہوتی ہیں۔ میری وہاں آمد کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھا گیا، اجنبیوں کی طرح جنازے میں شریک ہوا۔ گھر سے کہہ کر گیا تھا کہ سوئم تک رہوں گا، واپس آجاتا تو گھر والوں کے سامنے سبکی ہوتی چنانچہ سوئم تک ایک سرائے میں رکا، روزانہ بچوں کی خیر خیری کو جاتا تھا، دل سے مجبور تھا، جنازے ہی میں تمہیں نہ پا کر دبی زبان سے ٹوکا کہ شہزاد میاں کی موجودگی ضروری ہے لیکن کہا گیا کہ اس کے امتحانات ہو رہے ہیں اُسے اطلاع نہیں دی جائے گی لیکن وہاں غم کے مارے سوگوار ہونے کے بجائے حساب کتاب کے کھاتے کھولے بیٹھے رہتے تھے۔ سارے کارندے بلائے گئے تھے۔ منشی اکرم نواز بھی نئے کھاتے بناتے رہے تھے اور دوسرے لوگ ان کی معاونت کرتے رہے تھے۔ پرانے کھاتوں کا خدا جانے کیا ہوا۔ سارے نئے کھاتے تیار ہوئے۔ مجھ بدنصیب نے سوئم پر بھی درخواست کی کہ شہزاد کو بلا لیا جائے لیکن نقار خانے میں طوطی کی صدا کون سنتا۔ ابھی تو بہت سے کام باقی تھے۔ اگر شہزاد آجاتا تو جائیداد تین حصوں میں تقسیم کرنا پڑتی۔ اتنی جلدی یہ سب کچھ کیسے ہضم ہو سکتا تھا چنانچہ شہزاد کو اطلاع نہ دی گئی اور سب کچھ ہو گیا۔ میں تو بیٹے! چالیسویں پر بھی تمہاری موجودگی کی توقع نہیں کر رہا تھا لیکن شاید سب ٹھیک ہو گیا ہوگا۔"

ماموں صاحب کی باتیں میرے ذہن پر ہتھوڑے کی ضربیں بن کر پڑ رہی تھیں۔ کیا میرے بھائی ایسے ہیں۔ کیا وہ جائیداد کے لیے میرے ساتھ یہ سلوک کر سکتے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"ایک بات پوچھ سکتا ہوں شہزاد؟"

"جی۔۔۔" میں نے گھٹے گھٹے لہجے میں جواب دیا۔

"چوہدری فضل چالیسویں کے دن وہاں کیوں پہنچا تھا؟"

"اس سوال کے کئی جواب ہیں ماموں صاحب! بقول میرے دونوں بھائیوں کے، ہمارے پاس اب کچھ نہیں ہے، سب کچھ نامعلوم طریقے سے تباہ ہو چکا ہے، بہت سی زمینیں بک گئی ہیں۔ چوہدری فضل اپنے پچیس لاکھ کے لیے ہماری عزت کی نیلامی کرنے آیا تھا۔ بڑی خوشامد درآمد سے وہ خاموش ہوا۔ اسے پچیس لاکھ روپے کا سود ایک سال سے نہیں ملا ہے۔ ایسی ہی بہت سی باتیں میرے علم میں لائی گئی ہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ۔۔۔ خدا کی قسم لعنت ہے، لعنت ہے ایسے لوگوں پر، تم سے وہ کیا چاہتے ہیں؟"

"اس کا کوئی اظہار نہیں کیا گیا۔"

"صرف ایک ثبوت میں دے سکتا ہوں تمہیں۔ صرف ایک ثبوت۔ چوہدری فضل کے سلسلے میں وہ لوگ مار کھا گئے، اور کوئی بھی انتظام کیا ہو انہوں نے لیکن چوہدری فضل پچیس لاکھ کی رقم۔۔۔ وہ پچاس سال میں بھی کسی کو نہیں دے سکتا۔ لاکھ دو لاکھ کے ہیر پھیر کا آدمی ہے۔ میں اس سے زیادہ اس کی اوقات جانتا ہوں۔ تم چاہو تو دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہو سکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"ہمت کرنی ہوگی۔ انتظامات میں کروں گا۔"

"میں تیار ہوں ماموں صاحب! اور کوئی بات ہوتی تو ٹھیک تھا لیکن اس طرح میرے مرحوم باپ پر کیچڑ اچھالی جارہی ہے۔" میں نے کہا۔

"انتظامات کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ تم اگر چاہو تو اس دوران واپس چلے جاؤ تاکہ ان لوگوں کو شبہ نہ ہوسکے۔ ان کے دلوں میں چور ہے کہیں وہ ہماری کھوج میں نہ ہوں۔"

"کوئی حرج نہیں ہے ماموں صاحب! میں صورت حال معلوم کرکے ہی جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"تب یہاں آرام کرو۔ میرا نام احتشام احمد ہے۔ اچھے اچھوں کے دانت کھٹے کردیے ہیں میں نے۔ شہزاد! میں بھائیوں میں اختلافات کرا کر کوئی فائدہ حاصل کرنے کا خواہش مند نہیں ہوں لیکن تم تنہا رہ گئے ہو اور ان دونوں نے تمہارے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔ میں حق کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ ہم انہیں عدالتوں میں گھسیٹیں گے۔ ایک ایک پائی نکلوالیں گے ان کے حلق سے۔ جتنی دولت خرچ ہوگی تمہاری طرف سے میں کروں گا۔ میں انصاف کا بول بالا چاہتا ہوں۔ بس اب آرام سے سوجاؤ۔ میں کل تیاری کرکے تمہیں بتاؤں گا کہ اب کیا کرنا ہے۔"

ماموں صاحب سے رخصت ہوکر میں اپنے کمرے میں آگیا جو میرے لیے تیار کرلیا گیا تھا۔ لیکن نیند کا آنکھوں میں دور تک پتا نہیں تھا۔ طبیعت میں بے حد بے چینی تھی۔ میں نے دونوں بھائیوں کو بہت بڑا سمجھا تھا، وہ ایسے نکلیں گے، یہ سب کچھ ہوگا میرے ساتھ۔ بھابھیاں تو کھل کر بے اعتنائی کررہی تھیں لیکن بھائی۔۔۔ کیسی عجیب ہے یہ دنیا۔۔۔ بے چینی ایسی بڑھی کہ کمرے میں دم گھٹنے لگا۔ دو گھنٹے گزر گئے تھے ماموں کے پاس سے آئے ہوئے۔ اُن میں سے ایک لمحہ سکون سے نہیں گزرا تھا۔ باہر تاریک رات کے سناٹے پھیلے ہوئے تھے۔ سوچا کسی پرسکون گوشے میں جاکر کھلی ہوا میں بیٹھوں گا۔ باہر نکل آیا۔

کمروں کی قطار میں سے ایک کمرا روشن تھا۔ یہ ماموں ممانی کا کمرا تھا۔ باہر جانے کے لیے اس کے سامنے سے گزرنا تھا۔ اندر باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کمرے کا دروازہ بند نہیں تھا۔ میں نے سوچا اگر وہ دونوں جاگ رہے ہیں تو پھر ان سے ہی باتیں کروں۔۔۔ دروازے کے قریب پہنچا تو اپنا نام سنا۔ قدم خود بخود رک گئے۔

"تعلیم یافتہ ہے۔ اپنی پر آجائے تو دونوں کو ناکوں چنے چبوادے گا۔ میں اس کے لیے شہر کے بہترین وکیل کھڑے کروں گا۔ مجال ہے عارف اور اشرف کی کہ اس کا حصہ ہضم کرجائیں۔"

"ان دونوں نے تو بیویوں کے جال میں پھنس کر خوب رنگ دکھائے۔ اس کا حصہ ہڑپ کرنے کے لیے گٹھ جوڑ کرڈالا۔"

"تم دیکھتی رہو، سب ٹھیک کردوں گا۔ ایک دو لاکھ خرچ بھی ہوجائیں تو پروا نہیں۔"

"اتنی جلد بازی مت کرو۔ پہلے ٹھونک بجالو اسے کہیں بعد میں منہ دیکھتے نہ رہ جاؤ۔ ویسے اندازاً اس کا حصہ کتنا ہوگا۔"

"کروڑوں روپے کی جائیداد ہے نیک بخت۔ اندازہ نہیں ہے تجھے محسن علی خان کے بارے میں۔ بہت بڑا حصہ بنتا ہے اس کا۔ اسی لیے تو وہ جدوجہد کررہے ہیں۔ چھوٹی موٹی بات ہوتی تو مہینے بھر محنت نہ کرتے۔"

"چلو ٹھیک ہے، لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ سب کچھ حاصل کرنے کے بعد وہ ہمارا داماد بن جائے گا۔ شہر میں پڑھا ہے، ممکن ہے شہر ہی کی کسی لڑکی سے دل بھی لگائے بیٹھا ہو، کیا دھرا چوپٹ ہوجائے گا۔"

"سارے کام میں ہی کروں اب۔ تم بھی اس سلسلے میں کچھ کرو۔ لڑکیوں سے کہو اس کے دل میں جگہ بنائیں، جسے بھی وہ پسند کرے، دوسری اس کے لیے راستہ چھوڑ دیں۔ کل سے انہیں اس کام پر لگادو، سونے کی چڑیا جال سے نکلنے نہ پائے۔ اس کی دولت

میں اُسے دلوادوں گا باقی کام تم لوگ کرو۔ باقی رہی کسی شہری لڑکی کی بات، تو یہ بھی پتا چل جائے گا۔ میں بلاوجہ تو رقم نہیں لگاؤں گا۔ دوٹوک بات کروں گا۔ تینوں میں سے جو لڑکی اسے پسند آئی پہلے اس کا نکاح اس کے ساتھ کروں گا۔ اس کے بعد باقی کام ہوں گے۔'' ماموں صاحب کی آواز سنائی دی۔

میرا ہی ذکرِ خیر تھا۔ لیکن جو گفتگو ہو رہی تھی وہ عجیب تھی۔ اچانک ہی ماموں صاحب کا بھرم بھی کھل گیا تھا۔ میں دبے پاؤں وہاں سے واپس کمرے میں آ گیا۔ ہنسی بھی آ رہی تھی اور غصہ بھی۔ اس کائنات میں کوئی بے غرض بھی ہے۔ سب کے سب ہوس کے بندے، زر کے غلام۔ بھائی ہو، ماموں ہو، کوئی بھی رشتہ ہو۔ سارے رشتے زر کے رشتے ہیں۔ سب ایک ہی کیلی پر گھوم رہے ہیں۔ کیا دولت واقعی اتنی دلکش شے ہے۔ سوچنے کے لیے ایک نیا موضوع مل گیا تھا۔ جس طرف نظر دوڑائی دولت کے کھیل نظر آئے۔ انسان کاغذ کے جال میں جکڑ کر رہ گیا ہے۔ انسانیت سونے کی قید میں اسیر ہوگئی ہے۔ دولت صرف دولت۔۔۔ انسان کچھ بھی نہیں ہے۔ واہ مالک! ہم کیسے اشرف المخلوقات ہیں، کائنات مسخر کر دی ہمارے لیے لیکن ایک حقیر سی شے کے زیر نگیں کر دیا۔

دل چاہا کہ اسی وقت یہاں سے بھاگ جاؤں۔ ان تینوں لڑکیوں میں سے کوئی بھی میری بیوی بننے کے قابل کہاں ہے۔ جن کے لیے سب کچھ کیا جا رہا ہے اور اگر ہوتیں بھی تو میں اس طرح اپنی نیلامی کہاں پسند کرتا۔ لیکن ایک بات ضرور تھی، کم از کم میرے بھائیوں کے معاملے میں ماموں صاحب نے کوئی جال نہیں پھیلایا تھا۔ ان کے سلسلے میں وہ سچ ہی بول رہے تھے۔

پھر کیوں نہ میں بھی ذہانت سے کام لوں۔ آدھی رات تک میں اپنے ذہن میں منصوبے بناتا رہا۔ بہت کچھ فیصلے کیے تھے اپنی زندگی کے بارے میں۔ دوسری صبح میں ہشاش بشاش تھا۔ زندگی کی ان حقیقتوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ جن کے بارے میں ابھی تک کچھ معلوم نہیں تھا۔ ان چیزوں نے ذہن کو اداسیاں نہیں دی تھیں بلکہ کشادہ کر دیا تھا۔ دنیا کے اس نئے رنگ کو میں نے قبول کر لیا تھا۔ سینہ کچھ اور فراخ ہوگیا تھا۔ میں نے ان بیمار ذہنوں سے نفرت نہیں کی تھی بلکہ ان کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا کیا تھا سینے میں۔

تینوں ماموں زاد بہنیں میرے آگے پیچھے پھر رہی تھیں اور میں نے تینوں میں سے ایک پر اظہارِ الفت کر دیا تھا لیکن بس بڑے بھائیوں کے سے انداز میں۔ کسی کو بھی میں نے عشقی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔

پھر شام ہوگئی۔ پانچ بجے کی چائے پر ماموں صاحب واپس آ گئے تھے۔

''کہو بھئی کیسا دن گزرا؟''

''بہت عمدہ! یہ لڑکیاں تو مجھے بے حد چاہتی ہیں۔ مجھے گمان بھی نہ تھا کہ یہاں مجھے اتنی چاہت ملے گی۔''

''تمہارا گھر ہے بیٹے! ساری زندگی ہمارے سر آنکھوں پر رہو اس سے بڑی خوش بختی اور کیا ہوگی۔'' ماموں صاحب نے کہا، پھر وہ چائے سے فارغ ہو کر بولے۔

''ہاں بھئی لڑکیو! ہم بھی اس نوجوان کو چاہتے ہیں۔ ہمیں بھی اس سے پیار ہے، اب تھوڑی دیر کے لیے اسے ہمیں دے دو۔ بھاگ جاؤ یہاں سے، ہمیں کچھ باتیں کرنی ہیں۔'' لڑکیاں کھلکھلاتی ہوئی چلی گئیں۔ ماموں صاحب نے میرا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہاں کیسا محسوس ہوا شہزاد!''

''ایسا کہ ساری زندگی یہاں رہنے کو جی چاہے۔''

''باخدا رہو۔۔۔ ضرور رہو۔۔۔ میرے دستِ راست بن جاؤ۔ وعدہ کرتا ہوں زندگی بھر کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ خیر سے اپنے ہو، اپنوں میں خوش نہ

ہو گے تو کہاں ہو گے۔ میں نے چوہدری فضل کے لیے انتظام کیا ہے۔ کام خطرناک ہے۔ اس کے علاوہ کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آئی۔ چوہدری صاحب کسی مار سے نہ ڈریں گے سوائے جان کے خوف کے۔"

"میں نہیں سمجھا ماموں جان؟"

"رات کو ریوالور لے کر گھس جاؤ اس کے گھر میں۔ چار لونڈے تیار کر دیے ہیں ساتھ دینے کو۔ ہر طرح کی آئی گئی اپنے سر لیں گے۔ اس طرف سے بے فکر رہنا کوئی آنچ نہیں آئے گی تم پر۔ یہ احتشام احمد کا ذمہ۔۔۔"

"گڈ۔۔۔ لیکن کروں کیا؟"

"حقیقت پوچھ لو بس۔ دعوے سے کہتا ہوں کہ پورے پچیس لاکھ روپے اس نے زندگی بھر نہیں دیکھے ہوں گے۔ بس یہ معلوم کرو کہ اس میں کہاں تک جھوٹ ہے، کہاں تک سچ۔"

"کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے ماموں جان!"

"میں سنبھال لوں گا۔ وعدہ کرتا ہوں۔"

"ریوالور کہاں سے آئے گا؟"

"وہ ہے، اس کی فکر مت کرو۔"

"بات اگر سچ نکلی۔۔۔؟"

"تو اس کا کوئی قصور نہ ہوگا۔ واپس آ جانا۔ پھر دوسرے فیصلے کریں گے۔"

"ہوں۔۔۔!" میں نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر سوچنے لگا تو ماموں نے کہا۔

"جو کچھ میں نے کہا ہے اس سے موزوں اور کوئی ترکیب نہیں ہے۔ کوئی تردد مت کرو، وہ صرف یہی زبان سمجھے گا اور کوئی کوشش بے سود ہوگی۔"

"او کے ماموں جان! مجھے آپ سے اتفاق ہے۔"

"ویری گڈ۔۔۔ شکل و صورت سے تم اسی حوصلے کے مالک نظر آتے ہو۔ ورنہ میں کسی ایرے غیرے کو یہ مشورہ نہ دیتا۔"

گیارہ بجے ہم نے تیاریاں مکمل کر لیں۔ وہ چار لونڈے جو ماموں نے مجھے دیے تھے، شکل و صورت سے واقعی بدمعاش نظر آتے تھے۔ انہیں تمام صورت حال سمجھا دی گئی تھی۔ چنانچہ ہم خاموش بستی کی گلیاں عبور کرتے ہوئے چوہدری فضل کے گھر پہنچ گئے۔ گھر کی چار دیواری پھلانگی گئی اور چوہدری فضل کا کمرا تلاش کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ دوسرے کمروں میں اس کے اہلِ خاندان سو رہے تھے۔ اُن کی کنڈیاں باہر سے چڑھا دی گئیں اور پھر میں نے چوہدری فضل کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ تیسری دستک پر اس نے دروازہ کھولا۔

"کیا آفت آ گئی۔۔۔ کون ہے؟" اس کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔ دوسرے لمحے میرے چوڑے ہاتھ کا شکنجہ اس کی گردن پر کس گیا۔

"ارے، ارے، ارے۔۔۔" اس کی آواز بھنچ گئی۔ اسے اندر دھکیل کر ہم پانچوں بھی اندر داخل ہو گئے۔ میرے ایک ساتھی نے دیوار پر سوئچ تلاش کر کے روشنی کر دی تھی۔

چوہدری فضل کمرے میں تنہا تھے۔ ننگے بدن تھے اور اس طرح کانپ رہے تھے جیسے جاڑا چڑھ آیا ہو۔ سچویشن بھی ایسی ہی تھی۔ میرے ہاتھ میں ریوالور تھا اور باقی چاروں کے ہاتھوں میں خنجر چمک رہے تھے۔ چوہدری صاحب کا جو حال نہ ہوتا کم تھا۔

"حلق سے کوئی آواز نکلی چوہدری! تو آخری وصیت بھی نہ کر سکو گے۔ مجھے پہچانو کون ہوں میں۔"

"ارے، ارے۔۔۔ کون ہو بھائی؟"

"غور سے دیکھو چوہدری جی، پہچان جاؤ گے۔"

"ارے، ارے۔۔۔ زمیندار جی کے بیٹے۔۔۔ پہچان گئے بھائی۔۔۔ مگر ہم سے کیا بھول ہو گئی۔۔۔ معاف کر دو۔۔۔ ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"پھر کس کا قصور ہے۔" میں نے سفاک لہجے میں پوچھا۔ اس وقت زیادہ سے زیادہ اداکاری ہی کارگر ہو سکتی تھی۔

"ارے، ارے۔۔۔" چوہدری فضل نے

سنبھالا لینے کی کوشش کی جسے میں نے محسوس کرلیا اور آگے بڑھ کر پستول اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔

''تم مجھ سے واقف نہیں ہو چوہدری فضل۔۔۔! خون کرنے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوتی۔۔۔ بے موت مارے جاؤ گے۔'' اس سے پہلے بھی بے شمار لوگ اس پستول کا نشانہ بن چکے ہیں۔''

''مگر ہمارا کیا قصور ہے۔ ہمیں ہمارا جرم تو بتادو۔''

''تم نے پچیس لاکھ روپے دیے تھے میرے باپ کو؟''

''پچیس لاکھ۔۔۔'' چوہدری فضل نے میرے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور تھوک نگلنے لگا۔

''کہہ دو ہاں۔۔۔ اور اس کے بعد۔۔۔ مگر ٹھہرو چوہدری! اُن پچیس لاکھ روپے کا کاغذ تو ہوگا تمہارے پاس؟''

''ہاں ہے۔''

''دس لاکھ روپے اور بھی ہوں گے یہاں سمجھے دوستو! چوہدری فضل اچانک بہت دولت مند ہوگئے ہیں جبکہ اس سے پہلے ان کے پاس پچاس ہزار، ایک لاکھ سے زیادہ نہیں تھے۔ تمہارے بارے میں بڑی تحقیقات کرنی پڑی ہے چوہدری! میں نے تم سے چہرہ نہیں چھپایا کیونکہ میں فیصلہ کر کے آیا ہوں کہ تم میرے بارے میں کسی کو کچھ بتانے کے لیے زندہ نہیں رہو گے۔''

''ارے نا بیٹا نا۔۔۔ ہمیں مار کر کیا ملے گا تمہیں۔۔۔ لالچ میں مارے گئے ہیں۔''

''جان بچ سکتی ہے چوہدری! اپنی زبان سے سچ بولو، وعدہ کرتا ہوں، تمہیں معاف کردوں گا۔ لیکن ایک ایک لفظ سچ ہو۔''

''سچ بولیں گے۔۔۔ اسے ہٹاؤ۔۔۔ ہماری کھوپڑی سے۔ چل گئی تو۔۔۔ تو۔۔۔''

''سچ کے نام پر۔۔۔'' میں نے ڈرامائی انداز میں پستول ہٹالیا۔

''تم سچ کہہ رہے ہو، ہمارے پاس زندگی میں کبھی پچیس لاکھ نا ہوئے، ہم کہاں سے دیتے کسی کو پچیس لاکھ۔''

''ہوں۔۔۔ پورا کھیل بتاؤ۔''

''عارف علی آئے تھے ہمارے پاس، بیس ہزار روپے دیے ہمیں اور بولے کہ اس طرح ہم چالیسویں کے روز وہاں پہنچ جائیں اور پچیس لاکھ کی بات کریں تمہارے سامنے۔ انہوں نے ہمیں ایک کاغذ بھی دیا جس میں پچیس لاکھ کا کاغذ تھا۔ اس کاغذ پر عارف علی نے تمہارے والد صاحب کے جعلی دستخط کیے تھے۔ انہوں نے ہم سے کہا تھا کہ یہ کاغذ بھی عدالت نہیں پہنچے گا اور ہمیں اس سے کوئی نقصان نہ ہوگا۔ بیس ہزار کمانے کے لیے ہم نے یہ ناٹک کیا تھا بھائی! ہمیں معاف کردو۔۔۔ بھول ہوگئی۔''

''کاغذ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔ دل دکھ کر رہ گیا تھا۔ لیکن اب یہ ساری باتیں فضول تھیں۔

''ہمارے پاس موجود ہے۔ تجوری میں ہے۔''

''نکالو۔۔۔'' میں نے کہا اور چوہدری فضل کی جان نکلنے لگی۔ میں بولا۔

''وعدہ ہے چوہدری جی! کہ تمہاری تجوری سے اور کچھ نہیں لیا جائے گا۔''

''اچھا، اچھا۔۔۔'' چوہدری فضل نے کراہتے ہوئے کہا۔ تجوری اسی کمرے میں موجود تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے چابیاں تلاش کیں۔ تجوری کھولی اور کاغذ نکال کر میرے سامنے کردیا۔ درحقیقت بابا کے دستخطوں سے یہ دستخط ملادیے گئے تھے۔ میں نے کاغذ جیب میں رکھ لیا۔

''اب یہ بتاؤ چوہدری کہ میرے بھائیوں کو یہ اطلاع دینے کب پہنچو گے؟''

''کبھی نہیں جائیں گے بھائی۔۔۔! ایک بار معاف کردو۔''

''سنو تم لوگ! تم چوہدری فضل پر ایک ایک لمحہ نگاہ رکھو۔ ایک ہفتے تک یہ گھر سے باہر قدم رکھیں تو بے دریغ انہیں گولی مار دینا۔ چوہدری صاحب ایک

ملنے تک اگر میرے گھر یہ اطلاع پہنچی تو۔۔۔ تمہیں اس کے بعد معاف نہیں کروں گا، اسے یاد رکھنا۔"

"یاد رکھوں گا۔۔۔ خدا کی قسم یاد رکھوں گا۔"

"آؤ۔۔۔" میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا اور ہم سب واپس پلٹ پڑے۔ چوہدری صاحب واقعی نیک تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کریں گے۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد ہم واپس ماموں صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ سب لوگ سو رہے تھے، لیکن ماموں صاحب باہر برآمدے میں کرسی ڈالے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ اُن کے چہرے پر سنسنی پھیل گئی۔

"کام ہوگیا؟" انہوں نے بے چینی سے پوچھا۔

"ہاں ماموں صاحب! سب ٹھیک ہوگیا۔"

"واہ! اچھا عمران بیٹے! یہ لو دس ہزار روپے، آپس میں بانٹ لینا، کوئی اور ضرورت پیش آئی تو تمہیں تکلیف دوں گا۔"

"ہم حاضر ہیں۔" پیسے لینے والے نے کہا اور چاروں باہر نکل گئے۔

"ان لوگوں نے صحیح تعاون کیا تھا؟" ماموں صاحب نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک۔"

"کام کے بچے ہیں۔ میری ضروریات پر کام آتے رہتے ہیں۔ جی دار بھی ہیں، کہیں بھی بھڑ ادو پیچھے نہ ہٹیں گے، میں نے ضروری کاموں کے لیے انہیں پال رکھا ہے۔ خیر چھوڑو، سناؤ کیا رہی۔"

"آپ نے ٹھیک کہا تھا۔ چوہدری فضل کرائے کا آدمی ہے۔ بیس ہزار روپے لے کر اُس نے میرے سامنے یہ ڈرامہ کیا تھا۔ اس نے قبول کرلیا ہے۔"

"اللہ کا شکر ہے میری عزت رہ گئی، بڑی دعا کر رہا تھا اللہ سے کہ میری لاج رکھ لے۔ کہیں تم یہ نہ سوچو کہ مجھے ان سے کوئی پرخاش ہے اور بلاوجہ تمہیں ان کے خلاف بھڑکا رہا ہوں۔ تمہیں اطمینان ہوگیا۔"

"جی ماموں صاحب! آپ کا شکریہ کہ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں اپنے بھائیوں کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔"

"آنکھیں تو اب میں ان کی کھولوں گا۔ دیکھتے رہو کیا کھیل دکھاؤں گا۔ ایک ایک پائی نہ اگلوالوں تو احتشام احمد نام نہیں۔ حالانکہ تم تینوں میرے لیے یکساں ہو، مگر خدا لگتی کہنا بیٹے تمہارے اور ان کے رویے میں کتنا فرق تھا۔ کسی پڑوسی کے ساتھ بھی وہ سلوک نہیں کیا جاتا جو اُس دن اور اس سے پہلے انہوں نے میرے ساتھ کیا تھا۔ بات میرے محسن مرحوم کے درمیان ہوئی تھی۔ بچوں کا تو ان باتوں سے کوئی واسطہ نہیں تھا، اب اگر تم کہو تو میں ایک مشورہ دوں۔"

"جی ماموں صاحب!"

"صبح کو تم چلے جاؤ۔ ان سے بات کرو کہ وہ پائی پائی کا حساب دیں اور تمہارا حصہ الگ کردیں اگر اس میں کوئی حیل وحجت کریں تو انہیں صاف بتادو کہ وہ کورٹ آنے کے لیے تیار رہیں اور پھر تم اپنا سامان اٹھا کر یہاں چلے آؤ۔ یہ گھر تمہارا ہے۔"

"بہت بہت شکریہ ماموں صاحب! میں بہت جلد کوئی فیصلہ کرلوں گا۔"

"اجی بس فیصلہ ہوگیا۔ تمہارا مستقبل بنانا اب میری ذمہ داری ہے۔ کبھی خود کو تنہا مت سمجھنا۔ لاکھوں خرچ کروں گا تمہارے لیے مگر حق تلفی نہ ہونے دوں گا۔ واہ کیا گٹھ جوڑ کیا ہے سب نے مل کر میرے بچے کے خلاف۔ اب آرام کرو، صبح کو ملاقات ہوگی۔ میں تمہارے لیے ہی جاگ رہا تھا۔"

"بہتر۔" میں نے آہستہ سے کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔۔۔

ایک عجیب سی نفرت محسوس ہو رہی تھی اس دنیا سے۔ کسی ایک پر غصہ نہیں آرہا تھا۔ تجربہ ہوا تھا کہ سب ہی اپنے بارے میں سوچتے ہیں۔ ماموں صاحب میرے مستقبل کے لیے نہیں اپنی بیٹیوں کے مستقبل کے بارے میں سوچ رہے تھے، بے لوث وہ

بھی نہ تھے۔ لیکن اب کرنا کیا چاہیے۔ بھائیوں نے واقعی بہت برا کیا تھا۔ ان سے یہ توقع نہیں تھی۔ ماموں صاحب کو کسی غلط فہمی میں نہیں رکھنا چاہیے، ویسے کاغذ کے سلسلے میں، میں نے انہیں کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ یہ جھوٹا کاغذ میرے بھائیوں کی نادانی تھی۔ وہ اس کے ذریعے پھنس سکتے تھے لیکن میں یہ سب کچھ نہیں چاہتا تھا۔ میں ان کی قسمت کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہتا تھا۔

دوسری صبح ناشتے کی میز پر خوب رونق تھی۔ بڑا اہتمام تھا۔ میری ایک ماموں زاد بہن نے پوچھا۔

''آپ آج جا رہے ہیں؟''

''ہاں ماریہ! واپسی کا ارادہ ہے۔''

''پھر کب آئیں گے؟'' غزالہ بولی۔

''کب کیا؟ کل یا زیادہ سے زیادہ پرسوں واپس آجائیں گے۔ انتظام کرو، اب یہ یہیں رہیں گے۔'' ماموں صاحب بولے۔

''اتنی جلدی نہ کریں ماموں صاحب! مجھے کچھ سوچنے دیں۔''

''ہم مر گئے ہیں سوچنے والے۔ جو لوگ دشمنی پر آمادہ ہوں وہ تمہیں کیا سکھ دیں گے بلکہ میں تو کہتی ہوں اللہ نہ کرے وہ تمہیں زہر نہ کھلا دیں۔ دولت کے لالچی سب کچھ کر سکتے ہیں۔'' ممانی بیگم بولیں۔

''ہاں بھئی ہوشیار رہنا ضروری ہے۔ بس تم کو جو میں نے کہا ہے وہ کرو اور فوراً واپس آجاؤ۔''

''یہاں سے جانے کو دل کس کا چاہتا ہے۔ ممانی جیسی مشفق ماں، آپ جیسے ماموں اور سب سے بڑھ کر میری یہ تینوں بہنیں۔ آپ جانتے ہیں ماموں صاحب ہمارے خاندان میں لڑکیاں ناپید ہیں۔ مجھے بہنوں کی آرزو تھی اور اب یہاں مجھے تین تین بہنیں مل گئیں۔ یہ تینوں میرے لیے سگی بہنوں کی مانند ہیں۔ میرے دل میں ان کے لیے ایک بھائی کا پیار ہے۔''

میرے الفاظ ان سب کے لیے دھماکے سے کم نہیں تھے۔ لیکن ان میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔ انہیں برا کون کہہ سکتا تھا۔ میں نے ان سب کے چہرے پھیکے محسوس کیے، لیکن ماموں صاحب زیرک تھے، جلدی سے بولے۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔۔۔ کیوں نہیں۔'' اس کے بعد انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔

صبح کو تقریباً دس بجے میں نے ماموں کا گھر چھوڑ دیا۔ ماموں صاحب اب بھی کوئی آس لگائے ہوئے تھے۔ آخری ہدایات انہوں نے مجھے بڑے جوش و خروش سے دی تھیں۔ میں گھوڑے پر سوار ہو کر چل پڑا اور پھر یہ مسافت طے کر کے حویلی پہنچ گیا۔

اشرف بھائی سامنے ہی نظر آ گئے۔ جلدی سے میری طرف بڑھے اور پریشان لہجہ بنا کر بولے۔

''بتائے بغیر چلے گئے تھے۔ کہاں گئے تھے۔ بتا کر تو جاتے۔''

''آپ میرے لیے پریشان تھے بھائی صاحب!'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''پریشانی کی بات ہی تھی۔ چلے کہاں گئے تھے آخر؟''

''بس آوارہ گردی۔ اپنی پریشانیوں کا حل تلاش کرنے گیا تھا۔''

''کیا مطلب۔۔۔؟''

''عارف بھائی کہاں ہیں؟''

''وہ بھی تمہارے لیے پریشان تھا، زمین پر گیا ہے۔ وہاں کچھ جھگڑا چل رہا ہے۔ آؤ اندر آؤ۔''

اندر کی فضا جوں کی توں تھی۔ بھابھیوں نے مجھے دیکھ کر ناک سکیڑ لی تھی۔ اشرف بھائی نے کہا۔

''ارے بھئی ارم! کچھ ناشتے وغیرہ کے لیے لاؤ۔ پتا نہیں کچھ کھایا بھی ہے اس نے یا نہیں۔''

''ملازموں کو چھٹی دے دی ہے کیا۔ اُن سے منگوالو۔'' بڑی بھابھی نے کہا۔

''نہیں بھابھی! آج جو کچھ بھی کھاؤں گا آپ کے ہاتھوں سے کھاؤں گا۔ بس ضد ہے میری۔'' میں نے کہا۔ بھابھی نے کچھ نہ کہا۔ برا سا منہ بنا کر اندر چلی گئیں۔

''آخر کہاں گئے تھے؟'' اشرف بھائی مجھے اپنے کمرے میں لے آئے۔
''کچھ ذمہ داریاں مجھے بھی تو سنبھالنی ہیں بھائی صاحب! بس اس سلسلے میں گیا تھا۔''
''کہاں؟''
''مختلف جگہوں پر۔ عارف بھائی کب پہنچیں گے؟''
''دوپہر کا کھانا گھر پر ہی کھائے گا۔''
''آپ کو تو کوئی مصروفیت نہیں ہے آج؟''
''نہیں۔۔۔کوئی بات ہے؟''
''ہاں بس، تینوں بھائی بیٹھ کر زندگی کے مسائل پر بات چیت کریں گے۔'' میں نے کہا اور اشرف بھائی خاموش ہوگئے۔ بڑی بھابھی نے میرے لیے کھانے پینے کا کوئی بھی بندوبست نہیں کیا۔ یہاں کے حالات کا اندازہ پل پل ہو رہا تھا۔ درحقیقت میرے لیے اب اس گھر میں کوئی جگہ نہیں تھی۔
دوپہر کو کھانے پر البتہ بہت کچھ تھا۔ عارف بھائی بھی آگئے تھے۔ بھابھیاں بھی موجود تھیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے پوچھا۔
''عارف بھائی! آپ جس کام کے لیے گئے تھے ہوگیا وہ؟''
''ہاں، مگر تم کہاں گئے تھے۔ بتا کر تو جاتے۔''
''اب آپ کو سب کچھ بتا کر جاؤں گا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔
''تم کچھ بات کرنے کو کہہ رہے تھے؟''
''جی ہاں۔''
''کیا بات تھی؟''
''زمین اور جائیداد کی دیکھ بھال آپ لوگ خود کرتے ہیں یا اس کے لیے کوئی منشی ہے؟''
''منشی تو ہے لیکن ہم لوگ خود ہی سارے کام کرتے ہیں۔'' بڑے بھائی بولے۔
''تو پھر جائیے تمام زمینوں، جائیدادوں کے کھاتے لے آیئے۔ بینک اسٹیٹمنٹ اور دوسری چیزیں بھی ہونی چاہئیں۔ میں اپنے کمرے میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔'' میں نے پتھریلے لہجے میں کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ وہ سب ساکت رہ گئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ میرے اس لہجے اور ان الفاظ کا انہیں گمان بھی نہیں ہوگا۔ ابھی چند لمحات تو انہیں سنبھلنے میں ہی لگ جائیں گے۔ تاہم میں انتظار کرتا رہا۔ دس منٹ کے بعد دونوں بھائی میرے کمرے میں آگئے۔
''کھاتوں کی کیا ضرورت پیش آگئی تمہیں؟''
''میں دیکھنا چاہتا ہوں۔''
''وجہ؟'' عارف بھائی نے پوچھا۔
''جائیداد میں سے اپنا حصہ نکالنا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
''جو کچھ تمہارے سامنے آچکا ہے اس کے بعد بھی تم حصے کی بات کر رہے ہو۔'' اشرف بھائی بولے۔
''بابا صاحب ورثے میں قرض چھوڑ گئے ہیں نا۔۔۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ مجھے کتنا قرض ادا کرنا ہے۔''
''تمہیں کسی نے بہکایا ہے شہزاد۔۔۔! وہ کون ہے نام بتاؤ۔'' اشرف بھائی بولے۔
''ان تمام باتوں کو سننے کے بجائے میں چاہتا ہوں اشرف بھائی کہ آپ مجھے کھاتے دکھا دیں۔ بابا صاحب کے وہ سارے کاغذات دکھا دیں جو انہوں نے زمینوں کی خرید و فروخت کے سلسلے میں تیار کیے تھے۔''
''تم گستاخی کر رہے ہو شہزاد!''
''ہاں مجھے اس کا افسوس ہے۔''
''کوئی حصہ نہیں ہے۔ کوئی کھاتہ نہیں ہے۔ تمہاری تعلیم پر جو کچھ خرچ ہوا ہے وہ کم ہے؟ ہمارے بچوں کا حق مارا گیا ہے۔ اس کا حساب کون دے گا؟'' بڑی بھابھی نے کہا۔
''میں دوں گا بھابھی! آپ تو ان جاہل گنواروں کی تعلیم یافتہ بیگمات ہیں۔ کیا آپ یہ نہیں سوچتیں کہ کل حکومت کی طرف سے کورٹ میں آپ

سے کھاتے طلب کیے جاسکتے ہیں۔ اگر آپ یا میرے یہ بھائی یہ سب چاہتے ہیں تو مجھے اعتراض نہیں ہے۔ یہ بھی ہوجائے گا لیکن یہ سوچ لیں اُس وقت سمجھوتے کی کوئی بات نہ ہوسکے گی۔ جبکہ ابھی اس کا موقع ہے اور یہ موقع آپ کے حق میں بہتر ہے۔"

"تجھے کیا ہوگیا شہزاد! تجھ سے یہ امید نہیں تھی۔" بڑے بھائی بولے۔

"وقت ضائع نہ کیا جائے۔" میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے عارف جاؤ کھاتے نکال لاؤ۔" اشرف بھائی نے کہا اور پھر انہوں نے بھابھی سے کہا۔

"تم لوگ جاؤ آرام کرو۔"

"نہیں جو گفتگو ہوگی ہمارے سامنے ہوگی۔ ہم اس گھر کی لونڈیاں نہیں ہیں۔ ہم بھائیوں میں پھوٹ نہیں پڑنے دیں گے۔" چھوٹی بھابھی بولیں۔

"کوئی حرج نہیں ہے بھائی صاحب! تعلیم یافتہ ہیں آپ کی مدد کریں گی۔" میں نے جواب دیا اور عارف بھائی چلے گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ بہت سے رجسٹرز ایک ملازم پر لادے اندر آگئے۔

"لو۔۔۔ ان میں سر کھپاؤ۔۔۔ دیکھ لو سب کچھ۔۔۔" انہوں نے کہا۔ میں خاموش رہا۔ ملازم کے جانے کے بعد میں نے پہلا کھاتہ کھولا۔ آمدنی اور خرچ کے حسابات لکھے ہوئے تھے پھر دوسرا اور تیسرا کھاتہ میں نے دیکھا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"نہیں بھائی صاحب! مجھے یہ کھاتے نہیں۔ اصلی کھاتے درکار ہیں۔"

"کیا یہ اصلی نہیں ہیں؟"

"جی نہیں۔ افسوس میری تعلیم یافتہ بھابھیوں نے آپ لوگوں کو یہ نہیں سمجھایا کہ نئے اور پرانے کھاتوں میں فرق ہوتا ہے۔ ان کی روشنائی ہلکی ہوجاتی ہے۔ کاغذ میلا ہوجاتا ہے اور شاید انہوں نے آپ کو یہ بھی نہیں سمجھایا کہ بابا صاحب کے جعلی دستخط کرنے پر آپ لوگوں کو انفرادی سزائیں ہوسکتی ہیں۔ جو کچھ جائے گا وہ الگ سے ہوگا۔ یہ کھاتے ایک ماہ کے اندر اندر تیار کیے گئے ہیں۔ روشنائی اور کاغذ کے ایکسپرٹ یہ گواہی دیں گے اور پھر۔۔۔ جعلی دستخط۔۔۔"

"کیا بکواس کر رہا ہے۔" عارف بھائی گرجے۔

"ایک علیحدہ جرم ہوتے ہیں۔ آپ لوگ دھوکا دہی کے جرم میں آن کی آن میں گرفتار ہوجائیں گے۔۔۔" میں نے جملہ پورا کیا۔

"تم ہمیں دھوکے باز کہہ رہے ہو کیوں؟" اشرف بھائی بولے۔

"میں نہیں اشرف بھائی! یہ کھاتے کہہ رہے ہیں، چوہدری فضل کہہ رہا ہے جس نے زندگی میں کبھی پچیس لاکھ روپے اکٹھے نہیں دیکھے۔ اسے آپ نے صرف بیس ہزار روپے دے کر اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ بابا صاحب کے چالیسویں کے دن یہ ڈراما کرنے آجائے۔ چوہدری فضل نے یہ بیان ایک پولیس آفیسر کے سامنے دیا ہے اور یہ کاغذ دیکھیے جو جعلی ہے اور جس پر بابا صاحب کے جعلی دستخط کیے گئے ہیں۔" میں نے وہ کاغذ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا۔

اب ان کے حوصلے پست ہوگئے۔ یہ ناقابلِ تردید ثبوت تھا۔ عارف بھائی نے سر پکڑ لیا۔ اشرف بھائی کا چہرہ فق ہوگیا۔ میں نے بھابھیوں کی طرف رخ کرکے کہا۔

"آپ یہ کیوں بھول گئیں بھابھی! کہ میں بھی تو شہر میں ہی تعلیم حاصل کررہا ہوں۔" بھابھیوں کی زبان بھی بند ہوگئی تھی۔ کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔

"آپ نے یہ سازش میرے خلاف کی تھی۔ صرف میرے خلاف۔۔۔ آپ نے مجھے بابا

صاحب کی موت کی خبر صرف اس لیے نہیں دی تھی کہ آپ یہ سب کچھ کر لینا چاہتے تھے۔ کتنی محنت کی آپ نے اس پر۔ کتنا روپیہ خرچ کیا۔ آپ کے پاس چالیسواں کرنے کے لیے رقم نہیں تھی۔ یہ سب کچھ کرنے کے لیے تھی۔ کیوں بھائی صاحب! آخر کیوں؟ آپ نے ایسا کیوں کیا۔ بابا صاحب کی موت کے بعد آپ میرے باپ تھے۔ میری بھابھیاں میری ماں تھیں۔ میں تو آپ کے قدموں میں ساری زندگی گزار دیتا۔ کبھی کسی گلے کا لفظ زبان پر نہ لاتا۔ ماں باپ سے ناز سے کچھ پیسے تو مانگے جاسکتے ہیں، حصہ نہیں مانگا جاتا۔ آپ نے مجھے یہ احساس دلایا کہ آپ لوگ میرے بڑے نہیں ہیں، میرے ماں باپ نہیں ہیں بلکہ ہمارے اور آپ کے درمیان صرف جائیداد کا رشتہ ہے۔ آپ نے مجھے مجبور کیا ہے۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر آپ نے میرے باپ پر یہ الزام کیوں رکھا، بتائیے۔ میرا باپ فرشتہ سیرت تھا، آپ نے اس کی شخصیت مشکوک کیوں کی؟"

"عورت کے مشورے سے شہزاد! عورت کے جال میں پھنس کر۔" اشرف بھائی بے بس ہو کر بولے۔

"میری تعلیم یافتہ بھابھیاں! آپ کو یہ جاہلانہ مشورہ کیسے دے سکتی تھیں۔ اب ان سے کہیے کہ آپ کو جان بچانے کا کوئی مشورہ دیں۔ یہ کاغذ ایک پولیس افسر کی معرفت میرے ہاتھ آیا ہے۔ اصلی کھاتے آپ مجھے دیں گے یا میں کورٹ کی معرفت آپ سے طلب کروں۔"

"نہیں شہزاد! جو کچھ ہو چکا وہی بہت ہے۔ اصلی کھاتے موجود ہیں۔ یہ لوگ تو انہیں ضائع کرنے کا مشورہ دے رہے تھے لیکن وہ موجود ہیں۔ تمہارا حصہ تمہیں مل جائے گا۔"

"کون کون سی زمینیں فروخت ہوئی ہیں؟"

"کوئی نہیں۔"

"اشرف بھائی آپ۔۔۔" عارف بھائی بے چینی سے بولے۔

"بکواس مت کرو کمینے۔۔۔! تم سب نے۔۔۔ تم سب نے۔۔۔ لعنت ہو تم سب پر۔۔۔ تم نے شیطان بن کر مجھے بھی بہکا دیا۔ عاقبت تباہ کر دی تم نے میری۔۔۔ نہیں شہزاد! تمہیں تمہارا حصہ ضرور ملے گا۔۔۔ ہم بہک گئے تھے۔ خدا ہمیں معاف کرے۔۔۔ خدا ہمیں معاف کرے۔۔۔ خدا ہمیں معاف کرے۔۔۔" اشرف بھائی رو پڑے۔

"آپ نے یہ کیوں نا سوچا اشرف بھائی! کہ میں آپ کا سب سے چھوٹا بھائی ہوں۔ میں تو اپنی زندگی تعمیر کر رہا ہوں۔ میں نے تو ابھی اس دنیا میں کچھ نہیں دیکھا۔ میں نے کب آپ سے کوئی گستاخی کی تھی۔ بتائیے بھابھی! میں نے کب آپ کا ماں کی طرح احترام نہیں کیا۔ آپ کی بے اعتنائی کو کب میں نے نظر انداز نہیں کیا۔ مجھے بتائیے اشرف بھائی۔۔۔! مجھے بتائے عارف بھائی! آپ لوگوں نے مجھے اپنے دل سے الگ کیوں کیا؟ آپ دونوں نے گٹھ جوڑ کر کے صرف مجھے ہی خود سے الگ کیوں کر دیا، کیا جرم تھا میرا۔۔۔؟ صرف دولت۔۔۔ صرف یہ کہ آپ کوئی تیسرا حصے دار نہیں چاہتے تھے۔ مجھے حصہ نہیں صرف آپ کی محبت درکار تھی۔ صرف آپ کا پیار چاہیے تھا۔ میں خواہش مند تھا کہ آپ میرا مستقبل بنائیں گے۔ مجھے بھی زندگی کی شاہراہ پر لگائیں گے۔ آپ نے میری جڑ ہی کاٹ دی۔ دولت بے شک ایک انسان کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ میں بھی دولت مند بننا چاہتا ہوں۔ مجھے بھی ایک خوب صورت اور آسودہ حال زندگی گزارنے کی خواہش ہے لیکن یہ سب کچھ میں آپ کے زیر سایہ چاہتا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں آپ کے علاوہ میرا اور کوئی نہیں تھا۔ اب میں بڑا آدمی بنوں تو کس کے لیے؟ مجھے دیکھنے والا میری امارات سے خوش ہونے والا کون ہوگا لیکن اس کے باوجود بھائی صاحب، میری بھابھیو! میری ماؤ! میں بڑا آدمی بنوں گا۔ آپ لوگ انتظار کریں۔ ایک دن

میں دولت مند بن کر آپ کے سامنے آؤں گا۔ آپ سے آپ کی یہ ساری زمینیں خرید لوں گا۔ پھر زمینیں ایک بار پھر آپ کو بخش دوں گا۔ یہ میرے بڑے بھائی ہیں، یہ میری بھابھیاں، بھتیجے اور بھتیجیاں ہیں۔ سازشیں کیوں کی آپ نے بھائی صاحب! میں آپ کا بچہ تھا، آپ کہہ دیتے۔۔۔ پیار سے کہہ دیتے شہزاد! اپنا حصہ ہمیں دے دو، خدا کی قسم میں ہنس کر کہتا بھائی صاحب! سب کچھ آپ کا ہے۔ مجھے تو بس آپ کا سایہ درکار ہے۔ مجھے حصہ نہیں آپ کی محبت درکار تھی۔ مجھے دو بھائی، دو بھابھیاں، ننھے منے بھتیجے، بھتیجیاں اس دولت اور اس جائیداد سے کہیں زیادہ پیارے تھے۔ آپ نے غلط سوچا میرے بارے میں۔ مجھے میرے باپ کے آخری دیدار سے بھی محروم کر دیا۔ بہت برا کیا آپ نے، لیجیے یہ کاغذ۔۔۔ پھاڑ دیجیے اسے، میں نے پستول چوہدری فضل کے سینے پر رکھ کر اس سے یہ کاغذ حاصل کیا ہے۔ اگر وہ چالاک ہوتا تو اس کے عوض آپ کی زندگیاں خرید سکتا تھا۔ یہ نہیں سوچا آپ نے پچیس لاکھ نہیں وہ آپ سے اس کے پچاس لاکھ وصول کر سکتا تھا، کیونکہ یہ جعل سازی تھی۔ لیجیے آپ کے گلے کا پھندا میں نے کھول دیا۔" میں نے کاغذ کے پرزے پرزے کر دیے۔

"یہ جعلی کھاتے بھی ضائع کر دیجیے۔۔۔ میں آپ کی دنیا سے جا رہا ہوں۔ اس وقت تک کے لیے جب تک خود کچھ نہ بن جاؤں۔ یہ جعلی کھاتے آپ کے لیے عذاب بن سکتے ہیں۔ لوگ مجھے نہ پا کر سوچیں گے کہ آپ لوگوں نے مجھے قتل کر کے میری لاش کہیں چھپا دی ہے۔ یہ کھاتے آپ کے خلاف ثبوت بن جائیں گے۔ اس لیے میری رائے ہے کہ آپ انہیں ضائع کر دیں۔ میرا حصہ آپ کا ہے۔ وعدہ کرتا ہوں کہ بھوکا بھی رہوں گا، تو آپ سے کبھی ایک روپیہ مانگنے نہیں آؤں گا۔ آپ لوگ خوش رہیں۔ دوپہر کے اس کھانے کا شکریہ۔۔۔ چند دنوں کی اس رفاقت کا شکریہ۔" میری آواز بھرا گئی۔ میں اٹھ کر باہر نکل آیا۔ کسی کی کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔

چند جوڑے کپڑے تھے جو میں نے ایک سوٹ کیس میں رکھے اور باہر نکل آیا۔ اب میرے ذہن میں کوئی تکدر نہیں تھا۔ کوئی الجھن نہیں تھی، بلکہ ذہن سے ایک بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ میں احمد علی چچا کے گھر پہنچ گیا۔ انہوں نے حسب معمول میرا پرتپاک استقبال کیا۔ انہوں نے میرے ہاتھ میں سوٹ کیس دیکھ کر پوچھا۔

"کہیں جا رہے ہو؟"

"ہاں چچا! اس وقت آپ سے صرف ملنے نہیں آیا کچھ کام بھی تھا۔"

"ضرور بیٹے کہو؟"

"کچھ پیسے چاہیے تھے۔ شہر میں میرا اکاؤنٹ ہے، جاتے ہی آپ کو واپس بھیج دوں گا۔"

"ہاں، ہاں، ضرور۔ کتنے پیسے چاہئیں؟"

"ایک ہزار روپے صرف۔"

"ایک منٹ۔۔۔ ابھی لایا۔" انہوں نے کہا اور اندر چلے گئے۔ پھر انہوں نے ایک ہزار روپے لا کر مجھے دے دیے اور بولے۔

"یوں لگتا ہے جیسے۔۔۔ جیسے گھر سے کچھ ناراض ہو گئے ہو۔"

"ناراض نہیں بس یہ گھر چھوڑ رہا ہوں ہمیشہ کے لیے۔"

"وجہ؟"

"آپ کو ضرور بتاؤں گا۔۔۔ آپ میرے محسن ہیں، آپ کی وجہ سے آج مجھے یہ حیثیت حاصل ہے۔ اگر دوسری شکل ہوتی تو آج میں تباہ حال ہوتا۔"

"کیا بات ہے؟" انہوں نے پوچھا اور میں نے انہیں چوہدری فضل کی اور کھاتوں کی تفصیل بتا دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ میں گھر کو خیر باد کہہ کر آیا ہوں۔"

"انہوں نے تمہیں روکنے کی کوشش بھی نہیں کی؟"

"اچھا ہی کیا، میں نہ رکتا۔"
"اب کیا کرو گے؟"
"ایک طرح سے یہ میرے حق میں بہتر ہی ہوا ہے چچا! زندگی کی شاہراہیں میرے لیے کھل گئی ہیں۔ اپنے قول کو نبھانے کی جدوجہد کروں گا۔ نئے جہان دیکھوں گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ احمد علی چچا نے مجھے بہت سمجھایا۔

"بیٹے جوانی امنگوں کا نام ہے۔ رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کا طوفان، پہاڑوں کو پیس ڈالنے کا ولولہ رکھتا ہے لیکن حقیقت کی دنیا کچھ اور ہے۔ وہاں تمہیں مایوسیاں ملیں گی۔ دولت کا حصول آسان نہیں ہے۔ ہاں برائی کے راستے بے شمار ہیں اور اُن پر دولت بھی بکھری ہوئی ہے لیکن اس طرح اس دولت کا حصول تمہارے جیسے نوجوان کو زیب نہیں دے گا۔"

"میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا چچا جان! کوئی عہد نہیں کر سکتا۔ کوشش کروں گا کہ ناجائز راستے نہ اپناؤں لیکن اگر وقت نے حالات نے ساتھ دیا تو پھر خود پر سے ساری پابندیاں ہٹا دوں گا۔ آپ نے میرے جیسے نوجوان کی بات کی ہے۔ میں ایک نوجوان ہوں۔ کوئی خاص بات نہیں ہے مجھ میں، کوئی خوبی مجھے دوسروں سے منفرد نہیں کرتی۔ چنانچہ اگر حالات کی چکی نے مجھے اپنے درمیان لے لیا تو میں بھی وہی کروں گا جو دوسرے کرتے ہیں۔"

"لیکن تمہاری خاندانی شرافت۔ تمہارے خاندان کی روایات۔۔۔"

"میں والدین کا اکلوتا نہیں ہوں۔ دو اور بھی ہیں کیا ان کی رگوں میں میرے باپ کا خون نہیں تھا۔ چور، ڈاکو، اسمگلر اپنے گھروں کو نہیں لوٹتے۔ اپنوں کی گردن پر چھری نہیں پھیرتے، لیکن ان لوگوں نے اپنے بھائی ہی کو ذبح کر دیا۔ کیا میں ان میں سے ایک نہیں ہوں؟"

"میں تمہیں ایک مشورہ دوں بیٹے؟"

"جی فرمایئے۔"

"میں ان لوگوں سے بات کرتا ہوں، اُن کے خون سفید ہو گئے ہیں لیکن قانون سے ٹکر لینا آسان نہیں ہے۔ وہ تمہیں تمہارا حق دے دیں، تم الگ اپنا مکان بناؤ، نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرو۔"

"نہیں چچا جان! جو تھوک آیا ہوں اسے نہیں چاٹوں گا۔ بس آپ کی دعاؤں کا طالب ہوں۔"

"میرا معبود تمہاری راہنمائی کرے۔" احمد علی چچا نے کہا اور میں انہیں سلام کر کے وہاں سے نکل آیا۔

گھر سے مناسب اخراجات ملتے تھے۔ شہر میں تعلیم کے دوران کوئی خاص اخراجات نہیں تھے۔ بینک میں اکاؤنٹ کھول رکھا تھا اور اس میں خاصی رقم پس انداز تھی۔ ضرورت مند دوستوں کی مدد کرتا رہتا تھا۔ بہت سوں پر قرض تھا۔ یہ سب کچھ ملا کر اتنا دے سکتے تھے کہ دو چار ماہ سکون سے گزر جاتے۔ اس دوران کچھ سوچ سکتا تھا۔ کوئی پریشانی نہیں تھی۔ ابھی چند روز کسی پرسکون گوشے میں پناہ لوں اس کے بعد مستقبل کے بارے میں فیصلے کروں گا۔ کوئی ایسی جلدی نہیں ہے۔ بھائیوں کی بے اعتنائی، خود غرضی کا دکھ ضرور تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ نڈھال کر دیتا۔ بس ٹھیک تھا، وہ بے گانے ہو گئے تھے۔ میں نے بھی انہیں دل سے کھرچ پھینکا۔ میری زندگی میری اپنی ہے۔ اسے بہتر انداز میں گزارنے کی کوشش کروں گا۔

آخر کار شہر پہنچ گیا۔ ہاسٹل کا رخ نہیں کیا تھا کیونکہ اب زندگی کو دوسرے رنگ ملنے والے تھے۔ پھر اپنے پسندیدہ ریستوران میں جا بیٹھا جہاں کی بلیک کافی مجھے بے حد پسند تھی۔ اکثر یہاں کافی پینے آ جاتا تھا اور کافی کی ایک پیالی پی کر دماغ اس طرح کھل جاتا تھا جیسے اس کی ساری کثافت دور ہو گئی ہو۔

(جاری ہے)

رقابت

زبیر بٹ

دوستی کا رشتہ عبادت ہے اعتماد ہے
لیکن اگر اس جذبہ میں ذرا بھی شک کا
عنصر شامل ہوجائے تو اس رشتے کی
بنیادیں ریت کی دیوار کی مانند بیٹھ
جاتی ہیں

اختصارپسندوں کے لیے بطور خاص متاثر کن سرگزشت

ایک معصوم دل کا احوال، دوست کے اخلاص نے اس کے شیشہ دل کو پاش پاش کردیا تھا

آبادی پر سناٹا چھایا ہوا تھا اور بارش زور و شور سے ہورہی تھی۔ میں ہمپٹن تک کشتی کے ذریعے آیا تھا۔ خشکی پر قدم رکھتے ہی میں نے سواری تلاش کی کیوں کہ موسلا دھار بارش مجھے شرابور کیے دے رہی تھی۔

ساحل کی ایک جانب قبرستان اور دوسری طرف آبادی تھی۔ میں نے نگاہ دوڑائی تو آبادی والی سمت ایک ٹیکسی کو کھڑا پایا۔ نزدیک جاکر میں نے اس کے ڈرائیور سے ہمپٹن کی آبادی تک چلنے کو کہا اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ٹیکسی اسٹارٹ کی مگر شاید دیر سے بارش میں کھڑے رہنے کی بنا پر اس کا انجن سرد ہوچکا تھا۔ ڈرائیور کی پوری کوشش کے باجود ٹیکسی کا انجن بے دار نہ ہوسکا۔ نتیجے کے طور پر ڈرائیور نے اپنی سیٹ چھوڑ دی اور ٹیکسی سے نکل کر اس کا انجن چیک کرنے لگا۔

اس دوران میری نگاہ قبرستان میں بیٹھے ہوئے

ایک شخص پر پڑی۔ وہ ایک قبر کے نزدیک بیٹھا تھا جس پر صلیب لگی ہوئی تھی۔ اس شخص کے کپڑوں سے میں نے اندازہ قائم کیا کہ وہ کوئی پادری ہے۔

جب میں ہائی کومب سے یہاں آرہا تھا تو ایک عورت نے بتایا تھا کہ یہاں دو پادری رہتے ہیں جن میں سے ایک امریکی ہے اور دوسرا برطانوی۔ اس عورت نے مجھے دو بنڈل دیے تھے جن میں چادریں، تکیہ، غلاف اور میز پوش وغیرہ تھے۔ عورت نے تاکید کی تھی کہ میں ان دونوں بنڈلوں کو ان پادری حضرات کی بیویوں تک پہنچادوں۔

ڈرائیور ابھی تک بونٹ پر جھکا ہوا پرزوں سے کشتی میں مصروف تھا۔ میں نے اس سے سوال کیا۔

''یہ شخص جو قبرستان میں بیٹھا ہے، پادری رفٹن تو نہیں؟''

''یہ وہی ہیں۔'' اس نے بونٹ سے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔

میں نے اپنا بیگ کھولا اور دونوں بنڈل نکال کر بارش میں بھیگتا ہوا اس شخص کے پاس پہنچا۔

''آپ پادری رفٹن ہیں۔'' میں نے تصدیقی انداز میں پوچھا۔

''ہوں۔'' اس نے افسردگی سے جواب دیا۔

''شام بہ خیر مسٹر رفٹن! میں یہاں ڈریکر کا مہمان ہوں اور ابھی ہائی کومب سے آیا ہوں۔ ہائی کومب میں مسز کیرولا نے آپ کی بیوی کے لیے یہ بنڈل بھیجا ہے۔''

''مسز کیرولا پر خدا اپنی رحمت کا سایہ قائم رکھے۔'' پادری رفٹن نے گمبھیر آواز میں کہا۔ ''شاید انہیں معلوم نہیں کہ میری بیوی تو گزشتہ سال ہی ہیضے کا شکار ہو کر چل بسی تھی۔'' اس نے دل گرفتہ انداز میں اس قبر کی جانب اشارہ کیا جس کے قریب وہ بیٹھا ہوا تھا۔

''بہر حال، یہ تو آپ رکھ ہی لیجیے۔'' میں نے کہا۔ ''اس میں سے ایک بنڈل آپ کی بیوی اور دوسرا مسز سیڈلر کے لیے ہے۔ مہربانی فرما کر اسے بھی ان تک پہنچا دیجیے گا۔ مسز سیڈلر کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے، وہی دوسرے پادری کی بیوی جن کے بال سنہرے ہیں۔''

پادری رفٹن نے سر کو اثباتی جنبش دی اور تلخی سے بولا۔ ''یسوع مسیح مجھے معاف فرمائیں مگر میرے دل کی گہرائیوں سے یہ بددعا نکلتی ہے کہ مسز سیڈلر مر جائے۔ اس کے سنہرے بال، سیاہ موتیوں کا ہار اور اس کا شوہر سیڈلر سب جہنم کی آگ میں جلائے جائیں۔''

رفٹن کے اس جملے نے میرے تجسس کو بے دار کر دیا۔ جب میں اپنے دوست ڈریکر کے ہاں پہنچا تو میں نے اس سے پادری رفٹن کے بارے میں استفسار کیا۔

ڈریکر بولا۔ ''ڈارٹ مور کی تبلیغی جماعت نے جنگ کے فوراً بعد پادری رفٹن کو اس قصبے میں بھیجا تھا۔ پادری رفٹن کی بیوی، جوڈی بہت حسین تھی۔ اس کی آنکھیں کشادہ، دانت چمکیلے سفید اور رخسار شہابی تھے۔ رفٹن نے کچھ ہی عرصے پہلے شادی کی تھی اس لیے وہ اپنی بیوی کو ایک لمحے کے لیے بھی نگاہ سے دور نہیں ہونے دیتا تھا لیکن ہیضے کی وبا پھیلی تو جوڈی بھی اس کا شکار ہو گئی۔''

''مگر جوڈی کی موت کا پادری سیڈلر اور اس کی بیوی سے کیا تعلق ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''رفٹن کا خیال ہے کہ جوڈی کو ان دونوں میاں بیوی نے قتل کیا ہے۔'' ڈریکر بولا۔

''وہ کیسے؟'' میں نے سوال کیا۔

''سیڈلر اور اس کی بیوی یہاں پہلے سے قیام پذیر تھے۔ ان کا گھر کافی بڑا تھا۔ جب رفٹن یہاں آیا تو سیڈلر نے اسے اپنے گھر ٹھہرنے کی دعوت دی۔ نہ صرف اس کا گھر کشادہ تھا بلکہ نوکر بھی معقول تعداد میں تھے اور وہاں ہر طرح کا آرام تھا۔ رفٹن اپنی بیوی کے ساتھ وہاں ٹھہر گیا۔ جب ہیضے کی وبا پھوٹی تو جوڈی بھی اس مرض میں مبتلا ہو گئی۔ اس کا شوہر اس وقت یہاں سے دور کسی اور قصبے میں وعظ و تلقین کرتا

پھر رہا تھا جب وہ وہاں سے لوٹا تو ایک تحریر کے ذریعے اسے اطلاع ملی کہ اس کی بیوی ہیضے میں مبتلا ہوکر مرچکی ہے۔ اس کا ہر ممکن علاج کرایا گیا مگر وہ جانبر نہ ہوسکی۔ سیڈلر اور اس کی بیوی گھر چھوڑ کر جاچکے تھے۔ رقعے میں تحریر تھا کہ وہ جلد ہی ہمپٹن لوٹ آئیں گے۔''

''لیکن یہ تو ایسی بات نہیں ہے کہ اس کے لیے سیڈلر پر ناراض ہوا جائے۔'' میں بولا۔ ''اگر جوڈی ہیضے کا شکار ہوگئی تھی تو اس میں سیڈلر یا اس کی بیوی کا کیا قصور؟''

''تم درست کہتے ہو مگر پادری رفٹن کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ خود میرا بھی یہی قیاس ہے کہ رفٹن کا شبہ ٹھیک ہے۔''

''کیوں تم نے یہ اندازہ کیسے قائم کیا؟''

''قصبے کے بیشتر لوگوں کا خیال ہے کہ رفٹن کی بیوی جوڈی کو کلہاڑی سے ہلاک کیا گیا ہے۔''

''اس کا کیا ثبوت ہے۔'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''اول یہ کہ سیڈلر ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا یہ بھی نہیں معلوم ہوسکا کہ وہ کہاں گیا ہے۔ دوم یہ کہ سیڈلر زندہ دل اور خوش باش شخص تھا۔ وہ مرغن غذائیں استعمال کرتا تھا اس لیے فربہ تھا۔ قصبے کے تمام اشخاص اس سے خوش رہتے تھے اس کے برعکس اس کی بیوی سخنی اور دبلی تھی۔ اس کے نقوش جاذب نگاہ نہیں تھے اور وہ چیخ کر حاکمانہ لہجے میں گفتگو کی عادی تھی۔ ہنسی تو اسے شاذ ہی آتی ہوگی۔ قصبے کے سب ہی افراد اس سے نالاں رہتے تھے۔ بہرحال وہ جیسی بھی تھی اچھی تھی۔ وہ سادہ لباس پہنتی تھی اور اسے جنون کی حد تک صفائی کا خیال رہتا تھا۔ اس کے بال سنہرے تھے اور وہ اپنی ماں کی نشانی سیاہ موتیوں کا ہار ہمہ وقت پہنے رہتی تھی۔ رفٹن اور جوڈی کچھ عرصے تک تو ان کے ساتھ ہنسی خوشی رہے پھر دونوں عورتوں میں فساد شروع ہوگیا۔ سیڈلر کی بیوی نے جوڈی پر الزام لگانا شروع کردیا کہ وہ اس کے شوہر کو اپنے حسن کے جال میں پھانس رہی ہے اور اس کا سہاگ اجاڑ کر ہی دم لے گی۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ سیڈلر کی بیوی نے جوڈی سے بات چیت بند کردی اور یہ مطالبہ شروع کردیا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ یہاں سے چلی جائے۔ پادری رفٹن بہت پریشان ہوا۔ وہ چند ہی ہفتے قبل اس قصبے میں وارد ہوا تھا، اتنی جلدی کرائے کا مکان کیسے لے سکتا تھا۔ ابھی وہ مکان کی تلاش میں تھا کہ جماعت نے اسے حکم دیا کہ وہ دوسری جگہ جاکر تبلیغ کرے۔ اس کے جانے کے چند ہی روز بعد جوڈی پر ہیضے کا حملہ ہوا۔ نوکروں کا بیان ہے کہ ایک صبح سیڈلر اپنے کمرے سے اتر کر نیچے آیا اور اس نے پانی گرم کرنے کو کہا۔ اسی نے یہ اطلاع دی تھی کہ جوڈی بیمار ہے۔ نوکروں کو تاکید کی گئی تھی کہ اوپر آنے کی زحمت نہ کریں کیوں کہ ہیضہ چھوت کی بیماری ہے۔ دوپہر کو سیڈلر جب کھانا کھانے نیچے اترا تو اس نے بتایا کہ جوڈی کی حالت بہت نازک ہے اور کسی اچھے ڈاکٹر کو نہیں دکھایا گیا تو وہ چل بسے گی۔ اس نے اپنے ایک نوکر سے کہا کہ وہ دوسرے قصبے سے جاکر ڈاکٹر کو بلا لائے۔ دوسرا قصبہ یہاں سے تیس میل دور ہے۔ نوکروں سے کہانی سننے کے بعد لوگوں کو یقین ہوگیا کہ سیڈلر نے انہیں دھوکا دیا تھا کیوں کہ ڈاکٹر اتنا فاصلہ طے کرکے چوبیس گھنٹے سے پہلے یہاں نہیں پہنچ سکتا تھا۔''

''لیکن تم کہہ رہے تھے کہ پادری سیڈلر ایک خوش باش اور نیک دل شخص تھا تو پھر اس نے جوڈی کو کیسے قتل کردیا۔'' میں نے سوال کیا۔

''یہ قتل اس نے اپنی بیوی کے اشارے پر کیا ہوگا کیوں کہ اس کی بیوی اس پر حاوی تھی۔ سیڈلر اس کے سامنے دم نہیں مار پاتا تھا۔ بہرحال جوڈی کو انہوں نے رات ہی قتل کیا ہوگا اور دن بھر پہرا دیتے رہے ہوں گے۔ رات گیارہ بجے سیڈلر نیچے آیا اور اس نے نوکروں کو بتایا کہ جوڈی مرچکی ہے۔ وہ فوراً ایک تابوت کا بندوبست کریں اور گورکن سے قبر کھودنے کو کہیں۔ تابوت آیا تو پادری سیڈلر اسے لے

گر خود اوپر گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے چار نوکروں کو بلایا اور ان سے تابوت اٹھانے کو کہا۔ نوکر اوپر پہنچے تو انہوں نے تابوت کا ڈھکنا بند دیکھا۔ بہر کیف اسے پادری کی ہدایت کے مطابق جلد از جلد دفن کر دیا گیا۔ صبح ہونے سے کچھ دیر قبل پادری نے ایک ٹیکسی منگوائی، اس میں اپنا سامان لدوایا اور اپنی بیوی کے ساتھ سوار ہو کر یہاں سے چلا گیا۔ پھر اس کے بعد اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ شاید اس کے جانے سے نہ کسی قسم کی افواہ پھیلتی، نہ ہی کسی کو بدگمانی ہوتی لیکن ایک روز کسی نوکر کا پاؤں اندھیرے میں کسی چیز میں پھنس گیا۔ اس نے لالٹین کی روشنی میں دیکھا تو دیوار کے ایک شگاف میں اسے خون آلود چادر اور کلہاڑی ملی۔"

کہانی سنانے کے بعد میرا دوست ڈریکر خاموش ہو گیا اور کمرے میں ایک ناگوار سی خاموشی چھا گئی۔

☆☆☆

عرصے تک یہ کہانی نامکمل رہی۔ میں اسی شش و پنج میں مبتلا رہا کہ پھر کیا ہوا۔

ابھی ابھی ہیمپٹن سے میرے دوست ڈریکر کا خط آیا ہے جس سے یہ کہانی مکمل ہو گئی ہے۔ اس نے لکھا ہے۔ "تم نے ہیمپٹن میں بارش اور اس کی تباہ کاریوں کا حال تو اخباروں میں پڑھ ہی لیا ہوگا۔ اس بارش میں پانچ آدمی ہلاک ہو گئے۔ انہیں میں ایک بدنصیب پادری رفٹن بھی تھا۔ وہ حسب معمول اپنی بیوی کی قبر پر حاضری دینے کے لیے گھر سے نکلا تھا کہ راستے میں بارش سے شرابور ہو گیا۔ نتیجے کے طور پر اسے نمونیہ ہوا اور وہ چل بسا۔ اس بارش میں یہاں کئی لوگ ہلاک ہوئے، کچے مکانات بہہ گئے، وہیں قبرستان بھی تلپٹ ہو گیا۔ بہت سے تابوت پانی میں بہہ گئے اور کچھ قبروں میں پانی بھر گیا۔ انہی قبروں میں رفٹن کی بیوی کی بھی قبر تھی۔ اس کا ڈھکنا بھی کھل گیا۔ جانتے ہو دوست اس میں سے کیا نکلا، گردن کٹا ڈھانچا، سنہرے بال اور۔۔۔ سیاہ موتیوں کا ہار۔"

ہنسی علاج غم ہے

باپ (بیٹے سے): اپنی لکھائی خوش خط کرو۔"

بیٹا: "بھلا اس کی مجھے کیا ضرورت ہے میں تو بڑا ہو کر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں۔"

☆☆☆

استاد (طالب علم سے): "میں نے تم لوگوں کو تاریخ یاد کرنے کے لیے کہا تھا کیا سب نے تاریخ یاد کی ہے؟ اچھا زلفی تم بتاؤ۔"

زلفی: "سر! آج مئی کی چھ تاریخ ہے۔"

☆☆☆

ایک شخص جھوٹ بولنے میں جواب نہ رکھتا تھا۔ ایک دن ایک بدصورت بوڑھی عورت کسی تقریب میں ملی اس عورت کو جب معلوم ہوا کہ اس تقریب میں شہر کا مشہور جھوٹا موجود ہے تو وہ اس سے ملی اور پوچھا۔

"بیٹے کیا تم وہی شخص ہو جس کے جھوٹ بولنے کا دور دور شہرہ ہے۔"

جھوٹا نہایت ادب سے تعظیم بجا لایا اور جواب دینے کے بجائے کہنے لگا۔

"محترمہ! عجیب بات کر رہی ہیں آپ کو تو دیکھ کر میں اس حیرت کا شکار ہو گیا ہوں کہ آپ کی یہ عمر اور اس بلا کا حسن، میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے آپ جیسی حسین عورت اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔"

بوڑھی عورت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی اور بولی۔

"یہ دنیا والے بھی کتنے عجیب اور جھوٹے ہیں جو اچھے خاصے سچے آدمی کو خوامخواہ بدنام کر دیتے ہیں اور میرا تو اس پر ایمان ہے کہ جو دوسروں کو جھوٹا کہے وہ خود بھی جھوٹا ہوتا ہے۔"

☆☆☆

تعاقب

نیرہ احتشام

ممتا ،شفقت اور محبت، یہ ایسے وسیع و عظیم الفاظ ہیں جن میں پوری کائنات سمائی ہوئی ہے۔ محبت کی کوئی سرحد اور کوئی کنارا نہیں ہوتا اس کی لامحدودیت آفاقی ہے۔ وہ بھی محبت کے جذبے سے سرشار ایک ایسا انسان تھا جو اپنے جگر گوشوں کی محبت میں حد جنون سے گزر چکا تھا اور ان کے حصول کے لیے ہر قدم اٹھانے کے لیے کمر بستہ تھا مگر سامنے ایک بڑی رکاوٹ تھی جو سدراہ تھی،مگر جذبہ صادق ہو تو

اولاد کے ضمن میں زن وشوہر کی چپقلش کا دلچسپ احوال

رے نے مسز کرین کا قتل نہیں کیا تھا۔ اس کے ذہن میں جو جرم پرورش پا رہا تھا،اس کی نوعیت اس قتل سے بالکل مختلف تھی لیکن وہ اس جرم کو جرم تصور نہیں کرتا تھا بلکہ محض اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا ازالہ تصور کرتا تھا۔ قتل کا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اس وقت بھی نہیں جب اس کے ایام بڑے کرب میں گزر رہے تھے اور جب اسے لوسی سے نفرت ہو چلی تھی۔ تاہم جب مسز کرین کے سرائے میں بالائی منزل پر رہنے والے ایک کرائے دار نے مسز کرین کی لاش دریافت کی تو واقعاتی شہادتیں رے کے خلاف اتنی تھیں کہ وہ سخت دہشت زدہ ہوگیا۔

مسز کرین کی وہ مختصر سی سرائے ڈیلنگ فورڈ میں ایک تنگ سی پچھلی گلی میں واقع تھی۔ ڈیلنگ فورڈ، آکسفورڈ سے صرف 15 میل کے فاصلے پر ہے۔ مسز کرین گراؤنڈ فلور پر رہتی تھی جس کی ایک کھڑکی پر

ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس پر تحریر تھا۔ ''قیام اور ناشتا'' لیکن نہ تو اس کی سرائے کا بستر آرام دہ تھا اور نہ ناشتا لذیذ تھا۔ ہاں، سستا ضرور تھا اور ایک ایسے علاقے میں واقع تھا جو رے کے خیال میں اس کے منصوبے سے مطابقت رکھتا تھا۔ مسز کرین سرخ و سفید رنگت کی ایک صحت مند عورت تھی۔ جو اپنے کرائے داروں سے بڑی محبت اور بڑے اخلاق سے پیش آتی تھی اور ڈرنک کے لیے انہیں اپنے کمرے میں بھی مدعو کرلیتی تھی۔ لہٰذا یہی وجہ تھی کہ پولیس کو اس کی میز پر رکھے ہوئے ایک گلاس پر اور اس آہنی سلاخ پر جس سے آتش دان کی آگ کریدتے ہیں، رے کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے۔ اس آہنی سلاخ سے مسز کرین کی کھوپڑی پاش پاش کردی گئی تھی۔ اس کی ٹھیک ٹھیک وضاحت تو یہ تھی کہ جب رے اس کے ساتھ بیٹھا ڈرنک سے شغل کررہا تھا تو مسز کرین نے اس سے درخواست کی تھی کہ وہ ذرا آہنی سلاخ سے آتش دان کی آگ کرید دے۔ حالانکہ اس کے سارے کرائے داروں کے کمروں میں گیس اور بجلی کے آتش دان تھے جن کے میٹر بڑی تیزی سے سکے ہضم کرتے تھے، وہ اپنے کمرے میں اب بھی کوئلے کے آتش دان کو ترجیح دیتی تھی۔ رے نے اس آہنی سلاخ سے اس کے آتش دان کی آگ کرید دی تھی پھر بالائی منزل پر رہنے والے ایک انڈین کرائے دار مسٹر پٹیل نے مسز کرین کے کمرے کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی تھی۔ اس نے قسم کھا کر پولیس کو بتایا کہ وہ رے تھا جو اس وقت مسز کرین کے کمرے میں داخل ہوا تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت رے مسز کرین کے کمرے میں داخل نہیں ہوا تھا بلکہ وہاں سے نکلا تھا۔

وہاں سے نکلتے وقت وہ ذہنی طور پر پریشان تھا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اس نے سرائے کی مالکہ کے ساتھ بیٹھ کر ڈرنک سے شغل کرکے اپنے سہ پہر کے پلان کو غارت کردیا تھا۔ اس پریشانی کا تعلق مسٹر پٹیل کی غلط فہمی سے نہیں تھا۔ ہاں، مسٹر پٹیل کی غلط فہمی نے پولیس کی تفتیش کو غلط راہ پر ضرور لگا دیا تھا کہ جب مسز کرین کا قتل ہوا تو اس وقت مقتولہ کے پاس کون تھا۔ قتل درحقیقت اس وقت نہیں ہوا تھا جب رے مسز کرین کے کمرے میں تھا بلکہ اس وقت ہوا تھا جب وہ کمرے سے نکل چکا تھا۔ مسز کرین کی موت کا وقت ۲ بج کر ۲۷ منٹ پر ہوا تھا۔ کیونکہ یہی وقت تھا جب اس کے میز پر رکھی ہوئی گھڑی ٹوٹ جانے کے باعث بند ہوگئی تھی۔ گھڑی کے ساتھ ہی کئی دوسری چیزیں بھی ٹوٹی ہوئی پائی گئی تھیں۔ کسی نے رقم تلاش کرنے کی مجنونانہ کوشش میں پورے کمرے کو تہ و بالا کردیا تھا۔ ایک ریٹائرڈ اسکول ٹیچر نے جو پچھلے پندرہ سال سے اس سرائے میں مقیم تھی، پولیس کو بتایا کہ مسز کرین ساری رقم اپنے کمرے میں کہیں چھپا کر رکھتی تھی لیکن جب پولیس نے کمرے کی تلاشی لی تو اسے وہاں کوئی رقم نہیں ملی۔ صرف گلاس اور آہنی سلاخ پر رے کی انگلیوں کے نشانات ہی ملے پھر مسٹر پٹیل کا یہ حلفیہ بیان کہ اس نے ۲ بج کر ۱۰ منٹ پر مسز کرین کے کمرے کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی تھی۔

اگر مسز کرین کے قتل کا واقعہ پیش نہ آتا تو رے کا اس کے کمرے سے ذرا تاخیر سے نکلنا، اس کی خوش بختی کا باعث بنتا اور وہ اپنے آپ کو بے حد خوش نصیب سمجھتا۔ کیونکہ اگر وہ سوا دو بجے وہاں سے نکلتا تو اسے اپنی سابقہ بیوی لوسی کی جھلک نظر نہ آتی جو اس وقت باہر گلی کے نکڑ سے مڑ رہی تھی اور یہ لوسی ہی تھی جس کی تلاش میں وہ ڈیلنگ فورڈ آیا تھا۔ وہ اسے برمنگھم اور آکسفورڈ میں تلاش کرتا رہا تھا اور آکسفورڈ میں اسے باخبر ذرائع سے یہ معلوم ہوا تھا کہ لوسی غالباً ڈیلنگ فورڈ میں تھی لیکن اگر اسے اس لمحے لوسی نظر نہ آتی تو (جو مارکیٹ اسکوائر کی سمت گامزن تھی) اس کی تلاش میں اسے ہفتوں لگ جاتے۔

لوسی اسکوائر سے کچھ دور واقع سپر مارکیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ رے اس کے پیچھے بھاگا لیکن پھر سپر مارکیٹ کی داخلی گزرگاہ پر ٹھٹک کر رہ گیا اور

سوچنے لگا کہ اس کے پیچھے جائے یا وہیں رک کر اس کی واپسی کا انتظار کرے۔ لوسی کو اس کا علم نہیں ہونا چاہیے تھا کہ وہ اسے مل گئی تھی۔ چنانچہ اس نے کچھ سوچ کر سیاہ چشمہ لگالیا۔ کوٹ کا کالر کھڑا کرلیا اور اسٹور میں داخل ہوگیا۔ داڑھی وہ پہلے ہی بڑھا چکا تھا۔ اسے امید تھی کہ حلیے کی یہ تبدیلی اس کے لیے سود مند ہوگی اور لوسی اسے کم از کم پہلی نگاہ میں نہیں پہچان سکے گی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں لوسی اسٹور کے پچھلے دروازے سے نہ نکل جائے اور وہ اس کا سراغ کھو بیٹھے۔ اس نے اسٹور سے ایک ٹوکری اٹھالی اور کچھ خریدنے کا تاثر دیتا ہوا، خریداروں کے ہجوم میں آگے بڑھنے لگا۔ اس کی نظریں لوسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ چونکہ سنیچر کا دن تھا، بھیڑ بھاڑ بہت زیادہ تھی لیکن وہ ایک منٹ کے بعد اسے سبزی کے کاؤنٹر پر نظر آگئی۔ وہ اپنی ٹرالی میں پیاز، گاجر، گوبھی اور سیب رکھ رہی تھی پھر اس نے ڈیٹرجنٹ کا ایک پیکٹ، ڈبل روٹی، دودھ کا پیکٹ اور منجمد چکن کا ایک بڑا پیکٹ خریدا پھر باہر نکلتے ہوئے، وہسکی کی دو بوتلیں خریدیں۔ گویا وہ اب بھی وہسکی کی رسیا تھی۔ رے نے سوچا ویک اینڈ میں شغل کرنے کے لیے وہسکی کی دو بوتلیں۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ وہ پورے ہفتے کے لیے سودا لے رہی ہو۔ کیونکہ وہ بچوں کو کس پر چھوڑ کر بار بار سودا لینے نکل سکتی تھی۔ رے کو یہی معلوم کرنا تھا کہ وہ بچوں کو کس کے حوالے کرتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ بچوں کو گھر میں بند کرکے باہر نکلتی ہوگی۔ اسے اس کی فکر نہیں ہوگی کہ بچے گھر میں آگ لگادیں اور جل کر مر جائیں۔

وہ اپنی ٹرالی دھکیلتی ہوئی داخلی گزرگاہ تک پہنچ گئی۔ رے ایک لمحہ کے لیے بوکھلا گیا۔ لوسی نے اتنی ڈھیر ساری چیزیں خرید لی تھیں کہ انہیں اٹھانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ شاید باہر اس کی کار موجود تھی اگر یہ بات تھی تو رے اس کا سراغ ایک بار پھر کھودیتا۔ کیونکہ وہ بروقت کوئی ٹیکسی پکڑ کر اس کا تعاقب جاری رکھنے کی توقع نہیں رکھتا تھا لیکن تب

اس نے دیکھا کہ لوسی ٹرالی سے سودے کو ایک شاپنگ ٹرالی میں منتقل کررہی تھی جو وہ داخلی گزرگاہ کے پاس ہی چھوڑ گئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ پیدل ہی گھر لوٹنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس صورت میں وہ اس کا پیچھا کرسکتا تھا اور یہ معلوم کرسکتا تھا کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ اس نے لوسی کو فٹ پاتھ پر آگے بڑھتے ہوئے دیکھا اور جلدی سے دو چار چیزیں خرید کر باہر آگیا۔ لوسی چلتے چلتے ایک ڈریس شاپ کے شوکیس کے پاس رک گئی تھی اور اس کی مصنوعات کو تک رہی تھی لیکن وہ اندر نہیں گئی پھر وہ آگے بڑھ گئی اور اس کے برابر میں واقع کیمسٹ کی ایک دکان کے اندر چلی گئی۔ اس مرتبہ رے اندر نہیں گیا۔ وہاں بھیڑ نہیں تھی اور لوسی کے غائب ہونے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد وہ برآمد ہوئی اور ایک بار پھر اپنی شاپنگ ٹرالی کو دھکیلتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ رے نے غور کیا کہ وہ اب بھی پہلے کی طرح خوش اندام اور اسمارٹ تھی۔ اس میں بہت معمولی سی تبدیلی نظر آرہی تھی۔ اس کے جسم پر وہی اوور کوٹ تھا جو اس نے اس دن عدالت میں پہن رکھا تھا۔ جس دن ان کے درمیان طلاق واقع ہوئی تھی اور عدالت نے اسے بچوں کی کفیل مقرر کیا تھا۔ اس کے سنہرے اور چمکدار گھنگریالے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے لیکن آج اس کے سر پر ایک پرانا اسکارف تھا۔ رے اس اسکارف کو اچھی طرح پہچانتا تھا کیونکہ اسی نے وہ اسکارف اسے خرید کردیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مالی طور پر مستحکم نہیں تھی۔ حالانکہ وہ غالباً جاب بھی کرتی تھی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ بچوں کو کس طرح پال رہی تھی۔ اصل مسئلہ تو یہی تھا اور رے کو یہی معلوم کرنا تھا کہ وہ بچوں کو کس طرح پال رہی تھی۔

اب وہ اپنی ٹرالی دھکیلتی ہوئی ایک اسٹیشنری کی دکان پر رک گئی اور اندر چلی گئی۔ رے نے اسے شوکیس کی دیوار کے دوسری طرف لفافوں کا ایک پیکٹ خریدتے ہوئے دیکھا پھر وہ جیسے ہی کاؤنٹر پر

رقم ادا کرنے گئی۔ رے جلدی سے پیچھے ہوگیا تاکہ باہر نکلتے ہی وہ اسے نہ دیکھ سکے۔ وہاں سے نکل کر وہ ایک ہارڈ ویئر اسٹور میں داخل ہوگئی۔ رے یہ نہیں دیکھ سکا کہ اس نے وہاں سے کیا خریدا لیکن وہاں سے برآمد ہوکر اس نے سڑک عبور کی اور پھر فوراً ہی بائیں طرف مڑ گئی۔ رے سمجھ گیا کہ اب وہ گھر جارہی تھی لیکن اس سڑک پر اکا دکا لوگ تھے چنانچہ رے اس سے مزید پیچھے رہ گیا۔ اب جبکہ وہ اس کا تعاقب کرتا ہوا وہاں تک آ گیا تھا تو یہ خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا کہ لوسی پلٹ کر دیکھے اور اچانک اسے اپنے سامنے پائے۔ وہ اس فاصلے سے بھی یہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ کس دروازے پر رکی تھی پھر جونہی لوسی نے دروازہ کھولا، بچے بھاگتے ہوئے اس کے پاس آ گئے۔ ننھا اس سے بالکل یوں چمٹ گیا تھا گویا اسے ڈر ہو کہ کہیں اسے چھوڑ کر نہ چلی جائے۔ بڑے لڑکے نے ٹرالی تھام لی۔ لوسی گھر میں داخل ہوگئی اور اس نے دروازہ اندر سے بند کردیا۔ رے کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ بچوں کو گھر میں تنہا چھوڑ کر شاپنگ کرنے گئی تھی اور جہاں بھی جانا ہوتا تھا اسی طرح جاتی تھی۔ وہ یقیناً جاب کرتی تھی کیونکہ اس نے اپنی وکیل سے رابطہ کھودیا تھا اور رے سے رقم لینی بھی چھوڑ دی تھی جو وہ کبھی اسے وقتاً فوقتاً بھیجا کرتا تھا۔ شاید لوسی نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی کہ بچوں کو یوں تنہا چھوڑ کر جانا کتنا خطرناک ہوسکتا تھا۔ یہ سوچ کر رے غصے میں بھر گیا لیکن اگلے ہی لمحے وہ خوش ہوگیا اگر وہ اس بات کا کھوج لگا لیتا کہ لوسی عام طور سے کب گھر سے نکلتی تھی تو اسے اپنے منصوبے پر عمل کرنا اور بھی آسان ہوجاتا اور اگر وہ ہر سنیچر کو سہ پہر میں شاپنگ کرنے نکلتی تھی تو اس سے اچھی بات اور کیا ہوسکتی تھی۔ کیونکہ اس طرح اسے ضروری انتظامات کرنے کے لیے پورا ایک ہفتہ مل جاتا۔

وہ یہی کچھ سوچتا ہوا آہستہ آہستہ واپس چل دیا۔ ایسے میں وہ اپنے اندر بھرپور طمانیت محسوس کررہا تھا۔ لوسی کا سراغ لگانا اس کے لیے آسان ثابت نہیں ہوا تھا۔ پہلے لوسی ایک سہیلی کے ہاں رہنے لگی تھی۔ رے اس کا سراغ لگا کر اس سہیلی کے فلیٹ میں پہنچا تو لوسی بچوں سمیت وہاں سے غائب ہوگئی تھی۔ ایک پڑوسی نے اسے بتایا تھا کہ لوسی نے اس سے کہا تھا کہ وہ آکسفورڈ جارہی ہے۔ رے آکسفورڈ پہنچ گیا تھا اور اسے مختلف بار اور ریستورانوں میں ڈھونڈتا رہا تھا لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ اسی دوران ایک عمر رسیدہ شخص نے باتوں ہی باتوں میں اسے بتایا تھا کہ ایک نوجوان عورت نے جس کی زلفیں سنہری اور گھنگریالی تھیں، اس سے ڈیلنگ فورڈ کے بارے میں کچھ باتیں دریافت کی تھیں کیونکہ وہ کہہ رہی تھی کہ آکسفورڈ بہت مہنگی جگہ تھی اور وہ وہاں کی مہنگائی سے تنگ تھی۔ رے نے اس عمر رسیدہ شخص کو لوسی کی ایک تصویر دکھائی تھی اور اس شخص نے تصویر دیکھ کر کہا تھا کہ شاید یہ وہی عورت تھی۔ لہٰذا وہ آکسفورڈ سے اس کی تلاش میں ڈیلنگ فورڈ آ گیا تھا اور پچھلے تین دنوں سے اسے تلاش کرتا پھر رہا تھا اور اس دن مسز کرین کے ساتھ بیئر پینے کے بعد وہ سرائے سے نکل ہی رہا تھا کہ اسے لوسی کی جھلک نظر آ گئی تھی اور اس نے اس کا تعاقب کرکے اس کا مکان بھی دیکھ لیا تھا اور بچوں کو بھی۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس مرتبہ وہ ناکام نہیں ہوگا۔

لیکن مسز کرین کی سرائے کے باہر پولیس کار کیوں کھڑی تھی اور وہاں دو باوردی پولیس آفیسر اور دو سادہ لباس والے کیوں نظر آرہے تھے جو بار بار اندر باہر ہورہے تھے۔ رے ایک لمحے کے لیے ساکت ہوگیا پھر جھکے ہوئے سر کے ساتھ آگے بڑھا اور کھلے دروازے سے گزر کر اندر جانے لگا۔ وہاں تعینات ایک پولیس آفیسر نے پہلے تو اسے جانے دیا پھر اگلے ہی لمحہ اسے روک کر سوالیہ نظروں سے تکنے لگا۔

''یہاں کیا ہورہا ہے۔'' رے نے پوچھا۔

''تم کون ہو؟''

''میرا نام رے ہے اور میں یہاں مقیم ہوں۔''

''واقعی۔'' پولیس کانسٹیبل نے دروازے کی طرف گردن گھمائی اور چیخا۔ ''سر یہاں ایک شخص ہے جو اپنا نام رے بتا رہا ہے اور یہ یہاں مقیم ہے۔''

اندر سے ایک سادہ لباس والا باہر آیا۔ ''تمہارا نام رے ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔'' رے نے جواب دیا۔

''اور تم یہاں ٹھہرے ہوئے ہو۔''

''ہاں۔''

''تم یہاں کب سے ٹھہرے ہوئے ہو؟''

''تین دن سے لیکن تمہیں اس سے کیا سروکار ہے۔''

وہ لوگ اسے اندر لے گئے اور مسز کرین کی لاش دکھائی۔ مسز کرین کا سر، چہرہ اور لباس خون سے تر تھا۔ رے کو ایسا لگا کہ اسے وہیں پر الٹی ہو جائے گی۔ اس نے پہلے کبھی کوئی خون آلود لاش نہیں دیکھی تھی۔ پورا کمرا ابتری کا شکار تھا۔ کرسیاں الٹی ہوئی تھیں۔ گدے پھٹے ہوئے تھے۔ درازیں کھلی ہوئی تھیں اور ان کی ساری اشیا فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ وارڈ روب کھلا ہوا تھا۔ اس کا قفل توڑ دیا گیا تھا۔ وہ آہنی سلاخ جس سے اس نے آتش دان کی آگ کریدی تھی پاس ہی پڑا ہوا تھا اور اس پر خون کے دھبے تھے۔ میز پر بیئر کے دو کین اور دو گلاس جوں کے توں رکھے ہوئے تھے۔

وہ سادہ لباس والا انچارج لگتا تھا۔ اس نے خود کو سراغ رساں انسپکٹر اسٹان کی حیثیت سے اسے متعارف کرایا۔ رے نے پلٹ کر کھلے دروازے سے باہر بھاگنا چاہا لیکن انسپکٹر نے اسے پکڑ لیا اور اسے اندر کمرے میں لے گیا۔ رے نے رومال اپنے منہ پر رکھ لیا کیونکہ اس کا جی متلا رہا تھا۔ انسپکٹر اسے دھکیلتا ہوا آتش دان کے پاس لے گیا۔ رے کا سر چکرا رہا تھا وہ کمرا اسے رقص کرتا ہوا لگ رہا تھا۔ لہٰذا جب اس سے پوچھا گیا کہ وہ کس وقت اس کمرے میں تھا تو اس نے جواب دیا کہ مجھے نہیں معلوم۔

''لیکن تم اس کمرے میں تھے، یا نہیں تھے۔'' سراغ رساں نے پوچھا۔

''ہاں۔۔۔ ہاں، میں لنچ کرنے کے تھوڑی ہی دیر کے بعد یہاں آیا تھا۔'' رے نے جواب دیا۔ ''میں نے مچھلی اور چپس سے لنچ کیا تھا جو میں نکڑ کے ایک پب سے خرید کر لایا تھا۔ ان لوگوں کو میں یاد ہوں گا کیونکہ میں نے وہاں کام کرنے والی لڑکی سے تھوڑی بہت گپ شپ بھی کی تھی۔''

''اس کے بعد تم نے جو کچھ کیا ہمیں اس سے دلچسپی ہے۔'' سراغ رساں نے کہا۔ ''مسٹر پٹیل نے جو بالائی منزل پر رہتے ہیں ہمیں بتایا ہے کہ انہوں نے تمہیں 2 بج کر 10 منٹ پر راہداری میں مسز کرین سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر تم اس کے ساتھ کمرے کے اندر چلے گئے تھے۔''

''نہیں، نہیں، نہیں اس وقت تو میں یہاں سے نکلا تھا۔'' رے نے جواب دیا۔ ''ڈرنک لینے کے بعد وہ میرے ساتھ کمرے سے باہر راہداری میں آئی تھی اور ہمارے درمیان دو چار باتیں ہوئی تھیں۔ صدر دروازہ تو دن میں ہر وقت کھلا رہتا ہے اور صرف رات میں بند ہوتا ہے لہٰذا بے شک کوئی اس کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز نہیں سن سکتا تھا اور میں باہر نکل گیا تھا اور وہ واپس اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ مجھے اس کا یقین ہے کیونکہ میں یہاں سے نکلنے کے لیے بے چین تھا اور بار بار اپنی دستی گھڑی میں وقت دیکھتا اور سوچتا رہا تھا کہ وقت کتنی تیزی سے گزر رہا تھا۔ اگر وہ میرے یہاں سے جانے کے بعد ہلاک کی گئی تھی تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میرا اس واردات سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔''

''تمہیں کہاں جانے کی اتنی جلدی تھی۔'' اسٹان پوچھ بیٹھا۔

''خاص طور سے کہیں بھی نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''صرف باہر ٹہلنے، لیکن میں۔۔۔ میں اپنے لنچ کے ساتھ ڈرنک لے چکا تھا اور سچ پوچھیں تو دوسرا

ڈرنک لینا نہیں چاہتا تھا لیکن میں مسز کرین کی پیشکش ٹھکرا کر اس کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا میں نے عجلت میں کمرے میں جا کر ڈرنک لیا اور تقریباً دس منٹ تک اس سے باتیں کیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے جانے کے بعد کوئی کمرے میں داخل ہوا ہوگا۔ میرا مطلب ہے، یہ بالکل واضح ہے۔ کھلے دروازے سے کوئی بھی اندر داخل ہوسکتا تھا۔"

"اور تم یہاں تین دن سے ٹھہرے ہوئے ہو۔"

"ہاں"

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

"لندن سے۔" وہ بولا "لیکن ادھر کچھ عرصے سے سفر میں تھا۔"

"تم ڈیلنگ فورڈ کیوں آئے؟"

"محض گاؤں میں رہنے کا خیال مجھے یہاں کھینچ لایا تھا۔" اس نے کہا۔ "میں یہاں کچھ عرصے رہ کر کسی ایسی جگہ کا انتخاب کرنا چاہتا تھا جو رہنے کے لیے مجھے پسند آئی۔"

"اور تمہارا پیشہ کیا ہے۔"

"میں ایک صحافی ہوں۔" اس نے جواب دیا اور اس سے پہلے کہ سراغ رساں اس سے یہ پوچھتا کہ وہ کس اخبار سے منسلک تھا، وہ جلدی سے بول پڑا۔ "فری لانس۔" اور پھر وہ منت بھرے لہجے میں گویا ہوا۔ "دیکھو، اگر تم مجھ سے مزید پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہو تو اوپر میرے کمرے میں چلو۔ میں بالائی منزل پر ٹھہرا ہوا ہوں یہ۔۔۔ یہ جگہ بہت ہیبت ناک ہے، میرا جی متلا رہا ہے۔"

لیکن پولیس کا خیال تھا کہ اس کا جی متلا رہا ہو یا نہ متلا رہا ہو، اس کے لیے بہترین جگہ پولیس اسٹیشن تھی جہاں وہ ان کی تفتیش میں مددگار ثابت ہوسکتا تھا

☆☆☆

قتل کی خبر اس دن شام کے تقریباً تمام اخبارات میں تھی لیکن خبروں میں یہ بتایا گیا تھا کہ اگرچہ قتل کا الزام کسی پر بھی عائد نہیں کیا جا سکتا تھا تاہم ایک شخص سے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔ رے کا نام ظاہر نہیں کیا گیا تھا لہٰذا اگر لوسی نے شام کا کوئی اخبار پڑھا بھی ہوگا تو اسے یہ نہیں معلوم ہوسکا ہوگا کہ رے اس کے تعاقب میں تھا اور جب وہ رہا ہوگا تو اپنے اس منصوبے پر عمل کرے گا جس کے لیے وہ ڈیلنگ فورڈ آیا تھا لیکن پولیس اسٹیشن میں اس سے مزید پوچھ گچھ کی جا رہی تھی اور بار بار وہی سوالات کیے جا رہے تھے جن کے جواب وہ دے چکا تھا۔ دو سراغ رساں ایک مختصر سے کمرے میں اس سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ کبھی وہ نرم رویہ اختیار کرتے تھے اور کبھی ایک دم سے بھڑک اٹھتے تھے۔ لہٰذا رے یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ کیا اسے کوئی وکیل کر لینا چاہیے تھا جو اس کی مدد کرسکتا لیکن وہ جس واحد وکیل کو جانتا تھا وہ لندن میں تھا۔ وہی وکیل جس نے طلاق کے مقدمے میں اس کی پیروی کی تھی اور اس کا بیڑا غرق کر دیا تھا۔ رے کو یقین تھا کہ یہ اسی وکیل کی نااہلی تھی کہ بچے لوسی کے حوالے کر دیے گئے تھے اور رے کو ہفتے میں صرف ایک بار بچوں سے ملنے کی اجازت دی گئی تھی۔ لیکن لوسی اچانک بچوں سمیت برمنگھم چلی گئی تھی جہاں سے وہ لندن آئی تھی اور اس کی اس حرکت نے رے کو بچوں سے جدا کر دیا تھا لہٰذا وہ انتقاماً بچوں کو اس سے چھیننے کا ارادہ کر چکا تھا۔ اسی ارادے کے تحت اس نے رقم بچانی شروع کر دی تھی اور اسپین میں اپنے ایک دوست سے اس کا مختصر سا ولا خرید لیا تھا۔ وہ سچ مچ کوئی صحافی نہیں تھا بلکہ ایک بہت بڑی تعمیراتی کمپنی کے اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھا جہاں اس نے کافی رقم خرد برد کی تھی اور پھر اچانک فرار ہوگیا تھا۔ کمپنی کو اس کے فرار ہونے کے بعد ہی اس غبن کا علم ہوسکا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ اس رقم کو بہت آسانی سے ہضم کرسکتا تھا لیکن اب اگر وہ اپنے اس وکیل کو طلب کرتا تو کیا اسے وکیل کو ساری بات نہ بتانی پڑتی۔ وکیل اس سے ساری تفصیل جاننا چاہتا کہ وہ برمنگھم اور آکسفورڈ کیوں گیا تھا اور لوسی کا تعاقب کیوں کر رہا تھا۔ اس طرح تو الٹی

آنتیں گلے پڑ سکتی تھیں چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ پولیس کے سوالوں کا جواب دیتا رہے گا۔ آخر میں وہ لوگ خود ہی سمجھ جائیں گے کہ وہ بے قصور تھا اور اسے رہا کر دیں گے۔

پولیس بے شک اس سے یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اس نے مسز کرین کی رقم کہاں چھپائی تھی جس کے بارے میں پولیس کو یقین تھا کہ اس نے چرائی تھی۔ انہوں نے اس کی تلاشی لی تھی اور اس کے کمرے کی بھی تلاشی لی تھی جس میں وہ ٹھہرا ہوا تھا لیکن ظاہر ہے، انہیں کوئی رقم نہیں ملی تھی۔ انہوں نے اس کی انگلیوں کے نشانات بھی لیے تھے جو گلاس اور آہنی سلاخ پر پائے گئے نشانات سے قطعی مختلف نہ تھے اور جب انہوں نے اسے یہ بات بتائی تو خوف نے اس کے دل کو جکڑ لیا تھا۔ پھر بھی اسے یقین تھا کہ اس کے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''تم لوگ سمجھتے ہو کہ رقم میں نے چرائی ہے۔ پھر تمہی بتاؤ کہ میں نے رقم کہاں رکھی ہوگی۔'' اس نے پوچھا۔ ''آج سنیچر ہے بینک بند ہیں ویسے بھی ڈیلنگ فورڈ میں میرا کوئی پیکٹ اپنے لندن کے پتے پر خود کو ارسال کر نہیں سکتا تھا۔ صرف کوئی لفافہ ہی لیٹر بکس میں ڈال سکتا تھا۔''

''ہمیں اب بھی یہ نہیں معلوم کہ تم آج سہ پہر میں کہاں گئے تھے۔'' اسٹان نے کہا۔

''اوہ، بس۔۔۔ اِدھر اُدھر۔۔۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مجھے یاد نہیں کہ میں خاص جگہ گیا تھا۔''

''تم نے کہا ہے کہ تم نے تھوڑی بہت شاپنگ کی تھی۔''

اس کے پاس سپر مارکیٹ کا پلاسٹک کا شاپر تھا جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ واقعی وہاں گیا تھا۔

''ہاں، میں اسکوائر کے سپر مارکیٹ میں چند منٹ کے لیے گیا تھا اور وہاں سے رات کے کھانے کے لیے ایک دو چیزیں خریدی تھیں۔'' وہ بولا

''اور تم صرف چند منٹ وہاں ٹھہرے تھے۔''

''ہاں، حالانکہ مجھے چیک آؤٹ کاؤنٹر کے سامنے قطار میں بھی کھڑا رہنا پڑا تھا۔''

''کیا کوئی جانتا ہے کہ تم کس وقت وہاں گئے تھے''۔

''تمہاری مراد کاؤنٹر پر موجود لڑکی سے ہے؟''

''ہاں، یا کوئی اور۔۔۔''

''میں ایسے کسی شخص کو نہیں جانتا۔'' اس نے خوف اور بے بسی کی ملی جلی کیفیت کے تحت کہا۔

''اس کے بعد تم کہاں گئے تھے؟''

''کچھ دیر تک سڑک پر مٹر گشت کرتا رہا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ایک کیمسٹ کی دکان کے باہر کھڑا رہا تھا لیکن اندر نہیں گیا تھا۔ پھر میں قریب ہی اسٹیشنری کی ایک دکان تک گیا تھا۔''

''تم وہاں کیوں گئے تھے؟''

''چند لفافے خریدنے گیا تھا لیکن پھر میں نے ارادہ بدل دیا تھا۔''

''گویا اس دکان میں یا کیمسٹ کے ہاں ایسا کوئی نہیں جسے یہ یاد ہو کہ تم وہاں گئے تھے۔''

''نہیں، میں ہارڈ ویئر کی ایک دکان کے قریب سے بھی گزرا تھا لیکن میں نے وہاں سے بھی کچھ نہیں خریدا تھا۔''

''پھر بھی سپر مارکیٹ کے کاؤنٹر پر موجود اس لڑکی کو یاد ہوگا کہ تم کس وقت وہاں گئے تھے۔''

''ممکن ہے۔''

''اگر کسی نے تمہیں دیکھا ہوگا تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔''

اچانک اس کا جی چاہا کہ وہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگے۔ اگر اس نے لوسی کا تعاقب کرتے ہوئے خاص طور سے یہ احتیاط برتی ہوتی کہ لوسی اسے دیکھ نہ لے اور پہچان نہ لے تو وہ اس بات کی شہادت دے سکتی تھی کہ رے واقعی اس وقت سپر مارکیٹ میں تھا۔''

''اس کے بعد تم کہاں گئے تھے۔'' اسٹان نے پوچھا

''کہیں نہیں۔ بس سڑک پر ٹہلتا رہا تھا۔'' اس

نے جواب دیا۔ ''میں نے یہ غور نہیں کیا تھا کہ اس بلاک کا کیا نام تھا۔ کچھ دور تک گیا پھر واپس پلٹ کر ٹہلتا ہوا مسز کرین کی سرائے آ گیا اور وہاں تم لوگوں کو پایا۔

''تم کل کتنی دیر باہر رہے۔''

''کیا میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ میں ۲ بج کر ۱۰ منٹ پر سرائے سے نکلا تھا اور مجھے یاد نہیں کہ میں کس وقت واپس آیا تھا۔ تم لوگوں کو مجھ سے بہتر معلوم ہوگا۔

''۲ بج کر ۵۵ منٹ پر۔'' اسٹان بولا۔ ''اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم تقریباً پون گھنٹہ باہر رہے۔''

''ہاں شاید۔۔۔''

اس کے بعد وہ لوگ اس کے لیے ایک کپ چائے لے کر آ گئے اور پھر اسے لگ بھگ ایک گھنٹے کے لیے بالکل تنہا چھوڑ دیا۔ اتنا وقت کڑھنے اور خوش فہمی دور کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ لوگ اس سے جس قسم کے سوالات کرتے رہے تھے اور ان کے چہرے پر جو تاثرات تھے اس سے بہ آسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ انہیں یقین تھا کہ قتل اسی نے کیا تھا۔ وہ یہ سوچ کر ہلکے ہلکے کانپنے لگا۔ حالانکہ کمرا سرد نہیں تھا۔ شاید وہ لوگ سپر مارکیٹ کے کاؤنٹر کی اس لڑکی سے اور کیمسٹ وغیرہ سے پوچھ گچھ کرنے نکل گئے تھے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ یہ سوچنے لگا کہ اگر اس کے حالات بہت ہی خراب ہو گئے تو وہ کتنی آسانی سے موقع واردات سے اپنی عدم موجودگی کا ثبوت پیش کر سکے گا۔ آخر میں تو اسے یہی کرنا ہی تھا۔ اس کے سوا کوئی چارا نہیں تھا۔ وہ شدت سے اس معاملے پر غور کرنے لگا

☆☆☆

رات کے تقریباً آٹھ بج رہے تھے۔ اس وقت تک سپر مارکیٹ کے کاؤنٹر والی لڑکی سے پوچھ گچھ کی جا چکی تھی۔ ان لوگوں نے واپس پولیس اسٹیشن آ کر اسے بتایا کہ اس لڑکی کو مطلق یاد نہیں تھا کہ اس نے اسے دیکھا تھا۔ انہوں نے دوسرے لوگوں سے بھی پوچھ گچھ کی بھی لیکن نتیجہ صفر رہا تھا۔

''اب۔۔۔'' اسٹان نے کہا۔ ''سچ سچ ہمیں بتا دو کہ تم کہاں گئے تھے؟''

اس وقت اسٹان دوستانہ موڈ میں تھا۔ رے نے ایک گہری سانس لی۔ اس نے محسوس کیا کہ سچ بتانا اس کے حق میں بہتر ہوگا۔ سب نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔

''بات دراصل یہ ہے کہ میں نے تمہیں ساری بات نہیں بتائی ہے۔'' وہ بولا۔

''حیرت۔۔۔ حیرت۔'' اسٹان نے خوش دلی سے کہا۔ ''ویسے ہم جانتے تھے کہ تم نے ہمیں ساری بات نہیں بتائی ہے۔ اگر بتا دیتے تو ہم بہت سی پریشانی سے بچ جاتے لیکن ہم نے سوچا کہ تم جلد یا بدیر ہمیں سب کچھ سچ سچ بتا ہی دو گے۔ اب بتاؤ کہ تم حقیقتاً کہاں گئے تھے؟''

''میں سپر مارکیٹ میں ہی تھا۔'' اس نے جواب دیا

''لیکن میرے خیال میں، مجھے اس کی وضاحت کر دینی چاہیے کہ میں وہاں کیا کر رہا تھا۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے، میں وہاں تھا اور پھر میں کیمسٹ کی دکان کے باہر اور اسٹیشنری کی دکان اور ہارڈ ویئر اسٹور کے باہر بھی تھا لیکن اس کی وجہ۔۔۔ یہ بتانا میرے لیے ذرا مشکل ہو رہا ہے۔ میں دراصل اپنی بیوی کا تعاقب کر رہا تھا۔''

''ہمیں نہیں معلوم تھا کہ تمہاری کوئی بیوی بھی ہے۔ تم نے پہلے اس کا ذکر نہیں کیا۔'' اسٹان بولا۔

''ہاں، کیونکہ میں نے سوچا کہ تمہیں میری وہ حرکت بہت احمقانہ لگے گی۔'' رے نے جواب دیا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ ہم میں طلاق ہو چکی ہے لیکن یہ میں نہیں تھا جو طلاق دینا چاہتا تھا۔ کبھی نہیں۔ خیر، طلاق کے بعد میرے ذہن میں یہ خیال تھا کہ میں ایک بار پھر کوشش کر کے دیکھوں۔ ممکن ہے وہ مان جائے اور ہم پھر سے ایک ہو جائیں۔ مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ ڈیلنگ فورڈ آئی ہوئی ہے۔ پھر اتفاق سے میں جونہی مسز کرین کے ہاں سے نکلا میری نظر

اس پر پڑی۔ وہ سپر مارکیٹ کی سمت گامزن تھی چنانچہ میں اس کا تعاقب کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

"گویا وہ ہمیں یہ بتا سکتی ہے کہ تم ۲ بج کر ۱۰ منٹ کے چند لمحے بعد کہاں تھے۔" اسٹان بول پڑا۔

"پھر تم نے ہمیں یہ بات پہلے ہی کیوں نہیں بتائی؟"

"کیونکہ وہ تمہیں کچھ بھی نہیں بتا سکتی۔"

"کیا مطلب۔ کیا وہ اپنے سابق شوہر کو پہچان نہیں سکتی۔"

"دیکھو، بات دراصل یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے دیکھے۔ میں نے اس کا خاص خیال رکھا تھا کیونکہ میں وہاں اس سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ صرف یہ پتا چلانا چاہتا تھا کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ میں نے اس سے علیحدہ ہونے کے بعد ہی یہ داڑھی بڑھانا شروع کردی تھی اور اس وقت میں نے چشمہ لگا رکھا تھا اور کچھ فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کررہا تھا لہٰذا مجھے یقین ہے کہ اس نے مجھے نہیں دیکھا ہوگا۔"

"اچھا اب میں سمجھا۔" اسٹان اپنے جبڑے کو سہلاتے ہوئے اسے پرخیال نظروں سے دیکھنے لگا۔ "تم محض اس خیال سے اس کا پیچھا کررہے تھے کہ اپنے معاملات کو درست کرسکو۔"

"ہاں، یہی بات تھی۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے ارادے کچھ اور تھے۔ مثلاً تم اس سے انتقام لینا چاہتے تھے کیونکہ اس نے تمہاری زندگی تباہ کردی تھی یا ایسی ہی کوئی بات۔۔۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمیں کوئی لاش پڑی ہوئی ملے، تم نے اسے ہلاک تو نہیں کردیا۔"

"خدایا، نہیں۔" رے کے منہ سے نکلا۔ "وہ بالکل خیریت سے ہے۔ میں یہ پتا چلا کر کہ وہ کہاں رہتی ہے، واپس سرائے چلا گیا تھا۔ میں نے اس سے بات تک نہیں کی۔ میں اس بات پر غور کرنا چاہتا تھا کہ معاملات کو کیسے درست کروں۔ میں یہ سوچنا چاہتا تھا کہ اس سے کس طرح بات کروں۔"

"اگر تمہاری ان باتوں میں کوئی سچائی ہے تو وہ ہمیں یہ تو بتا سکے گی کہ وہ واقعی سپر مارکیٹ میں تھی جیسا کہ تمہارا بیان ہے اور یہ کہ وہ اس کے بعد کہاں کہاں گئی تھی۔"

"ہاں، بالکل۔" رے جلدی سے بول پڑا۔ "وہ کیمسٹ کی دکان میں گئی تھی لیکن میں اندر نہیں گیا تھا۔ پھر وہ اسٹیشنری کی دکان اور پھر ہارڈ ویئر اسٹور میں گئی تھی۔ اس کے بعد وہ گھر چلی گئی تھی۔"

"تو اگر وہ یہ کہتی ہے کہ وہ تمہارے بیان کردہ وقت کے مطابق ان جگہوں پر گئی تھی تو اس کا یہی مطلب ہوگا کہ تم اس کا تعاقب کررہے تھے۔"

"ہاں، ہاں، میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔" رے نے زور زور سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن، کیا۔۔۔ لیکن کیا تمہیں اسے یہ بتانا پڑے گا کہ تم اس سے یہ سوالات کیوں کررہے ہو۔ میرے خیال میں، تمہیں بتانا پڑے گا۔ افسوس صد افسوس۔ اس طرح میرے معاملات تو بگڑ جائیں گے لیکن یہ معاملہ ممکن ہے سدھر جائے۔"

"مجھے تو ایسا کچھ نظر نہیں آتا کہ تمہیں اس سے نقصان ہوگا۔" اسٹان بولا۔ "اب ہمیں اس کا نام اور پتا دے دو، کیا وہ اب بھی مسز رے کہلاتی ہے یا پھر سے اپنا کنوارے پن کا نام اختیار کرلیا ہے۔"

"میرے خیال میں وہ اب بھی مسز رے ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سڑک کا نام پارک وے ٹیرس یا ایسا ہی کچھ تھا اور مکان کا نمبر 37 تھا۔"

"ٹھیک ہے آؤ بوب۔" اسٹان نے کہا اور وہ اور اس کا نائب بوب دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ پھر اسٹان دروازے پر پہنچ کر مڑا۔ "مسٹر رے، ایک بات یاد رکھنا، جیوری اکثر بیوی کی گواہی کو معتبر تصور نہیں کرتی۔" وہ بولا اور دونوں نکل گئے۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد جب وہ واپس آئے تو لوسی ان کے ہمراہ تھی۔ اس کے جسم پر اب بھی وہی اوورکوٹ تھا لیکن اس نے اسکارف اتار دیا تھا اور اس کی سنہری زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ اس کے اندر داخل ہونے پر رے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "ہیلو۔" وہ دھیرے سے بولا۔

لوسی نے منہ سے کچھ نہیں کہا صرف اسے تکتی چلی گئی۔

"کیا تم اسے اپنے شوہر کی حیثیت سے پہچانتی ہو۔" اسٹان نے پوچھا۔

"سابق شوہر۔" وہ بولی۔

"سوری، مجھ سے غلطی ہو گئی۔ تمہارا سابق شوہر، کیا تم ہمیں یہ بتا سکتی ہو کہ تم نے اسے آج سہ پہر میں دیکھا تھا۔

لوسی کے تاثرات بالکل سرد تھے۔ وہ گویا کسی اجنبی کو دیکھ رہی تھی۔ "میں نے اسے طلاق کے وقت سے اب تک نہیں دیکھا تھا۔" وہ بولی۔ "اس بات کو ایک سال سے زیادہ ہو گیا ہے۔"

یہ جھوٹ تھا۔ اس نے رے کو برمنگھم میں دیکھا تھا جب رے نے اس سے بچوں کو چھیننے کی کوشش کی تھی۔ رے سمجھ گیا کہ اب کیا پیش آنے والا تھا۔

"کیا تم ہمیں یہ بتا سکتی ہو کہ تم آج سہ پہر میں کہاں تھی۔" اسٹان نے پوچھا۔

"میں تمہیں یہ کیوں بتاؤں؟"

"اس سے ہمیں مدد مل سکے گی۔"

"میں شاپنگ کرنے گئی تھی۔" وہ بولی۔

"اسکوائر کے سپر مارکیٹ میں۔"

"نہیں۔ میں مشکل سے وہاں جاتی ہوں، وہاں کی بھیڑ بھاڑ سے مجھے نفرت ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"پھر تم کہاں گئی تھیں۔

"میں مارکس اینڈ اسپنسر میں گئی تھی اور وہاں سے پکانے کی کچھ ریڈی میڈ چیزیں خریدی تھیں اور بس۔

رے کو یقین ہو گیا کہ اس کی باتیں درست ثابت ہوں گی لیکن وہ آج نہیں بلکہ گزشتہ کل مارکس اینڈ اسپنسر گئی ہو گی۔ اگر وہاں کسی کو یہ یاد بھی ہو گا کہ اس نے اسے وہاں دیکھا تھا تو یہ یاد نہیں ہو گا کہ کب دیکھا تھا اور اگر سراغ رسانوں نے اس کے گھر کی تلاشی لی تو انہیں فریج میں وہ چیزیں مل بھی جائیں گی

"یہ جھوٹ بول رہی ہے۔" اس نے چیخنا چاہا لیکن جب وہ بولا تو اس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔ "یہ سپر مارکیٹ میں تھی اور اس نے وہاں سے کچھ سبزیاں اور ڈبل روٹی وغیرہ اور وہسکی کی دو بوتلیں خریدی تھیں۔ جا کر دیکھو، اس کے گھر میں وہسکی کی دو بند بوتلیں ہیں کہ نہیں۔"

"نہیں صرف ایک بوتل ملے گی جو میں نے گزشتہ کل نکڑ سے یہ خریدی تھی۔ اس کے ساتھ اور ایک بوتل تھی جو میں نے بالائی منزل پر رہنے والے بڑے میاں کے لیے خریدی تھی لیکن آج سہ پہر میں نے لے جا کر انہیں دی تھی۔"

وہ بولی۔ "میں اپنے لیے وہسکی کی دو بوتلیں خرید کر کیا کروں گی۔"

"کیا تم کیمسٹ کے ہاں بھی گئی تھیں۔" اسٹان نے سوال کیا

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

"اور اسٹیشنری کی دکان میں اور ہارڈ ویئر اسٹور میں۔"

"نہیں

"گویا تم صرف مارکس اینڈ اسپنسر میں گئی تھیں۔"

"ہاں

اسٹان، رے کی طرف مڑا اور طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ گویا وہ موقع واردات سے اس کی عدم موجودگی کے ثبوت کو کافور ہوتے دیکھ کر محظوظ ہوا ہو۔

"اب۔۔۔" وہ بولا۔

رے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ لوسی کی شکل دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس نے اس تمام عرصے میں اپنے ہاتھوں کو اس تک پہنچنے سے کیسے روکا تھا۔ سوائے ایک موقع کے جب وہ غیر متوقع طور پر گھر لوٹا تھا اور اس نے بچوں کو گھر میں بند، تنہا اور بھوکا پایا تھا اور جب لوسی پب سے لوٹی تھی جہاں وہ لنچ ٹائم میں ڈرنک لینے اور گپ شپ کرنے جایا کرتی تھی تو

رے نے اس کے جبڑے سہلا دیے تھے۔ وہ الماری سے جا ٹکرائی تھی اور اس کی پسلی کی دو ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ وہی واقعہ طلاق کا نقطہ آغاز ثابت ہوا تھا۔ عدالت نے بچوں کو بھی اس کے حوالے کر دیا تھا جن سے اسے اتنی محبت نہیں تھی جتنی رے کو تھی۔

''یہ سب جھوٹ ہے۔'' وہ چیخا۔ ''حقیقت میں نے تمہیں بتا دی ہے۔''

لوسی نے اپنی گردن دھیرے سے نفی میں ہلائی۔ اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ ''تمہارا ایک لفظ بھی سچ نہیں ہے۔''

''لوسی! خدا کے لیے۔۔۔''

لوسی نے ایک بار پھر دھیرے سے گردن نفی میں ہلائی۔ اس کے ہونٹوں کے ایک گوشے پر مسکراہٹ گویا پھڑپھڑا رہی تھی۔ ایک زہریلی مسکراہٹ۔ اس نے تیسری بار اپنی گردن دھیرے سے نفی میں ہلائی۔ اس موقع پر اسٹان بول پڑا۔ 'ایک منٹ۔'' اس کے ساتھ ہی وہ اور اس کا نائب باہر چلے گئے۔ رے سمجھ گیا کہ وہ لوگ کمرے کے باہر کھڑے ان کی باتیں سننے کی کوشش کریں گے۔ تبھی وہ انہیں تنہا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ رے بے بسی سے سوچنے لگا، کیا کوئی ایسا طریقہ تھا کہ وہ لوسی سے سچ اگلوا سکتا اور وہ لوگ سن لیتے لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، لوسی میز پر آگے کی جانب جھکی اور اپنا چہرہ اس کی طرف بڑھایا۔ ''تم کتنا ہی جھوٹ کیوں نہ بولو رے، یہ لوگ تمہاری جان نہیں بخشیں گے۔'' وہ اتنی بلند اور واضح الفاظ میں بولی کہ وہ لوگ سن لیں۔ ''تم اپنی جان نہیں چھڑا سکو گے اور جب تم رہا ہو کر آؤ گے تو ہمارے بچے جوان ہو چکے ہوں گے اور مجھے تم سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔''

''تم بچوں کو اپنے پاس کیوں رکھنا چاہتی ہو۔'' اس نے پوچھا۔ ''تم اچھی ماں تو نہیں ہو۔''

''عدالت نے انہیں میرے حوالے کیا تھا۔'' وہ بولی۔ ''وہ میرے حوالے کیے گئے تھے کیونکہ تم ایک انتہائی کھٹیا انسان ہو۔ اب میں چند سال سکون سے گزار سکوں گی۔ مجھے یہ خوف نہیں ہوگا کہ تم بچوں کو مجھ سے چھین لو گے۔ انہیں یہ جاننے کی بھی ضرورت نہیں کہ ان کا ایک باپ ہے جو جیل میں پڑا سڑ رہا ہے۔''

''لیکن لوسی! کیا تم یہ نہیں سمجھتیں کہ تم ایک قاتل کو آزاد کر رہی ہو۔'' وہ چیخا۔ ''صرف میرے بارے میں مت سوچو، کوئی شخص اس گھر میں کھلے دروازے سے داخل ہوا تھا۔ غریب مسز کرین نے اسے اپنے کمرے میں بلایا تھا اور اس شخص نے اس کی کھوپڑی پاش پاش کر دی اور ساری رقم چرا لے گیا۔ وہ پھر ایسی حرکت کرے گا کیا تم نہیں سمجھتیں لوسی۔۔۔! وہ پھر ایسی حرکت کرے گا۔''

لیکن اس کا خیال غلط تھا، قاتل اسی شام پکڑا گیا تھا۔ مسز کرین کے سامنے والے مکان میں رہنے والی ایک عورت نے انہیں فون کر کے بتایا تھا کہ اس نے سوا دو بجے کے بعد ایک شخص کو اندر جاتے اور باہر نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ شخص مسز کرین کی گلی میں ہی رہتا تھا اور جب پولیس نے اس سے پوچھ گچھ کی تو وہ یہ بتانے سے قاصر رہا کہ اس کے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی تھی جو اس سے برآمد ہوئی تھی لیکن لوسی نہیں جانتی تھی کہ رے کا خیال غلط تھا۔ وہ اس کی بات سن کر مسکرا دی۔ اگر وہ نہ مسکراتی تو شاید صحیح سلامت کمرے سے نکل جاتی۔ سراغ رساں حضرات اس کی وہ مسکراہٹ دیکھنے کے لیے اس وقت کمرے میں نہیں تھے لیکن انہوں نے اس کی چیخ ضرور سنی اور جب وہ بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے تو اسے میز پر بکھرا ہوا پایا جبکہ رے کے ہاتھ اس کا گلا گھونٹ چکے تھے۔ گویا ایک اور قاتل ان کے سامنے تھا۔ اب وہ اپنے بچوں کو لے کر اسپین نہیں بھاگ سکتا تھا جہاں ایک وِلا ان کا منتظر تھا۔

الھانی

شہزاد رفیع

ایک مصنف کا قصہ،وہ اپنی ہر کہانی کا انجام حقیقت سے قریب ترین لکھنے کا عادی تھا۔ لیکن جب اس نے اپنی ذاتی زندگی کو کہانی کا روپ دینا چاہا تو...... ایک جوڑے کا قصہ ،وہ مقدس بندھن میں جکڑے ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے دور تھے۔

ذہانت و فطانت سے بھرپور ایک مختصر لیکن خوب صورت تحریر

"میں یہ درست کرنا چاہتا ہوں۔" ہیری نے کہا۔ "پچھلی کتاب میں یہ غلطی کرنے کے بعد کہ ٹورنٹوں سے ڈیٹرائٹ پہنچنے میں کتنا وقت لگتا ہے، میں اس کہانی میں ایسی کوئی غلطی کرنا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ بالکل واٹرنائیٹ ہو۔ اس لیے میرے ساتھ رہو تاوقتیکہ مجھے یقین نہ ہو جائے کہ ہم نے وقت کا بالکل صحیح تعین کیا ہے۔

وہ دونوں میاں ،بیوی سڈبری سے تقریباً دس میل دور شمال میں ایک بہت پرانی کان کی سرنگ کے کنارے کھڑے تھے۔ وہ سرنگ تقریباً پچاس سال پہلے ڈالی گئی تھی۔ پورا علاقہ گھنی جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ راستہ بہت دشوار گزار تھا وہاں چیڑ اور صنوبر کی بہتات تھی۔ انہیں جھاڑ جھنکاڑ میں پنجوں کے بل چل کر وہاں تک پہنچنا پڑا تھا۔ بڑی ہی ویران اور پر ہول جگہ تھی۔ دور دور تک کسی کا نام ونشان نہ تھا۔ لوسی حیران تھی کہ اس کے شوہر نے وہ جگہ کیسے دریافت کی

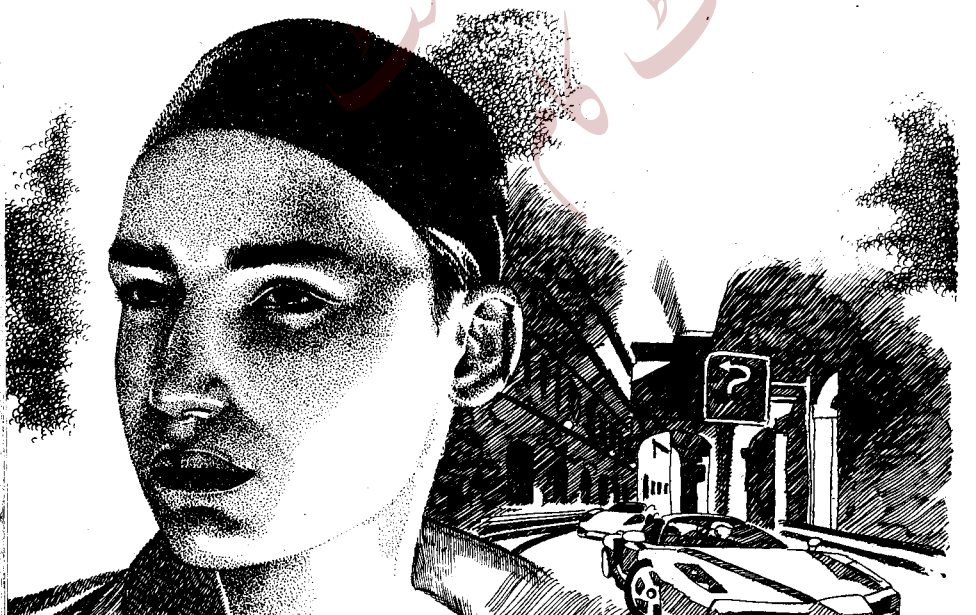

تھی۔ معلوم ہوتا تھا، ہیری نے اس کا ذہن پڑھ لیا تھا۔

''میں نے دو سال پہلے یہ جگہ دریافت کی تھی۔'' اس نے کہا۔ ''ہوا یہ کہ میں اور ڈیوٹ شکار کھیلنے کے ارادے سے آئے تھے کسی نے ہمیں بتایا کہ کان کے ذخائر کے ساتھ ساتھ ہمیں ریچھ مل جائیں گے، لیکن ہم اس سڑک پر مڑنے کے بجائے غلط سڑک پر مڑ گئے تھے اور ادھر آ نکلے تھے۔

وہ ایک رائٹر تھا۔ جرائم اور سراغ رسانی پر مبنی کہانیاں لکھتا تھا اور جہاں تک اس سے ممکن ہوتا تھا کہانی کے پلاٹ پر پہلے خود عملی طور پر اس کے صحیح اور غلط ہونے کا اندازہ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اسے یقین ہو جاتا تھا کہ اب کام بن جائے گا۔ کہانی کی نوک پلک بعد میں درست کی جا سکتی تھی۔ اس عملی تحقیق میں اس کی بیوی لوسی ہمیشہ اس کا ساتھ دیتی تھی۔ کہانی کی خاطر اکثر وہ پرفضا مقامات کی سیر کرتے تھے اور بہت مزا آتا تھا لیکن اس مرتبہ وہ اس لیے اپنے شوہر کے ہمراہ آئی تھی کہ وہ جاننا چاہتی تھی، ہیری کے ذہن میں کیا تھا۔ اکتوبر کے مہینے میں لوگ سڈبری نہیں آتے تھے۔

''مجھے پھر بتاؤ۔'' وہ بولی۔ ''تمہاری کہانی کا ولن اپنی بیوی کو اتنی دور لانے پر کیسے آمادہ کرتا ہے۔''

''تم آ گئی ہو۔''

''میں تو تحقیق کے لیے آئی ہوں۔ اگر تم اپنی کہانی کے ولن کو رائٹر کے طور پر پیش نہیں کرو گے تو تمہیں پریشانی ہوگی۔ ویسے وہ کرتا کیا ہے۔''

''ابھی میں نے اس کا فیصلہ نہیں کیا ہے۔'' ہیری نے جواب دیا۔ ''ویسے بھی اس بات کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ میں صرف اس امر کو یقینی بنانا چاہتا ہوں کہ میرا مطلب پورا ہو جائے اس کے بعد ہی میں اس کردار کو سنواروں گا۔''

''تمہاری بات درست ہے لیکن جب تک قاری کو یقین نہ آئے کہ ہیروئن اس ویرانے میں چوتھائی میل تک جھاڑیوں میں ٹھوکریں کھاتی رہی تھی، تمہارا مقصد پورا نہیں ہوگا۔ تمہیں اس کی کوئی معقول وجہ فراہم کرنی پڑے گی۔'' لوسی نے کہا۔

''فراہم کر دوں گا۔'' وہ بولا۔ ''اب ہم پلاٹ کی طرف آتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔''

''تم عام طور سے اس طرح کام نہیں کرتے۔ عام طور سے تم پہلے کردار تخلیق کرتے ہو۔ پھر ان کرداروں سے کہانی کا تانا بانا بنتے ہو۔ تم بہرحال یہی کہتے ہو۔''

''ہاں، لیکن یہ پلاٹ تصنع سے پاک ہے۔ میرا مطلب ہے کم از کم میرا ولن یہی سمجھتا ہے۔ لہٰذا میں اس کی دنیا تخلیق کرنے سے پہلے اس کی تحقیق کرنے میں کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔ اوکے۔''

''اوکے۔۔۔ تو۔۔۔ اب ولن اپنی بیوی کو ہلاک کر دیتا ہے، ٹھیک ہے۔ اور اس کی لاش نیچے پھینک دیتا ہے۔'' لوسی نے ایک پتھر کو ٹھوکر ماری اور بغور سننے کی کوشش کی لیکن پتھر کے کسی چیز سے ٹکرانے کی آواز نہیں سنائی دی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نیچے سیکڑوں فٹ گہری کھائی تھی۔

''بالکل درست۔'' ہیری نے کہا۔ ''اور پھر پستول بھی نیچے پھینک دیتا ہے۔ وہ پہلے ہی اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ پستول دریافت نہ ہو سکے گا۔ پھر وہ ڈرائیو کرتا ہوا پیری ساؤنڈ میں واقع موٹل پہنچتا ہے جہاں انہوں نے ریزرویشن کرا رکھی تھی۔ جب وہ وہاں پہنچتا ہے تو تاریکی پھیل چکی ہوتی ہے۔'' وہ خاموش ہو کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا جہاں مغرب میں لالی پھیل گئی تھی۔

''تمہیں یہ آئیڈیا کہاں سے ملا۔'' لوسی پوچھ بیٹھی۔

''تم سے اور خود اپنے آپ سے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لوگ کہتے ہیں کہ ہم دیکھنے میں ایک جیسے لگتے ہیں۔''

''تمہارا ولن کپڑے کہاں بدلتا ہے؟''

''اپنی کار میں، کسی سڑک کے کنارے۔ دریا کے متوازی جو سڑک ہے شاید وہاں، کسی ویران جگہ

ہے۔'' ہیری نے جواب دیا۔ ''دراصل اسے پورے کپڑے بدلنے کی ضرورت بھی نہیں۔ صرف سنہری زلفوں کی وگ، لپ اسٹک اور چشمہ لگانا ہوتا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو دیکھا گویا لوسی کو بتانا چاہتا ہو کہ اس کا کیا مطلب تھا۔ ہیری اور لوسی دونوں ایک جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ نیلی جینز اور بھاری بھرکم جیکٹ جو ان کی کمر سے نیچے تک کی تھی۔''

''تمہارا مطلب ہے وہ اپنی بیوی کا روپ دھار لیتا ہے۔'' لوسی نے پوچھا۔''

''ہاں تم ٹھیک سمجھیں۔'' وہ بولا۔ ''وہ اپنی بیوی کے روپ میں اس موٹل میں پہنچتا ہے اور موٹل والوں سے کہتا ہے کہ اس کا شوہر کار پارک کر رہا ہے یا بیئر خرید رہا ہے یا ایسا کوئی بہانہ کرتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ موٹل کے لوگ ''بیوی'' کو دیکھتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ اس کا شوہر بھی موجود ہے۔ ایک گھنٹہ کے بعد وہ اپنے اصل روپ میں یعنی شوہر کے روپ میں موٹل کے آفس پہنچتا ہے اور ان لوگوں سے کہتا ہے کہ صبح انہیں جگا دیا جائے۔ اب موٹل والوں نے گویا دونوں میاں بیوی کو دیکھ لیا ہے۔ پھر آدھی رات کو جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ آس پاس کے کمروں میں ٹھہرے ہوئے لوگ زبردست لڑائی جھگڑے اور مار پیٹ کی آوازیں سنتے ہیں۔ جب شور شرابے کی آوازیں تھمنے کا نام نہیں لیتیں تو وہ لوگ جا کر استقبالیہ پر اس کی شکایت کرتے ہیں جس پر شبینہ کلرک ان کے کمرے میں فون کر کے ان سے کہتا ہے کہ وہ لڑائی جھگڑا بند کریں اور لوگوں کی نیند حرام نہ کریں۔

''لڑائی جھگڑے کی آوازیں ٹیپ سے آ رہی ہیں۔ ٹھیک۔'' لوسی بول پڑی۔

''بالکل۔'' ہیری نے کہا۔ ''پھر علی الصباح ایک بار پھر جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ دھواں دھار طریقے سے پھر دروازا ایک زوردار دھماکے سے بند ہوتا ہے اور لوگ بیوی کو سخت طیش کے عالم میں کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ناشتے کے وقت شوہر نکل جاتا ہے لیکن جاتے وقت اس خیال سے اپنی بیوی کے لیے ایک پیغام چھوڑ جاتا ہے کہ ممکن ہے وہ لوٹ آئے۔ وہ استقبالیہ کلرک کو بتاتا ہے کہ اس کی ''بیوی'' اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی ممکن ہے وہ کسی دوسرے موٹل میں جا ٹھہری ہو۔ اس کا پیغام یہ ہے کہ وہ آس پاس رہ کر اس کا انتظار نہیں کرے گا بلکہ وہ سیدھے گھر جا رہا ہے۔''

''گویا وہ سنہری زلفوں کی وگ، لپ اسٹک، اور چشمہ لگا کر یعنی اپنی بیوی کا روپ دھار کر موٹل سے نکل جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے بعد خاموشی سے لوٹ آتا ہے۔ کیا اس طرح وہ ایک خطرہ مول نہیں لیتا؟''

''قطعی نہیں۔'' ہیری نے جواب دیا۔ ''اگر کوئی اسے دیکھ لیتا ہے، تو وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے پیچھے گیا تھا لیکن وہ نہیں ملی اور بس۔ پھر وہ گھر چلا جاتا ہے اور جب اس کی بیوی اس دن نہیں لوٹتی تو وہ پولیس کو رپورٹ کر دیتا ہے لیکن ایسے حالات میں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بیوی کہیں چلی گئی ہے اس طرح چند ہفتے گزر جاتے ہیں اور تب وہ پولیس کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ سنجیدگی سے اس معاملے میں دلچسپی لیں۔''

''اور جب وہ سنجیدگی سے اس معاملے کو لیتے ہیں تو کیا بیوی انہیں مل جاتی ہے۔'' لوسی نے جاننا چاہا۔

اب کچھ زیادہ روشنی نہیں رہ گئی تھی۔ مشرق میں آسمان تقریباً سیاہ ہو گیا تھا۔

''یہ میں نہیں جانتا۔ اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔'' وہ بولا۔ ''چند ہفتے یا چھ مہینے۔۔۔ بات ایک ہی ہے۔''

''پولیس اس پر شک کرے گی۔'' لوسی نے کہا۔

''خاص طور سے اس صورت میں کہ جب دونوں میں زبردست لڑائی ہوئی تھی۔''

''لیکن وہ لوگ کچھ ثابت نہیں کر سکیں گے۔'' وہ بولا۔ ''صبح ناشتے کے وقت موٹل سے نکلنے کے بعد وہ اثار یو کی صوبائی پولیس کو لے کر پھر اس خیال سے

وہاں واپس آتا ہے کہ ممکن ہے اس کی بیوی پولیس کو لے کر وہاں آ گئی ہو اور وہ ٹورنٹو تک یہی کرتا ہے۔ پولیس کو اپنے وقت کا ٹھوس سراغ دیتا رہتا ہے۔''

''یہاں تک تو سب کچھ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔'' لوسی نے کہا۔ ''لیکن کیا تم نے سوچا ہے کہ تم اسے کیسے حل کرو گے۔ میرا مطلب ہے تمہارا ہیرو پورٹر اس کیس کو کیسے حل کرے گا؟''

''ابھی میں نے اس پر غور نہیں کیا ہے۔'' وہ بولا۔

''تم یوں شروع کر سکتے ہو کہ پورٹر کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ تم یہ پتا لگا سکتے ہو کہ وہ سڈبری سے کس وقت روانہ ہوا تھا اور اسے پیری ساؤنڈ کے اس موٹل تک پہنچنے میں پانچ گھنٹے کیوں لگ گئے تھے۔ کیا کسی نے ہائی وے پر اس کی کار کھڑی ہوئی دیکھی تھی، اس طرح کا کوئی نکتہ۔۔۔''

''کوئی مشکوک کیوں ہونے لگا۔'' ہیری نے الٹا سوال داغ دیا۔

لوسی نے اس نکتے پر غور کیا۔ ''لڑکی کا باپ۔'' وہ کچھ دیر کے بعد بولی۔ ''وہ اس شخص کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا جس سے اس کی بیٹی نے شادی کی تھی۔ اس نے اپنے داماد پر کبھی بھی بھروسا نہیں کیا تھا۔ چنانچہ وہ پرائیویٹ سراغ رساں پورٹر کی پیشہ وارانہ خدمات حاصل کر لیتا ہے۔''

اب تار پکی چھانے لگی تھی۔ ''اور اس کار کا کیا کرو گے جو کہانی کا ولن ڈرائیو کر رہا تھا۔ کسی نے یقیناً ان کی کار ہائی وے پر کھڑی ہوئی دیکھی ہوگی۔''

''کار کرائے کی ہے۔ بالکل عام سی کرائے کی کار۔'' ہیری نے کہا۔ ''اگر کوئی دیکھتا ہے تو اسے اس کا نمبر یاد نہیں۔ دیکھنے والا یاد رکھنے والے یہی سمجھیں گے کہ وہ شکاریوں کی جوڑی ہوگی لیکن ان اطراف میں تو مجھے ابھی تک کوئی نظر نہیں آیا، تمہیں نظر آیا؟''

''نہیں، مجھے بھی نہیں۔ اس ویرانے میں کون مارا مارا پھرتا ہوگا۔'' وہ بولی اور دل ہی دل میں یہ تسلیم کیے بغیر نہ رہ سکی کہ ہیری نے ہر چیز کور کر لی تھی۔ کم از کم لگتا تو یہی تھا۔ ''اب ہمیں واپس چلنا چاہیے۔'' وہ بولی اور پلٹ کر سڑک کی طرف بڑھنے لگی وہ مزید ایک بات جاننا چاہتی تھی۔

''میرا کام بن جائے گا۔'' ہیری نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ بن جائے گا۔'' اس نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنا ننھا سا پستول نکال لیا جو اس نے ڈیٹرائیٹ میں خریدا تھا۔''

مڑنا مت، لوسی!'' وہ بولا۔ ''میں نے کہا ہے، مڑنا مت۔''

''تو یہ بات تھی۔'' لوسی جو کچھ جاننا چاہتی تھی۔ ''تمہارا کام نہیں بننے والا ہیری۔'' وہ بولی۔

اس کا جملہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا ہیری نے ٹریگر دبا دیا۔ ایک بار، دو بار، تین بار۔

☆☆☆

سارا کام آرام سے ہو گیا تھا۔ اس کی بیوی اکثر اس کی کہانیوں کے پلاٹ پر اعتراض کرتی تھی کہ یہ بہت پیچیدہ ہوتا تھا لیکن اس مرتبہ کام بن گیا۔ ایک حسینہ نے جس کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا، رجسٹر پر مسز ہیری کے نام سے دستخط کیے اس دوران اس کا شوہر غالباً کار میں سے سامان اتار رہا تھا۔

رات کے دوران شبینہ کلرک کو انہیں فون کر کے تنبیہ کرنی پڑی کہ وہ بہت زیادہ لڑ جھگڑ رہے ہیں اور اتنا شور مچا رہے ہیں کہ دوسرے مہمانوں نے شکایت کی ہے۔ یہ لڑائی جھگڑا علی الصباح دروازا ایک دھماکا سے بند ہونے کے ساتھ ختم ہوا۔ پھر مسز ہیری استقبالیہ پر آئی اور اس نے کہا کہ وہ جا رہی ہے۔ اس کی آنکھوں پر اب بھی سیاہ چشمہ تھا۔ شبینہ کلرک نے سوچا، ممکن ہے اس کی آنکھ پر چوٹ آئی ہو اور اس نے اس چوٹ کو چھپانے کے لیے چشمہ لگا لیا ہو، مسٹر ہیری نے اسے بتایا کہ اس کا شوہر اسے چھوڑ کر ٹرین یا بس کے ذریعہ واپس ٹورنٹو چلا گیا ہے۔ ممکن ہے کار والوں سے لفٹ لی ہو۔ نہ تو یقین سے کچھ کہہ سکتی ہے اور نہ ہی اسے اس کی پروا ہے۔ وہ اس خیال سے اس کے لیے پیغام چھوڑ گئی کہ شاید وہ کال کر لے۔

لیکن اس کے شوہر نے کبھی کال نہیں کی۔

وہ ڈرائیو کر کے اپنے گھر پہنچی اور دو دن تک ہیری کی واپسی کا انتظار کیا۔ پھر پولیس کو مطلع کر دیا۔ پولیس نے اپنی معمول کی تحقیقات کیں، لیکن وہ لوگ کوئی خاص دلچسپی لیتے نہیں نظر آ رہے تھے۔ اس رات موٹل میں پیش آنے والا واقعہ بالکل واضح تھا اور پولیس کا یہ خیال تھا کہ ہیری محض اپنی بیوی کو پریشان کرنے کے لیے اس وقت تک غائب رہنا چاہتا تھا جب تک اس کے پیسے ختم نہیں ہو جاتے۔ پھر وہ اپنا کریڈٹ کارڈ استعمال کرنا شروع کر دیتا اور تب ہی وہ لوگ ٹھیک ٹھیک اس کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ ہاں انہوں نے یہ سراغ ضرور لگا لیا تھا کہ اس کی ایک گرل فرینڈ تھی جو شربورنی اسٹریٹ پر رہتی تھی اور وہ لوگ مستقل اس کے گھر کی نگرانی کر رہے تھے لیکن وہ لڑکی ہیری کی طرف سے اتنا ہی پریشان تھی جتنا کہ پولیس والے تھے۔

ہیری بھی لوٹ کر نہیں آیا۔ اس نے کبھی لوسی کو فون تک نہیں کیا۔ ایک ماہ کے بعد پولیس کو واقعہ کی سنگینی کا احساس ہوا اور وہ سنجیدگی سے تفتیش اور تحقیق کرنے لگی۔ لیکن جب پہلی برف باری ہوئی تو لوسی سمجھ گئی کہ پولیس موسم بہار سے پہلے اس کے شوہر کا سراغ نہیں لگا سکے گی اور وہ سراغ بھی کس کا لگائے گی۔ ایک لاش کا، جس کے پرس میں کوئی رقم نہیں ہوگی۔ ہاں، وہ پستول ضرور ہوگا جس سے وہ ہلاک ہوا تھا۔ لوسی نے اس کا وہ پستول پھینک دیا تھا جس سے اس نے اس کی گولیاں سفر پر روانہ ہونے سے ایک رات پہلے نکال لی تھیں کیونکہ وہ جان گئی تھی کہ ہیری کے کیا ارادے ہیں اور وہ گولیاں اس نے پیری ساؤنڈ جاتے ہوئے فرنچ ریور میں پھینک دی تھیں۔ پھر پولیس بھی کیا نتیجہ اخذ کرتی۔ یہی کہ وہ کاروالوں سے لفٹ لیتا ہوا سفر کر رہا تھا اور کسی مقامی بدمعاش نے اسے لوٹ کر ہلاک کر دیا اور اس کی لاش کان کی سرنگ کے پاس پھینک دی۔ ہاں، اس بات کا بہت ہی خفیف سا امکان تھا کہ اس شام کسی نے انہیں ان جھاڑیوں میں جاتے ہوئے دیکھا ہوگا لیکن یہ ایک ایسا امکان تھا جس کے لیے ہیری پہلے سے تیار تھا لہٰذا اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ پکی بات تو یہ کہ اس کی لاش کے دریافت ہونے کا امکان بھی دس ہزار میں ایک فیصد تھا۔ اس سے بھی کم اس بات کا امکان تھا کہ کسی نے لوسی کو صرف چند ہفتے تک غم کی چادر اوڑھے بیٹھے رہنا تھا۔ پولیس تفتیش کرتی رہتی۔

ہیری کا منصوبہ اپنی جگہ بہت اچھا تھا، مکمل تھا۔ اگر لوسی کافی عرصہ سے اس کی معشوقہ کے بارے میں نہ جانتی ہوتی اور اگر وہ اپنے پلاس کی تلاش کے دوران ہیری کا ماہی گیری کے سامان کے کٹ میں بھرا ہوا پستول، سنہری زلفوں کا وگ، میک اپ کا سامان اور سیاہ چشمہ نہ دیکھ لیتی تو وہ کبھی نہ جان سکتی کہ اس کے کیا ارادے ہیں۔ یہ جاننے کے بعد لوسی کو اپنے لیے صرف ایک پستول حاصل کرنا پڑا تھا اور ہیری پر یہ ظاہر کرنا پڑا تھا کہ اس کے اندازے غلط اور ہیری کے اندازے صحیح تھے۔ باقی سب کام ہو بہو ہیری کے منصوبے کے مطابق ہی انجام پایا تھا۔

ہنسی علاج غم ہے

''تمہارے شوہر کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

''مجھے تو شوہر سے نجات مل گئی ہے۔''

''تم نے کوئی علاج بھی کیا؟''

''اگر علاج کرتی تو نجات کیسے ملتی۔''

☆☆☆

ایک ماں نے اپنے بچے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ ''یاد رکھو بیٹا! ہم اس دنیا میں دوسروں کی بھلائی کے لیے آئے ہیں۔''

بچے نے تھوڑی دیر سوچا پھر بولا۔ ''اور امی دوسرے یہاں کس لیے آئے ہیں۔''

پانچویں قسط

لاوارث

غزالہ جلیل راؤ

انسان کسی بھی علاقے سے تعلق رکھتا ہو' کسی بھی ملک میں رہتا ہو' جہاں اس سے پیار کرنے والے ہوتے ہیں' وہیں اس سے نفرت کرنے والوں کا وجود بھی اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ اس کو زمانے کے گرم و سرد سے بچانے والے' اس کو سایہ فراہم کرنے والے اس کے لیے جان نچھاور کرنے والے ہر جگہ' ہر علاقے میں اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ وہیں اس کے خلاف سازشیں کرنے والے' اس کی راہوں میں کانٹے بچھانے والے' اس کی زندگی کے دشمن بھی اس کے دوستوں کے روپ میں اس کے وجود کا حصہ بن کر رہتے ہیں۔

ایک ایسے ہی نوجوان کا قصہ' اس کے باپ کا پتا نہیں تھا..... لیکن اس کو ایک نیک فطرت شخص کا سایہ میسر آگیا تھا..... اس نے اسے ایک نئی زندگی دی تھی..... لیکن اس کی زندگی کے دشمن بھی اس کے ساتھ ساتھ ہی موجود تھے۔

قارئین عمران ڈائجسٹ کے لیے ایک سلسلہ وار انوکھی داستان

"اری، ارے، ارے تُو بول رہی ہے۔ تُو بول رہی ہے اللہ وسائی! ارے تُو بول رہی ہے یہ تیری آواز ہے بیٹی! یہ تیری آواز ہے۔"

"ہاں بابا! آیئے، آیئے۔" اللہ وسائی نے آگے بڑھ کر رمضان بابا کا ہاتھ محبت سے تھام لیا۔ رمضان بابا بے حواسی سے آگے بڑھا۔

ہمایوں اندر بیٹھا ہوا تھا۔ رمضان بابا کے احترام میں کھڑا ہوگیا۔ اس نے بڑی محبت سے رمضان بابا کا ہاتھ پکڑا اور اسے بیٹھنے کی جگہ دی۔

"تو دیکھ رہا ہے۔ ارے تو دیکھ رہا ہے یہ معجزہ بیٹے! اللہ وسائی بول رہی ہے، تیری ماں بول رہی ہے ہمایوں! عمر گزر گئی اسے دیکھتے ہوئے کبھی نہیں بولی تھی اور اب یہ بول رہی ہے۔"

"ہاں! میری ماں کی قوت گویائی واپس آ گئی۔ وہ فرعونوں کے لگائے ہوئے الزامات کو برداشت نہیں کرسکی۔ اسے بولنا ہی تھا بابا! ورنہ میرے دل کے سوراخ کو کون بند کرتا۔"

"چاند پر کتنی ہی خاک ڈالو بیٹا! وہ کب میلا ہوتا ہے۔ ایک بار اپنی ماں کی آنکھوں میں جھانک لیتا وہ تو مریم ہے لوگوں کی زبان کے آگے لگام کہاں ہوتی ہے۔"

"اور یہ بے لگامی ان کا مستقبل سیاہ کردے گی بابا! تم دیکھتے رہو وہ مجھے نہیں جانتے میرا نام ہمایوں ہے۔"

"نہیں ہمایوں بیٹے! تم ابھی کوئی فیصلہ نہیں کروگے۔ کوئی ایسی قسم نہیں کھاؤ گے جسے توڑنا پڑے۔ پہلے میری پوری بات سن لینا۔" اللہ وسائی نے سخت لہجے میں کہا۔

"میں تیری ہر بات مان لوں گا، جو تُو کہے گی زندگی بھر وہی کروں گا۔ لیکن میں ان لوگوں کو نہیں چھوڑوں گا جنہوں نے میرے خون پر الزام لگایا ہے، جنہوں نے میری ماں پر کیچڑ اچھالی ہے۔ مجھے اس کی اجازت دے دے۔ مجھے اس کی اجازت ضرور دے دے ماں! انہوں نے تیرے ساتھ جو سلوک کیا ہے میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا۔ اگر رمضان بابا نہ ہوتے تو میں کیا کرتا، تجھے کہاں تلاش کرتا۔"

"شکیلہ بیگم نے ہمارے ساتھ جو کیا ٹھیک کیا۔ خدا نے انہیں دیکھنے والی آنکھ ہی نہیں دی تھی۔ سمجھنے والا دماغ بھی نہیں دیا تھا پھر بھی ہم اس گھر کے احسانات کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔"

"کیا احسان ماں! آخر کیا احسان کیا راؤ گل نواز نے اپنے اہل خاندان کو یہ نہیں بتایا تھا کہ تم بھی ان کی بیوی ہو۔ کیا انہوں نے تم سے نکاح نہیں کیا تھا۔" ہمایوں نے بپھرے ہوئے انداز میں کہا اور اللہ وسائی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"نہیں ہمایوں کیسی باتیں کررہا ہے، میرا راؤ گل نواز سے نکاح نہیں ہوا تھا۔" اللہ وسائی نے کہا اور ہمایوں کا منہ تعجب سے کھلا رہ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ماں کو دیکھ رہا تھا۔ دوسری طرف رمضان بابا بھی خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بڑی بے چینی محسوس کررہا تھا اور ہمایوں کی آنکھیں اللہ وسائی کے چہرے کا طواف کررہی تھی۔ ماں کے اس انکشاف نے اسے ایک بار پھر حیران کردیا تھا۔ اللہ وسائی خلا میں گھور رہی تھی جیسے ماضی کے بکھرے ہوئے اوراق یکجا کررہی ہو۔ پھر اس کی نگاہیں بیٹے کے چہرے کی جانب اٹھیں اور ان میں مسکراہٹ پھیل گئی۔

"سوچ رہا ہوگا کہ کیسی بے وقوف عورت ہے۔ شاید لفظوں کے جال میں پھنسا کر مجھے بے وقوف بنانا چاہتی ہے۔ نہیں ہمایوں بیٹے! تیرا خیال غلط ہے۔ وہ خاندان۔۔۔ وہ گھر ہمارے محسنوں کا گھر ہے۔ عورت سب سے زیادہ کمزور عقل کی مالک ہوتی ہے، شک و شبہ اس کے خمیر میں گوندھا ہوتا ہے۔ میں یہ ساری باتیں اس سے پہلے نہیں جانتی تھیں لیکن اب ایک طویل تجربہ ہے مجھے۔ سالوں گزر گئے اب تو مجھے یاد بھی نہیں ہے کہ کتنے سال ہوگئے۔ میں نے ان سالوں میں صرف تجربات ہی تو حاصل کیے ہیں۔ میں بول تو نہیں سکتی تھی، سمجھ تو سکتی تھی وہ خاندان ہر طرح سے اس قابل ہے کہ ہم اس کی پوجا کریں۔ ہم

اس کے احسانات کو تسلیم کریں، ہم انہیں دعائیں دیں، خداوند عالم راؤ گل نواز کو جنت الفردوس میں جگہ دے، وہ میرے شوہر نہیں تھے بیٹے! وہ میرے لیے بھائی کا درجہ رکھتے تھے۔ ہاں وہ سگے بھائیوں سے زیادہ میرے محسن تھے۔ اس دور میں شاید سگے بھائی بھی وہ سلوک نہ کرسکیں اپنی بہن کے ساتھ جو انہوں نے میرے اور تیرے ساتھ کیا۔ میں جانتی ہوں بیٹے! انہوں نے تجھے لندن بھیجا، تجھے تعلیم دلوائی اور خود کو تیرے باپ کی حیثیت دی۔ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے تجھے یہ حیثیت صرف اس لیے دی ہوگی کہ تو بن باپ کا نہ کہلائے تیری شخصیت مشکوک نہ ہو۔''

''مگر ماں میرا باپ کون تھا؟ کوئی تو ہوگا جب میں تیری ناجائز اولاد نہیں ہوں تو میرا جائز باپ کہاں ہے؟''

''خدا جانے کہاں ہے وہ بدنصیب۔ خدا جانے کہاں ہے وہ جس نے تجھے ایک وجود دیا اور اس کے بعد ہم دونوں کے ساتھ یہ سلوک کیا۔ وہ قاتل ہے بیٹے! وہ قاتل ہے۔ اس نے مجھے بھی قتل کردیا تھا اور تجھے بھی۔ میں اگر مرجاتی تو تیرا وجود کہاں ہوتا۔ تیرا ننھا سا وجود تو میری ذات میں ہی فنا ہوجاتا۔ راؤ گل نواز نے ہم دونوں کو زندگی دی۔ مجھے بھی اور تجھے بھی۔''

''کیا؟'' ہمایوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ رمضان بابا کا منہ بھی تعجب سے کھلا رہ گیا۔ اللہ وسائی کی کہانی ان بے چارے کو کہاں معلوم۔ وہ تو بس ازراہ انسانیت سب کچھ کرتے رہے تھے۔ وہ کیا جانتے تھے کہ اللہ وسائی کون ہے۔ کس طرح راؤ گل نواز کے ہاتھ لگی۔ وہ کس طرح یہاں تک پہنچی۔ بس انہوں نے اسے ہمیشہ سے دیکھا تھا۔ اس کی نرمی، سادگی اور معصومیت ان سب کے دلوں پر نقش تھی اور پھر جب اس پر ظلم ہوا تو رمضان بابا اس ظلم کو نہ دیکھ سکا اور جو کچھ کرسکتا تھا اس نے اللہ وسائی کے لیے کیا۔ وہ خود بھی متجسس تھا اور اللہ وسائی کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اللہ وسائی کے چہرے پر ماضی کے سائے لرزاں تھے اور ہمایوں اسے دیکھ رہا تھا۔

اللہ وسائی نے چند لمحات کے بعد کہا۔

''میرا نام اللہ وسائی نہیں ہے۔ یہ نام تو ان نیک لوگوں نے مجھے اپنی آرام گاہ میں دیا تھا۔ میرا اصل نام سجیلہ ہے۔ میں اور میرے بابا جن کا نام سردار شاہ تھا ایک چھوٹے سے گاؤں نور پورہ میں رہتے تھے۔ میری ماں میری پیدائش کے وقت مرگئی تھیں۔ بابا نے میری بڑے ناز و نعم سے پرورش کی۔ تھوڑی سی زمین تھی ہماری جس پر میرے بابا کھیتی باڑی کرتے تھے، ترکاریاں اگاتے تھے اور انہیں منڈی میں لے جاکر فروخت کردیا کرتے تھے۔ گاؤں کے حسین ماحول میں پلی بڑھی، مری عمر ابھی زیادہ نہیں تھی لیکن قد کاٹھ بڑھ گیا تھا اور پھر جب بابا نے میرے قد کاٹھ کو دیکھا تو انہیں میری شادی کی فکر ہوئی۔ انہوں نے مجھے گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح اجڈ، جاہل اور گنوار نہیں رکھا تھا۔ ہمارے پڑوس میں ایک موذن صاحب رہتے تھے جو ہمارے گاؤں کی مسجد میں امامت بھی کیا کرتے تھے اور بچوں کو درس و تدریس بھی دیتے تھے۔ بڑے نیک آدمی تھے۔ میرے باپ نے ان سے کہہ کر مجھے کلام پاک کی تعلیم دلوائی اور اس کے بعد اردو کی کچھ کتابیں بھی پڑھوائیں۔ میں اچھا خاصا لکھنا پڑھنا سیکھ گئی تھی اور اس طرح میں گاؤں کی دوسری لڑکیوں سے ذرا الگ ہوگئی تھی اور میری فطرت میں کوئی ایسی بات بھی نہیں تھی جو کسی کے لیے ناخوشگوار ہو۔

زندگی یونہی رواں دواں تھی۔ مجھے دنیا کی ہر نعمت حاصل تھی، سہیلیوں کا ساتھ تھا۔ میں ان کے ساتھ باغوں میں جھولا جھولتی اور ساون کے گیت گایا کرتی۔ پھر ایسی ہی ایک منحوس شام ایک شخص نے مجھے دیکھ لیا، جس کا نام بابر علی تھا۔ بابر علی ہماری زمینوں سے کچھ فاصلے پر جنگلوں کی کٹائی کرانے آیا تھا وہ ٹھیکے دار تھا اور جب بھی وہ جنگلوں کی کٹائی کے لیے آتا تھا ہمارے گاؤں کے بہت سے جوانوں کو

اس کے پاس نوکری مل جاتی تھی اور وہ اس کی غلامی میں لگ جاتے تھے۔ بابر ایک جوان ایک خوبصورت آدمی تھا۔ گھوڑے پر بیٹھ کر نکلتا تو ایسا لگتا جیسے کوئی شہزادہ اپنی محل سرا سے نکل کر سفر کے لیے چلا ہو۔ میں نے بھی انہیں دیکھا اور دل پکڑ کر رہ گئی۔ بیٹے تمہارے سامنے یہ سارے اعترافات کرتے ہوئے میں شرم محسوس کر رہی ہوں ایک ماں اور بیٹے کے درمیان شرم وحیا کے جو رشتے ہونے چاہئیں میں ان سے نا آشنا نہیں ہوں۔ لیکن میں اپنی ساری کہانی تمہیں سنا دینے پر مجبور ہوں۔ صرف تمہیں اور اس لیے کہ کچھ ناعاقبت اندیش لوگوں نے تمہارے ذہن کو گندا کر دیا ہے۔ انہوں نے تم پر جو کیچڑ اچھالی ہے میں وہ کیچڑ واپس ان کے منہ پر تو نہیں مار سکتی لیکن میرے بچے تیرا دل صاف کرنا میری ذمہ داری ہے۔ اتنے عرصے کے بعد تمہارے واپس آنے سے میں بے حد خوش ہوں لیکن میری ذات سے تمہیں کوئی بوجھ ملے یہ ایک ماں برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لیے میرے لفظوں پر مجھے معاف کر دینا۔"

"تم کہو ماں میں سن رہا ہوں۔" ہمایوں نے کہا۔

"بابر کی خوبصورتی، آن، بان، شان دیکھ کر میں متاثر ہوگئی۔ بیٹے میں فطرتاً بری نہیں تھی۔ لیکن عمر کا ایک حصہ ایسا ہوتا ہے جب انسان کے دل میں خواہ مخواہ امنگیں جنم لیتی ہیں۔ بابر علی نے بھی مجھے دیکھا اور کھو گیا وہ اتنا برا انسان نہیں تھا بیٹے! یا پھر میرا تجربہ کچھ نہیں تھا۔ میں اس کی آرزو کرنے لگی۔ میں اس کے خواب آنکھوں میں بسائے گھر لوٹی اور اس کے بعد موقع تلاش کرتی رہی کہ کب اسے دیکھوں۔ اس کی بھی اپنی وہی کیفیت تھی۔ بہت بڑے آدمی کا بیٹا تھا وہ۔ بڑی شان سے رہتا تھا۔ جنگلوں کی کٹائی کا ٹھیکے دار کوئی معمولی شخصیت نہیں ہوتی تھی۔ وہ نور پورہ میں رہنے والوں کے لیے بڑی حیثیت رکھتا تھا وہ سب کا ان داتا تھا اور وہ اس کے ہر احکام پر سر جھکانے والوں میں سے تھے۔ بہت سے جوان اس کے ملازموں میں شامل تھے۔ چنانچہ اس کے لیے کسی کے دل میں کوئی برائی پیدا ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

وہ پھر مجھ سے ملا اور میرے نزدیک آگیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے چاہنے لگا ہے۔ میرے کان یہی الفاظ سننا چاہتے تھے۔ میں نے اس کی بات کے جواب میں گردن جھکا دی۔ اس کے بعد بات میرے بابا کے کانوں تک پہنچ گئی۔ سردار شاہ نور پورہ کے انتہائی شریف لوگوں میں اور نیک نام لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ اسی بستی میں پیدا ہوا، اسی بستی میں شادی کی۔ اسی میں زندگی گزاری لیکن اس کے نام کے ساتھ کوئی حرفِ غلط کبھی نہیں ابھرا۔ اس کی زندگی میں پہلا مشکل مرحلہ تھا اس نے بابر علی سے بات کی۔ اس نے کہا کہ یہ جوڑ کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ یہ ساری کہانیاں وہی ہیں جن کا اختتام المیوں پر ہوتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرے، اس طرح نہ سوچے، وہ ہمارے لیے قابلِ احترام ہیں، ہم اس کی عزت کرتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس عزت میں کوئی فرق آجائے۔ تب بابر علی نے آنسو بھری آنکھوں سے میرے بابا سے کہا کہ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میرے بابا نے اس سے کہا کہ کیا وہ اپنے والدین کی رضامندی حاصل کر سکتا ہے۔ اس پر بابر علی نے کہا کہ یہ اس کی ذمہ داری ہے لیکن آسانی سے یہ کام نہیں ہوگا۔ وہ اپنی دلہن کو وہی مقام دے گا جو ایک شریف گھرانے میں بہو کو ملتا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ مجھ سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ نکاح کے بعد مجھے اس وقت تک یہیں رہنا ہوگا جب تک جنگلوں کی کٹائی ہوتی رہے گی۔ وہ خود بھی یہیں رہے گا اور اس کے بعد وہ مجھے لے کر چلا جائے گا۔

گاؤں کے بہت سے لوگوں نے میرے باپ کو مجبور کیا کہ وہ ٹھیکے دار کی بات مان لے۔ ٹھیکے دار بھلا آدمی ہے۔ اس کی بیٹی کی تقدیر جاگ رہی ہے تو وہ کیوں اس پر سیاہی تھوپنا چاہتا ہے۔ میرا بابا بہت مشکل کا شکار تھا۔ وہ بیمار بھی رہتا تھا ان دنوں۔ دمہ کا

مرض لگ گیا تھا اسے اور میری ہمیشہ فکر رہتی تھی اس کو۔ بہت غور کرنے کے بعد آخر کار اس نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ مولوی صاحب نے ہمارا نکاح پڑھایا اور بابر علی مجھے رخصت کر کے لے گیا۔ اس نے اپنے گھر میں مجھے بڑی عزت و احترام سے رکھا۔ میرے بابا کو علاج کے لیے قریب کے شہر لے گیا۔ اس طرح اس نے ہماری ہر طرح سے دیکھ بھال کی اور میرے بابا اس کی طرف سے مطمئن ہو گئے۔ ہماری شادی کے تین مہینے بعد بابا کا انتقال ہو گیا۔ بابر علی نے مجھے ہر طرح سے دلاسہ دیا تھا۔ لیکن میں کبھی کبھی اسے تنہائیوں میں پریشان دیکھتی تھی۔ وہ کھویا کھویا رہتا تھا۔ بظاہر وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ مجھے اس کی طرف سے کوئی خوف نہیں تھا۔ لیکن وہ پریشان رہنے لگا تھا۔ میں نے کئی بار اس سے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھی لیکن وہ مجھے کچھ نہیں بتا سکا۔

وقت گزرتا رہا۔۔۔ کٹائی کا کام اب بہت تھوڑا سا رہ گیا تھا۔ جنگلوں میں اس نے جتنا حصہ خریدا تھا وہ سب کا سب کٹ چکا تھا اور اب درختوں کے تنے گاڑیوں پر لدوا لدوا کر روانہ کیے جا رہے تھے۔ گویا اب کام آخری مراحل میں تھا۔ میں نے بابر علی کے انداز میں کچھ تبدیلیاں محسوس کیں۔ لیکن میں ناتجربے کار تھی صحیح طور پر اس تبدیلی کو نا محسوس کر سکی اور آخر کار اس کا آخری کام بھی مکمل ہو گیا اور وہ واپسی کی تیاریاں کرنے لگا۔ تب اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے اسی مکان میں چھوڑے جا رہا ہے۔ یہاں میرے لیے ساری چیزیں مہیا کر دی جائیں گی۔ دو چار مہینے وہ لکڑی کے اس کاروبار کو مختلف جگہوں پر پھیلانے کی کوششیں کرے گا۔ نئے ٹھیکے حاصل کرے گا اور اس کام سے فارغ ہوتے ہی وہ مجھے لے جائے گا۔ اس نے کہا کہ نیا ٹھیکہ لینے کے بعد ہم پھر کسی جنگلی مقام پر قیام کریں گے لیکن میرا دل نہیں مانا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ جہاں بھی جا رہا ہے مجھے اپنے ساتھ لے جائے۔ میں اس پر بوجھ نہیں بنوں گی۔ کچھ دن تک تو بابر علی مجھے یونہی ٹالتا رہا لیکن ایک دن وہ سخت ہو گیا۔ اس نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ ممکن نہیں ہے۔ ابھی میں نے تمہارے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ کیسے لے جا سکتا ہوں تمہیں۔ پہلے مجھے تمہارے لیے ایک راستہ ہموار کرنا ہوگا اس کے بعد ہی تم میرے ساتھ جا سکتی ہو۔"

میں رونے لگی۔ میں نے یہ بات ان مولوی صاحب کو بتائی جنہوں نے بچپن سے مجھے پڑھایا تھا اور جنہوں نے میرا نکاح پڑھایا تھا۔ مولوی صاحب نے یہ معاملہ پنچائیت کے سامنے رکھ دیا۔ ہمارے سرپنچ ایک بہت سخت گیر آدمی تھے۔ وہ بستی کے سردار بھی تھے۔ انہوں نے بابر علی کو پکڑ بلوایا اور سخت لہجے میں کہا۔

"سنو بابر علی! اس قسم کے حادثے گاؤں دیہات میں ہوتے رہتے ہیں۔ شہروں سے آنے والے گاؤں کی بھولی بھالی لڑکیوں پر جال ڈالتے ہیں۔ انہیں اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں اور اس کے بعد انہیں اس طرح بھول جاتے ہیں جیسے ان سے کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو۔ ایسے بہت سے المیے ہو چکے ہیں چونکہ تم نے وعدہ کیا تھا کہ یہاں کی کٹائی کا کام مکمل ہوتے ہی تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ گے اور یہ وعدہ تم نے سب کے سامنے کیا تھا۔ اس لیے اب تم پر لازم ہے کہ اپنا وعدہ پورا کرو اور اس بچی کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔" سرپنچ نے اس سلسلے میں کافی سختی اختیار کی اور بابر علی بحالتِ مجبوری تیار ہو گیا۔ لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔" اللہ وسائی کی آواز سسکیوں میں تبدیل ہو گئی۔ اس کا سانس تیز ہو گیا اور اس نے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ لیے۔ ہمایوں تڑپ اٹھا تھا۔

"سنبھالو خود کو ماں سنبھالو۔۔۔ پھر کیا ہوا۔۔۔؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔ اللہ وسائی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ رمضان خان بھی اپنی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو نہیں

روک سکا تھا۔ دیر تک یہ غم ناک فضا قائم رہی۔ پھر سجیلہ یا اللہ وسائی نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"بابر علی مجھے لے کر چل پڑے۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ ان کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ ان کی آنکھوں میں نفرت کی پرچھائیاں صاف محسوس کی جاسکتی تھیں۔ وہ مجھے کسی طور ساتھ لے چلنے کے لیے راضی نہیں تھے۔ روانہ ہونے سے کچھ دیر قبل انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ان پر بھروسہ کروں اور خود ہی ان لوگوں سے کہہ دوں کہ میں ابھی نہیں جانا چاہتی لیکن بابر علی کی ضد مجھے بھی وحشت زدہ کر رہی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ کہیں میری بھی کوئی المیہ کہانی منظرِ عام پر نہ آجائے۔ کہیں یوں نہ ہو کہ بابر علی پھر اس طرف واپس ہی نہ آئیں اور میری پوری زندگی آہوں اور آنسوؤں کا گہوارہ بن جائے۔ میں محسوس کر رہی تھی بیٹے! کہ میں تمہاری ماں بننے والی ہوں میں۔۔۔ میں کسی قیمت پر وہاں نہیں رکنا چاہتی تھی۔ مجبوراً بابر علی مجھے لے کر چل پڑے۔ ان کے ساتھ بستی کا ایک آدمی بھی تھا۔ جس کا نام یونس خان تھا۔ یونس خان بابر علی کا خاص آدمی تھا اور ان کے ہر کام میں ان کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ ہم جیپ میں سفر کر رہے تھے۔ بابر علی خود ہی اسے چلا رہے تھے۔ بستی سے دور ایک علاقہ میں بابر علی نے گاڑی روک دی۔ اس وقت صرف یونس خان ان کے ساتھ تھا۔ بابر علی اتر کر کہیں چلے گئے اور تھوڑی دیر کے بعد یونس خان بھی جیپ سے نکل کر چل پڑا۔ وہ مجھے نظر نہیں آرہے تھے۔ دس منٹ، پندرہ منٹ، آدھا گھنٹہ، پھر گھنٹہ گزر گیا تو میں سخت پریشان ہوگئی۔ میں جیپ سے اتر کر اس طرف چل پڑی جدھر بابر علی، یونس خان گئے تھے۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ وہ کہاں گئے اور کیوں گئے ہیں۔ میں انہیں آوازیں دیتی جارہی تھی کہ دفعتاً گولی چلی اور میرا پاؤں کسی چیز سے ٹکرا کر زخمی ہوگیا۔ میں نیچے گری اور میرے سر میں چوٹ لگ گئی۔ بہت زور سے چوٹ لگی تھی۔ بس اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔ البتہ نیم تاریک ماحول میں۔۔۔ میں نے بابر علی کو دیکھ لیا تھا۔ جن کے ہاتھ میں بندوق نظر آرہی تھی۔ یہ گولی بابر علی نے مجھ پر ہی چلائی تھی۔ میرے سرتاج نے۔۔۔ میرے شوہر نے۔۔۔ مجھ سے پیار کرنے والے نے اور یہ آخری احساس تھا جو میرے سینے میں درد بن کر اتر گیا۔ اس کے بعد بیٹے! مجھے ہوش آیا تو میں گویائی کھو چکی تھی۔ میرے سر پر پتھر لگا تھا اور ایک شدید بوجھ میرے دل، سینے پر پتھر کی طرح جم گیا تھا۔ اس نے میری آواز ہمیشہ کے لیے بند کر دی۔ وہ جگہ جہاں میں نے آنکھ کھولی اور جہاں مجھے ہوش آیا۔ راؤ گل نواز کی شان دار حویلی تھی۔ بے شمار ملازم تھے اس حویلی میں، اس میں بیگم صاحبہ تھیں، بچے تھے، راؤ گل نواز تھے۔ راؤ گل نواز نے میرے ساتھ اس محبت کا برتاؤ کیا کہ میں تم سے بیان نہیں کرسکتی ہمایوں! انہوں نے مجھے اپنی سگی بہن کا درجہ دیا۔ لیکن وہ شکیلہ بیگم سے ڈرتے تھے۔ شکیلہ بیگم عجیب و غریب فطرت کی مالک تھیں۔ راؤ گل نواز پر پوری طرح حاوی تھیں وہ، انہوں نے مجھے شک کی نگاہ سے دیکھا۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ ان سے اپنے بارے میں سب کچھ کہہ دوں لیکن میری زبان میرا ساتھ نہ دے سکی۔ میں اشاروں میں بھی انہیں یہ نا سمجھا سکی کہ میں ان کے گھر میں کیا حیثیت رکھتی ہوں۔ راؤ صاحب نے مجھ پر اپنی عنایتیں جاری رکھیں اور پھر تم پیدا ہوئے۔ بہت سے واقعات ہوئے بیٹا! اس دوران جگہ جگہ میرا دل ٹوٹا لیکن مجھے سہارا دینے والا موجود تھا۔ راؤ گل نواز فرشتہ صفت انسان تھا۔ اس نے ہمیشہ مجھے پاکیزہ نگاہوں سے دیکھا۔ ایک بھائی کی نگاہ سے اسی نے تمہاری پرورش کی۔ راؤ گل نواز نے تمہارے لیے ہر وہ بہتری فراہم کرنے کی کوشش کی جو وہ اپنی اولاد کے لیے کرسکتے تھے لیکن شکیلہ بیگم آڑے آئیں۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ وہ عورت تھیں اور عورت کی سوچ عام طور پر غلط ہوتی ہے۔ وہ اپنی جلن میں رشتوں کا تقدس بھول جاتی ہے۔ رشتے خون ہی سے تخلیق نہیں ہوتے۔ بعض اوقات زبان کے رشتے خون سے

زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ میں وہاں سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ یہ گھر میری آخری پناہ گاہ تھا۔ کہاں جاتی، کس سے کہتی۔ ان لوگوں نے میرا نام اللہ وسائی رکھ دیا جو میں نے قبول کرلیا۔ اپنی بستی میں بھی میرا کوئی نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو کیا بگاڑ لیتا بابر علی کا۔ وہ تو اپنا کام کر کے جاچکا تھا۔ اس نے تو مجھے مردہ سمجھ لیا ہوگا۔ اگر نا سمجھتا تو اس طرح چھوڑ کر نہ جاتا۔ بلکہ دو چار گولیاں صحیح نشانہ لے کر اور چلا دیتا مجھے ختم کرنے کے لیے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ بقیہ زندگی اسی گوشۂ عافیت میں گزار دوں۔ اس کے بعد کے حالات تمہارے سامنے ہیں ہمایوں! یہاں تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوتا تھا اس لیے راؤ گل نواز نے ظاہر کیا کہ تم گھر سے بھاگ گئے ہو لیکن درپردہ انہوں نے تمہیں اعلا تعلیم کے لیے ملک سے باہر بھیج دیا۔ مجھے تمہارے بارے میں بتا دیا گیا تھا اور میں مطمئن تھی کہ اس فرشتہ صفت انسان نے تمہاری زندگی بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بس اس کے بعد ہمایوں حالات یونہی گزرتے رہے۔ پھر تقدیر نے مجھ سے میرا بھائی چھین لیا۔ راؤ گل نواز ہمارے درمیان سے اٹھ گئے اور میرے لیے مصیبتیں ہی مصیبتیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس کے بعد حرام خون لوگ شکیلہ بیگم کے گرد جمع ہوگئے اور آخر کار مجھے وہاں سے نکال دیا گیا۔ اس وقت واقعی میرے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔ میں بے سہارا تھی اور یہ بات شکیلہ بیگم کو معلوم تھی۔ راؤ گل نواز بھی اس دنیا میں نہیں تھے وہ اگر چاہتیں تو مجھے کسی کونے کھدرے میں پڑا رہنے دیتیں لیکن جلن اور حسد کی وہ زندگی جواب تک انہوں نے گزاری تھی رنگ لائی اور انہوں نے مجھے نکال پھینکا لیکن خدا سب کا سہارا ہوتا ہے۔ ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو ستر دروازے کھلتے ہیں۔ رمضان بابا نے مجھ پر کرم کیا اور مجھے اپنے اس گھر میں لے آئے۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہونے دی۔ ہمایوں! یقین کرو یہ میرے باپ کی طرح ہیں۔ ان کے زیر سایہ میں اپنی تمام مصیبتیں بھول چکی ہوں، بس میرے دل میں ایک ہی لگن تھی کہ تم واپس آجاؤ اور مجھے اپنی مضبوط بانہوں کا سہارا دے دو۔ میرے بچے۔۔۔ میرے بیٹے یہ ہے میری کہانی یہ ہے میری داستان۔"

اس چھوٹے سے گھر کے اس کمرے میں سکوت پھیلا ہوا تھا۔ اللہ وسائی یا صحیح معنوں میں جمیلہ کی سسکیاں کبھی کبھی اس سکوت کو توڑ دیتی تھیں۔ ہمایوں کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔ وہ خلا میں گھور رہا تھا۔ کافی دیر اس طرح گزر گئی تو رمضان بابا نے ہی سکوت توڑا۔

"قدرت کے کھیل ہیں۔ کتنی مختصر کتنی ناپائیدار زندگی ملتی ہے انسان کو اور اس موہوم سی زندگی میں وہ کیا کچھ کر ڈالتا ہے۔ جانتا ہے کہ دوسرا لمحہ حساب کا لمحہ بن سکتا ہے لیکن برائی سے باز نہیں آتا۔ اگر اسے اس کی مرضی کی زندگی مل جاتی تو کیا کرتا یہ۔ اللہ پاک نے سوچ لیا تھا ضرور اس نے سوچ لیا تھا۔"

"رمضان بابا! میری ماں پر بہت ظلم ہوا ہے۔ اسے زندگی سے محروم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسے ذلیل و خوار کیا گیا ہے پوری زندگی۔ بابا! یہ طویل زندگی اس نے انگاروں پر لوٹتے گزاری ہے۔" ہمایوں کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

"لیکن ہر دکھ کی ایک حد ہوتی ہے بیٹے! خدا گل نواز کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ اس نے تو اپنا فرض ادا کر دیا تھا اب تم اپنی ماں کو سنبھالو۔" رمضان بابا نے کہا۔

"نہیں بابا۔۔۔! ایسا نہیں ہوگا۔ ایک ایک سے حساب لیا جائے گا۔ بیگم صاحبہ نے میری ماں پر بہت گھناؤنا الزام لگایا ہے میں ان لوگوں کو نہیں چھوڑوں گا۔"

"ہمایوں۔۔۔! ہمایوں تُو میرا بیٹا ہے نا۔ تیرے اوپر تو میں مان کر سکتی ہوں۔ تجھ پر تو غرور کر سکتی ہوں میں۔ تجھ پر تو حکم چلا سکتی ہوں۔ تُو۔۔۔ تُو میری بات مانے گا۔ بول مانے گا یا تُو بھی مجھے ٹھکرا دے گا۔"

"نہیں ماں، ہمایوں تیرے قدموں کی خاک ہے، بول کیا کہتی ہے۔"

"راؤ گل نواز کا گھر میرے لیے عبادت گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ایک ایسے انسان کا گھر ہے جس نے مجھے عورت رہنے دیا۔ اگر وہ مجھے سہارا نہ دیتا بیٹے! تو ممکن ہے میں وہیں مرجاتی۔ نامرتی تو ممکن ہے میں کسی گندے ماحول میں پناہ لے رہی ہوتی، نہ جانے کس کس کے ہاتھ لگتی میں اور نہ جانے کیا کیا سلوک ہوتا میرے ساتھ۔ شکیلہ بیگم عورت تھیں وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں دے سکتی تھیں۔ لیکن وہ تینوں بچیاں راؤ گل نواز کی بیٹیاں ہیں، اس کی جگر گوشہ۔ تم ان سے انتقام لوگے۔۔۔؟ شکیلہ بیگم بے سہارا رہ گئی ہے۔ کوئی بیٹا نہیں ہے بے چاری کا۔ ان بے سہارا لوگوں کو پریشان کروگے؟ کیا راؤ گل نواز کی روح نہیں تڑپ اٹھے گی۔ کیا یہ ان کے احسانوں کا صلہ ہوگا؟ وہ بے قصور لوگ ہیں ہمایوں! انتقام لینے کے قابل نہیں ہیں۔"

"اور وہ شہنشاہ بابر، ماں۔۔۔!" ہمایوں دانت پیس کر بولا۔

"دلی آرزو ہے ہمایوں۔۔۔! دلی آرزو ہے کہ اگر وہ زندہ ہے تو ایک بار زندگی میں۔۔۔ صرف ایک بار تو انہیں میرے سامنے لے آ۔۔۔ ایک بار تو انہیں لاکر میرے قدموں میں جھکا دے۔ میں تیرا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"

"یہ تو تیرا قرض ہے ماں مجھ پر۔۔۔ اور میرا عہد ہے کہ اگر وہ زندہ ہے تو ایک بار ضرور اسے تیرے قدموں میں لاکر ڈال دوں گا۔"

"ایک وعدہ تجھے اور کرنا ہوگا ہمایوں۔۔۔!"

"بول ماں۔۔۔! جو دل [redacted] کہہ میں تیری اولاد ہوں۔"

"انتقام لیتے ہوئے تو کسی کو جسمانی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ کسی کو قتل نہیں کرے گا۔"

"ٹھیک ہے ماں! تیرے حکم کی تعمیل ہوگی۔"

"بہت خوش ہوں ہمایوں! خدا کی قسم بہت خوش ہوں۔ مجھے شکرانے کے نفل پڑھنے دو اب۔ اپنی خوشی میں، میں اپنے معبود کو نہیں بھولوں گی۔ جس نے مجھے یہ سب کچھ واپس کردیا ہے۔ آج میں با آواز بلند اس کی حمد و ثنا کروں گی۔ بابا! آپ ہمایوں کو باہر لے جائیں۔ میں اپنے اور اپنے رب کے درمیان کسی کو نہیں رہنے دوں گی۔"

"آؤ ہمایوں۔۔۔!" رمضان بابا نے کہا اور ہمایوں اس کے ساتھ کمرے سے باہر آگیا۔ دونوں برآمدے میں چارپائی پر بیٹھ گئے۔

"آپ راؤ گل نواز کی حویلی کے پرانے ملازم ہیں بابا؟"

"ہاں بیٹے!"

"آپ نے میرا بچپن بھی دیکھا ہوگا۔"

"ہاں بیٹے! میرے سامنے ہی تم بڑے ہوئے تھے۔"

"آپ کو ہم لوگوں کی وجہ سے یہ نوکری چھوڑنی پڑی ہے۔ اب تو آپ حویلی واپس نہیں جائیں گے۔"

"خدا کی زمین وسیع ہے بیٹے! وہ رازق ہے۔ مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ کہیں اور نوکری کرلوں گا کوئی کام کرلوں گا۔"

"میں جو آگیا ہوں نانا ابو۔۔۔! بابا میرے منہ سے نکل جاتا ہے لیکن میں آپ کو نانا ابو ہی کہوں گا۔ میری زندگی میں اب آپ کیوں کام کریں گے۔ آپ میرے نانا ہیں۔ یہ باتیں بھول جائیے۔ اب مجھے مشورہ دیجیے کہ میں کیا کروں۔"

"کیا تم لندن واپس نہیں جاؤ گے؟"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا نانا ابو۔"

"اور تمہاری تعلیم۔۔۔؟"

"وہ پوری ہوچکی ہے۔ میں تو وہاں نوکری بھی کرتا رہا ہوں۔ بہت سے پیسے ہیں میرے پاس۔ کافی رقم ہے۔ اس وقت تک کے لیے کافی ہوں گے جب تک میں اپنا کوئی بہتر مقام نہ حاصل کرلوں۔"

"تو ٹھیک ہے بیٹے! میں حویلی واپس نہیں

جاؤں گا۔"

"جی۔۔۔ آپ بالکل نہیں جائیں گے۔ وہاں آپ کا کوئی سامان تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔ لیکن بس جنت وہاں نوکری کرتی ہے۔ جنت میرے لیے بیٹیوں جیسی ہے۔ میں وہاں تھا تو کوئی بات نہیں تھی لیکن اب۔۔۔"

"ہم جنت کو وہاں نہیں رہنے دیں گے بابا! آپ بس جنت کو وہاں سے لے آئیں۔"

"لے آؤں گا بیٹے!"

"اب یہ بتائیں کہ میں اس بابر علی کو کہاں تلاش کروں؟ میرا خون کھول رہا ہے میں اسے کہاں تلاش کروں؟"

"تم مجھ سے زیادہ ذہین ہو بیٹے! تم بہتر سوچ سکتے ہو۔"

"یہ نور پورہ کہاں ہے نانا ابو؟"

"ایک پہاڑی گاؤں ہے، دور نہیں ہے یہاں سے۔ بس دو چار سو کوس پر ہوگا۔ میں اس کا نام سنتا رہا ہوں۔"

"ہوں۔۔۔ ہماری اس جگہ کا نام نور گلی ہے نا؟"

"ہاں، یہ نور گلی ہے اور وہ نور۔۔۔ پورہ۔" رمضان بابا نے بتایا۔

"بہت پرانی بات ہے لیکن پورے گاؤں میں کوئی نہ کوئی تو مل ہی جائے گا۔ ایک نام بتایا تھا ماں نے۔۔۔ کیا نام تھا اس کا جو نور پورہ میں بابر علی کا ساتھی تھا اور جو اس وقت اس کے ساتھ تھا جب بابر علی نے ماں پر گولی چلائی تھی۔"

"یونس خان۔۔" رمضان بابا نے بتایا۔

"ہاں۔۔۔! وہ نور پورہ کا ہی رہنے والا تھا نا۔ ممکن ہے وہ زندہ ہو، ممکن ہے وہ مل جائے۔" ہمایوں نے جیسے خود سے کہا۔ پھر بولا۔

"جاؤ نانا ابو! آپ جنت کو لے آؤ ان لوگوں سے اور کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے بیٹے! جیسے تم کہو۔ اللہ وسائی تو نماز پڑھنے بیٹھ گئی ہوگی۔ کوئی سودا سلف ہی منگواتی تو میں لا دیتا۔"

"آپ جاؤ نانا ابو! اب میں جو موجود ہوں۔" ہمایوں نے کہا اور رمضان بابا گردن ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ ہمایوں اسی کھردری چارپائی پر لیٹ گیا تھا۔

☆☆☆

بہت بڑا واقعہ ہو گیا تھا۔ شکیلہ بیگم بظاہر خود کو سنبھالے ہوئی تھیں لیکن اندر کی کیفیت کا اندازہ صحیح طور پر نہیں ہو رہا تھا۔ پھر بابا رمضان خان حویلی میں داخل ہو گیا۔ ملازموں نے اس کے آنے کی خبر بیگم صاحبہ کو دی۔ شکیلہ بیگم بری طرح جھنجھلاہٹ کا شکار تھیں۔ شوہر کا انتقال ہو چکا تھا لیکن آج بھی یہ بات دل پر نقش تھی کہ ہمایوں، راؤ گل نواز کی اولاد ہے اور اللہ وسائی نے ان کے سہاگ پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ اس محرومی کا بھی انہیں شدید احساس تھا کہ ان کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں ہے۔ ایک داشتہ کے بیٹے کو تو وہ جائیداد میں سے ایک پائی بھی نہیں دے سکتی تھیں اور پھر تین تین بیٹیوں کا بوجھ بھی تھا ان پر۔ ہمایوں جو کچھ کہہ گیا تھا وہ بہت تھا۔ اتنا کہہ سننے کی تاب نہیں رکھتی تھیں لیکن انہیں سب سے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ تینوں بیٹیاں ان سے باغی ہو گئی تھیں۔ ماں کی گفتگو کو انہوں نے پسند نہیں کیا تھا۔ گل نور نے تو فوراً ہی وہاں سے جانے کا اعلان کر دیا تھا۔ اس واقعے کے بعد جب ہمایوں اور رمضان بابا وہاں سے چلے گئے تھے تو وہ بہت دیر تک تنہا بیٹھی اس بارے میں سوچتی رہی تھی اور کوئی سہارا نہیں ملا تو مجبوراً عبداللہ صاحب کو طلب کر لیا۔ اس وقت وہی مخلص نظر آتے تھے۔

"کیا بات ہے شکیلہ بہن! بہت پریشان نظر آ رہی ہیں۔"

"ہاں، عبداللہ بھائی! راؤ گل نواز کا سہارا سر سے اٹھتے ہی کمینوں کی بن آئی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ لوگ مجھے جینے نہیں دینا چاہتے۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔

''ایسی بات نہ کہیں، ہم سب زندہ ہیں۔ کیا بات ہوئی؟''

''نیاڈرامہ آپ کو نہیں معلوم؟''

''نہیں مجھے خبر نہیں ہوسکی، کیا ہوا؟'' عبداللہ صاحب کو واقعی ان تمام باتوں کی خبر نہیں تھی۔

''ہمایوں لندن سے واپس آگیا ہے۔ راؤ گل نواز نے، خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، ساری زندگی مجھے بے شک کوئی دکھ نہیں دیا لیکن یہ ایک ایسی چھری رکھ گئے کہ باقی زندگی اذیت سے گزرے گی۔''

''ہمایوں کون ہے؟''

''اس آوارہ ماں کی آوارہ اولاد۔ اللہ وسائی کا وہ لوفر بیٹا جو گھر سے بھاگ گیا تھا اور جس کے بارے میں راؤ صاحب ہمیشہ کہتے رہے کہ وہ میری اولاد نہیں ہے اور اللہ وسائی نے اپنی اولاد نرینہ کی پرورش لندن میں کرائی۔ اسے اعلا تعلیم سے آراستہ کیا، لندن کے اسکول، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہمایوں راؤ گل نواز کی اولاد کی حیثیت سے درج ہے۔ یہ اس کے پاس ثبوت ہیں۔''

''ارے پھر کیا ہوا؟''

''آیا تھا ماں کی تلاش میں، آگیا ہے لندن سے واپس۔ راؤ صاحب کی موت کی اطلاع بھلا اسے کون دیتا، کسی کو پتا ہی نہیں تھا۔ یہاں آخر حق جتا کر گیا ہے اپنا، دھمکیاں دے گیا ہے کہ اگر یہ الزام غلط نکلا کہ اللہ وسائی راؤ گل نواز کی منکوحہ نہیں ہے تو میری بیٹیوں کو طوائف بنا دے گا۔ اتنی بدتمیزی کی ہے اس نے کہ بیان سے باہر ہے۔''

''گیا کہاں؟''

''جہنم میں۔۔۔ مجھے کیا معلوم۔'' شکیلہ بیگم نے روتے ہوئے کہا۔

''آپ ہراساں نہ ہوں شکیلہ بیگم! اللہ وسائی بے شک ایسی نہیں تھی۔ اس کا بیٹا تو واقعی بڑا کمینہ نکلا۔''

''ارے بس منہ نہ کھلوائیں عبداللہ بھائی! جو کچھ وہ تھی مجھے معلوم ہے۔''

''اس کا کوئی پتا ہے؟ کہاں چلی گئی؟''

''نہیں مجھے نہیں معلوم۔ ویسے اچھا ہی ہوا میں نے اس کلموہی کو نکال دیا ورنہ اس وقت دونوں ماں بیٹے میری چھاتی پر مونگ دلتے۔''

''معاملہ واقعی الجھا ہوا ہے۔ اگر یہ بات ثابت ہوگئی کہ وہ راؤ گل نواز کی اولاد ہے تو قانونی الجھنیں پیدا ہوجائیں گی۔ میرے خیال میں ہمارے وکیل صاحب بھی ہماری حمایت نہیں کرسکیں گے۔''

''ارے راؤ علی یار سے مدد لیں گے۔ عبداللہ بھائی! انہیں بلائیں ان سے کہیں ٹکڑے کردیں ان دونوں ماں بیٹوں کے۔ ان کی لاشیں چیل کوؤں کو کھلادیں۔ میں سارا الزام اپنے سر لے لوں گی چاہے جیل ہی کیوں نہ جانا پڑے۔''

''خدا نہ کرے۔۔۔ خدا نہ کرے شکیلہ بہن! تمہاری جگہ ہم جیل جانے کو تیار ہیں۔ کوئی اور تھا اس وقت جب وہ یہ دھمکیاں دے رہا تھا۔''

''ہاں لڑکیاں تھیں اور وہ نمک حرام رمضان خان تھا۔ مجھے حیرت تو یہی ہے کہ نمک خوار بھی غداری کررہے ہیں۔''

''رمضان خان۔۔۔ انہوں نے کیا کیا؟''

''اس کی طرف داری کی اور لے کر چلے گئے اسے۔ ارے میں نے ان لوگوں کے ساتھ کبھی نوکروں کا سا سلوک نہیں کیا اور انہوں نے مجھے کیا صلہ دیا۔''

''رمضان چلے گئے یہاں سے؟''

''ہاں۔۔۔ پھر آمریں گے، اس بڑھاپے میں اور کہاں جائیں گے۔''

''خیر آپ فکر نہ کریں۔۔۔ ذرا لڑکیوں کو بلائیں میرے پاس۔'' پھوپھا عبداللہ نے کہا اور بیگم صاحبہ نے ایک ملازم کو بلا کر لڑکیوں کو طلب کرلیا۔

گل نور جانے کی تیاریاں کررہی تھی۔ تینوں لڑکیاں منہ بنائے ہوئے پہنچ گئیں۔

''کیا بات ہے؟''

''میں نے بلایا تھا بچیو۔۔۔! وہ اللہ وسائی کا بیٹا کیا کہہ کر گیا ہے؟'' پھوپھا عبداللہ نے پوچھا۔

''امی جان سے ہی پوچھ لیں۔'' گل نور تنک کر بولی۔

''سن رہے ہیں عبداللہ بھائی! سن رہے ہیں اس کا لہجہ۔'' بیگم صاحبہ نے فریاد کی۔

''سنا ہے بیٹی کہ وہ دھمکیاں دے کر گیا ہے، بڑی غلیظ باتیں کر کے گیا ہے۔''

''آپ یہ بتایئے کہ آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں پھوپھا جان!'' نبیلہ نے کہا۔

''اس کی رپورٹ کرنا پڑے گی بیٹی! پولیس کو اطلاع دینی پڑے گی کہ وہ ہمیں دھمکیاں دے کر گیا ہے۔''

''اور ہمیں اس کے خلاف گواہی دینی پڑے گی۔۔۔ کیوں؟''

''ہاں ممکن ہے اس کی ضرورت پیش آجائے۔''

''تو پھر آپ کان کھول کر سن لیجیے پھوپھا عبداللہ! ہم تینوں کا مشترکہ فیصلہ ہے کہ ہم اس سلسلے میں کوئی گواہی نہیں دیں گے۔''

''کیوں بیٹی؟''

''اس لیے کہ اس حویلی میں ایک انسان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوا۔ وہ جو کچھ بھی تھا، کچھ بھی کہہ رہا تھا اس کی تسلی کی جاتی۔ ایک پُروقار اور تعلیم یافتہ نوجوان کو ناجائز اولاد کہہ دینا کوئی اچھی بات تو نہیں تھی۔ اس کے ساتھ بہت برا سلوک ہوا ہے۔ وہ طویل عرصے کے بعد اپنی ماں سے ملنے کی آس لے کر آیا تھا لیکن اس کی ماں ظلم کا شکار ہو چکی ہے۔''

''ہاں ہاں، میں ہی تو ظالم ہوں، قاتل ہوں۔ بدتہذیب ہوں۔ سب کچھ ہوں۔۔۔ ٹھیک ہے، دیکھتی ہوں کوئی میرا کیا بگاڑ لیتا ہے۔ آپ نے دیکھ لیا عبداللہ بھائی! یہ میری اولاد ہے، دیکھ لیا آپ نے۔۔۔ دیکھ لیا۔۔۔'' شکیلہ بیگم کی آواز رندھ گئی اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

''ہونہہ۔۔۔'' گل نور نے کہا اور پھر اس کے بعد تینوں لڑکیاں اٹھ کر چلی گئیں۔ عبداللہ صاحب کو صورت حال کا اندازہ ہو گیا تھا۔ لڑکیاں ماں کے خلاف ہو چکی تھیں تاہم وہ شکیلہ بیگم کو دلاسہ دیتے رہے۔

''صبر اور ہوشیاری سے کام لیں، نوجوان بچیاں ہیں، جذباتی ہو گئی ہیں۔ اگر ہم نے ہوشیاری سے کام نہ لیا تو نقصان بھی اٹھانا پڑے گا۔ میں اس مسئلے کا حل سوچتا ہوں۔''

''سوچ لیں، سوچ لیں میں بھی اتنی بے بس نہیں ہوں۔ دیکھوں گی کہ میں کیا کر سکتی ہوں۔'' شکیلہ بیگم نے کہا اور پھر عبداللہ صاحب وہاں سے چلے گئے۔ گل نور اسی شام شہر چلی گئی تھی پھر رمضان، شکیلہ بیگم کے سامنے پہنچ گیا۔ شکیلہ بیگم نے نفرت بھری نگاہوں سے رمضان کو دیکھا تھا۔

''ہونہہ۔۔۔! آ گئے۔ ہوا نکل گئی غبارے سے۔ میرا کھایا زندگی بھر اور پھر مصلحت کے تحت یہاں سے بھاگ گئے۔ سوچا ہوگا کہ اب حویلی کے نئے مالک سے بنانی چاہیے تاکہ باقی زندگی بھی سکون سے گزر جائے۔''

''ہاں بیگم صاحبہ! اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ زندگی بھر آپ کا نمک کھایا ہے۔ اس کا جواب خدا کو دوں گا کہ حلال تھا یا نہیں۔ لیکن آپ نے حویلی کے نئے مالک کی کیا کہی۔''

''گل نواز کا بیٹا۔۔۔ جائیداد اسے ہی ملے گی نا۔''

''نہیں بیگم صاحبہ! وہ ایک غریب ماں کا بیٹا ہے اور غریب صرف اپنے باپ کو باپ کہتا ہے۔ وہ کسی بھی لالچ کے تحت اپنی ولدیت نہیں بدلتا۔ آپ فکر نہ کریں اسے پتا چل چکا ہے کہ گل نواز اس کے باپ نہیں تھے اور وہ کسی اور کی اولاد ہے۔ اسے معلوم ہو گیا بیگم صاحبہ! کہ اللہ وسائی راؤ گل نواز کے لیے صرف ایک بہن کی حیثیت رکھتی تھی صرف ایک بہن کی۔ آپ مطمئن رہیں اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے

گا۔ اس نے آپ کا کہا سچ مان لیا ہے اس کی قسم تو وہیں ٹوٹ گئی بیگم صاحبہ! وہ کبھی آپ کو پریشان نہیں کرے گا۔ یہ اس غریب بوڑھے کا وعدہ ہے۔"

شکیلہ بیگم کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"کیا کہہ رہے ہو رمضان! اسے یہ کیسے معلوم ہوا اور کیا۔۔۔ کیا یہ واقعی سچ ہے کہ اللہ وسائی۔۔۔ اللہ وسائی۔۔۔"

"ہم غریبوں کی دنیا آپ دولت مندوں کی دنیا سے بہت مختلف ہوتی ہے بیگم صاحبہ! بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہوں گا۔ میں جنت کو لینے آیا ہوں، اسے اجازت دے دیں۔ اب وہ آپ کی خدمت نہیں کر سکے گی۔ البتہ ایک عرض ہے۔ اب یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ اللہ وسائی راؤ صاحب کی کچھ نہیں تھی۔ ان کے درمیان ہمدردی کا ایک بے لوث رشتہ تھا۔ اب یہ بات کسی سے نا کہیں کہ وہ راؤ گل نواز کی داشتہ تھی۔ میرے مرحوم مالک کی روح کرب کا شکار ہوتی ہوگی اس الزام سے۔ خدا کے لیے یہ الزام اب نہ لگائیں ان کی روح پر۔" رمضان روتا ہوا باہر نکل گیا۔ شکیلہ بیگم سکتے کے عالم میں بیٹھی رہ گئی تھیں۔

دوسری طرف رمضان جنت کو لے کر اپنے چھوٹے سے گھر میں پہنچ گیا۔ ہمایوں اور بجیلہ لپٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ ماں بیٹے کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی۔ رمضان نے راستے میں ہی مختصراً جنت کو یہ کہانی سنادی تھی۔ شوخ و شنگ لڑکی جسے حویلی سے چلے آنے کا افسوس ہوا تھا۔ اس کہانی سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔ حویلی چھوڑنے کا افسوس اسے صرف اس لیے ہوا تھا کہ وہاں تینوں لڑکیاں اس کی دوست بن چکی تھیں۔ جمال الدین صاحب کے بیٹوں کے سلسلے میں جنت نے جو کچھ کیا تھا اس نے لڑکیوں کے دل میں اس کی قدر بڑھا دی تھی۔ اس کے علاوہ خود جنت کو بھی اس کام میں بہت مزا آیا تھا اور بعد میں ان واقعات کو یاد کر کے وہ خوب ہنستی رہتی تھی۔ گل نور نے خاص طور سے جنت کو اپنے بہت قریب کر لیا تھا اور اس سے جنت کو بہت لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ سب سے زیادہ خوش مزاج اور سب سے اچھی سہیلی تھی۔

رمضان جنت کو لے کر گھر میں داخل ہوا تھا اور اس نے ہمایوں اور بجیلہ سے جنت کا تعارف کرایا پھر بولا۔

"اب یہ بچی تمہاری خدمت کرے گی بجیلہ بہن! اسے اپنے بچوں کی طرح رکھنا، اس کا بھی کوئی نہیں ہے اس دنیا میں اور رمضان تم لوگوں کے لیے کہیں نوکری کرے گا۔ ابھی اس کی ہڈیوں میں بہت جان ہے۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں نانا ابو! دوبارہ اگر آپ نے یہ الفاظ کہے تو میں یہ سمجھوں گا کہ آپ نے مجھے اپنا نواسا تسلیم نہیں کیا ہے۔ میرے پاس کافی پیسے ہیں۔ یہ آپ کچھ رقم سنبھال کر رکھیے۔ آپ لوگوں کی ضروریات کے لیے بہت کافی ہوگی۔ اس گھر کی مکمل نگرانی اب آپ کی ذمہ داری ہے۔ میں اپنی ذمہ داریاں اپنی ماں کے لیے وقف کر چکا ہوں۔ اس نے پہلی بار مجھے ایک کام سونپا ہے اور وہ کام یہ ہے کہ میں اس شخص کو جو مجھ بدنصیب کا باپ ہے اور میری ماں کا شوہر اسے ایک بار اپنی ماں کے قدموں میں جھکا دوں۔ خدا کرے وہ زندہ ہو، تندرست ہو اور کسی ایسے حادثے کا شکار نہ ہوا ہو جس کی وجہ سے مجھے اس پر ترس کھانا پڑے۔ میں چاہتا ہوں نانا ابو! کہ بس کل نور پورہ روانہ ہو جاؤں اور وہاں جا کر اس شخص کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔"

"بہت پرانی بات ہے بیٹے! اب تو ان جگہوں پر نئے درخت پیدا ہو چکے ہوں گے جہاں جنگلوں کی کٹائی ہوتی تھی۔ یہ درخت بھی جوان ہوں گے اور کوئی نیا ٹھیکے دار ان کے ٹھیکے لے رہا ہوگا۔ تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوگی کہ وہ کون تھا، میری مراد بابر علی سے ہے۔"

"نانا ابو! جذبے صادق ہوں تو انسان اپنی منزل پا ہی لیتا ہے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ اس کا پتا لگ جائے۔"

"تمہاری مرضی بیٹے! لیکن ایک درخواست

گروں تم سے وہ یہ کہ رمضان خان کو اس کے چھوٹے سے کام کا اتنا بڑا صلہ نہ دو۔ میں اپنی بوڑھی ہڈیوں کو رنگ نہیں لگانا چاہتا اور پھر میرے اوپر بھی کچھ ذمے داریاں ہیں۔ یہ جنت جنگلی بیل کی طرح جوان ہوتی جارہی ہے۔ کچھ دن نوکری کرانا چاہتا تھا اس سے۔ اس کے بعد سوچا تھا کہ اس کے پاس کچھ ہوگا کچھ میں اپنے پاس سے ملاؤں گا اور اس کے ہاتھ پیلے کردوں گا۔"

ہمایوں نے ہنس کر جنت کی جانب دیکھا اور بولا۔

"یہ تو آپ کا احسان ہے نانا ابو کہ آپ نے مجھے ایک بہن بھی دے دی اور کیا بھائی پر بہن کا حق نہیں ہوتا۔ اب آپ اس کا خیال چھوڑ دیجیے۔"

"کیا کرو گے بیٹا! ابھی تو تم خود تعمیر کی منزل میں ہو، کچھ بن جاؤ تو پھر میں ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھ جاؤں گا۔"

"بس میں نے کہہ دیا نا، نانا ابو! اگر آپ میری بات نہیں مانیں گے تو میں اپنی ماں کو لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔ آپ بے شک نوکری کریں مگر میرے جانے کے بعد۔" رمضان خان ہنس پڑا، پھر بولا۔

"بڑے ضدی ہو۔۔۔ اچھا جیسے تم کہو، ہم تسلیم کرتے ہیں۔"

جنت نے باورچی خانہ سنبھال لیا تھا۔ بجیلہ کو اس نے کسی کام میں ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ پورے گھر کی از سرِ نو صفائی ہوئی اور شوخ فطرت اور ہلکے ہلکے قہقہے لگانے والی جنت نے اس گھر میں نور ہی نور بکھیر دیا۔ تنہا ہی ہنسنے کی عادی تھی کوئی شریک ہو یا نا ہو۔ بات بات میں جیسے اس کے گدگدی ہونے لگتی تھی۔ ہمایوں کو دیکھ کر اچانک ہی ہنسنے لگی اور وہ بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"اللہ اللہ۔۔۔ پاگل لڑکی! میں تو تجھ سے بے تکلف نہیں ہوں پھر کیوں مجھے دیکھ دیکھ کر ہنسی جارہی ہے۔" ہمایوں نے کہا اور جنت ہنستی ہنستی بے قابو ہوگئی۔

"کمال کی ہے بھئی، یہ تو یوں لگتا ہے جیسے ہوا اس کو گدگدی کرتی ہے۔"

"بیٹے! یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے مگر جنت اتنا ہنسنا اچھی بات نہیں ہے۔" رمضان خان نے درمیان میں مداخلت کی تو ہمایوں جلدی سے بول پڑا۔

"ارے، ارے نانا ابو! آپ کو ہم بہن بھائی کے معاملے میں مداخلت کرنے کے لیے کس نے کہا تھا۔ دیکھ لو ماں جی! یہ آپ کے بزرگ ہمارے معاملات میں دخل دے رہے ہیں۔" ہمایوں نے شکایت آمیز لہجے میں کہا اور بجیلہ بے اختیار مسکرا پڑیں۔

"کیسا اچھا لگ رہا ہے رمضان بابا! کیسا اچھا لگ رہا ہے۔"

"اور تجھے تو بولتے ہوئے دیکھ کر مجھے یقین نہیں آتا کہ ان سوکھے دھانوں میں پھر سے ہریالی آگئی ہے۔"

"ہاں بابا۔۔۔! میرا بیٹا جوان ہوکر آیا ہے۔ دیکھو کیسا پیارا ہے، یہ کتنا خوب صورت ہے، کتنا لمبا چوڑا ہے، اتنا لمبا چوڑا تو اس کا باپ بھی نہیں تھا۔ یہ۔۔۔ بابا! یہ۔۔۔"

"خدا تجھے مبارک کرے بیٹی۔۔۔! خدا کی قدرت کا اس سے بڑا اظہار اور کیا ہوگا سب کے دن پھیر دیتا ہے وہ۔"

ہمایوں جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ دوسرے دن رمضان بابا اور بجیلہ نے اسے لاتعداد دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ نور پورہ جانے کے لیے ٹرین سے سفر کرنا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اوکاڑہ اسٹیشن پہنچ گیا۔ اس کے چہرے کی وہ شوخ مسکراہٹیں غائب ہوگئی تھیں اور ان کی جگہ سنجیدگی نے لے لی تھی۔ ٹرین کے سفر کے دوران وہ کھڑکی سے باہر کے مناظر دیکھتا رہا۔ لہلہاتے ہوئے سرسبز کھیت، افق کی دھندلاہٹوں میں پہاڑی ٹیلے، درخت اور ان درختوں میں سے کام کرتے ہوئے مزدور نظر آرہے

تھے۔ جنگلوں کی کٹائی کرتے ہوئے ایک شخص گھوڑے پر سوار وجیہہ شخصیت کا مالک ان مزدوروں کے درمیان نظر آرہا تھا۔ بڑی مغرور اور فاتحانہ نگاہوں سے ان غریب لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو اس کے سامنے ایک حقیر سی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے اشارے پر اس کے لیے دولت کے انبار لگانے والے یہ محنت کش جو اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے تھے۔

پھر اس نے اپنی ماں کو ایک الہڑ اور نوخیز حسینہ کے روپ میں دیکھا۔ شرمائی، لجائی نگاہوں سے وہ اس گھڑسوار کو دیکھ رہی تھی۔ پھر ایک چیخ، ایک دردناک چیخ اور ماں کے پلو سے خون ابل پڑا۔ وہ زخمی اور لاوارث اس جنگل میں پڑی ہوئی تھی۔ ہمایوں کی آنکھیں خون سے سرخ ہوگئیں۔ اس کے جبڑوں کی نسیں ابھر آئیں اور اس کے حلق سے بھرائی ہوئی سی آواز نکلی۔

''بابر علی تُو میرا باپ ہے لیکن کسی بیٹے نے اپنے باپ سے اتنا خوف ناک انتقام نہ لیا ہوگا جتنا میں تجھ سے لوں گا۔ کاش! تُو زندہ ہو، کاش! تُو مجھے مل جائے۔''

''کیا مجھ سے کہا بیٹے!'' برابر بیٹھے ہوئے ایک بزرگ نے پوچھا جن کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی، ہمایوں سنبھل گیا۔

''نہیں جناب! معافی چاہتا ہوں۔۔۔نہیں۔''

''مگر تم آہستہ آہستہ سے کچھ بڑبڑا رہے تھے اور تمہارا لہجہ بڑا عجیب سا تھا جس نے مجھے تمہاری طرف متوجہ کیا۔'' بوڑھے شخص نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

''کچھ نہیں بابا! معافی چاہتا ہوں۔ خود سے باتیں کررہا تھا آپ کو ڈسٹرب کیا۔''

''نہیں نہیں، ایسی کیا بات ہے۔ کہاں جارہے ہو؟'' بڑے میاں نے ہم سفر کی حیثیت سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔ ان کے ساتھ بیٹھی نوجوان دیہاتی سی لڑکی کاجل بھری آنکھوں سے ہمایوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ ہمایوں نے جلدی سے اس پر سے نگاہ ہٹالی۔

''نور پورہ جارہا ہوں بابا صاحب!''

''اچھا، اچھا۔۔۔کوئی رشتہ داری ہے وہاں پر۔''

''ہاں پورا کنبہ ہے وہاں۔''

''بڑی اچھی جگہ ہے، بڑی سرسبز اور خوب صورت۔ میری ماں رہتی تھی وہاں پر۔ بے چاری کو سانپ نے کاٹ لیا اور وہ مرگئی۔ اس کا شوہر تیسرے مہینے ہی دوسری کرلایا اور نور پورہ سے چلا گیا۔ میں تو کئی سال پہلے نور پورہ گیا تھا جب میری سالی زندہ تھی۔۔۔'' بڑے میاں تفصیل بتاتے رہے اور ان کے قریب بیٹھی نوجوان لڑکی مسکراتی نگاہوں سے ہمایوں کو دیکھتی رہی۔ ہمایوں گہری سانسیں لے کر دوسری طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ بزرگ کی باتیں وہ بہت کم سن رہا تھا۔ ذہنی طور پر مصروف رہنا چاہتا تھا۔ بزرگ سے یہ سوچ کر اس نے گفتگو کی تھی کہ ممکن ہے وہ نور پورہ کے بارے میں کچھ اور جانتے ہوں لیکن جب سالی ہی مرگئی تو اب ان کا نور پورہ سے کیا واسطہ۔

تھوڑی دیر تک وہ اسے اپنی داستانیں سناتے رہے۔ پھر اس کی طرف سے جواب نا پاکر خاموش ہوگئے۔ ہمایوں خیالات میں کھویا رہا تھا۔ سفر جاری رہا پھر تھوڑی دیر کے بعد ہمایوں کو ایک خیال آیا اور اس نے بزرگ سے پوچھا۔

''آپ کہاں جارہے ہیں؟'' یہ کہتے ہوئے اس کی نگاہیں لڑکی کی جانب اٹھ گئیں۔ اب وہ ایک چادر اوڑھے دونوں پاؤں سیٹ پر سکوڑے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی وہی مسکراہٹ جاگ رہی تھی۔ پتا نہیں کب سے وہ اسی طرح ہمایوں کو دیکھے جارہی تھی۔ ہمایوں کو الجھن ہونے لگی۔

''علی پور۔۔۔وہیں رہتا ہوں۔''

''اچھا، ایک بات بتایئے۔ یہ علی پور، نور پورہ سے پہلے پڑتا ہے یا بعد میں؟''

چار اسٹین بعد ہے۔ نور پورہ سے تو بڑا فاصلہ ہے اس کا۔'' بڑے میاں نے جواب دیا۔

''میں آپ کو ایک تکلیف دوں گا، جب نور پورہ آجائے تو مجھے بتا دیجیے گا۔''

''تم پہلی بار وہاں جا رہے ہو مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ تمہارا پورا کنبہ وہاں رہتا ہے۔''

''بس۔۔۔ میں ملک سے باہر گیا ہوا تھا پڑھنے کے لیے۔ میرے ماں باپ شہر میں رہتے ہیں اور اب میں اپنے کنبے سے ملنے جا رہا ہوں۔''

''پھر تو بڑا مزا آئے گا۔ وہ تمہیں کیسے پہچانیں گے؟''

ہمایوں کو الجھن ہونے لگی کہ اس نے بڑے میاں سے جھوٹ بولا ہی کیوں تھا۔ کافی جھکی آدمی تھے۔ آخر کار بڑے میاں نے اسے بتایا کہ اب جو ٹرین رکے گی تو نور پورہ پر ہی رکے گی۔

شام کے سائے زمین پر اتر آئے تھے۔ اطراف کا ماحول دھندلاتا جا رہا تھا۔ ٹرین پہاڑوں کے درمیان سفر کر رہی تھی اور پہاڑوں کے درمیان میں درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ نظر آ رہے تھے۔ سرسبز جھنڈ جو اس وقت شام کی کجلاہٹوں میں دھندلا گئے تھے۔ بڑا خوب صورت علاقہ تھا۔ آخر کار وہ نور پورہ کے اسٹیشن پر اترنے کے لیے تیار ہو گیا۔ یہاں ٹرین چند لمحوں کے لیے رکتی تھی کیونکہ چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ ٹرین رکی تو ہمایوں اترنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کا سامان پیروں کے نزدیک رکھا تھا۔ اس کی نگاہ لڑکی کی جانب اٹھی تو اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ لڑکی کی آنکھوں میں اب دکھ کے آثار تھے۔ بے چینی اور کرب تھا۔ یہ کرب چند لمحات کے لیے ہمایوں کے ذہن پر چسپاں ہو گیا۔ کیسی معصوم ہوتی ہیں یہ لڑکیاں، ہر ایک سے متاثر ہو جانے والی۔ تھوڑی دیر تک یاد کرے گی پھر بھول جائے گی لیکن اس کی آنکھیں ہمایوں کو اپنے ذہن میں چبھتی ہوئی لگی تھیں۔

آخر کار وہ نیچے اتر گیا۔ بس ایک نگاہ اس نے لڑکی کی طرف دیکھا تھا۔ اب اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ ہمایوں نے ذہن کو جھٹکا اور سرخ بجری کے پلیٹ فارم پر آگے بڑھنے لگا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر چائے کا اسٹال لگا ہوا تھا اور دو آدمی وہاں کھڑے چائے پی رہے تھے۔ اسٹیشن پر اور کوئی نہیں اترا تھا اور نا ہی وہاں سے کوئی ٹرین میں سوار ہوا تھا۔ ٹرین وسل دے کر آگے بڑھ گئی۔ پلیٹ فارم کے نکاس کے دروازے پر کوئی ٹکٹ چیکر موجود نہیں تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے گیٹ کے نزدیک پہنچ گیا۔ سامنے چھوٹا سا مسافر خانہ تھا جس میں کوئی مسافر نہیں تھا۔ البتہ دو تین تانگے کھڑے ہوئے تھے۔ ہمایوں نے گہری سانس لی۔

شام کے سناٹے گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ سردی بھی بڑھ رہی تھی۔ قیام کے لیے کسی مناسب جگہ کی تلاش تھی اور اس سلسلے میں تانگے والے ہی مدد کر سکتے تھے۔ اس نے ایک تانگے والے کو چنا اور اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ وہ چادر اوڑھے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ یہاں سواریاں بھی بہت کم ہی ملتی ہوں گی۔ تانگے والا اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کہاں جاؤ گے بابو جی۔۔۔! کہاں جانا ہے؟'' اس نے ہمایوں سے پوچھا اور ہمایوں نے اپنا سوٹ کیس اسے تھما دیا۔ تانگے والے نے سوٹ کیس اپنے تانگے میں رکھا اور ہمایوں اس تانگے میں بیٹھ گیا۔ تانگے والے نے خود بھی تانگے پر سوار ہو کر تانگہ آگے بڑھا دیا۔ دوسرے تانگے والے دیکھتے رہ گئے۔ انہیں شاید افسوس ہو رہا تھا کہ ٹرین کے آنے کے وقت انہیں اونگھ کیوں آ گئی تھی۔

''کہاں جاؤ گے بابو جی؟''

''یار! نور پورہ میں پہلی بار آیا ہوں، ٹھہرنے کے لیے کوئی جگہ بتاؤ، یہاں کوئی ہوٹل وغیرہ ہے؟''

''ہوٹل نہیں ہے بابو جی۔۔۔! ہوٹل تو بڑے بڑے شہروں میں ہوتے ہیں۔ یہاں تو سرائے ہوتی

ہیں۔ بابو کی سرائے، رحیمو کی سرائے۔ بولیں کون سی سرائے میں لے جاؤں؟''

''کون سی اچھی ہے؟''

''تب آپ رحیمو کی سرائے میں چلیں، وہاں انتظام اچھا ہوتا ہے۔''

رحیمو کی سرائے لکڑی کے بنے ہوئے مکان پر مشتمل تھی۔ جس میں چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ اس لکڑی کے گھر میں کچی مٹی کا ایک احاطہ تھا۔ دروازے کو گولائی سے بنایا گیا تھا۔ دروازے سے تھوڑی ہی فاصلے پر رحیمو تندور پر بیٹھا روٹیاں لگا رہا تھا۔ یہی سرائے کا مالک تھا۔ ایک دو آدمی بیٹھے نظر آرہے تھے جو زمین پر بیٹھے چنگیری میں روٹیاں رکھے سالن سے کھا رہے تھے۔ رحیمو نے لوہے کے گز سے تندور کریدتے ہوئے ہمایوں کی طرف دیکھا۔ تانگے والا اس کے ساتھ ساتھ ہی اندر آگیا تھا۔

''مسافر لایا ہوں رحیمو بھیا! شہر کا آدمی ہے، ذرا آرام سے رکھیو۔''

''بڑی مہربانی تیری۔۔۔ آؤ بابو جی! ٹھہرو گے یہاں؟''

''ہاں۔۔۔''

''ارے او پھیکے۔۔۔! پھیکے۔۔۔!'' رحیمو نے کسی کو آواز دی اور ایک پھیکا قریب ہی پہنچ گیا۔ شکل سے ہی پھیکا نظر آتا تھا۔ جوان العمر تھا لیکن گال پچکے ہوئے تھے۔ چہرے پر ہلکے ہلکے چیچک کے نشانات نظر آرہے تھے۔ قریب آگیا۔

''بابو صاحب کو چھ نمبر میں لے جاؤ۔۔۔ چھ نمبر صاف کیا ہوا ہے نا؟''

''ہاں چاچے! آؤ بابو جی!'' اس نے آگے بڑھ کر ہمایوں کا سوٹ کیس اٹھا لیا اور احاطے سے اندرونی حصے کی جانب چل پڑا۔ چھ نمبر دروازے سے اندر گھستے ہی بائیں سمت میں واقع تھا۔ واقعی جگہ صاف ستھری تھی۔ بستر بھی اچھا لگا ہوا تھا۔ پائنتی پر لحاف رکھا ہوا تھا۔ ایک طرف مٹکا رکھا ہوا تھا جس پر صاف ستھرا گلاس رکھا تھا۔ بس یہی اس کمرے کی کل کائنات تھی۔ پھیکے نے سوٹ کیس ایک کونے میں رکھ دیا اور مسکراتی نگاہوں سے ہمایوں کو دیکھنے لگا۔

''ہیرو لگتے ہو جی بالکل۔۔۔ کہاں سے آئے ہو۔'' پھیکے نے پوچھا۔ لیکن ہمایوں نے اسے کوئی جواب دیے بغیر جیب سے ایک نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا۔

''کیا منگوانا ہے بابو جی؟''

''کچھ نہیں۔۔۔ یہ رقم تم رکھ لو۔''

''مم۔۔۔ میں۔'' پھیکے کا منہ ایک دم تر و تازہ ہو گیا۔

''ہاں۔۔۔ کیوں حیران کیوں ہو؟''

''نہیں بابو جی۔۔۔! شکریہ۔۔۔ سلام۔ آپ نے بتایا نہیں کہاں سے آئے ہیں آپ، کسی فلم کمپنی میں کام کرتے ہیں؟''

''نہیں بس سیر کرنے آیا ہوں یہاں۔''

''سمجھ گیا جی سمجھ گیا۔'' پھیکے عجیب سے انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔

''کیا سمجھ گئے۔'' ہمایوں نے اسے تعجب سے دیکھا۔

''بس سمجھ گیا بابو جی! بتاؤں گا نہیں۔'' وہ ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔ ہمایوں گہری سانس لے کر پلنگ پر بیٹھ گیا تھا۔ پھر اس نے جوتے اور موزے اتارے اور پلنگ پر دراز ہو گیا۔ رحیمو نے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ یہاں کتنے دن قیام کرے گا۔ نا ہی قیام کے اخراجات بتائے تھے۔ خیر ان ساری باتوں کی ہمایوں کو پروا نہیں تھی۔

رات ہو گئی۔ پھیکے اس کے لیے کھانا لے کر آگیا تھا۔ کھانا ٹرے میں سجا ہوا تھا۔ درمیانے درجے کا کھانا تھا۔ بس سالن اور روٹی، ساتھ میں ایک پلیٹ میں کٹی ہوئی پیاز، پودینہ اور ٹماٹر بھی تھے۔

''یہ تمہارا رحیمو چاچا کسی مسافر سے پیسے دیے نہیں لیتا۔''

''وہ بڑا بیبا آدمی ہے جس نے جو دے دیا لے

کبھی اپنے کسی مسافر سے جھگڑا نہیں کرتا وہ۔"

"ٹھیک۔۔۔" ہمایوں نے کہا، پھر بولا۔

"تم پڑھے لکھے آدمی ہو پھیکے؟"

"جی صاحب! جی پورے تین سپارے پڑھے ہیں نے مسجد کے مولوی صاحب سے اور اس کے بعد دو قاعدے۔ اپنا نام بھی لکھ لیتا ہوں اور انگوٹھا لگانے کے بجائے دستخط کر لیتا ہوں۔ بس مار کھا گیا صاحب اپنی غریبی سے ورنہ دل تو چاہتا تھا کہ شہر جا کر اب پڑھوں۔"

"خیر، چلو ٹھیک ہے یہ نوکری بھی کیا بری ہے۔ کیا ملتا ہے تمہیں یہاں سے؟"

"صاحب جی پانچ روپے روز اور چھٹی والے دن دس روپے۔"

"یہیں گھر ہے تمہارا؟"

"جی صاحب جی! اپنے دادا کے ساتھ رہتا ہوں۔ باپ مر چکا ہے، ماں موجود ہے۔"

"اچھا اچھا۔۔۔ ویسے نور پورہ کی آبادی کتنی ہوگی پھیکے؟"

"صحیح تو پتا نہیں ہے صاحب! بہت سے گھر ہیں، ہم نے کبھی گنے نہیں ہیں۔"

"تم سب ایک دوسرے کو جانتے ہوگے، ظاہر ہے اس چھوٹی سی آبادی میں کون کس کو نہیں جانتا۔"

"ہاں صاحب جی! ہم سب بڑی محبت سے رہتے ہیں۔ نور پورہ میں کبھی آپس میں جھگڑا نہیں ہوا کبھی کسی میں۔"

"واہ۔۔۔! یہ تو اچھی بات ہے۔ کتنے بہن بھائی ہیں تمہارے۔"

"نہیں صاحب جی! میں نے کہا نا بس دادا جی ہیں، ماں ہے اور میں ہوں۔ جو کچھ کماتا ہوں کافی ہوتا ہے۔ رحیمو بہت اچھا آدمی ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں بھی وہ دے دیتا ہے۔ دادا جی کی تھوڑی سی زمین ہے وہیں پر کام کرتے ہیں اور اس سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ بھی دادا جی ہم لوگوں پر ہی خرچ کر دیتے ہیں۔ صاحب جی! آپ شکل سے ہیرو لگتے ہیں۔ بہت دن ہوئے ایک فلم کمپنی آئی تھی فلم بنانے کے لیے مجھے دیکھا، چانس دیا مگر صاحب جو فلم انہوں نے بنائی تھی وہ میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ یہاں کوئی سینما ہی نہیں ہے۔ کبھی سال دو سال میں چھٹی ملتی ہے تو میں دھان پور چلا جاتا ہوں۔ دھان پور میں دو سینما گھر ہیں لیکن وہ فلم آج تک نہیں لگی جس میں اپنا بھی کام تھا۔"

"اچھا تو تم نے بھی فلم میں کام کیا ہے؟"

"ہاں صاحب جی! ریل کی پٹڑی کے پاس ہیرو پٹڑی سے بندھا ہوا پڑا تھا۔ ہم دور سے دوڑتے ہوئے آئے، ریل آ رہی تھی۔ ہم نے ہیرو کو کھولا اور اس کی جان بچائی۔ ہیرو نے ہمیں گلے لگایا۔ وہ کیا نام تھا اس کا۔۔۔ وہ ہمیں یاد نہیں پڑ رہا صاحب جی! بہت شان دار جوان تھا۔ ڈائریکٹر نے ہمیں دیکھا اور بولا وہ ہمیں فلم میں چانس دے گا۔ صاحب! بڑی خدمت کی ہم نے ان کی۔ ڈائریکٹر ہم سے وعدہ کر کے گیا کہ وہ ہمیں شہر بلا لے گا اور اگلی فلم میں ہم ہیرو بنیں گے۔ اسی لیے ہم آج تک بنے ٹھنے رہتے ہیں کہ پتا نہیں کس وقت ڈائریکٹر آ جائے اور ہمیں شہر لے جائے مگر وہ ابھی تک نہیں آیا۔ دو سال ہو چکے ہیں پورے۔"

ہمایوں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ بے اختیار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ وہ اس سر سے پاؤں تک ہیرو کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ خوش فہمیاں ہی انسان کو زندہ رکھتی ہیں۔ اگر وہ اپنے بارے میں ان خوش فہمیوں کا شکار نہ ہو تو موت کی آغوش میں جا سوئے۔

رات کو رحیمو آیا۔ انگوچھے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس نے اندر آ کر سلام کیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

"کوئی تکلیف ہو بابو جی تو بتا دینا، رحیمو کی سرائے ہے، سب مجھے چاچا کہتے ہیں اور میں بھی بس بابو جی! زندگی گزارنے کے لیے چکر چلائے ہوئے ہوں، لوگوں کی خدمت کر لیتا ہوں، دل کو خوشی مل

جاتی ہے۔ کوئی بھی تکلیف مت اٹھانا، کتنے دن یہاں رہو گے؟''

''کچھ نہیں کہہ سکتا رحیو چاچا! میں بھی تمہیں چاچا ہی کہوں تو بُرا تو نہیں مانو گے؟''

''ارے بابو جی! آپ بڑے لوگ ہیں، آپ کسی کو چاچا واچا کیسے کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں رحیو کہہ لیا کریں۔''

''کیوں بڑے لوگوں کے چاچا نہیں ہوتے کیا۔۔۔ خیر میں ممکن ہے دو چار دن رہوں، ممکن ہے دس پندرہ دن اور ممکن ہے کئی مہینے۔''

''جب تک دل چاہے رہو بابو جی!''

''مگر تم نے کرایہ وغیرہ نہیں بتایا۔''

''جو دل چاہے دے دینا بابو جی! کیا بتاؤں؟''

''پھر بھی۔۔۔''

''نہیں جی۔ ہم بتاتے نہیں ہیں، جو دو گے لے لیں گے قسم اللہ کی کبھی گردن نہیں اٹھائیں گے۔''

''یہ پیسے رکھ لو رحیو چاچا! جب ان کا حساب پورا ہو جائے تو مجھ سے اور مانگ لینا۔''

''جو حکم بابو صاحب!'' رحیو نے وہ نوٹ لیے اور حیرانی سے انہیں دیکھتا رہا۔

رات کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی تھی۔ پھر نجانے کن کن سوچوں میں نیند آ گئی۔ صبح کو اٹھا، منہ ہاتھ دھویا، ناشتا کیا جس میں چائے، دو انڈے اور ایک پراٹھا تھا۔ اچھا ناشتا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد تیار ہوا اور باہر نکل گیا۔

نور پورہ بہت سی کہانیوں کا حامل۔۔۔ وہ اس کے اطراف میں گھومنے لگا۔ بہت زیادہ بڑی جگہ نہیں تھی۔ بس ایک چھوٹا سا پہاڑی قصبہ کہا جا سکتا تھا۔ دو بازار تھے جن میں ضروریات کی دکانیں سجی ہوئی تھیں۔ چھوٹے بڑے کچے پکے مکانات جن میں کچھ لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ کچھ گھاس پھوس کے کچھ کچی مٹی کے۔ ہمایوں ان بازاروں کو، ان مکانوں کو اور ان گلیوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ بہت سی باتیں یاد آ رہی تھیں، بہت سے خیالات تھے۔۔۔ بہت سی پرچھائیاں تھیں۔ انہیں میں کوئی گھر بابر علی کا ہوگا، انہی میں سے کسی گھر میں اس کی ماں نے جنم لیا ہوگا۔ سجیلہ نے ان گلیوں اور بازاروں میں وقت گزارا ہوگا وہ وہاں کھیلی ہوگی اور وہیں اس نے پرورش پائی ہوگی۔ ماں ایک انتہائی قابلِ احترام ماں۔ ایک بہت ہی پیاری ہستی جس نے اپنی پوری زندگی دکھوں میں گزاری ہے اور اس نے صرف ایک خوشی دیکھی ہے۔۔۔ اپنا بیٹا ہمایوں۔۔۔ ہمایوں کے دل میں ماں کے لیے ایک عجیب سی محبت ابھر آئی۔ اس عورت کے لیے تو ایک ہزار زندگیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔ اس کی خوشیاں حاصل کرنے کے لیے تو زندگی کا آخری قدم تک اٹھایا جا سکتا ہے۔

وہ گھومتا رہا۔۔۔ پھر ایک دکان پر رک گیا۔ ایک بوڑھا آدمی وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ ہمایوں نے اس بوڑھے آدمی کو سلام کیا اور بوڑھا اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''بابا جی! میں باہر سے آیا ہوں، ایک آدمی کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ہی کی طرح ایک اور بزرگ یہاں رہتے ہیں ان کا نام یونس خان ہے۔۔۔ یونس خان۔''

''ہاں جی ہاں، جانتا ہوں مگر وہ چھوٹی سی بستی میں رہتا ہے۔ تم چھوٹی بستی چلے جاؤ۔ کسی سے بھی یونس خان کے بارے میں پوچھ لینا۔''

''چھوٹی بستی کدھر ہے؟''

''بس یہاں سے سیدھے چلے جاؤ پھر الٹے ہاتھ پر ایک کچی سی پگڈنڈی جاتی ہے اس پر چلے جانا۔ وہ چھوٹی بستی پر ہی ختم ہوتی ہے۔''

''بہت بہت شکریہ بابا صاحب!'' ہمایوں نے کہا اور بوڑھے کے بتائے ہوئے پتے پر چل پڑا۔ چھوٹی بستی میں یونس خان کے بارے میں معلوم کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ایک شخص نے اسے ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے لا کھڑا کیا۔ مکان بوسیدہ سا تھا۔ اس نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی تو چھوٹی سی آٹھ نو سال کی بچی باہر نکل

آئی۔

''بابا یونس ہیں؟''

بچی نے کوئی جواب بھی نہیں دیا تھا کہ ایک آدمی اس کے قریب آ گیا۔ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا، جاہل سا تھا۔ ہمایوں کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

''کس سے ملنا ہے بابو جی؟''

''یونس خان سے۔''

''میں یونس خان ہوں۔''

''اوہو۔۔۔ مجھے تم سے بہت ضروری کام ہے۔''

''تو اندر آ جاؤ بابو جی!'' اس شخص نے کہا اور اسے صحن میں لے آیا۔ جہاں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اندر عورتیں بھی تھیں جو اسے دیکھ کر کمرے میں چلی گئیں۔

''ہاں بابو جی بولو۔۔۔ کیا کام ہے مجھ سے؟''

''یونس خان میں تم سے ایک بہت پرانی بات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ بہت ہی پرانی۔۔۔ میرا خیال ہے بیس پچیس سال پہلے کی۔''

''بیس پچیس سال پہلے تو ہم اس بستی میں نہیں تھے بابو جی! کون سی بات ہے؟''

''بیس پچیس سال پہلے تم اس بستی میں نہیں تھے؟''

''نہیں بابو جی!''

''تو پھر تم کہاں رہتے تھے؟''

''ہم حکیم آباد میں رہتے تھے بابو جی! وہیں ہمارا دھندہ تھا۔ ہمیں اس بستی میں آئے ہوئے آٹھ نو سال سے زیادہ نہیں ہوئے۔''

''اوہو۔۔۔ تو پھر معاف کرنا میں غلط فہمی میں تمہارے پاس آ گیا۔ ویسے یونس خان نامی کوئی اور آدمی بھی یہاں رہتا ہے؟''

''نہیں جی اور تو کوئی نہیں ہے۔ ویسے ہم ایک لڑکے کو جانتے ہیں جس کا نام یونس ہے وہ جوان ہے اور دکان پر کام کرتا ہے۔''

''تمہیں تکلیف دی معافی چاہتا ہوں۔''

''کوئی بات نہیں بابو جی!'' اس نے کہا اور ہمایوں وہاں سے نکل آیا۔ یونس خان کا پتا کہیں سے بھی نہیں چلا تھا۔ پتا نہیں وہ شخص مر گیا یا زندہ ہے۔ سرائے میں واپس آ کر وہ بہت دیر تک غور کرتا رہا اسی دوران پھیکے اس کے پاس آ گیا تھا۔

''کہاں گھومتے رہے بابو جی!''

''بس پھیکے! تمہاری بستی دیکھ رہا تھا۔''

''کیسی لگی؟''

''بہت خوب صورت ہے۔ مجھے بہت پسند آئی۔ ویسے ایک بات بتاؤ پھیکے، یہاں جنگلوں کی کٹائی وغیرہ بھی ہوتی رہتی ہوگی۔''

''ہاں بابو جی!''

''ٹھیکے دار بھی آتے ہوں گے۔ لوگوں کو کام بھی ملتا ہوگا۔''

''ہاں بابو جی! آج کل بھی کٹائی کا کام ہو رہا ہے۔''

''کس طرف؟''

''پچھائی پلے میں۔''

''یہ کہاں ہے؟''

''جنگل کا علاقہ ہے بابو جی! بستی سے ملا ہوا ہے۔ وہاں آج کل ایک ٹھیکے دار کٹائی کروا رہا ہے۔''

''کیا نام ہے اس کا؟''

''ہمیں تو پتا نہیں ہے۔ دوسرے لوگ جانتے ہوں گے۔''

''مجھے بھی ایک ایسے آدمی کی تلاش ہے پھیکے! وہ جنگل کی کٹائی کے ٹھیکے داروں کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا۔ پچیس سال پہلے میرے باپ کی اس سے ملاقات ہوئی تھی اور میرا یہاں اس بستی میں آنے کا مقصد یہی ہے کہ میں اپنے اس بزرگ سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''اچھا جی، ویسے ہمارے دادا جی بھی ٹھیکے داروں کے ساتھ مل کر کام کرتے رہے ہیں، آپ ان سے پوچھ لیں، آپ کو پتا چل جائے گا۔''

''ارے واہ۔۔۔! تمہارے دادا جی سے کیسے

ملاقات ہوسکتی ہے؟''

''آرام سے۔''

''تم شروع سے اس بستی میں رہتے ہو؟''

''ہاں جی، ہماری تو نسلیں یہاں رہتی ہیں۔''

''تب تو تمہارے دادا جی میرے کام کے ہوسکتے ہیں۔ کب لے چلو گے مجھے ان کے پاس۔''

''آج ہی چلیں۔ ابھی چلیں۔ رحیمو چاچا سے کہہ دوں وہ منع تھوڑی کریں گے۔''

''تم یہاں کب تک رہتے ہو؟''

''کوئی پتا نہیں ہے جی۔ آٹھ، نو، دس بھی بج جاتے ہیں۔ بس جب کام ختم ہوجائے۔''

''اس وقت تمہیں کوئی کام ہے؟''

''نہیں بابو جی! کوئی کام نہیں ہے۔ چلو رحیمو چاچا سے چھٹی لے لو۔ آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے کہا اور ہمایوں اس کے ساتھ چل پڑا۔

رحیمو چاچا نے انہیں بہ خوشی جانے کی اجازت دے دی اور تھوڑی دیر کے بعد پھیکے ہمایوں کو اپنے مکان پر لے گیا۔ اس کے دادا سے ملاقات ہوئی۔ اچھے تن و توش کا چوڑے جبڑے والا آدمی تھا۔ اس نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے ہمایوں کو دیکھا اور پھیکے اسے ہمایوں کے بارے میں بتانے لگا۔

''کہو بابو جی! کیا پوچھنا ہے۔ اتنی پرانی بات کسے یاد رہتی ہے۔''

''بابا مجھے یونس خان نامی ایک آدمی کا پتا چاہیے جو بہت عرصے پہلے جنگل کی کٹائی کے ٹھیکے داروں کے ساتھ مل کر کام کیا کرتا تھا۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں؟''

بوڑھے کے بجائے پھیکے جلدی سے بول پڑا۔

''ہمارے دادا جی بھی تو یونس خان ہی ہیں۔ بہت عرصے تک یہ جنگل کاٹنے والے ٹھیکے داروں کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں۔ کیوں دادا جی میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔''

ہمایوں کے بدن میں سرد لہریں دوڑنے لگیں۔

''تو یہ ہے یونس خان، بابر علی کے دستِ راست، اس کی ماں کے قاتلوں میں سے ایک۔'' وہ آنکھوں کے بدلتے ہوئے رنگ پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ یونس خان کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کے ذہن میں آگ سی دہکنے لگی تھی۔ لیکن اپنے آپ پر قابو پایا۔ کچھ لمحے کے لیے خود کو پرسکون کرتا رہا۔ پھر وہ بولا۔

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے بابا صاحب! سنا ہے اپنی جوانی میں آپ نے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ دراصل میری اب تک کی زندگی ولایت میں گزری ہے لیکن یہ میرا وطن ہے اور اب میں اپنے وطن واپس آکر کچھ کرنا چاہتا ہوں۔''

''بڑی اچھی بات ہے بیٹا! رہی میری جوانی کی بات تو ایسی کوئی خاص بات نہیں۔ اس قصبے میں زندگی گزاری ہے۔ یہیں عزت سے کھایا، کمایا اور یہ کوئی کارنامہ نہیں ہے۔''

''ولایت میں میری ملاقات ایک آدمی سے ہوئی تھی۔ آپ کی بہت تعریف کرتا تھا وہ۔۔۔''

''کون تھا وہ۔۔۔؟''

''میں اسے بابر علی کے نام سے جانتا ہوں۔ پورا نام مجھے نہیں معلوم۔ نجانے آپ اسے کس نام سے جانتے ہوں۔''

''بابر علی۔۔۔'' یونس خان سوچ میں ڈوبا اور پھر اچانک ہی اچھل پڑا۔

''بابر علی۔۔۔ وہی بابر علی، بیٹا! جو جنگلوں کی کٹائی کا ٹھیکے دار تھا اور اس کے باپ کا نام حیدر علی تھا۔''

''ہاں، ہاں۔۔۔ بابا جی بالکل وہی۔۔۔ بالکل وہی۔''

''مگر بیٹا۔۔۔! وہ اچھا آدمی نہیں تھا۔ بہت ہی برا آدمی تھا وہ۔''

''اچھا۔۔۔ مگر وہ تو آپ کی بہت تعریف کرتا تھا۔''

''کرتا ہوگا بدبخت کہیں کا۔ میں بھی اس وقت

اچھا انسان نہیں تھا بیٹے! بروں کے ساتھ رہنے والا اچھا انسان تو نہیں ہوتا مگر اس کے ساتھ مل کر کرنے والی برائیوں نے مجھے کبھی سکھ سے نہیں بیٹھنے دیا۔ میرا ضمیر مجھے آج تک ٹھوکریں لگاتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں بابا!"

"بس بیٹا! کسی کی برائی چھپی رہے تو بہتر ہے۔ کیا کرو گے پوچھ کر۔"

"میں تو اسے تلاش کر رہا تھا بابا! اس نے مجھے اپنے ساتھ کاروبار کرنے کی پیش کش کی تھی۔ آپ کے پاس میں اسی لیے آیا تھا کہ میں آپ سے اس کے بارے میں معلومات کروں۔" ہمایوں نے مایوس سے لہجے میں کہا۔

"کاروبار کی تو میں نہیں کہتا بیٹے! لیکن انسان کی حیثیت سے وہ بہت برا تھا۔ اس نے ایک ایسا گناہ کیا تھا جسے اللہ کبھی معاف نہیں کرے گا اور میں بدنصیب اس کے ساتھ تھا۔"

"بابا! مجھے اس کے بارے میں بتا دیں۔ بڑی مشکل سے میں آپ کو تلاش کر سکا ہوں۔ کیا آپ مجھے مایوس کر دیں گے۔"

"بتا دو بابا صاحب! بہت اچھے آدمی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میرے دوست بن گئے ہیں۔ بابا! اس زمانے میں کوئی بھی بڑا آدمی کسی چھوٹے آدمی سے دوستی کب کرتا ہے۔ یہ بہت ہی اچھے آدمی ہیں۔"

"ہاں ہاں، ٹھیک کہتے ہو۔ بابر علی میرا بھی دوست تھا۔ خدا جانتا ہے مجھے اُس وقت اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ وہ ٹھیکے دار تھا اور اس نے مراد شاہ کی بیٹی بجیلہ سے شادی کی تھی۔ اس وقت اس نے مجھے دوست بنا لیا تھا مگر مجھے اس کی نیت کا پتا نہیں تھا۔ میری کوشش سے سردار شاہ نے اپنی معصوم بیٹی کو اس کے نکاح میں دے دیا۔ وہ بہت خوش تھا اور اس نے میرا بہت شکریہ ادا کیا تھا۔ پھر جنگلوں کی کٹائی ختم ہو گئی اور بابر علی واپس جانے لگا۔ اس نے کوشش کی کہ لڑکی کو اپنے ساتھ لے جائے۔ اس دوران سردار شاہ مر گیا تھا۔ لوگوں نے ٹھیکے دار کو مجبور کر دیا کہ وہ بجیلہ کو ساتھ لے جائے۔ ٹھیکے دار بہت پریشان ہو گیا تھا۔ یہاں میں صرف اس کا دوست تھا۔ جس پر وہ اعتبار کرتا تھا۔ میں خود بھی اس سے بہت مانوس تھا۔ ایک شام اس نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ بہت پریشان تھا۔ اس نے اپنی پریشانی کی وجہ بتاتے ہوئے کہا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے۔ شہر میں اس کے بیوی بچے ہیں۔ ایک پورا خاندان ہے اور یہ خاندان اس کی دوسری شادی کو قبول نہیں کرے گا۔ اس نے مجھ سے گڑگڑاتے ہوئے کہا کہ یونس خان میری مصیبت آجائے گی۔ اتنے خوف ناک حالات میں گھر جاؤں گا جس کا تم تصور نہیں کر سکتے۔ میرا باپ حیدر علی بہت غصہ ور آدمی ہے۔ بہت ہی جلاد صفت ہے اور میرے اس کاروبار میں میرا بہت بڑا حصہ میری بیوی کی دولت کا ہے۔ سب کچھ ختم ہو جائے گا، میرے بچے مجھ سے چھن جائیں گے اور مجھے خودکشی کرنا ہوگی۔ اس بدبخت نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا کہ یونس خان اس وقت تم میرا واحد سہارا ہو جو میرے لیے کچھ کر سکتے ہو۔ میں بہت پریشان ہو گیا تھا بابو جی! میں نے اس سے کہا کہ ٹھیکے دار! سردار شاہ کی بیٹی باپ کی موت کے بعد بالکل بے سہارا ہو کر رہ گئی ہے۔ یہاں اس کا ساتھ دینے والا اور کوئی نہیں ہوگا۔ جس پر وہ بولا کہ میں اس کے لیے خرچہ بھیجتا رہوں گا۔ تم یہاں اس کی نگہداشت کی ذمے داری سنبھالو اور بے فکر ہو جاؤ۔ روپے پیسے کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی مگر میں نہیں مانا۔ میں نے کہا۔ میں نے کہا نہیں جی پوری بستی اس بات کا برا مانے گی کہ تم اسے خرچہ بھیجتے رہو بلکہ بات یہ ہے کہ ایسی بستیوں میں تم جیسے سرمایہ دار آتے رہتے ہیں۔ یہاں کی لڑکیاں خراب کرتے ہیں اور پھر لاتعداد کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ البتہ ایک کام تم چاہو اگر تو کرو۔" تب میں نے اسے ایک تجویز پیش کی اور وہ اس بات پر تیار ہو گیا کہ بجیلہ کو یہاں سے لے جائے لیکن وہ اسے اپنے گھر نہیں لے جائے گا بلکہ کسی اور

بستی میں اس کے قیام کا بندوبست کردے گا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ یونس خان تم بھی بستی چھوڑ دو اور اس کی گل رانی کی ذمہ داری سنبھال لو۔ میں نے اس بات پر رضامندی ظاہر کردی لیکن ٹھیکے دار کے دل میں بددیانتی تھی۔ وہ مجھے لے کر چل پڑا۔ سردار شاہ کی بیٹی بجیلہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ پھر ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جو بے حد سنسان تھی اور جہاں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے وہاں جا کر بجیلہ کو گولی ماردی صاحب! اس نے یہی فیصلہ کیا کہ بجیلہ کو قتل کر کے اس کی لاش یہاں جنگل میں پھینک دے۔ درندے اور مردہ خور اسے کھالیں گے اور اس طرح بجیلہ کی کہانی یہاں ختم ہوجائے گی لیکن قتل کرنے سے پہلے ٹھیکے دار بابر علی نے مجھ پر اپنے ارادے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ جب اس نے اسے گولی ماردی اور میں نے اس کا گریبان پکڑ لیا تو وہ میرے سامنے گڑگڑانے لگا۔ اس نے کہا کہ اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ ادھر میرا دل مجھے ملامت کررہا تھا۔ میں نے اس پر لعنت بھیجی لیکن صاحب جی! انسان انسان ہوتا ہے۔ بابر علی نے مجھے بہت بڑی رقم دی اور دولت کی چمک نے مجھے بھی اندھا کردیا۔ میں دل سے اس جرم میں شریک نہیں تھا لیکن ایک اتنی بڑی رقم مجھے ملی تھی جو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ چنانچہ میں نے زبان بند رکھ لی اور اس کے بعد میں نے ٹھیکے دار کی کہانی کسی کو نہیں سنائی۔ بابو جی! بہت بڑی رقم تھی وہ لیکن آہستہ آہستہ ختم ہوگئی اور پھر مجھے احساس ہوا کہ اس رقم کے عوض میں نے اپنی عاقبت خراب کرلی ہے۔ میں ایک ایسے جرم کا شریک کار بن گیا تھا جس میں میری مرضی شامل نہیں تھی۔ لیکن مجھے آج بھی سردار شاہ کا چہرہ نظر آتا ہے۔ وہ میرے خوابوں میں آتا ہے اور مجھ سے پوچھتا ہے کہ یونس خان تُو نے میری دوستی کا یہی صلہ دیا ہے۔ بس تم یہ سمجھ لو بابو جی! کہ اس کے بعد سے میرے دل میں ٹیسیں اٹھتی رہتی ہیں۔ کیا یاد دلا دیا تم نے آج مجھے۔۔۔ کیا یاد دلا دیا۔ وہ بڑا کمینہ انسان تھا۔ اس کے ساتھ کوئی بھی کاروبار تیرے لیے سودمند نہیں ہوگا۔ جو بندہ قاتل ہو، کسی کو اتنا بڑا دھوکا دے تو وہ کبھی اچھا آدمی نہیں ہوسکتا۔ تو اس کے ساتھ کاروبار کا ارادہ ختم کردے۔ میں نے یہ راز تجھے صرف اس لیے بتا دیا ہے کہ میرے پوتے نے تیری سفارش کی تھی، خدا مجھے معاف کرے، خدا مجھے معاف کرے۔۔۔"

ہمایوں کا پورا بدن شعلوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں، آگ ناچ رہی تھی۔ یونس خان نے اپنے آپ کو بے قصور ثابت کردیا تھا۔ لیکن وہ بھی اس ٹھیکے دار کے جرم میں برابر کا شریک تھا۔ ہمایوں اس کے بارے میں فیصلہ نہیں کرسکا کہ اسے اس کے ساتھ کیا کرنا چاہیے لیکن پھر بھی اس نے مصلحت سے کام لیا۔ اس نے کہا۔

"آپ نے میری بھرپور مدد کی ہے بابا صاحب! آپ کا احسان ہے مجھ پر۔ ٹھیک ہے اب میں اس شخص کے ساتھ کوئی کاروبار نہیں کروں گا۔ لیکن مجھے ایک بات بتایئے کہ کیا پھر وہ دوبارہ آپ سے نہیں ملا۔"

"کئی بار۔۔۔ کئی بار۔ وہ دلیر آدمی نہیں ہے۔ ابھی میرا خیال ہے چار سال پہلے ایک بار مجھ سے ملا تھا۔ یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ میں زندہ ہوں یا مرگیا۔ اسے اپنے جرم کا ڈر تو لگتا ہی ہوگا۔ کئی بار مجھے پیسے بھی بھجوا چکا ہے لیکن میں نے اس کے بعد اس کی مدد قبول نہیں کی، اسے ٹھکرا دیا لیکن دل میں یہ سوچا کہ زبان بند رکھوں گا، کیا فائدہ گڑھے مردے اکھاڑنے سے۔ سردار شاہ کی بیٹی مرچکی ہے۔ لاکھ لوگوں سے کہوں گا کہ میں اس کے جرم کا شریک نہیں تھا لیکن کون قبول کرے گا میری بات کو۔"

صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بابا غمزدہ ہوگیا ہے۔ کچھ لمحوں کے بعد ہمایوں نے پوچھا۔

"اب وہ کہاں رہتا ہے بابا صاحب!"

"شہر میں رہتا ہے بیٹے! بڑا سرمایہ دار ہوگیا

ہے اب تو۔ پہلے جنگلوں کے ٹھیکے لیا کرتا تھا، اب بڑے بڑے کاروبار کرتا ہے۔ حال کا تو معلوم نہیں لیکن پانچ سال پہلے جب وہ آیا تھا تو یہ شان دار لمبی گاڑی تھی اس کے پاس، دو ملازم بھی بیٹھے ہوئے تھے اور اس کی شکل ہی بدلی ہوئی تھی۔ اس وقت جب وہ ٹھیکے دار کی حیثیت سے آیا تھا اتنا زیادہ دولت مند نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن اب تو یوں لگتا ہے جیسے اس کے پاس دولت کے انبار لگے ہوں۔''

''کون سے شہر میں رہتا ہے؟''

''لاہور میں جی لاہور میں۔''

''یہ پتا ہے کس جگہ رہتا ہے؟'' ہمایوں نے پوچھا۔

''نہیں اتنا مجھے نہیں معلوم۔ لیکن پتا چل جائے گا۔ بابر علی کا نام وہاں مشہور ہے ایک سرمایہ دار کی حیثیت سے۔ اس کے باپ کا نام حیدر علی ہے۔ بس اتنا ہی مجھے معلوم ہے۔ سچ ہے یا جھوٹ، اللہ جانے۔''

''بہت بہت شکریہ بابا صاحب! بلاشبہ آپ نے اس کے جرم میں ساتھ دے کر بہت بڑا گناہ کیا تھا لیکن اگر اس گناہ نے آپ کے ضمیر کو بے چین کیا ہے تو آپ قابلِ معافی ہیں۔ آپ کا مسئلہ آپ کے اور خدا کے درمیان ہے۔''

پھیکے خاموشی سے وہاں کھڑا ہوا تھا۔

''چلو پھیکے! تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے مجھے دادا جی سے ملا دیا۔''

''کمال ہو گیا بابو جی! ہمیں تو معلوم ہی نا تھا کہ آپ جسے ساری بستی میں تلاش کرتے پھر رہے ہیں وہ ہمارا ہی دادا ہے۔ چلو ٹھیک ہے۔ ہم آپ کے کام آئے، آپ ہمارے کام آجانا بابو جی!''

''ہاں، ہاں پھیکے۔۔۔! بتاؤ میں تمہارے کس کام آسکتا ہوں؟''

''بس جی ایک بار ہیرو کا چانس دلوا دو، اپنی تو یہی آرزو ہے۔'' پھیکے نے کہا اور ہمایوں مسکرانے لگا۔

''کاش! میں تمہارے لیے کوئی فلم بنا سکتا، ایسا ہوتا پھیکے! تو میں تمہیں اپنی فلم میں ہیرو کا چانس دیتا۔''

''جب بھی وقت آئے اور آپ فلم بنائیں تو پھیکے کو نہ بھولیں۔'' پھیکے نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ رحیمو کی سرائے پہنچ گیا۔ ہمایوں کا اب یہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ وہ اپنی جس مہم پر نکلا تھا اس میں پہلے مرحلے پر کافی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ بابر علی اس کے ذہن پر نقش ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لاہور میں اسے تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔ اب یہاں سے واپسی کے سوا اور کوئی ضرورت نہیں تھی۔

غرض یہ کہ وہ واپس چل پڑا اور نور پورہ سے بستی نورالٰہی پہنچ گیا۔ رمضان بابا، جنت اور بجیلہ بہت ہی خوش تھے اسے دیکھ کر۔ سب نے خوشی کا اظہار کیا تھا اور جنت حسبِ معمول ہنسنے لگی تھی۔

''تیرے دانت توڑنے پڑیں گے جنت! ہنستے ہوئے تیرے سارے دانت منہ کے دہانے سے باہر نکل آتے ہیں کہ لگتا ہے کاٹنے کو دوڑے گی۔''

''واہ ہمایوں بھیا! ہم آپ کو کیوں کاٹیں گے۔ چلیں آپ آگئے جلدی سے بتائیے کہاں گئے تھے۔''

''بس تیرے لیے کوئی بے وقوف سا لڑکا تلاش کرنے گیا تھا جس سے جلد از جلد تیری شادی کر کے اس مصیبت کو دور کر دیا جائے۔'' ہمایوں نے کہا اور جنت کی آنکھوں میں عجیب سے خواب لہرا گئے۔ اس نے گل نور، نبیلہ اور ثریا سے ایک شرط پر تعاون کا وعدہ کیا تھا لیکن اب تو ان کے ہاں سے چلی ہی آئی تھی خیر اب اس کا بھیا موجود تھا۔ اس نے سوچا کہ اس خوب صورت اور جوان سے بھیا سے بھی نہ کبھی اپنے دل کا حال کہہ دے گی اور اپنی منزل پالے گی۔۔۔ لیکن اس کے لیے ابھی وقت درکار تھا۔

(جاری ہے)

بالواسطہ

راجپوت اقبال احمد

یادیں بڑی قاتل ہوتی ہیں۔۔۔۔
زندگی کے آخری لمحوں تک
انسان یادوں سے دامن نہیں بچا
پاتا اور یہی یادیں بعض اوقات
عذابِ جان ثابت ہوتی ہیں۔

ایک ایسے شخص کا المیہ جس سے تقدیر کے جینے کا سہارا چھین لیا تھا

"**ٹریبل** اسکاچ۔ جلدی پلیز!"

آواز سنتے ہی میں نے نظر اٹھا کر دیکھا میں اُس وقت واٹرلو اسٹیشن کے ریفریشمنٹ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ جنگ کے بعد وہ پہلا موسم سرما تھا۔ میں نے اسے چار سال سے نہیں دیکھا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اُس مخصوص لہجے میں ٹریبل اسکاچ طلب کرنے والا وہی ہو سکتا تھا۔

جہاں میں بیٹھا تھا وہاں سے اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک پُرانا سا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اُس کے سر پر ہیٹ تھا اور پَیروں میں تازہ پالش کیے ہوئے چمک دار جوتے!

"کیا کُہر کم ہو رہی ہے جناب؟" بارمیڈ نے اُس کے گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے کہا۔

اُس نے سر ہلایا اور ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے اُتار کر بولا۔ "نہیں موسم مزید خراب ہوتا جا رہا ہے۔ اُنھوں نے بتایا ہے کہ میری ٹرین کم از کم ایک گھنٹہ لیٹ ہے۔"

بارمیڈ مُڑی اور اپنے عقب میں دیوار گیر کلاک دیکھنے لگی۔ نو بج کر پینتالیس منٹ ہوئے تھے۔ اُس نے ایک اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈالی اور میں با آہستگی اپنی کرسی سے اُٹھ گیا۔ میری دائیں ٹانگ میں پھر درد ہونے لگا تھا۔ جب میز کا کونا اُسی ٹانگ سے ٹکرایا تو میں کراہ کر رہ گیا۔

وہ آدمی مُڑا، نظریں ٹکرائیں اور پھر وہ مجھے بغور دیکھنے لگا۔

"ٹیڈ ہیروکس!" میں حیرت سے چلایا۔ میں بھول گیا کہ ایولین گھر پر میرا انتظار کر رہی تھی۔ ٹیڈ کو خلافِ توقع وہاں دیکھ کر میرے ذہن سے یہ بھی نکل گیا کہ کُہر پڑنے اور دیر ہو جانے کی وجہ سے ایولین پریشان ہو گی۔ میں لنگڑاتا ہوا اُس کی طرف بڑھا۔ میں قریب پہنچا تو اُس کی نگاہ میری نگاہ سے ٹکرائی، پھر اُس نے سر ہلا دیا۔

"ہیری!" وہ بولا۔ "میں تو تمھیں پہچان بھی نہیں سکا۔ تم بوڑھے اور کسی قدر موٹے نظر آ رہے ہو!"

"اِس ٹانگ کی وجہ سے!" میں نے کہا۔ "نارتھ افریقہ میں زخمی ہونے کے بعد سے اِس کی حالت اور بگڑ گئی ہے۔ اِس کی وجہ سے میں ورزش بھی نہیں کر سکتا۔ اِسی کی وجہ سے یہ موٹاپا ہے۔"

"بڑا افسوس ہوا۔" اُس نے اظہارِ غم کیا۔

"تم سناؤ کیا حال ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہمیشہ کی طرح خوش قسمت؟ تم کافی چاق و چوبند نظر آ رہے ہو۔" وہ ایسا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ سوائے دو لکیروں کے جو اُس کے مُنہ پر بن رہی تھیں۔ کانوں پر سے اُس کے بال بھورے ہوتے جا رہے تھے۔ ہم ایک چھوٹے سے قصبے میں ساتھ ساتھ اسکول جایا کرتے تھے فوج سے نکالے جانے سے پیشتر ہم ساتھ ہی تھے۔ پھر اُس کے بعد نہ میں نے اُسے دیکھا تھا اور نہ ہی اُس کے بارے میں سنا تھا۔

اُس نے ایک لمحے تک میری آنکھوں میں جھانکا، اپنا گلاس ختم کیا اور جذباتی آواز میں بولا۔ "شاید تم سالوں تک جرمن قید خانے میں رہنے کو خوش قسمتی کہہ رہے ہو؟"

گلاس رکھتے ہوئے اُس کا ہاتھ ذرا سا لرزا۔ میں نے بارمیڈ سے اُسے دوبارہ بھرنے کے لیے کہا۔ اپنے لیے میں نے دوسری رَم اور لائم جوس کا آرڈر دے دیا۔ "مجھے افسوس ہے ٹیڈ!" میں نے معذرت چاہی۔ "مجھے یقین ہے کہ وہ جگہ تمہارے لیے جہنم رہی ہو گی۔" میرا مطلب صرف یہ تھا کہ قید ہونے سے قبل وہ بہت خوش قسمت تھا۔ اسکول کے زمانے میں وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے کھیلوں میں بھی نمایاں حیثیت کا حامل تھا۔ کھیلوں کا شوقین ہونے ہی کی وجہ سے اُسے فوج میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

میرے سمندر پار جانے سے پہلے ایک دن وار آفس کو معلوم ہوا کہ ٹیڈ ہیروکس فرانسیسی، جرمن اور اطالین بڑی روانی سے بول سکتا تھا چنانچہ اُسے کسی نامعلوم مقام پر ایک ایسے کام سے روانہ کر دیا گیا جسے

وہ کسی پر بھی آشکار نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جانے سے پہلے اُس نے اپنے نئے فرائض کے بارے میں خوشی کا اظہار کیا تھا۔

''چیئرز!'' وہ اپنا دوسری بار بھرا ہوا گلاس اُٹھا کر بولا اور ایک بڑا سا گھونٹ بھرا۔ ''تو تمہاری ٹانگ میں خرابی رہ ہی گئی؟''

''دوسروں کا مجھ سے بھی بُرا حال ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم آج کل کیا کر رہے ہو؟''

''مڈلینڈ کے ایک کالج میں زبانیں پڑھا رہا ہوں۔''

''اس شہر میں گھومنے آئے تھے کیا؟''

''نہیں! ایک ذرا سا نامکمل کام رہ گیا تھا، اُسے مکمل کرنے آیا تھا اور تم؟''

''میں اب یہیں رہتا ہوں، روزانہ مضافات سے اپنے ہیڈ آفس آتا ہوں۔''

''تمہارا ہیڈ آفس؟''

''ہاں میں نے یہی کہا ہے۔ تمہیں وہ چھوٹا سا گیرج یاد ہے جہاں میں اسکول چھوڑنے کے بعد مکینک کا کام سیکھنے جایا کرتا تھا؟ اسپتال سے نکل کر جب فوج نے مجھے ناکارہ کردیا تو میں نے وہ گیرج خرید لیا تھا۔ میں نے اُسے ورک شاپ میں تبدیل کردیا ہے۔ مجھے فضائیہ سے کچھ ٹھیکے مل جاتے ہیں اور کچھ میں اپنے تجربات کرتا رہتا ہوں۔''

''تمہاری فرم کا نام کیا ہے؟''

''مڈ ٹاؤن انٹر پرائزز لمیٹڈ! میں نے پُرانے گیرج کو وسیع کرلیا ہے۔ اب وہاں ڈھائی سو آدمی کام کرتے ہیں۔ اگلے ہفتے میں جنوب مشرقی ساحل پر ایک فیکٹری کھولنے والا ہوں۔''

''مبارک ہو! مگر تم جیسا آدمی ریلوے ریفریشمنٹ روم میں وقت کیوں ضائع کر رہا ہے؟ کیا تم بھی میری طرح کہر گرفتہ ہو؟''

''نہیں! میں جنوب مشرق کے طویل اور تھکا دینے والے سفر سے آرہا ہوں۔ میری ٹانگ میں درد بڑھ گیا تھا اِس لیے یہاں ذرا آرام کرنے اور ایک گلاس پینے کے لیے رُک گیا تھا۔ یہاں سے مضافات تک میری اپنی گاڑیاں چلتی ہیں۔''

''کیا تم نے شادی کرلی؟''

''اوہ..... وہ.....''

ٹیڈ میرا جواب سننے سے پہلے ہی ہنس پڑا اور اچانک وہ پہلے والا ٹیڈ نظر آنے لگا۔ خوش مزاج، زندہ دل اور لاپروا! اُس کے چہرے کی کی لکیریں نرم پڑگئیں اور آنکھوں میں چھائی ہوئی سنجیدگی ہَوا ہوگئی۔ اُس نے اپنا گلاس اُٹھایا اور مُنہ سے لگالیا۔ پھر گھونٹ بھرنے کے بعد کہا۔ ''تمھیں معذرت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اولڈ بوائے! کون ہے وہ؟''

میرا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ ''جو تم سوچ رہے ہو وہ بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں اسپتال سے آنے کے بعد اُس سے ملا تھا اور پھر وہ میری سیکریٹری بن گئی۔''

ٹیڈ شرارت سے ایک آنکھ بند کرکے مسکرادیا۔ پھر بولا۔ ''ہاں! کاروبار کے ساتھ ساتھ اگر صحبتِ خوباں بھی میسر آجائے تو کیا مضائقہ ہے!''

''تم بھی خوب آدمی ہو! پہلے پوری بات تو سُن لو! میں حقیقتاً اُس سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر وہ آزاد نہیں ہے۔ اُس کا شوہر اُس سے جُدا ہوگیا ہے جس کے بارے میں اُسے پتا نہیں کہ کہاں ہے!''

''تمہاری خاطر یہ اُمید کی جاسکتی ہے کہ وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔''

''میں اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔'' میں نے مختصراً کہا۔ ریفریشمنٹ روم اچانک ہی مجھے گرم محسوس ہونے لگا۔ میں نے اپنا ہیٹ اور دستانے اُتار کر بار کاؤنٹر پر رکھ دیے۔ ٹیڈ کی نظر میرے بائیں ہاتھ پر پڑی۔

''یہ انگوٹھی؟'' وہ بولا۔

''پسند آئی؟'' میں نے اپنا ہاتھ اُس کے سامنے کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ ایک غیر معمولی انگوٹھی ہے۔'' اُس نے شراب کے لیے مزید آرڈر دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں! اِس طرح کی ہزاروں انگوٹھیاں ہوں گی اور یہ زیادہ قیمتی بھی نہیں ہے۔''

''دراصل یہ انگوٹھی دیکھ کر مجھے وہ میجر یاد آ گیا جو ہمارے ساتھ آخری جرمن قید خانے میں تھا۔ اُس کے پاس بھی اِس سے ملتی جلتی ایک انگوٹھی تھی۔ بڑا اچھا آدمی تھا وہ! اتنا اچھا کہ اُس کے ساتھ جرمنوں کا سلوک دیکھ کر میرا دل جلتا تھا۔''

''جرمن؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا وہ اُس کے ساتھ بُرا برتاؤ کرتے تھے؟''

ٹیڈ نے سر ہلا دیا۔ اُس کے چہرے کی لکیریں پھر گہری ہوگئی تھیں اور آنکھوں میں اُداسی تیرنے لگی تھی۔ ''ایک طرح سے یہ میری بھی غلطی تھی۔'' وہ بولا۔ ''ایک گارڈ، کتے کا بچہ ہمارے کیمپ کا چکر لگاتے وقت ہمیں طرح طرح کی باتیں سُنایا کرتا تھا تاکہ ہم جواباً کچھ کہیں تو اُسے ہمیں ٹھوکریں مارنے کا بہانہ ہاتھ آجائے۔ ایک دن اُس نے چلّا کر فرش سے کوئی چیز اُٹھانے کا مجھے حکم دیا اور جب میں جُھکا تو میرے مُنہ پر ٹھوکر ماری، پھر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔'' ٹیڈ نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ ''میں گر پڑا، پھر سنبھل کر اُٹھا اور اُس کی طرف جھپٹا۔ اُس نے ذرا سا ہٹ کر ایک اور ٹھوکر ماری۔ مجھ میں اِتنی جان نہیں تھی کہ اُس سے لڑسکتا۔ مجھے برداشت سے کام لینا چاہیے تھا مگر بس غلطی ہوگئی تھی اور میں دوبارہ اُس کی ٹھوکر کھا کر زمین چاٹ رہا تھا۔ پھر تو اُس نے مسلسل میری پسلیوں پر ٹھوکروں کی برسات کردی۔ اِس کے ساتھ ساتھ وہ قہقہے بھی لگاتا جارہا تھا۔ ہر ٹھوکر کے ساتھ میرا دَم نکل نکلا جارہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اگر ذرا دیر اور یہی حال رہا تو سچ مچ میرا دَم نکل جائے گا۔ اُسی وقت میجر آ گیا۔ اُس نے کونے میں پڑی ایک لکڑی اُٹھائی اور پوری قوت سے گارڈ کے سر پر دے ماری۔ مجھے لڑکھڑاتے ہوئے گارڈ کے چہرے پر بکھری ہوئی حیرت اب تک یاد ہے۔ گارڈ بے ہوش ہوگیا تھا۔ مجھے بڑا سکون ملا مگر میری یہ خوشی بہت مختصر ثابت ہوئی۔ میں ابھی فرش سے اُٹھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ دو تین گارڈز اندر آ گئے اور پوچھنے لگے کہ اُن کے ساتھی کا سر کس نے پھاڑا تھا! میجر نے ہم سب کو سزا سے بچانے کے لیے فوراً ہی الزام اپنے سر لے لیا۔'' ٹیڈ نے ایک گھونٹ لیا اور آنکھیں بند کرلیں جیسے اُس تلخ یاد سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہو۔ پھر اُس نے آہستہ سے پلکیں اُٹھائیں اور مدھم لہجے میں دوبارہ بولنے لگا۔ ''گارڈز، میجر کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ وہ ساری رات اور سارا دن ہم سے الگ رہا۔ دوسرے دن صبح وہ اُسے ہماری کوٹھری میں لائے اور ہماری عبرت کے لیے اُسے ایک کونے میں ڈال کر چلے گئے۔ جب وہ ذرا ہوش میں آیا تو ہمیں بتایا کہ گارڈز اُسے مسلسل سزائیں دیتے رہے تھے۔ تین ہفتے کے بعد وہ اِس قابل ہوسکا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر ذرا دُور چل سکے۔ میں شرمندہ تھا کیونکہ میری ہی وجہ سے میجر کو اُس اذیت سے گزرنا پڑا تھا۔ جب کبھی میں میجر سے معذرت کرنے کی خاطر لب کھولتا تو وہ مجھے ٹوک دیتا اور کہتا کہ وہ خود اُس کی غلطی تھی۔ اُسے دخل نہیں دینا چاہیے تھا۔ وہ یقیناً یہ جانتا تھا کہ جرمن دوسرے قیدیوں کے مقابلے میں ہم دونوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔'' ٹیڈ تلخی سے ہنس پڑا۔

''اُس میجر کا کیا ہوا؟'' میں نے تھرّاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''کیا وہ بالکل ٹھیک ہوگیا؟''

''جسمانی طور پر!'' اُس نے جواب دیا۔ ''مجھے اور میجر کو اُنھوں نے ایک ہی کوٹھری میں بند کردیا تھا جس کے سبب ہمارے درمیان مزید قربت ہوگئی۔ میجر نے پہلی بار مجھے اپنی بیوی کے بارے میں بتایا۔ وہ اُس عورت کو پوجا کی حد تک چاہتا تھا۔ اُس نے اپنی بیوی کو برسوں سے نہیں دیکھا تھا پھر بھی اُس کے بارے میں سوچتا رہتا تھا اور اُسی کے خواب دیکھتا تھا۔ اُس انگوٹھی کے علاوہ جو اُس کی بیوی نے میجر کو دی تھی، میجر کے پاس اُس کی ایک تصویر بھی تھی۔ میجر وہ تصویر مجھے اکثر دکھایا کرتا تھا اور بڑی چاہت سے اپنی بیوی کا تذکرہ کرتا تھا۔ پھر اچانک اُس نے اپنی

وہ کبھی کا تذکرہ کرنا ترک کردیا۔ وہ چڑچڑا ہوگیا اور مجھے بھی نظر انداز کرنے لگا۔ میں ابتدا میں یہ سمجھا کہ قید اُس کے اعصاب پر اثر انداز ہوگئی ہے اِس لیے مجھے اُس کی تلخ کلامی پر ذرا بھی غصہ نہیں آیا مگر مجھ سے اُس کی وہ حالت نہیں دیکھی جاتی تھی کیونکہ کیمپ میں وہی میرا بہترین دوست تھا۔ میں نے ایک دو ہفتے اُس سے کوئی بات نہیں کی، پھر جب مجھ سے تنہائی برداشت نہ ہوسکی تو میں اُس کے پاس گیا اور اُس کی مدد کرنے کے لیے کہا۔ اُس وقت وہ پتھر کے بت کی طرح تاروں کے پار خلا میں گھور رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ چند ہفتے پیشتر اُسے ایک خط ملا تھا۔ میں نے اُس سے دریافت کیا کہ کیا اُسے کوئی بُری خبر ملی تھی۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا اور ساکت کھڑا رہا مگر جب میں چلنے لگا تو اُس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک مڑا تڑا سا کاغذ نکال کر میری طرف اچھال دیا۔ اُس نے مجھ سے وہ کاغذ پڑھنے کے لیے کہا۔ وہ ایک مختصر اخط تھا مگر میں نے اُس سے زیادہ ظالمانہ اور خود غرضانہ تحریر کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ میجر کی بیوی کا خط تھا۔ وہ اُس عورت کا خط تھا جسے میجر پوجتا تھا اور جس پر وہ انتہائی اعتماد کرتا تھا۔ وہ اُس عورت کی یاد ہی تھی جو جیل کے تاریک ترین لمحات میں میجر کے دل میں آزادی کی شمع روشن کیے ہوئے تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اُسے اپنی بیوی سے اتنی محبت نہ ہوتی تو وہ بھیانک اذیتوں کی وجہ سے پاگل ہوجاتا یا مرجاتا۔ اُس عورت نے لکھا تھا کہ اُس کی جوانی اور حسن ضائع ہورہے تھے۔ وہ حکومت سے ملنے والے الاؤنس میں بڑی مشکل سے گزارہ کررہی تھی اور اب وہ میجر کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی ہورہی تھی۔'' یہ کہہ کر ٹیڈ نے ایک طویل سانس لیا اور خاموش ہوگیا۔

کچھ دیر تو میں نے اُس کی خاموشی کو برداشت کیا مگر زیادہ دیر اپنے تجسس کو نہ دبا سکا۔ ''پھر کیا ہوا؟'' میں بولا۔

''میں نے وہ خط میجر کو واپس کردیا۔'' ٹیڈ نے جواب دیا۔ ''میں اُسے تسلی بھی نہ دے سکا۔ آخر میں اُس سے کہتا بھی کیا! اُس کے بعد میں میجر سے کترانے لگا۔ میں اُس کے چہرے پر بکھرے کرب کو دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ وہ کسی زندہ لاش کی طرح چلتا پھرتا تھا۔ وہ مشینی انداز میں کھانا کھاتا اور کسی سے بھی بات نہیں کرتا تھا۔ اب ہم دونوں کو دوبارہ کوٹھری سے نکال کر دوسرے قیدیوں کے ساتھ بیرک میں بھیج دیا گیا تھا۔ پھر ایک رات خبر آئی کہ صبح ہمیں کسی دوسرے کیمپ میں منتقل کیا جارہا تھا۔ کافی عرصے سے یہ خبریں سننے میں آرہی تھیں کہ مشرقی محاذ پر ہماری قوت بڑھتی جارہی تھی۔ اِس کا ثبوت یہ تھا کہ گارڈز کا سلوک ہمارے ساتھ بہتر ہوتا جارہا تھا مگر میجر کا حال جوں کا توں رہا۔ اُس پر خبر کا ذرا بھی اثر نہیں تھا۔ اُس رات وہ کئی ہفتے بعد مجھ سے بولا۔ اُس نے مجھے اپنا بٹوا دیا جس میں اُس کی بیوی کا فوٹو اور کچھ ذاتی کاغذات تھے۔ اُسے توقع تھی کہ مجھے جلد ہی قید سے رہائی نصیب ہوجائے گی۔ اُس کی خواہش تھی کہ میں وہ کاغذات اور تصویر اُس کی بیوی تک پہنچا دوں جس کا پتا کاغذات میں موجود تھا۔ مجھے اُس کے رویّے پر حیرت تھی کیونکہ جنگ ختم ہونے کی صورت میں خود اُسے بھی رہا کردیا جاتا، پھر آخر وہ مجھے اپنی بیوی کے پاس کیوں بھیجنا چاہتا تھا۔ میں نے یہ سوال اُس سے بھی کیا۔ جواب دینے کے بجائے اُس نے اپنا ہاتھ اُٹھا دیا۔ ''گڈلک!'' وہ بولا۔ ''تم سے ملنا بہت اچھا رہا!'' میں بھی چپ ہوگیا۔ مجھے حیرت ہورہی تھی کہ کہیں وہ پاگل تو نہیں ہوگیا تھا۔ تم جانتے ہو ایسے حالات میں بعض لوگ ہوش وحواس کھو بیٹھتے ہیں اور میجر کے ساتھ تو وہ گزری تھی کہ اُسے پہلے بہت پہلے دیوانہ ہوجانا چاہیے تھا۔ دن نکلنے پر گارڈز نے ہمیں کوٹھریوں سے نکال کر موٹر لاریوں کے پاس لا کھڑا کیا۔ میں میجر کے پیچھے تھا۔ جیسے ہی ہم لوگ گیٹ سے نکلے وہ اچانک سڑک پر بھاگ لیا اور پھر جھاڑیوں میں گھس گیا۔ وہ محض خودکشی تھی اور میجر کا مقصد یہی تھا۔ کئی گارڈز کی رائفلیں اُس طرف

مڑیں اور انھوں نے فائر کھول دیا۔ میجر بچا اس گز بھی نہیں گیا تھا کہ گولیاں کھا کر گرا اور مر گیا۔ گارڈز نے میجر کی لاش وہیں چھوڑ دی اور لاریوں میں سوار ہو گئے۔ انھیں شاید کیمپ چھوڑنے کی جلدی تھی۔ فرار ہوتے وقت گولی ماردی گئی، پرانا فارمولا، مگر اس بار یہ غلط نہیں تھا۔ میجر نے واقعی فرار ہونا چاہا تھا مگر جرمنوں سے نہیں! اُس ذلیل عورت نے میجر کو قتل کیا تھا، بالکل اسی طرح جیسے خود اُس نے ٹریگر دبایا ہو۔'' ٹیڈ نے گلاس ختم کر کے اُسے باآہستگی رکھ دیا۔

''کیا تم نے بھی وہ فوٹو اور بٹوا اُسے واپس کیا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''یہی وہ نامکمل کام تھا جس کے لیے میں یہاں آیا تھا۔'' وہ سر ہلا کر بولا۔ پھر ایسا لگا جیسے اب وہ کچھ نہیں بولے گا۔ اب باقی بچا بھی کیا تھا۔ یہ جنگ کے بے شمار المیوں میں سے ایک المیہ تھا۔

''میرے خیال میں ہمیں اُٹھنے سے پہلے ایک ایک جام اور مل جائے گا!'' میں نے بارمیڈ سے کہا جو ابھی ہمارے قریب آ کر کھڑی ہوئی تھی۔

''افسوس جناب! وقت ختم ہو چکا ہے۔'' وہ بولی۔

ہمارے علاوہ وہاں صرف ایک نوجوان سیاہی اور تھا۔ اُس نے اپنا تھیلا کندھے سے لٹکایا اور رائفل پکڑ کر وہاں سے چلا گیا۔

''ہمیں بھی اب چلنا چاہیے!'' میں نے ٹیڈ سے کہا۔

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہیٹ کو نیچے کھسکا کر وہ مڑا ہی تھا کہ دو بھاری بھرکم آدمی اندر آ گئے۔

''مجھے افسوس ہے جناب عالی!'' بارمیڈ اُن سے بولی۔ ''وقت ختم ہو گیا ہے۔ ہم بار بند کر رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے!'' اُن میں سے ایک بولا۔ ''ہمیں پینے کے لیے کچھ نہیں چاہیے اور نہ ہی ہم تمہارا وقت ضائع کریں گے۔'' پھر ٹیڈ کی طرف مڑا۔ ''بس پولیس آفیسر ہوں اور آج رات ٹیڈنگٹن میں ہونے والے ایک عورت کے قتل کی تفتیش کر رہا ہوں۔ بہتر ہوگا کہ تم ہمارے ساتھ یارڈ تک چلو ہمیں تم سے کچھ سوالات کرنے ہیں اور میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ.....''

''نہیں!'' ٹیڈ چلایا اور پولیس افسر کا اُٹھا ہوا ہاتھ جھٹک کر کرسی پھلانگتا ہوا دروازے کی طرف بھاگا مگر ابھی وہ آدھے راستے ہی میں تھا کہ پولیس افسر کے ساتھی نے اُسے پکڑ لیا۔ ذرا سی جدوجہد کے بعد اُنھوں نے اُسے ہتھکڑی پہنا دی اور اُس کے کوٹ کی جیب میں سے ایک ریوالور نکال لیا۔

میں نے کاؤنٹر سے اپنا ہیٹ اور دستانے اُٹھا لیے پھر ٹیڈ کی طرف دیکھ کر حیرت سے کہا۔ ''تم نے..... اُسے.....''

''ہاں میں نے ہی اُسے قتل کیا ہے۔ وہ میجر کی بیوی تھی اور اسی کی مستحق تھی۔''

''مگر تم نے..... تم نے خوامخواہ ہی خود کو قربان کر دیا۔'' میں چلایا۔ ''بقول تمہارے اب تو اُس نے ایک اور شکار پھانس لیا تھا۔''

اُس نے کندھے جھٹک دیے اور بولا۔ ''اِس قسم کی عورتیں ہمیشہ کامیاب شکار کرتی ہیں مگر کچھ بھی ہو، اب وہ مزید شکار کرنے کے قابل نہیں رہی۔''

''مگر آخر تم نے اُسے کیوں قتل کیا؟'' میں نے پوچھا۔ ''جو کچھ اُس نے کیا وہ ناقابلِ معافی تھا لیکن تمہارا اِس معاملے سے کیا تعلق تھا؟''

ٹیڈ نے بڑی بے تابی سے اپنا سر دائیں بائیں ہلایا۔ ''تم شاید قید کے دوران میں ایسے احساسات سے نہیں گزرے۔ تم وہاں ایسی چیزیں سیکھ سکتے ہو جو آزاد رہ کر تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہ چیزیں جو وفا شعاری اور برادرانہ جذبات سے تعبیر کی جاتی ہیں۔''

''مگر تم اُس عورت کو قتل کر کے میجر کی کیا مدد کر سکتے تھے؟ وہ تو پہلے ہی مر چکا تھا۔ وہ عورت اب اُسے کیا تکلیف پہنچا سکتی تھی؟''

''تم نہیں سمجھ سکتے!'' وہ بولا۔ اُس کا انداز ناصحانہ تھا جیسے وہ کسی بچے کو کوئی مشکل بات سمجھانے

وہ کرنا کوشش کر رہا ہو۔" میں نے جب میجر کو کھیت میں گولی کھا کر گرتے دیکھا تھا تو قسم کھائی تھی کہ اُس عورت کو ڈھونڈ کر میجر کی موت کا انتقام ضرور لوں گا۔ وہ عورت قانون کے ہاتھوں سے دُور تھی مگر انصاف سے دُور نہیں تھی، میرے انصاف سے!"

"تم پاگل ہو۔" میں چلایا۔

"اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو میں تمہیں اپنی صفائی میں بطور گواہ پیش کرنا چاہوں گا۔ اگر تم عدالت میں یہ ثابت کر سکے اور لوگوں کو یقین دلا سکے تو میں دیوانگی کی بنیاد پر آزاد کیا جا سکتا ہوں۔" پھر وہ پولیس افسران کی طرف مڑا۔ "تم لوگ اتنی جلدی مجھ تک کیسے پہنچ گئے؟"

وہ پولیس افسر جو ٹیڈ سے پہلی بار مخاطب ہوا تھا بولا۔ "نچلے فلیٹ میں جو عورتیں رہتی ہیں وہ ایک پولیس والے کی بیوی ہے۔ اُس کا شوہر ڈیوٹی پر تھا۔ اُس نے پستول چلنے کی آواز سنی، پھر تمہیں وہاں سے نکلتے ہوئے دیکھا تو ریلوے اسٹیشن تک تمہارا تعاقب کیا۔ جب تم واٹرلو والی گاڑی میں سوار ہوئے تو وہ بھی تمہارے برابر والے ڈبے میں بیٹھ گئی، پھر اُس نے ہمیں ٹیلی فون کر دیا۔"

"تو یہ مسئلہ تھا!" ٹیڈ تلخی سے بولا۔

"عورت کو گولی مارنے کے بعد اُس کی لاش کے پاس تم صرف یہ چھوڑ آئے تھے۔" پولیس افسر نے اپنی جیب سے ایک مڑا تڑا سا پرانا فوٹو نکال کر سامنے کر دیا۔

میں نے ذرا آگے بڑھ کر وہ فوٹو دیکھا اور پھر میرے مُنہ سے چیخ نکل گئی۔ "نہیں!"

ٹیڈ اور دونوں پولیس آفیسر میری طرف مڑے۔ اُن کے چہروں پر حیرت تھی۔ میں نے اُنھیں حقیقتِ حال سے آگاہ کرنا چاہا مگر آواز میرے گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اُنھیں کیسے بتاؤں کہ بالکل ویسا ہی ایک فوٹو میرے دفتر کی میز پر سجا ہوا تھا جس پر لکھا تھا۔

"ایولین کی طرف سے، انتہائی پیار کے ساتھ!"

ہنسی علاجِ غم ہے

ایک پروفیسر اپنی عینک گھر بھول آیا۔ بازار میں ایک پوسٹر چسپاں دیکھ کر ایک پاس کھڑے آدمی سے دریافت کیا۔

"جناب اس پوسٹر میں کیا لکھا ہے ذرا پڑھ تو دیجیے۔"

وہ آدمی بولا۔ "حضرت افسوس پڑھ نہیں سکتا۔ بدقسمتی سے میں بھی آپ کی طرح اَن پڑھ ہوں۔"

☆☆☆

جھگڑے کے دوران بیوی نے شوہر کو تھپڑ مارا، شوہر کہنے لگا۔

"تم نے یہ تھپڑ مجھے مذاق میں مارا ہے یا سیریس ہو کر؟"

بیوی نے کہا۔ "سیریس ہو کر۔"

یہ سن کر شوہر کہنے لگا۔ "پھر ٹھیک ہے، ایسا مذاق مجھے بالکل پسند نہیں۔"

☆☆☆

بیوی: "میرا بھائی ایک بدمزاج لڑکی سے شادی کر رہا ہے۔ آپ ہی اسے منع کریں۔"

شوہر: "میں کیوں کروں؟ کیا اس نے مجھے اس وقت منع کیا تھا، جب میں تم سے شادی کرنے والا تھا۔"

☆☆☆

ایک فلم ڈائریکٹر نے ایک فلم کے لیے بہت سے ایکسٹرا لڑکے رکھ لیے۔ پروڈیوسر نے گھبرا کر پوچھا۔

"آپ نے اتنے ایکسٹرا لڑکے رکھ لیے ہیں، ان سب کے اخراجات کون برداشت کرے گا؟"

ڈائریکٹر نے جواب دیا۔ "فکر نہ کریں ہم فائٹ کے آخری سین میں اصلی گولیاں استعمال کریں گے۔"

چوہے

احمد جاوید

آج سائنس دان کو پہلی بار تاسف ہوا اور اس نے خیال کیا تھا کہ سیکھنے والے چوہے جو کچھ سیکھتے ہیں' اپنے اوپر تجربہ کرنے والوں کے لیے سیکھتے ہیں' اپنے لیے کچھ بھی نہیں اور اس نے یہ بھی خیال کیا کہ چوہے کو معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ ایسا بھی ہوگا۔ اسے معلوم ہوتا تو شاید وہ آہستہ آہستہ سیکھتا اور کبھی اپنے علم کو مکمل نہ ہونے دیتا.....!

ادب سے انتخاب۔۔۔ ایک فکریہ تحریر

وہ چوہے جو اپنے بل سے پنیر کی بُو پا کر نکلے تھے اور ادھر ادھر منڈلاتے پھرتے تھے۔ اس چوہے سے بے خبر تھے جو لیبارٹری کی میز پر ایک آہنی پنجرے میں سائنسدان کے تجربے کا منتظر تھا۔

وہ بلی جو غراتی پھرتی تھی' کمرے کے اندر داخل ہونے میں ناکام تھی۔ وہ ایک سوراخ سے بار بار اندر جھانکتی اور بار بار پلٹتی اور چوہے جو تجربہ گاہ کے اکھڑے ہوئے فرش کے ایک بل میں آباد تھے چوروں کی طرح باہر نکلتے' زمین سونگھتے اور ڈر کر پلٹ جاتے۔

بل سے نکلنے والے چوہوں کے لیے کمرے کی زمین ایک دور تک پھیلی ہوئی وسیع کائنات تھی مگر خطروں سے بھری ہوئی..... بلی کی خشمگیں نگاہیں ہی ایک عتاب نہیں ہوتا اور بھی کئی ان دیکھے اندیشے ہیں جو چوہوں کو اپنے سوراخوں سے زیادہ دور نہیں جانے دیتے مگر کیا کیجئے کہ پنیر کی خوشبو بھی ایسی ظالم تھی کہ وہ بھی تو کسی پل چین نہیں لینے دیتی تھی۔ کشش کرتی تھی' بلاتی تھی۔ ایسی خوشبو کہ جس کے آگے ایک مرتبہ تو خود زندگی بھی بے معنی تھی' بے کیف تھی مگر ان چوہوں کی ایسی صلاحیت کہاں تھی کہ وہ یہ بھید پا سکتے کہ لذت کا محور وہ تازہ پنیر کہاں تھا؟ وہ تو اک خواب تھا۔ ایک ان دیکھی' دنیا جہاں تک پہنچنا محال تھا۔ ان کے حساب میں تو تقدیر کا لکھا ہوتا ہے اگر میسر ہو اور ان دیکھے خطروں سے بچنا۔ میز کے اوپر کی دنیا تو ایک تصوراتی ہیولا تھی اور ان کا وہ مقدر نہ تھا جو تجربے کے لیے رکھے ہوئے چوہے کو حاصل تھا۔

سائنسدان نے لیبارٹری کی میز پر جو پنجرہ رکھا تھا' وہ ان پنجروں سے مختلف تھا جو اناج کے دشمن چوہوں کو پھانسنے کے لیے گھروں میں رکھے جاتے ہیں اور جن میں بلوں میں چھپے گندے غلیظ چوہے' رزق کے لالچ میں اپنی بے خبری کے ہاتھوں پھنس جاتے ہیں اور ہلاک کر دیئے جاتے ہیں۔

یہ صاف ستھرا پنجرہ' صاف ستھرے چوہوں کے لیے بالخصوص بنوایا جاتا ہے اور صاف ستھرے ماحول میں رکھا جاتا ہے۔ لیبارٹری کی میز پر رکھے پنجرے میں بند چوہے کو پھانس کر ہلاک کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ اس کی بھوک اور اس کی لالچ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے رزق تلاش کرنے کے آداب سے آگاہ کرنا اور سیکھنے کی صلاحیت کو جانچنا اور بڑھانا مقصود ہوتا ہے۔ بلوں میں چھپے چوہوں کی نسبت اسے یہ سہولت حاصل ہوتی ہے کہ وہ اپنی غلطیوں سے سیکھ سکے۔ اس مقصد کے لیے اسے وقت اور موقع بھی دیا جاتا ہے اور احساس تحفظ بھی۔

بلوں میں چھپے چوہے کسی کی دلچسپی کا باعث نہیں ہوتے' البتہ ان کے سروں پر بلی غراتی رہتی ہے۔ ہلاک کرنے والا پنجرہ پڑا رہتا ہے یا ان کے بلوں میں چوہے مار گولیاں ڈالی جاتی ہیں یا ہلاکت آفریں چھڑکاؤ کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی موت آپ مر جاتے ہیں یا مختلف ذریعوں سے مار دیئے جاتے ہیں۔ انہیں غلطیوں سے سیکھنے کا موقع نہیں دیا جاتا یا پھر وہ اپنی غلطیوں سے سیکھتے نہیں تو حیف..... دنیا کے نقشے پر چوہوں کے لیے بہت سی دشواریاں ہیں۔

ہر چند کہ چوہوں کے لیے بہت سی دشواریاں ہیں مگر لیبارٹری کی میز پر پڑا پنجرے میں بند چوہا اپنے تجربے سے سیکھتا تھا اور اس طرح صرف اپنی استعداد اور سائنسدان کے علم میں اضافہ ہی نہیں کرتا تھا' خود کو دوسروں میں ممتاز بنانے کی صلاحیت حاصل کرنے کے جتن میں بھی تھا۔

چوہوں کے لیے تربیت کا مرحلہ زیادہ سہل نہیں۔ انہیں ٹامک ٹوئیاں مار کر سیکھنا ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے گندے غلیظ چوہوں سے انتخاب نہیں کیا جاتا۔ اچھی نسلوں کے صاف ستھرے چوہے ہی کارآمد ہوتے ہیں۔ ایسے جو ڈر اور خوف پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جنہیں رزق کا لالچ اطاعت کرنا سکھائے اور جو فطرت کو فراموش کرنے کا مظاہرہ کریں کہ اطاعت سیکھنے کے لیے اپنی اصل کو فراموش کرنا بنیادی شرط ہے۔

تو وہ چوہا دوسروں میں ممتاز تھا۔ اس پر تجربے کا آخری دن تھا۔ میز پر رکھے پنجرے کے وسط میں ایک تازہ پنیر کا صاف ستھرا ٹکڑا رکھا گیا۔ پنجرے میں چاروں طرف زگ زیگ جالی دار راستوں کا جال بچھا تھا۔ سائنس دان نے روز کی طرح آج بھی سیکھنے والے چوہے کو اس بڑے پنجرے سے نکالا تھا' جہاں اس جیسے دوسرے بھی تھے۔ ہتھیلی پہ بٹھایا' پیار سے پچکارا۔ کوئی کراہت محسوس نہیں کی اور تجربے والے پنجرے کے دروازے پہ بٹھا دیا تھا۔ پہروں کا بھوکا چوہا پنیر کی خوشبو کی لپٹوں میں آ کر جھوم گیا تھا مگر قدم آگے نہیں بڑھائے تھے۔ اس نے ایک عرصے میں

جو تعمیل کرنے کا فن سیکھا تھا' وہ اس سے منحرف ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ محض اس پنیر کے لیے جو اسی کے لیے تھا۔ سو اس نے انتظار کیا۔ انتظار کیا جب تک کہ سائنسدان کے ہاتھوں میں پکڑی ٹائم واچ کی ٹک ٹک نہ گونجی۔ ٹک ٹک گونجی تو وہ جست بھر کے اندر داخل ہوا کہ اس آواز میں جادو کی کشش تھی۔ یہ اجازت تھی اور عنایت تھی۔ وہ اندر داخل ہوا تھا اور پنیر کی خوشبو نے اسے راستہ دکھایا تھا' وہ جھومتا چلا اور گھومتا چلا۔ اس طرح کہ کسی رکاوٹ نے اسے راستے میں نہیں ٹوکا تو وہ راہداریوں میں سے بل کھاتا خلاف معمول کسی رکاوٹ سے ٹکرائے بغیر پنیر تک پہنچ گیا تھا۔

سائنس دان نے تجربے میں استعمال ہونے والے چوہے کو پچکار کر نکالا تھا' پیار سے اس کی پشت سہلائی تھی اور اسے ایک دوسرے میز پر اپنے سامنے بٹھا دیا تھا۔ کچھ دیر اسے محبت سے دیکھتا رہا تھا اور پھر کاغذ پنسل سنبھال کر بیٹھ گیا تھا۔

یہ دن کچھ دنوں کے بعد آیا تھا' کچھ دن۔ کبھی کل کی بات لگتی ہے' کبھی صدیوں پہلے کا قصہ..... تجربے کا پہلا دن اس چوہے پر کتنا مشکل تھا۔ پہلی گھڑی ہمیشہ مشکل ہوتی ہے۔ پہلے روز اسے دروازہ کھول کر جب اندر رکھا گیا تو جہاں رکھا گیا تھا' وہ وہیں دبک کر بیٹھ گیا تھا۔ کوئی ڈر جالیوں کے اندر سے جھانکتا تھا۔ وہ دیر تک وہیں بیٹھا رہا تھا مگر پھر اچانک بھول گیا تھا۔ فضا پنیر کی خوشبو سے معطر تھی' جس نے مدہوش کیا تھا۔ مدہوش ہوا تو اچھل کر چلا تھا مگر پھر اپنی فطرت کیسے بدلتا کہ آخر چوہا تھا۔ ایک مرتبہ پھر عدم تحفظ کا شکار ہوا تھا۔ رُکا تو رُکا رہا تھا۔ خطرے کو سونگھتا رہا تھا۔ خطرے کی بُو کہیں سے آتی تھی۔ حالانکہ وہ پنیر کی بُو تھی۔ پنیر کی تھی یا خطرے کی پہلی مرتبہ کسی احساس کسی ہوشیاری نے اس کے اندر جنم لیا تھا اور اس نے حرکت کی تھی۔ آہنی فرش کو سونگھتا' کبھی دبک کر' کبھی اچھل کر' کبھی جست بھرتے ہوئے' کبھی بدحواسی تھی' کبھی احتیاط تھی جو بھوک اور ڈر نے طاری کی تھی' بھوک اسے بہکاتی تھی اور ڈر اسے دھکاتا تھا۔ ہوشیار اور منصوبہ سازی تھی مگر وہ کب آگاہ تھا کہ اس کی زندگی اس کے اوقات اس کی اپنی منصوبہ بندی اور ہوشیاری کے تابع نہیں ہے۔ وہ اپنے اوپر جھکے سائنسدان کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا' جس کے ہاتھوں میں اس کے اناج کی ڈور تھی۔ وہ بے خبر اپنی ہی بے خبری کے جتن میں مصروف تھا۔ ایک سمت کو چلتا رہا۔ حتیٰ کہ پہلی رکاوٹ نے اسے روکا..... وہ ڈر گیا..... ڈر کر دبک گیا..... پھر کچھ ساعت بعد حوصلہ پا کر پلٹا..... پھر رکاوٹ..... پھر حوصلہ پھر رکاوٹ..... پھر کئی پہر کا بھوکا جھنجلاہٹ میں آکر زگ زیگ رستوں پر بھٹکتا پھرا تھا۔ منزل پر پہنچ جانے کی آس میں وہ بار بار راستہ بھولتا رہا تھا۔ رکاوٹوں سے ٹکراتا رہا تھا۔ کبھی صحیح راستے پر آجاتا' کبھی غلط پر نکل کھڑا ہوتا تو اس نے رزق تک پہنچنے میں گویا شام کر دی تھی۔ شام تو کر دی تھی مگر صد اطمینان پھل بھی تو پایا تھا۔

یہ طمانیت کی بات تو تھی کہ وہ پہنچ گیا تھا مگر پہنچنے کے سوا چارہ کیا تھا۔ بھوک کا کیا چارہ ہے۔ اگرچہ ہشیاری نہیں' بے خبری کام آئی تھی مگر یہ ایک بات تو سیکھی تھی کہ کچھ بھی کام میں لایا جاسکتا ہے' چاہے وہ بے خبری ہی کیوں نہ ہو۔

بے خبری سے خبر نہ پاسکنے والے چوہے بھی پنیر کی بُو پا کر ضرور نکلتے رہے مگر بے خبر ہی رہے اور ادھر ادھر کا رمنہ مارا۔ کتر کتر کیا اور پلٹ گئے اور اس سے لاعلم ہی رہے کہ ایک ان میں ایسا بھی تھا جو ممتاز ہونے کی تربیت میں تھا۔

تو دن بہ دن' گھڑی بہ گھڑی تربیت پانے والے چوہے کے اندر حوصلے نے جگہ بنانا شروع کر دی تھی۔ وہ اپنے اوپر جھکے ہوئے جس آدمی کو دشمن سمجھتا تھا' اس میں دوستی کی خو تھی۔ اب احتیاط لازم نہ تھی۔ ڈر کی چادر دھوئیں کے غبار کی طرح اترتی گئی۔ شفقت اور محبت کا سائبان پھیلتا گیا۔ پنیر کی خوشبو ہر جذبے پر غالب آتی چلی گئی اور وہ سیکھتا گیا۔ سیکھتا گیا۔ کس،

سمت اسے چلنا تھا اور کس سمت اسے نہیں چلنا تھا اور آج وہ ہر رُکاوٹ پر قادر تھا کہ رُکاوٹ تو خوف اور بے خبری کا نام ہے۔

''چوہوں میں سیکھنے کی استعداد ہوتی ہے۔'' سائنس دان نے اپنی یادداشتوں میں یہ لکھا اور اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ ایک تخلیقی مسرت اس کے سارے وجود پر بکھری ہوئی تھی۔ وہ ایک کام سے گزرا تھا۔ تجربے کے آغاز سے آج تک وہ اس کی سیکھنے کی صلاحیتوں کو تجسس اور بے چینی سے دیکھتا آیا تھا۔ وہ اس کے منزل مقصود پر پہنچنے کے وقت کو بھی نوٹ کرتا اور ان رُکاوٹوں کو بھی، جن کو وہ عبور کرنے کی کوشش میں تھا۔ تو یوں رفتہ رفتہ وقت بھی کم ہوتا گیا تھا اور رکاوٹیں بھی اور آج بالآخر آسودگی کا مرحلہ تھا۔

مگر وہ کچھ ہی دیر آسودہ رہا تھا پھر اس کا چہرہ تفکر میں ڈوب گیا تھا اور پھر اس نے یہ بھی لکھا۔ ''یہ سب کچھ ایک حد تک ہوتا ہے۔ ایک چوہا ایک خاص حد تک سیکھنے کی صلاحیت کا اظہار کرتا ہے اور پھر اس کے بعد تجربے کے لیے بے کار ہو جاتا ہے۔''

چوہوں کو بے کار اکٹھا کرنے کے عمل میں سائنسدان مبتلا نہیں ہوتے۔ وہ انہیں کام میں لاتے ہیں، اس سائنسدان نے بھی یہی کیا تھا اور اب کسی دوسرے چوہے کا انتخاب کرنا تھا جو اس سے بھی کم وقت میں رکاوٹوں کو عبور کرتا اور اس کے علم میں اضافے کا باعث بنتا۔ یہی سب تھا کہ اس نے اپنے نتائج میں سیکھ جانے والے چوہے کو اب ناکارہ قرار دے دیا تھا۔

ناکارہ چوہے کا کیا ٹھکانہ تھا۔ یہی کہ نتائج لکھنے کے بعد سائنسدان اٹھا تھا۔ ایک سرنج میں کوئی محلول بھرا تھا اور سوئی سیکھنے والے چوہے کے جسم میں پیوست کر دی تھی تو یوں ناگہانی وہ کہ جو سب میں ممتاز ہو گیا تھا، اب نہیں تھا۔ اجل اسے لے گئی تھی۔

اجل اسے لے جاتی ہے جو سیکھتا ہے اور اجل اسے بھی لے جاتی ہے جو نہیں سیکھتا۔ یہ اور بات کہ کچھ تو اپنی موت مرتے ہیں اور کچھ چوہے کی موت مر جاتے ہیں۔ ان پر کوئی دوسری مثال صادق نہیں آتی، وہ بلوں میں چھپے ہوئے غلیظ چوہے ہوں یا صاف ستھرے پنجروں میں بند صاف ستھرے ممتاز چوہے ہوں۔

میز سے سیکھنے والے چوہے کی لاش اٹھاتے اور اسے کوڑا کرکٹ کے ڈرم میں پھینکتے ہوئے معلوم نہیں کیوں آج سائنس دان کو پہلی بار تاسف ہوا اور اس نے خیال کیا تھا کہ سیکھنے والے چوہے جو کچھ سیکھتے ہیں، اپنے اور پر تجربہ کرنے والوں کے لیے سیکھتے ہیں، اپنے لیے کچھ بھی نہیں اور اس نے یہ بھی خیال کیا کہ چوہے کو معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ ایسا بھی ہوگا۔ اسے معلوم ہوتا تو شاید وہ آہستہ آہستہ سیکھتا اور کبھی اپنے علم کو مکمل نہ ہونے دیتا۔ ہلاکت تو ہر چوہے کا مقدر ہے مگر ہلاکت تک پہنچنے میں کچھ عرصہ تو صرف ہوتا اور اگر وہ یہ نہیں کر سکتا تھا تو دوسرے چوہوں کے ساتھ مل کر بغاوت کر دیتا یا کم از کم غیرت میں آ کر پنجرے کی دیواروں سے سر ٹکرا کر مر جانا اس کے کسی کام نہ آتا۔

یہ باتیں ہر چند کہ اس کے سوچنے کی نہیں تھیں مگر اس وقت تک جب تک کہ وہ کسی دوسرے چوہے پر تجربے کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ ہو جاتا، یوں ہی تفنن طبع کے لیے سوچتا رہا مگر اس نے جتنی بھی باتیں سوچیں، وہ آدمیوں سے تو ممکن تھیں، چوہوں سے نہیں، اسی لیے وہ ہنس پڑا اور ہنستا رہا اور یوں ہی ہنستے ہنستے خیال کیا۔ کیا بعید ہے، کبھی کوئی ایسا سائنسدان بھی آئے جو چوہوں کو آدمی بننا سکھا دے۔ بات عقل و دانش کی نہیں تھی، تمسخر کی تھی مگر ایک کام آنے والے چوہے کی موت کے احترام میں ایک فضول سی خواہش کرنے اور امید رکھنے میں کیا مضائقہ تھا۔

یہ کون ہوا

زین مہدی

Pakistanipoint
Waqar Azeem

قصہ ایک تیز طرار اور شاطر قاتل کا جس کا چلایا ہوا ہر تیر اپنے ٹھیک نشانے پر لگتا ہے۔ لیکن اس کی ایک عادت ۔۔۔۔۔ اس کے ہر گناہ کا ثبوت بن جاتی ہے۔

ایک چالباز قاتل کی سسپنس سے بھرپور داستان

میرا جگری یار انیس رواں لہجے میں بول رہا تھا۔ ”احسن یار بس کیا بتاؤں لڑکی کیا تھی زہر کی پڑیا تھی۔ مجھے اس شہر میں کاروبار کرتے ہوئے پندرہ سال ہو گئے تھے۔ طرح طرح کے خریداروں سے واسطہ پڑا تھا، مگر اس لڑکی جیسی دوسری نہیں دیکھی۔ اسے تو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس کا چہرہ یاد آ جاتا ہے تو آج بھی خون کھول اٹھتا ہے۔ خود کو میں نے اتنا مجبور اور بے بس کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اس سے میری پہلی ملاقات اپنی ہی دکان پر ہوئی تھی۔ صبح کے دس بجے ہوں گے۔

میں نے ابھی دکان کھولی ہی تھی اور اگربتی سلگا کر گدی پر بیٹھا ہی تھا کہ ایک برقع پوش عورت آئی۔ اس کے انداز و اطوار سے پتا چل رہا تھا کہ وہ عام خریداروں سے الگ ہے۔ پردے کی بھی سخت پابند لگ رہی تھی کیوں کہ کپڑا دیکھنے کے دوران میں بھی اس نے نقاب نہیں ہٹایا تھا۔ جب کہ میں تھان پر

تھان کھول کر اس کے سامنے پھیلاتا جارہا تھا اور گاہے بگاہے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ بھی لیتا تھا۔ وہ جو بھی کپڑا پسند کرتی اسے کٹوا کر الگ رکھ لیتی۔ صرف آدھے گھنٹے میں اس نے تقریباً ڈھائی ہزار روپے کا کپڑا پسند کرلیا تھا۔ پھر اس نے پرس کھول کر ڈھائی ہزار روپے نکالے اور میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔ یہ سب سو سو کے لال نوٹ تھے۔ میں نے رسید بنادی جسے اس نے پرس میں رکھ لیا اور کپڑوں کا بنڈل اٹھا کر باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اپنے سیلز مین عامر سے کہا۔ ”بھائی خریدار ہو تو ایسا، نہ مول تول، نہ چیخ چیخ جو بتایا بغیر کسی ہیل حجت کے ادا کردیا۔“

صبح ہی صبح اتنا اچھا سودا ہونے کی خوشی حد سے زیادہ محسوس ہورہی تھی۔ کیوں کہ اس دور میں جب کا یہ قصہ ہے، ایک کلرک کی تنخواہ دو سو سے ڈھائی سو روپے تھی۔ اس دور میں صبح ہی صبح اتنا بڑا سودا ہوجانا معمولی بات نہ تھی۔ ابھی میں اس سودے پر خوش ہورہا تھا کہ دکان کے باہر ایک ٹیکسی آکر رکی اور اس سے ایک عورت اتری۔ اسے دیکھ کر میں نے سوچا، یہ بھی میری ہی دکان میں آجائے تو اچھا ہے۔ شاید وہ قبولیتِ دعا کی گھڑی تھی، وہ عورت سیدھے میری دکان میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر میں نے سوچا، ایک وہ لڑکی تھی کیسی باپردہ کہ ایک ناخن تک نظر نہ آیا اور ایک یہ لڑکی ہے جو اتنی بے باک، بے حجاب! میں ابھی ان دونوں کا ذہن میں موازنہ کر ہی رہا تھا کہ اس لڑکی نے ایک تھان کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ دکھایئے گا۔“

میں نے نکال کر اسے دکھایا۔ ایک کے بعد ایک اس نے کئی کپڑے پسند کیے جنہیں میں الگ رکھتا جارہا تھا۔ پھر میں نے بنڈل بنا کر اسے دے دیا۔ وہ بنڈل اٹھا کر جانے کے لیے مڑی تھی کہ میں نے کہا۔ ”مس سنیے! شاید آپ کچھ بھول رہی ہیں۔“

”کیا؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

”آپ نے پیسے نہیں دیے ہیں۔“

”پیسے۔ کیسے پیسے؟“

”ارے بھئی ان کپڑوں کی قیمت۔“ میں نے کچھ تیز لہجے میں کہا۔

”ارے واہ! میں نے پیسے تو دے دیے ہیں۔“ اس نے بھی تیز لہجے میں جواب دیا۔

گرما گرمی بڑھتے دیکھ کر بہت سے آدمی جمع ہوگئے تھے۔ آس پاس کے دکان دار بھی آگئے تھے۔ وہ مسلسل ایک ہی بات کی رٹ لگائے ہوئی تھی کہ اس نے کپڑوں کی قیمت ادا کردی ہے۔ تنگ آکر میں نے دھمکی دی۔ ”اچھی بات ہے میں ابھی پولیس کو بلاتا ہوں۔ وہی لوگ حقیقت کا پتا لگائیں گے۔“

پولیس کی دھمکی سن کر وہ اسٹول پر بیٹھ گئی۔

”ٹھیک ہے بلائیں، میں بھی یہیں موجود ہوں۔ پولیس والے خود پتا لگالیں گے اور تم جیسے لوگوں سے شریف خاندان کی لڑکیوں کو تنگ کرنے کا جواز بھی طلب کرلیں گے۔“

لڑکی کا حوصلہ، اطمینان دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ مجبوراً میں نے تھانے فون کردیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک اے ایس آئی، دو کانسٹیبلو کے ساتھ آگیا۔ اس نے میری باتوں کو سنا پھر لڑکی سے بولا۔ ”ہاں بی بی! اب آپ بتائیں معاملہ کیا ہے؟“

”جناب میں ایک شریف گھرانے کی لڑکی ہوں۔ آج پہلی بار ان کی دکان میں آئی ہوں۔ ان کی دکان کیا، اس مارکیٹ میں پہلی بار آئی ہوں۔ میں تو ہمیشہ طارق روڈ سے خریداری کرتی ہوں۔ میرا نام مس گلناز ہے۔ آپ چیپ اینڈ بیسٹ فون کرکے پوچھ لیں۔ یہ رہا ان کا کارڈ۔ مجھے پتا ہوتا کہ اس بازار میں ایسا کچھ ہوتا ہے تو میں کبھی بھی یہاں نہ آتی۔“

اس کی بات نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ بہت سے دکان دار پہلے ہی مجھ سے جلے بھنے بیٹھے تھے۔ انہوں نے موقع پاکر کہا۔ ”آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے اس سے پوری مارکیٹ کی ساکھ بگڑ رہی ہے۔“

”مجھے تو حیرت ہورہی ہے کہ یہ صاحب کتنی دیدہ دلیری سے جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ دیکھیے کیش

میمو جوانہوں نے مجھے دیا تھا۔'' کہہ کر اس نے بیگ سے نکال کر اے ایس آئی کی طرف کیش میمو بڑھا دیا۔

اے ایس آئی نے کیش میمو پر نظر ڈالی پھر اسے برابر والی دکان کے مالک جاوید کی طرف بڑھا کر بولا۔ ''بنڈل کے کپڑوں سے ملا کر دیکھو۔''

جاوید نے کپڑوں کا بنڈل کھولا اور اسے ملا کر دیکھا پھر بولا۔ ''تقریباً تمام کپڑے وہی ہیں جو اس میں درج ہیں۔''

مجھے خود بھی حیرت تھی کہ جب میں نے اسے کیش میمو دیا ہی نہیں تو پھر اس کے پاس کہاں سے آ گیا۔ میں نے کیش میمو لے کر دیکھا۔ رائٹنگ میری تھی مگر یہ رسید تو میں نے اس برقع پوش لڑکی کو دیا تھا۔ یہ بات میں نے اے ایس آئی کو بھی بتائی مگر اس نے ایک نہ سنی اور اس لڑکی کو کپڑوں کا بنڈل دے کر کہا۔ ''بی بی! آپ جائیں، میں ان سے نمٹ لوں گا۔'' پھر اس نے مجھ پر وہ الزام لگائے جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے مجھے پورے ایک ہزار روپے اسے ٹیبل کے نیچے سے دینے پڑ گئے۔

بات آئی گئی ہوگئی۔ دوسرے دن میرے نوکر نے ایک نئی بات بتائی۔ اس نے طارق روڈ سے گزرتے ہوئے اس لڑکی کو چیپ اینڈ بیسٹ کی دکان میں دیکھا تھا۔ وہ کاؤنٹر پر بیٹھے شخص سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ ''ایسا لگتا ہے صاحب جیسے وہ ان کی بہت پرانی کسٹمر ہے۔ میں یہ سوچ کر دکان کے باہر کھڑا ہو گیا تھا کہ دیکھوں یہ کیا کیا خریدتی ہے اور پیمنٹ کیسے کرتی ہے مگر جناب میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اس لڑکی کو وہی بنڈل جو اس نے ہمارے ہاں سے خریدا تھا کاؤنٹر والے کو دیتے دیکھا اور جناب ایک نہیں۔ اس نے دو بنڈل دیے یعنی ایک وہ جو نقاب پوش لڑکی کو دیا تھا وہ بھی اسی لڑکی نے آسے دیا اور ہزار ہزار کے دو نوٹ لے کر باہر نکل آئی۔

''کہیں تمہیں مغالطہ تو نہیں ہوا ہے۔'' میں نے ٹوکا۔

''نہیں جناب! میں اپنے ہاتھ سے بندھے بنڈل کو پہچانوں گا نہیں؟ پھر ہماری دکان کا بیگ! اسے کیسے بھول سکتا ہوں۔''

اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ لڑکی چور ہے مگر میں اس کے خلاف کچھ بھی نہ کر سکا۔

وقت گزرتا رہا۔ زندگی کی ہما ہمی میں وہ یاد بھی نہ رہی لیکن اس نقصان کو میں بھول نہ سکا۔ آج اس کی تصویر دیکھی تو پھر سے زخم ہرے ہو گئے۔ تم کچھ بھی کہو یہ وہی لڑکی ہے۔''

''نہیں یار تمہیں مغالطہ ہوا ہے۔ یہ لڑکی بہت مظلوم ہے۔'' میں نے اسے سمجھانے کے لیے کہا۔

''ہو سکتا ہے اس سے ملتی جلتی شکل ہو۔''

''یار! اس کی ناک پر یہ تل دیکھ رہے ہو نا، یہ خاص نشانی میں نے یاد کر رکھی تھی۔''

''ناک پر تل، میاں کم سے کم پچاس لڑکیوں کے ناک پر تل میں دیکھ چکا ہوں۔''

''اچھا، تم بتاؤ اس نے تمہیں کیسی کہانی سنائی ہے۔''

''اس سے میری پہلی ملاقات ایک سال پہلے ہوئی تھی۔ ان دنوں میں نور پور تھانے میں تعینات تھا۔ یہ میری ایک جاننے والی کے ساتھ آئی تھی۔ وہ صاحبہ میری پھوپی زاد کی سہیلی تھیں اس لیے میں اس لڑکی پر توجہ دینے پر مجبور تھا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ حفظ ماتقدم کے طور پر ایک رپورٹ لکھوانا چاہتی ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آپ کیا لکھوائیں گی تو وہ بولی کہ میں ایک پرائیوٹ نرس ہوں۔ امیر گھرانوں کے مریضوں کے لیے مجھے ہائر کیا جاتا ہے۔ تقریباً دو سال پہلے کی بات ہے۔ ایک بہت بڑی فرم کے مالک امجد نے اپنی بیمار بیوی کے لیے مجھے نوکری دے دی۔ وہ خاتون بس قبول صورت تھیں لیکن امجد صاحب سے عمر میں بڑی تھیں پھر بھی وہ اپنی بیگم کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ بیوی کی بیماری نے انہیں ذہنی پریشانی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ میرے آجانے سے

انہیں کچھ ریلیف مل گیا تھا پھر بھی وہ موقع ملتے ہی بیوی کے سرہانے آجاتے۔ جب کہ بیوی کا انداز ہمیشہ ہتک آمیز ہوتا۔ میں اس یک طرفہ محبت کے بارے میں متجسس تھی۔ بالآخر میں نے وہ راز جان لیا۔ وہ دولت بنگلا گاڑی سب کچھ ان کی بیگم کا تھا۔ یہ کبھی ان کے ابا کے سیکریٹری تھے، پھر انہوں نے اپنی خدمت گزاری، تابعداری سے بیگم صاحبہ کے دل میں بھی جگہ بنالی اور جیسے ہی ان کے ابا کا انتقال ہوا۔ انہوں نے حالات کا اتنا بھیانک نقشہ کھینچا کہ بیگم صاحبہ ڈر گئیں پھر یہ ہمدرد بن کر انہیں خود سے مزید قریب کرتے چلے گئے اور ایک دن شادی کا پیغام دے دیا۔ بیگم صاحبہ کے سارے راستے بند تھے۔ انہوں نے شادی کے لیے ہامی بھرلی۔ شادی کے بعد بھی یہ دنیا والوں کو دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ اپنی بیگم سے بہت پیار کرتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی بیگم سے نہیں ان کی دولت سے پیار کرتے ہیں۔

بیگم صاحبہ تو عرصے سے بیمار تھیں، بڑے بڑے ڈاکٹروں سے رجوع کیا جارہا تھا۔ دوا مسلسل چل رہی تھی مگر وہ ٹھیک ہو کر نہیں دے رہی تھیں۔ میں بھی دوا وغیرہ وقت پر دیتی پھر ایسا ہوا کہ ایک روز جب میں صبح کو دوا پلانے پہنچی تو وہ مر چکی تھیں۔ یہ ایک حیرت انگیز بات تھی کیوں کہ ان کی صحت لوٹ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے بیماری پر کچھ حد تک قابو پالیا تھا۔ انتقال کے بارے میں ڈاکٹرز کی رائے تھی کہ انہوں نے نیند کی دوا زیادہ مقدار میں پی لی تھی۔

امجد صاحب بیوی کے انتقال پر ٹوٹ گئے۔ انہوں نے کئی ماہ تک سوگ منایا۔ وہ اکیلے گھر میں بیٹھے بچوں کی طرح روتے تھے کیوں کہ بیگم کے انتقال کے بعد مجھے بھی فارغ کردیا گیا تھا اور میں ایک پرائیویٹ اسپتال میں نوکری کرنے لگی تھی۔ امجد صاحب نے ہی میری ساکھ بچھائی تھی۔ انہوں نے جھوٹی گواہی دی تھی کہ اس رات میں ڈیوٹی سے غیر حاضر تھی ورنہ مجھ پر کیس بن جاتا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ تقریباً چھ ماہ پہلے کی بات ہے ایک دن سرراہ امجد صاحب سے میری ملاقات ہوگئی۔ وہ مجھے ایک ہوٹل میں لے گئے۔ کافی دیر تک مرحومہ کے بارے میں باتیں کرتے رہے پھر یکا یک ہی انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''صوفیہ! میں بہت اکیلا ہوگیا ہوں۔ سونا گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔''

میں ان کی بات سمجھ رہی تھی پھر بھی خاموش تھی۔ بالآخر انہوں نے کھل کر کہہ دیا۔ اگر تم چاہو تو میری سونی زندگی میں آسکتی ہو۔ یہ کروڑوں کا کاروبار اور میں اکیلی جان۔ تم اگر چاہو تو میری جائیداد کاروبار کو وارث دے سکتی ہو۔ میں نے اس وقت تو کچھ نہیں کہا صرف اتنا بولی کہ آپ کی بیگم کے انتقال سے لوگوں میں چہ مگوئیاں شروع ہوگئی ہیں۔ اگر ہم نے شادی کرلی تو مزید باتیں بننے لگیں گی۔ اس بات پر امجد نے کہا کہ لوگوں کا کیا ہے۔ وہ پیٹھ پیچھے کچھ بھی کہہ لیں مگر ہمارا دامن صاف ہے۔ میں نے سوچنے کی مہلت مانگ لی اور چلی آئی۔ پھر ایسا ہوا کہ میں نے اس آفر کو قبول کرلیا۔ تقریباً تین ماہ پہلے شادی کی ہے

''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں۔'' اس کی تمہید سن کر میں اکتا گیا تھا۔

''میری جان کو خطرہ ہے۔'' صوفیہ نے کہا۔

''کس سے خطرہ ہے۔''

''بات یہ ہے کہ ایک ہفتہ پہلے کا واقعہ ہے، لائٹ چلی گئی تھی۔ میں نے امجد پر نظر ڈالی وہ بے خبر سو رہے تھے۔ میں بستر سے نیچے اترنا چاہتی تھی کہ میرے کان کھڑے ہوگئے۔ امجد نیند میں بڑبڑا رہے تھے۔ ان کی بڑبڑاہٹ سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ جانتے ہیں وہ کیا کہہ رہے تھے۔ وہ ایک ہی جملہ بار بار دوہرا رہے تھے۔ ''میری جان بس آخری گھونٹ، پی لو۔ دوا پی لو۔''

''اس میں گھبرانے والی کیا بات ہے؟''

''دراصل بیگم صاحبہ کو دوا میں پلاتی تھی۔ میرے علاوہ کسی کو دوا پلانے کی ضرورت کیا تھی۔ میں

سمجھ گئی تھی کہ امجد نے بیگم صاحبہ کو غلط دوا پلادی جس کے ری ایکشن سے وہ مر گئیں۔"

"ہوسکتا ہے یہ تمہارا وہم ہو۔ انہوں نے ماضی میں کبھی دوا پلائی ہو جو ان کے ذہن میں محفوظ ہوگئی ہو۔"

"بالکل غلط۔ نیند میں بڑبڑانے والے حضرات زیادہ پرانی بات نہیں دوہراتے۔ وہی بات تحت الشعور میں بیٹھی ہے جو اہم ہو اور اہم بات ہی نیند میں بڑبڑاتے ہیں۔ انہوں نے دوا پلائی تو یہ اہم بات نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ غلط دوا پلائی جائے۔"

"بات صحیح ہے۔ میں اس پر سوچ ہی نہیں رہا تھا۔" میں نے صوفیہ سے کہا۔ پھر اس کے خلاف رپورٹ درج کرلی کہ صوفیہ کو اس سے جان کا خطرہ ہے۔ رپورٹ لکھنے کے تیسرے یا چوتھے مہینے کی بات ہے ایک دن صبح ہی صبح صوفیہ کا فون آ گیا کہ امجد نے خودکشی کرلی۔ میں نے فوراً تیاری کی اور پولیس پارٹی کو ساتھ لے کر اس کے ہاں پہنچ گیا۔ امجد کی لاش بیڈ پر پڑی تھی اور اس کی مٹھی میں نیند کی گولیوں کی شیشی تھی۔ اس نے کوئی تحریر نہیں چھوڑی تھی۔ صوفیہ کی جانب سے رپورٹ درج کی گئی۔ اس نے رپورٹ میں لکھا تھا کہ کل دن میں ایک بڑی بی امجد سے ملنے آئی تھیں۔ امجد نے بتایا تھا کہ وہ ان کی سسرالی رشتے دار ہیں۔ انہوں نے امجد کو کافی برا بھلا کہا کہ اس نے دولت کی خاطر اپنی بیوی کو خودکشی پر مجبور کیا ہے۔ وہ قاتل ہے۔ اس الزام سے وہ ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ حد سے زیادہ رنجیدہ تھے۔ رات میں کئی بار اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ حد سے زیادہ پریشان لگ رہے تھے۔ میں خود بھی اتنی ہی زیادہ پریشان تھی۔ بار بار آنکھیں کھل رہی تھیں، نیند اچاٹ ہوگئی تھی مگر فجر کے وقت آنکھ لگ گئی۔ لیکن صبح اٹھی تو انہیں۔" کہہ کر وہ رونے لگی۔

میں نے اس کی بھرپور مدد کی اور اس پر آنچ نہ آنے دی۔ تمام قانونی پیچیدگیوں سے اسے بچالیا۔ اس خوشی میں اس نے مجھے اپنی ایک سہیلی کی سالگرہ پارٹی میں بلالیا۔ اس کا کہنا تھا آپ کے احسان کا بوجھ ہے۔ میں خود پارٹی دیتی مگر مجبور ہوں، حالات موافق نہیں۔ شوہر کا غم ہے اس لیے میں چاہتی ہوں آپ اس پارٹی کو میری طرف سے سمجھیں۔ میں اس کا دل رکھنے کے لیے پارٹی میں چلا گیا تھا۔ وہیں اس نے میرے ساتھ ایک تصویر کھنچوائی تھی۔ یہ وہی تصویر تھے جسے دیکھ کر انیس نے کہا تھا کہ یہ ایک فراڈی لڑکی ہے اور میں نے انیس کو ڈانٹ دیا تھا کہ اسے مغالطہ ہوا ہے کسی پر الزام لگانا درست نہیں۔

انیس کو ڈانٹ پلائے ہوئے دو سال کا عرصہ گزر چکا ہے مگر اب میں بہت زیادہ خوف زدہ ہوں۔ آپ کہیں گے کس سے خوف زدہ ہوں تو سنیں میں اس عورت سے خوف زدہ ہوں جس کا نام صوفیہ ہے۔ اس کا خوف مجھے سونے نہیں دیتا۔ میں ساری ساری رات جاگ کر گزارتا ہوں۔ آپ پوچھیں گے ایسا کیوں ہو رہا ہے تو سنیں۔ اب وہ میری بیوی ہے اور ایک ہفتہ پہلے وہ نیند میں بڑبڑا رہی تھی۔ "یہ گولیاں کھانی ہیں۔ چلو خاموشی سے کھالو۔ اچھی نیند آجائے گی۔"

اب میں جان گیا ہوں کہ نیند میں بڑبڑانے کی عادت کسی اور کو نہیں خود صوفیہ کو ہے۔

ہنسی علاج غم ہے

دوست: "آپ کا ناول کس نے چھاپا؟"

ادیب: "میں نے خود چھاپا۔"

دوست: "کچھ بکا بھی؟"

ادیب: "کیوں نہیں میرا مکان اور سائیکل دونوں بک گئے۔"

☆☆☆

استاد: "چیئرمین کسے کہتے ہیں؟"

شاگرد: "کرسیاں بنانے والے کو۔"

تباہ کن

اسرار احمد

تمنا اگر حد سے تجاوز کر جائے تو وہ جنون اور دیوانگی کہلاتی ہے۔ ہم میں سے بیشتر کسی نہ کسی خواہش کے باعث دیوانے نہیں تو دیوانگی کے قریب ضرور ہوتے ہیں شاید اسی لیے سیانے کہہ گئے ہیں کہ انسان کو کسی بھی معاملے میں اعتدال سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے ایک دیوانے کا قصہ، وہ بلیک میلنگ اور دہشت گردی کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔

قدم قدم ہنگامے سطر سطر سنسنی خیزی لیے ایک خوب صورت ناول کی تلخیص

میکسم زکوف ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ اس کی آنکھیں چمک دار اور چہرہ سرخ تھا۔ عام جرمن باشندوں کی طرح اس کی ناک ستواں اور آنکھیں چھوٹی تھیں۔ تاہم مجموعی اعتبار سے اسے خوب رو اور دل کش کہا جا سکتا تھا۔

جرمن کے محکمہ جاسوسی میں وہ میکسم ریڈون تھا۔ ان کے جاسوسوں کا جال دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں پھیلا ہوا تھا۔ ایک شہر میں ان کے جتنے بھی آدمی ہوتے تھے ان کا ایک سربراہ ہوتا تھا جسے وہ لوگ میکسم ریڈون کہتے تھے۔ ریڈون کے تحت کام

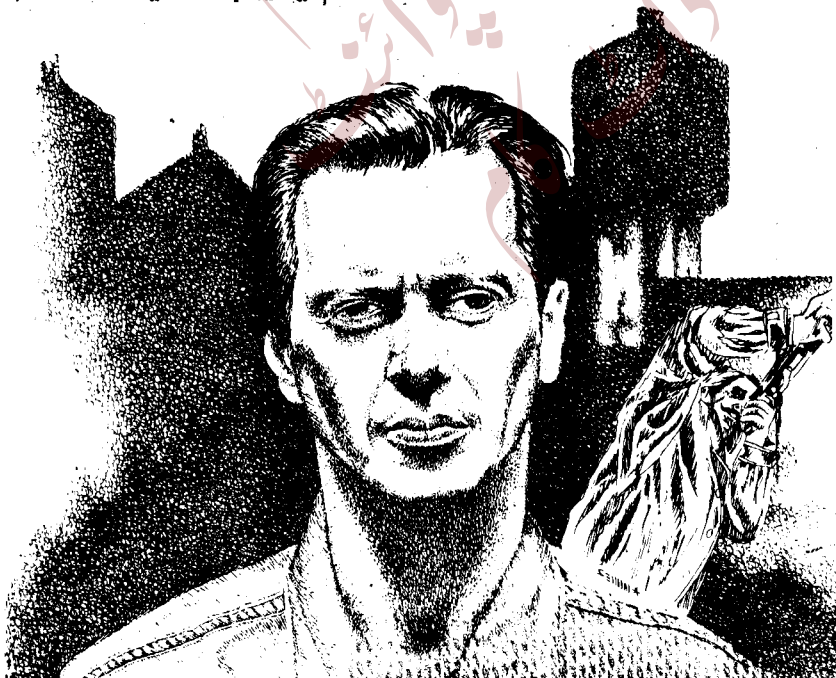

کرنے والوں کی تخصیص نمبروں کے ذریعے ہوتی تھی۔

باب ہک کو معلوم تھا کہ میکسم زکوف ان دنوں تاجکستان کے ہوٹل انٹرنیشنل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ میکسم زکوف اپنے ملک کے لیے جاسوسی کرنے کے علاوہ ایک ملک کے فوجی راز دوسرے ملک کے ہاتھ بھی بیچا

کرتا تھا۔ اس نے متعدد بار باب ہک کو بھی اس کی پیش کش کی تھی مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔

باب ہک سی آئی اے کا ایک فرض شناس آفیسر تھا اور اپنے شعبے کا سربراہ بھی تھا۔

اس نے چند روز پہلے تاجکستان کے ایک سائنس داں کی لیبارٹری سے ایک ایٹمی ہتھیار کا نقشہ اور اس کا فارمولا چرا لیا تھا۔ سی آئی اے کے ایک ایجنٹ نے تاجکستان سے اطلاع دی تھی کہ میکسم زکوف اس نقشے اور فارمولے کو جرمنی بھیجنا چاہتا ہے۔ اس خطرناک ایجاد کا جرمن کے ہاتھ میں جانا عالمی امن کے لیے بہتر نہ تھا۔ ڈی سیکشن کے انچارج کرنل ڈیوڈ نے باب ہک کو تاجکستان روزانہ کیا تھا تاکہ وہ میکسم زکوف سے تمام چیزیں چھین لے اور انہیں امریکا لا سکے۔

باب ہک ایک روز پہلے اس شہر میں وارد ہوا تھا۔ مقامی ایجنٹ سے اس نے تازہ ترین صورت حال معلوم کی اور دوسرے روز صبح ہی ایک ٹیکسی پکڑ کر ہوٹل انٹرنیشنل روانہ ہو گیا۔ اس وقت نو بجے کا عمل تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک کا اژدہام تھا اور راستوں پر رونق تھی۔ ہوٹلوں اور دکانوں پر کاروبار شروع ہو چکا تھا اور زندگی روزمرہ کے مطابق معمول پر تھی۔

ہوٹل انٹرنیشنل تاجکستان کے شہر ٹاؤن میں واقع تھا۔ تاجکستان ایک ترقی پذیر ملک تھا۔

ہوٹل انٹرنیشنل کی تعمیر اس انداز سے کی گئی تھی کہ وہ کسی بھی اعتبار سے خوب صورت معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ہوٹل کے دروازے اور کھڑکیاں بدوضع تھیں اور دیواروں میں جابہ جا درزیں پڑی ہوئی تھیں۔

باب ٹیکسی سے اتر کر ہوٹل میں داخل ہوا تو اسے ایک ڈیسک کلرک اپنی سیٹ پر اونگھتا دکھائی دیا۔ وہ تاجکستانی تھا اور اس ماحول کا ایک مناسب جزو معلوم ہوتا تھا۔ باب اس کے قریب سے گزر کر ایک تنگ سی لابی میں پہنچا اور پھر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

سیڑھیاں طے کرتے وقت اس نے حتی الامکان کوشش کی تھی کہ اس کے قدموں کی آواز نہ پیدا ہونے پائے۔ تیسری منزل پر پہنچ کر وہ راہداری کی طرف مڑ گیا۔ اب اس کا رخ کمرا نمبر تین سو سات کی طرف تھا۔

دروازے کے قریب پہنچ کر وہ سن گن لیتا رہا۔ نہ صرف راہداری میں سناٹا طاری تھا بلکہ کمرے سے بھی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ باب نے جھک کر، کی ہول سے آنکھ لگائی تو اسے کمرے میں تاریکی کا راج دکھائی دیا۔

باب نے ماسٹر کی نکال کر ہول میں داخل کی۔ وہ اس وقت پوری طرح سے محتاط تھا۔ کمرے میں چھائی ہوئی خاموشی سے یہ مطلب ہرگز اخذ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ زکوف وہاں نہیں ہوگا۔

لاک ایک ہلکی سی کلک کے ساتھ کھل گیا۔ باب نے چابی جیب میں رکھی اور ناب کو آہستہ سے گھما کر دروازہ کھول دیا۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت بھی ایسی کوئی آواز سنائی نہیں دی جس سے کسی کی موجودگی کا پتا لگ سکتا۔

باب نے پھرتی سے اپنا ریوالور نکال کر دروازا بند کیا اور کمرے پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ میکسم زکوف کہیں دکھائی نہ دیا۔ باب کا خیال تھا کہ وہ اس وقت اپنے لیے اخبار وغیرہ خریدنے گیا ہوگا۔

روشنی سے اچانک تاریکی میں آ جانے کی بنا پر پہلے تو کچھ واضح طور پر دکھائی نہ دیا پھر آنکھیں بتدریج تاریکی سے مانوس ہوتی چلی گئیں۔ باب نے کمرے اور اس سے ملحقہ باتھ روم کی تمام چیزوں کو بہ غور دیکھنا شروع کیا۔

کمرے کی ہر چیز بے ترتیبی کا شکار تھی۔ گندے برتن بکھرے ہوئے تھے۔ قالین داغ دار تھا۔ جابجا سگریٹ کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے اور ایک سنین زدہ بدبو پھیلی ہوئی تھی۔

میکسم زکوف وہ قیمتی نقشہ اور فارمولا کمرے میں چند ہی جگہوں پر چھپا سکتا تھا۔ بظاہر وہاں کوئی ایسی خاص جگہ نظر نہیں آ رہی تھی جو باب کو متجسس کرتی۔

یہ سوچنا عبث تھا کہ وہ قیمتی کاغذات زکوف اپنے ساتھ ساتھ لیے پھر رہا ہوگا حالانکہ یہ بات ممکن تھی مگر پیشہ وارانہ ضوابط کے خلاف تھی۔ ہر سیکرٹ ایجنٹ کوئی ایسی چیز ہاتھ لگتے ہی تیزی سے اسے کسی دوسرے کے ہاتھ منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے یا پھر اسے کسی ایسی جگہ چھپانے کی سعی کرتا ہے جہاں کسی کا ہاتھ نہ پہنچ سکے۔

منطقی رو سے زکوف وہ کاغذات وہیں چھپا سکتا تھا جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا، لیکن پندرہ منٹ کی مسلسل کوشش کے باوجود باب کو وہ کاغذات نہیں ملے۔ اس دوران میں اس نے کمرے کی ہر چیز تہ و بالا کر کے رکھ دی تھی مگر اس نقشے اور فارمولے کی جھلک کہیں دکھائی نہیں دی۔

باب نے کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ اس وقت دس بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ زکوف ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا وہ کسی کام سے کافی دور نکل گیا ہو۔ باب کو اسی دوران میں وہ کاغذات تلاش کر کے امریکا پہنچانا تھے۔ دوسری صورت میں وہ کاغذات ایک روز بعد دشمن کے ہاتھ میں پہنچ جاتے۔

کافی دیر دماغ سوزی کرنے کے بعد بھی کمرے اور باتھ روم میں ایسی کوئی چیز دکھائی نہیں دی جس پر یہ شبہ کیا جا سکتا کہ اس میں کاغذات چھپائے گئے ہوں گے۔ کمرے میں کوئی روشن دان یا خفیہ کھڑکی نہیں تھی۔ باب کو معلوم تھا کہ تاجکستان کے اعلا ہوٹلوں میں بھی مسافروں کو کسی قسم کی کوئی سہولت نہیں ملتی، گنتی کی چند چیزوں پر گزارا کرنا پڑتا ہے اور وہ ان گزارے لائق تمام چیزوں کو کھنگال چکا تھا۔

باب نے تھک ہار کر یہی مناسب خیال کیا کہ باتھ روم کو ایک بار پھر دیکھنا چاہیے۔ وہ اس ارادے سے باتھ روم کی طرف بڑھا ہی تھا کہ راہ داری میں اچانک آہٹ ہوئی۔ باب نے پھرتی سے ریوالور نکالا اور چھلانگ مار کر دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ ایک لمحے کی غفلت اس وقت کسی بڑی مصیبت کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔

چاپ اس بار دوسری منزل کی راہداری سے آتی محسوس ہوئی پھر کسی نے دروازہ کھولا تھا۔ باب نے اطمینان کا سانس لیا اور ریوالور ہولسٹر میں رکھ کر دوبارہ باتھ روم کی طرف مڑا۔

ٹھیک اسی وقت ایک مدھم سی ''کلک'' ابھری اور کمرے کا دروازہ کھلا۔ باب ٹھٹک گیا اس نے اپنا ریوالور نکالنا چاہا مگر اسے اس کی مہلت نہیں ملی۔

میکسم زکوف نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سرد لہجے میں کہا۔ ''یہ احمقانہ حرکت تمہیں موت کے منہ میں بھی پہنچا سکتی ہے۔ اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔''

باب نے ریوالور نکالنے کا ارادہ ترک کر دیا اور ہولسٹر پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔

زکوف نے دروازہ بند کیا اور کوئی مہلت دیے بغیر باب کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور دبا ہوا تھا جس کی نال اب باب کے سینے کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

وہ قد و قامت میں تقریباً باب کے برابر تھا اور اپنے انداز سے کافی چاق و چوبند دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے باب کا ریوالور اندرونی ہولسٹر سے نکال کر بستر کی طرف اچھال دیا اور چند قدم پیچھے ہٹتا ہوا بولا۔ ''خوش آمدید باب ہک!''

''تم بہت جلد لوٹ آئے۔'' باب نے وقت گزاری کے لیے ایک فضول سا جملہ کہا۔

باب کا دماغ تیزی سے مختلف راہوں پر دوڑ رہا تھا۔ ایک ریوالور کی نال اس کے سینے کی طرف اٹھی ہوئی تھی اور وہ یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ اس کی نال سے کس لمحے ہلاکت خیز شعلہ نکلے گا۔ بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کمرے کی موجودہ ترتیب پر تمہیں غصہ بھی آ سکتا ہے مگر میرا خیال ہے کہ اس قسم کے بے ہودہ کمرے میں سامان کی ترتیب ایسی ہی ہونا چاہیے۔''

زکوف کے ہونٹ جواباً زہریلے انداز میں کھنچ

گئے۔ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''مگر سامان کو اس نئی ترتیب سے رکھنے کے بعد بھی وہ کاغذات تمہارے ہاتھ نہیں لگ سکے، کیوں؟''

''مجھے اعتراف ہے کہ میں انہیں تلاش کرنے میں ناکام رہا۔'' باب بولا۔ ''اس جستجو میں میرا بہت وقت ضائع ہوا ہے۔''

''یہ اعتراف سن کر مجھے مسرت ہوئی۔'' زکوف بولا۔ ''وہ کاغذات اتنے قیمتی ہیں کہ مجھے ان کے لیے ایسی جگہ تلاش کرنا پڑی جہاں کسی زیرک ترین شخص کے ہاتھ نہ پہنچ سکیں۔''

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' باب بے پروائی سے بولا۔ ''اگر مجھے تھوڑی سی مہلت اور ملتی تو میں یقیناً انہیں تلاش کر لیتا۔''

''کیا مطلب؟'' زکوف کا لہجہ استفہامیہ تھا۔

''تم بہت ذہین اور دانش مند شخص نہیں ہو۔'' باب بولا۔ ''تھوڑی سی کوشش سے ایک بچہ بھی تمہیں مات دے سکتا ہے۔''

زکوف کے چہرے کے عضلات میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ اس نے سرد آواز میں کہا۔ ''تم نے کیا اندازہ لگایا ہے۔ وہ کاغذات کہاں ہو سکتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ کاغذات اس باتھ روم میں ہوں گے۔'' باب نے ایک ثانیے کے لیے مڑ کر باتھ روم کی طرف اشارہ کیا۔

اس کا داہنا ہاتھ اب تک اٹھا ہوا تھا۔ باتھ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جب وہ اسے نیچے لایا تو اس نے خفیف سا جھٹکا دیا۔ اس طرح اس کے جیکٹ کی آستین میں چھپا ہوا تیز دھار خنجر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ باب، زکوف کی طرف پلٹنے کے بجائے پھرتی سے فرش پر بیٹھ گیا۔ زکوف کے ریوالور سے ایک شعلہ کوندا اور سامنے والی دیوار میں جا کر معدوم ہو گیا۔ اس محدود سے کمرے میں اس قدر زور دار دھماکا ہوا تھا کہ اس کی دیواریں ہلتی محسوس ہوئی تھیں۔

گولی باب کی جیکٹ پر سے رگڑ کھاتی ہوئی گزری تھی۔ اس نے فائر ہوتے ہی قلابازی کھائی اور زکوف سے چند قدم دور ہو گیا۔

پھر اس سے پہلے کہ زکوف دوسرا فائر کرتا باب نے ہاتھ میں دبا ہوا خنجر اس کے سینے کی طرف پھینکا مگر وہ وہاں پیوست ہونے کے بجائے زکوف کے شانے میں پیوست ہو گیا۔

زکوف کے حلق سے ایک کراہ نکلی اور ریوالور اس کی انگلیوں میں جھول گیا۔ باب نے اسے مہلت نہیں دی۔ اس نے زکوف کی ٹانگیں پکڑ کر کھینچ لیں۔ وہ دیوار سے ٹکراتا ہوا فرش پر گرا۔ باب نے برق رفتاری سے اس کے ریوالور والے ہاتھ کو مروڑ کر جھٹکا دیا۔ ریوالور زکوف کی انگلیوں سے نکل کر دور جا پڑا۔

زکوف نے اپنی لاتیں چلائیں تو باب نے ایک طرف ہو کر خود کو ان سے محفوظ رکھا۔ اس نے جواباً زکوف کے جبڑے پر وار کیا۔ ہڈی چٹخنے کی آواز آئی اور باب نے اس کا جبڑا ٹیڑھا کر دیا۔ زکوف نے ہاتھ پیر ڈھیلے ڈال دیے۔ اس کی باچھوں سے خون بہہ رہا تھا اور وہ گہرے سانس لے رہا تھا۔

باب نے خنجر اس کے شانے سے نکالتے ہوئے پوچھا۔ ''نقشہ کہاں ہے۔'' سفاک لہجے میں سوال کیا۔

زکوف کے ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔

''کسی کو بلاوجہ ہلاک کرنا میرے اصول کے خلاف ہے۔'' باب نے دانت پیس کر کہا۔ ''مگر تم نے اپنی زبان نہیں کھولی تو تمہیں ہلاک کر دوں گا۔''

زکوف نے نفی میں سر ہلایا تو باب نے خنجر کی نوک اس کی گردن پر پھیر دی۔ زکوف کی گردن کی کھال کٹ گئی جس جگہ خنجر پھیرا گیا تھا وہاں اب ایک سرخ لکیر دکھائی دے رہی تھی۔

دفعتاً راہ داری میں دوڑتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ شاید ہوٹل کے عملے نے فائر کی آواز سن لی تھی اور وہ حقیقت معلوم کرنے کی غرض سے ادھر بھاگے تھے۔ ''کون ہے۔۔۔ یہ آواز کیسی تھی۔'' ان میں سے ایک نے بلند آواز سے پوچھا

لا۔

"کچھ نہیں! سب ٹھیک ہے۔" باب نے اجنبی زبان میں جواب دیا۔ "میں اپنا ریوالور صاف کر رہا تھا کہ گولی چل گئی۔"

زکوف نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر باب نے جھٹ سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے غرا کر سرگوشی کی۔ "پولیس چند منٹ بعد اس کمرے تک پہنچ جائے گی اور میں مجبوراً تمہارا کام تمام کردوں گا۔ تمہاری زندگی اسی صورت میں بچ سکتی ہے کہ کاغذات کا پتا بتادو۔"

"تم مجھ سے بہ خوبی واقف نہیں ہو۔" زکوف بولا۔ "ورنہ مجھے جان سے مارنے کی دھمکی نہ دیتے۔ زندگی اور موت کی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں۔ تم خوشی سے میری جان لے سکتے ہو۔"

باب نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ سی آئی اے کے ریکارڈ میں زکوف کے متعلق وہی کچھ لکھا تھا جو اس نے اپنی زبان سے ابھی بتایا تھا مگر اس کے علاوہ ریکارڈ میں یہ بھی درج تھا کہ وہ عورتوں میں بے حد مقبول ہے اور ان ہی کے درمیان گھرا رہنا پسند کرتا ہے۔

"ٹھیک ہے میکسم زکوف۔۔۔!" باب بولا۔ "میں تمہیں ہلاک نہیں کروں گا۔ اس کے بجائے میں تمہارا چہرہ بگاڑ دوں گا۔ تمہیں اپنے حسن پر بہت ناز ہے نا! تمہارے متعلق مشہور ہے کہ لڑکیاں تم پر جلد فریفتہ ہوجاتی ہیں لیکن جب یہ چہرہ ہی نہیں رہے گا تو۔۔۔"

"کک۔۔۔کیا۔" زکوف آنکھیں پھاڑ کر ہکلایا۔ "تت۔۔۔تم نے۔۔۔کک۔۔۔کیا کہا۔"

باب نے سرد لہجے میں کہا۔ "میں اپنی بات دوہرانا پسند نہیں کرتا۔" اس نے خنجر سے زکوف کے داہنے گال پر ایک ہلکی سی لکیر بنائی اور پھر اس کی ایک آنکھ پر خنجر کی نوک رکھتا ہوا بولا۔ "اگر میں تمہاری ایک آنکھ پھوڑ دوں تو کیسی رہے گی۔"

باب کی اس حرکت پر میکسم زکوف بری طرح سراسیمہ ہوگیا۔ اسے توقع تھی کہ جب تک وہ کاغذات کا پتا نہیں بتادے گا۔ باب اس پر انگلی بھی نہیں اٹھائے گا مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس نے کمرے کی اکلوتی کھڑکی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"وہ۔۔۔وہ۔۔۔"

باب نے خنجر ایک طرف پھینک کر زکوف کی کنپٹیوں پر دباؤ ڈالا۔ زکوف کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکلیں اور پھر اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ وہ بے ہوش ہوچکا تھا۔

باب نے اس کی طرف مطمئن ہوجانے کے بعد اس کی کھڑکی کی طرف چھلانگ لگائی۔ کھڑکی کے فریم میں ایک شٹر لگا تھا جو کھٹکا دبانے پر اٹھ جاتا اور گر جاتا تھا۔ کھڑکی اس وقت بند تھی۔

باب نے اس کا کھٹکا دبا کر شٹر اٹھا دیا۔ اس کی نچلی پٹی کا جائزہ لینے پر اسے محسوس ہوا کہ وہ آسانی سے علیحدہ ہوسکتی ہے۔ باب نے اسے تھوڑی سی دیر میں شٹر سے الگ کرلیا۔

شٹر دوہرا ثابت ہوا۔ نچلی طرف لگی ہوئی لکڑی ہٹتے ہی ایک جھری ظاہر ہوئی تھی اور ایک تہ کیا ہوا کاغذ اس دوہرے شٹر میں سے پڑا تھا۔

باب نے اسے کھول کر ایک نگاہ ڈالی اور پھر اس کھڑکی سے باہر لٹک گیا۔ وہ ہوٹل کی عقبی سمت تھی اور ایک ہنگامی سیڑھی کھڑکی سے لگ کر نیچے تک چلی گئی تھی۔

راہداری کی طرف سے بہت سی آوازیں آئیں اور تاجکستانی زبان میں دروازہ کھولنے کو کہا گیا۔ اسی دوران میں ہوٹل کے صدر دروازے پر پولیس وین کے سائرنوں کی آواز بھی سنائی دی تھی مگر باب ان تمام چیزوں سے بے نیاز اس فولادی سیڑھی سے عقبی گلی میں اتر رہا تھا جو آگ وغیرہ لگ جانے کی صورت میں استعمال ہوتی ہے۔

☆☆☆

باب نے احتیاط کے پیشِ نظر اپنی قیام گاہ تبدیل کردی۔ وہ اسی وقت دوسرے ہوٹل میں منتقل

ہوگیا تھا۔ میکسم زکوف کی طرح اس نے بھی وہ کاغذات بالکل سامنے رہنے والی ایک چیز میں چھپا دیے۔ وہ اس دوران میں جب بھی ہوٹل سے باہر گیا۔ کاغذات اس کے کمرے میں موجود ہوتے۔

وہ خفیہ کاغذات اب اسے دوسرے روز ائرپورٹ پر ایک آدمی کے حوالے کرنا تھے جہاں سے اس آدمی کو تازہ ترین فلائٹ سے امریکا روانہ ہونا تھا۔

ائرپورٹ جا کر باب کو اس مقامی ایجنٹ سے ایک سگریٹ طلب کرنا تھی اور پھر چند کوڈز کا تبادلہ کرنا تھا۔ یہ کارروائی مکمل ہوتے ہی کاغذات اس شخص کے حوالے کر دینا تھے۔

دوسرے روز دس بجے کے قریب باب نے کاغذات اپنی جیب میں رکھے اور ہوٹل سے باہر آ گیا۔ اس نے احتیاطاً ہوٹل کے دروازے سے کوئی ٹیکسی نہیں لی اور دو فرلانگ تک پیدل چلتا رہا۔ اس دوران میں وہ یہ اندازہ بھی لگانا چاہتا تھا کہ کوئی اس کا تعاقب نہیں کر رہا ہے مگر جب اس دوران میں کسی نے اس کا تعاقب نہیں کیا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے خدشات بے بنیاد تھے۔ ٹیکسی اسٹینڈ پر آ کر اس نے ایک ٹیکسی لی اور ڈرائیور سے ائرپورٹ چلنے کو کہا۔

ٹیکسی وہاں سے آگے بڑھی تو باب نے عقبی سیٹ سے ٹیک لگا کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اسے یہ مشن اتنی جلدی مکمل ہونے پر حیرت ہو رہی تھی۔

ٹیکسی ابھی دو یا تین بلاک آگے گئی ہوگی کہ باب چونک پڑا۔ اس کا اطمینان رخصت ہوگیا تھا۔ ایک سیاہ رنگ کی کار ٹیکسی کا پیچھا کر رہی تھی۔

"بائیں جانب موڑ لو۔" باب نے ڈرائیور سے کہا۔

"مگر آپ تو ائرپورٹ جانا چاہتے تھے۔ اس طرف سے تو۔۔۔"

"تم اس کی پروا نہ کرو۔" باب اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"ائرپورٹ پہنچنے سے پہلے میں اپنے ایک دوست سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"

ڈرائیور نے بڑبڑا کر ٹیکسی بائیں طرف موڑ دی۔ سیاہ کار اب بھی ان کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ باب کی تمام حسیات جاگ اٹھی تھیں اور وہ پوری طرح چوکنا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور اب اس کی ہدایت پر ٹیکسی کو دائیں بائیں موڑ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ باب تعاقب میں آنے والی گاڑی سے بچنا چاہتا ہے۔ ڈرائیور ٹیکسی کو ہدایت کے مطابق لہراتا ہوا مرکزی سڑک پر آ گیا۔ پھر اس نے باب کی طرف مڑ کر پوچھا۔ "اب کہاں چلیے گا جناب!"

"بس سیدھے چلے چلو۔" باب نے جواب دیا۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچنے میں مشغول تھا۔ ایک بار اس نے ارادہ کیا کہ وہ ان کاغذات کو ٹیکسی میں ہی کہیں چھپا دے مگر یہ سوچ کر باز رہا کہ اس کے تعاقب میں آنے والے ٹیکسی کی تلاشی بھی لے سکتے ہیں۔

تقریباً دو میل کے بعد باب کو دور ہی سے عجائب گھر دکھائی دیا۔ اس عجائب گھر میں نوادرات کی نمائش ہوتی تھی اور اس کے ساتھ ہی تاجکستان کے سب سے بڑے فلسفی شاعر فیروز بخت کو تحفے میں ملنے والی اشیا بھی وہیں رکھی جاتی تھیں۔ فیروز بخت اسی عجائب گھر میں واقع ایک عمارت میں رہتے تھے۔

"عجائب خانے کی طرف چلو۔" باب نے ڈرائیور کی طرف ایک بڑا سا کرنسی نوٹ اچھالتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس کے گیٹ پر اتار کر تم وہاں سے چلے جانا۔"

"شکریہ جناب۔" ڈرائیور نے وہ نوٹ اپنی جیب میں ٹھونستے ہوئے احسان مندی سے کہا۔

جیسے ہی ٹیکسی عجائب خانے کے دروازے پر رکی باب نے دروازہ کھولا اور لمبی سی زقند بھر کر اندر چلا گیا۔ وہاں سیاحوں کی بھیڑ تھی اور اس بنا پر اس کے تعاقب میں آنے والے اس پر فائرنگ نہیں کر سکتے تھے۔

باب نے عجائب گھر کے ایک چوڑے سے دالان کے پیچھے چھپ کر دیکھا۔ سیاہ کار بھی اسی دروازے پر رکی تھی۔ اس میں سے اب دو آدمی باہر آرہے تھے۔

باب ایک ہال سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں پہنچ گیا۔ تیسرے ہال میں استقبالیہ کاؤنٹر بنا ہوا تھا اور وہیں پر ٹکٹ فروخت ہوتے تھے۔ باب نے اپنے لیے ٹکٹ خریدا اور سیاحوں کی بھیڑ میں شامل ہو کر اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔

اس کے تعاقب میں آنے والے دونوں افراد جرمن لگ رہے تھے۔ باب کو یقین تھا کہ وہ جرمن کے مقامی ایجنٹ ہوں گے۔

جب وہ گارڈز کو ٹکٹ دکھا کر ہال میں داخل ہو رہا تھا تو وہ دونوں استقبالیہ کاؤنٹر پر پہنچ چکے تھے۔

باب برق رفتاری سے ان سیڑھیوں کی طرف بڑھا جو عجائب گھر کی گیلریوں کی طرف جاتی تھیں۔ انہی گیلریوں میں فیروز بخت کے تحائف اور قیمتی کتابیں رکھی جاتی تھیں۔

ایک چھوٹے سے ہال میں دونوں جانب شیشے کی الماریوں میں قسم قسم کی اشیا سجی ہوئی تھیں۔ سونے چاندی کے پرانے ظروف، سنہرے سکے، زیورات اور قدیم مذہبی کتب، وہاں آقائے فیروز بخت کا سامان ہی نہیں بلکہ ان کے پیش رو شاعروں کا اثاثہ بھی محفوظ کیا گیا تھا۔ بڑے برتن اور پتھروں کے مجسمے الماریوں کے باہر بھی رکھے تھے۔

"باب نے سیڑھیاں طے کر کے اپنا سانس درست کیا اور پھر لائبریری میں گھس گیا۔ لائبریری کے دو دروازے تھے اور دونوں پر اس وقت ایک ایک مسلح محافظ متعین تھا۔ باب نے ان تمام چیزوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور کوئی ایسی چیز تلاش کرنے لگا جہاں وہ اپنے قیمتی کاغذات چھپا سکے۔ ان کاغذات کو اپنے پاس رکھنا اس وقت خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہ دونوں سیکرٹ ایجنٹس کسی وقت بھی اس کے قریب پہنچ سکتے تھے۔

باب نے کاغذات اپنی جیب سے نکال کر انہیں تہہ کیا اور ان چیزوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا جو شیشے کی الماریوں کے باہر رکھی تھیں۔

دروازوں پر متعین دونوں محافظ ایک جگہ ساکت کھڑے ہونے کے بجائے آہستہ آہستہ ٹہل رہے تھے۔ باب کن انکھیوں سے ان کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔ اسے کسی ایسے لمحے کی تلاش تھی جب وہ دونوں بہ یک وقت نگاہ سے اوجھل ہو جائیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک ایسا لمحہ میسر آ گیا۔

باب نے پھرتی سے ایک کونے میں رکھی ہوئی کانچ کی صراحی میں تہہ کیا ہوا کاغذ ڈال دیا۔ کاغذ کی تہہ فوراً ہی کھل گئی تھی اور وہ نیچے تک پہنچنے کے بجائے گردن میں ہی پھنس گیا تھا۔

ٹھیک اسی وقت لائبریری کے دروازے پر چاپ ابھری۔ باب آہستہ قدمی سے آگے کھسک گیا۔

وہ دونوں اور ان کے ساتھ تین چار سیاح مزید اندر آ گئے۔ باب ہر ایک چیز کو دیکھتا ہوا دوسرے دروازے پر پہنچ گیا۔ اسے یقین تھا کہ قیمتی کاغذات صراحی میں ڈالتے ہوئے اسے کسی نے نہیں دیکھا ہے۔

جب باب سیڑھیاں طے کر کے ایک اور ہال کی طرف جا رہا تھا تو اس نے ان میں سے ایک کو اپنے پیچھے آتے دیکھا۔ ہال کی طرف جاتے ہوئے باب اچانک باتھ روم کی طرف مڑ گیا۔ اس کی عقابی نگاہ نے محسوس کر لیا تھا کہ اس وقت ادھر کوئی نہیں ہے۔

باتھ روم میں داخل ہوتے ہی باب ایک دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ حسب توقع ریڈ پول ایجنٹ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دروازے سے اندر آیا۔ اسے باب کی تلاش تھی مگر اندر قدم رکھتے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے ہوں گے کیوں کہ باب نے اچھل کر اس کی گردن پکڑ لی تھی اور اسے دیوار سے رگڑ ڈالا تھا۔ اس کے شکار کے حلق سے کرب ناک آوازیں نکلیں اور اس نے اپنا سر ایک

طرف ڈال دیا۔

اس باتھ روم میں ایک عقبی دروازہ بھی تھا۔ شاید وہ خاکروب کے لیے خصوصی راہ تھی تاکہ وہ لوگوں کی نگاہ میں آئے بغیر اپنا کام کرکے چلا جائے۔

باب نے اس دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھا تو اسے محسوس ہوگیا کہ دروازہ مقفل ہے۔ اس نے جیب سے ماسٹر کی نکال کر لاک کھولا اور عقبی سیڑھیاں طے کرتا ہوا عمارت کے پچھلے حصے میں پہنچ گیا۔

وہیں تھوڑے فاصلے پر کار پارکنگ تھی۔ باب نے ایک ٹیکسی کے قریب پہنچ کر اس کے ڈرائیور سے کہا۔ ''ہوٹل توران چلو۔''

ڈرائیور نے اپنے دانتوں کی نمائش کی اور باب سے بیٹھنے کو کہا۔ جب ٹیکسی عجائب گھر کے سامنے والے حصے سے گزری تو باب کو ریڈ پول کا دوسرا ایجنٹ صدر دروازے پر کھڑا دکھائی دیا۔ شاید اس کے ساتھی نے باب کو مکمل طور پر گھیرنے کے لیے اسے وہاں بھیجا تھا۔

ٹیکسی جب صدر دروازے کے قریب سے گزرنے لگی تو باب نے اپنی سیٹ کے پاس پڑا ہوا اخبار اٹھا کر چہرے کے سامنے کرلیا تاکہ اس پر کسی کی نگاہ نہ پڑ سکے۔

ہوٹل توران پہنچنے سے پہلے باب نے اس مقامی ایجنٹ کو فون کرکے صورت حال سے مطلع کیا اور اگلے روز صبح ائرپورٹ پر پہنچنے کی ہدایت کی۔

☆☆☆

باب نے ہوٹل توران پہنچنے کے بعد اپنا سامان اٹھایا اور دو بلاک چھوڑ دوسرے ہوٹل میں منتقل ہوگیا۔ ان ساری احتیاطی تدابیر کا مقصد یہ تھا کہ وہ کاغذات امریکا تک بہ حفاظت پہنچ جائیں اور اس سلسلے میں زیادہ ہنگامہ آرائی نہ کرنا پڑے۔

دھاچوکڑی کی صورت میں تاجکستان کا محکمہ جاسوسی ہوشیار ہوسکتا تھا اور اس کی راہ میں مزید مشکلات کھڑی ہوسکتی تھیں۔

باب نے دوسرے روز صبح سب سے پہلے ایک جنرل اسٹور سے ایک لمبی سی چمٹی خریدی۔ اس لمبی گردن والی صراحی میں سے اب وہ کاغذات نکالنا آسان نہ تھا۔ صراحی کو چھونے یا اسے ہاتھ لگانے پر محافظین ہوشیار ہوسکتے تھے۔ اب ایک ہی صورت رہ جاتی تھی کہ کسی لمبی چمٹی کی مدد سے وہ کاغذات اس کی گردن میں سے دوبارہ کھینچ لیے جائیں۔

جیسے تیسے اس نے ناشتا کیا اور عجائب گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ باب چاہتا تھا کہ عجائب گھر جیسے ہی سیاحوں کے لیے کھولا جائے وہ اسی وقت اندر پہنچ جائے۔ مجمع ہونے کی صورت میں وہ صحیح طور پر اپنا کام انجام نہیں دے سکتا تھا۔

ٹیکسی عجائب گھر کے دروازے پر پہنچی تو باب نے وہاں مجمع دیکھا۔ یہ کوئی تشویش ناک بات نہیں تھی۔ فیروز بخت ہفتے میں دوبار اپنی قیام گاہ کی کھڑکی میں آکر لوگوں کو جلوہ دکھاتے تھے مگر آج سیاحوں اور مقامی لوگوں کا ہجوم کچھ زیادہ ہی تھا۔

باب کو اپنی ٹیکسی مجبوراً عجائب گھر سے آدھے فرلانگ پہلے ہی چھوڑنا پڑی۔ وہ کرایہ ادا کرکے اس طرف لپکا تو اس کی راہ میں مجمع حائل تھا۔ باب ان کے بیچ سے راستہ بناتا ہوا کسی نہ کسی طرح سے مرکزی دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔

فیروز بخت کی قیام گاہ عجائب گھر کے ابتدائی حصے میں تھی۔ وہاں سرہی سر دکھائی دے رہے تھے۔ دفعتاً لوگوں نے نہایت گرم جوشی سے نعرے لگانا شروع کردیے۔ باب نے چونک کر اس کھڑکی کی طرف دیکھا جہاں آقائے بخت جلوہ آرائی کرتے تھے۔ وہ اس وقت وہاں کھڑے ہاتھ ہلا رہے تھے۔

ان کے جسم پر ایک سفید رنگ کا چغا سا تھا اور سر پر سفید ہی ٹوپی تھی۔ گلے میں بڑی سی تسبیح پڑی تھی جس کے دانے دور سے چمک رہے تھے۔

باب نے محسوس کیا تھا کہ ان کی شخصیت میں بہت سحر ہے۔ کوئی آدمی ان سے نگاہ نہیں چرا سکتا۔ وہ ان کی دل کش شخصیت میں کھویا ہوا ان کے جمال کا

نظارہ کررہا تھا کہ اس نے اچانک دھماکوں کی آواز سنی۔

جب سامنے والی اس کھڑکی کا شیشہ چکنا چور ہوگیا جہاں فیروز بخت کھڑے تھے تو باب کو پتا چلا کہ ان پر فائرنگ کی گئی ہے۔

ایک شخص نے چیخ کر کچھ کہا۔ فیروز بخت کے باڈی گارڈز نے انہیں پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔

دو فائر مزید ہوئے اور کھڑکی میں لگے ہوئے شیشے کی کرچیاں لوگوں پر برسیں۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی لوگ سراسیمہ ہوگئے تھے اور متعدد افراد نے چیخنا شروع کردیا تھا۔

باب نے سر گھما کر چاروں طرف دیکھا لیکن یہ اندازہ لگانے سے قاصر رہا کہ گولیاں کس جانب سے چلائی گئی تھیں۔ فیروز بخت اس حملے میں بال بال بچے تھے۔ گولیاں ان کے سر پر سے محض چند انچ کے فاصلے سے گزری تھیں۔

کچھ لوگ اپنی جانیں بچانے کی فکر میں تھے اور کچھ اپنی جان کی پروا کیے بغیر فیروز بخت کی قیام گاہ کی طرف بھاگے تھے۔ غالباً وہ سب یہ اطمینان کرنا چاہتے تھے کہ فیروز بخت زخمی تو نہیں ہوئے۔

کھڑکی پر اب پردہ گرادیا گیا تھا اور عظیم شاعر نگاہ سے اوجھل ہوگئے تھے۔ عجائب گھر کے دروازے اور سیڑھیوں پر سینکڑوں افراد کا ہجوم تھا اور سب کی توجہ اسی جانب مبذول تھی۔

باب عجائب گھر کی عمارت کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اس نے اپنے عقب میں ایک عجیب سی آواز سنی۔ وہ چونک کر مڑا تو اسے ایک سیاہ رنگ کی کار شور مچاتی ہوئی دکھائی دی۔ کار کا ڈرائیور بہت مہارت سے لوگوں کے درمیان راستہ بناتا ہوا سیدھا ادھر ہی آرہا تھا۔ باب کا ذہن متعدد الجھنوں کا شکار تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کار اتفاقاً ادھر آرہی ہے یا وہ کوئی سوچی سمجھی اسکیم ہے۔

ابھی وہ اس پریشانی کا شکار تھا کہ اس نے فضا میں گڑگڑاہٹ سنی۔ باب نے چونک کر اوپر دیکھا۔ ایک ہیلی کاپٹر لائبریری والے حصے پر گردش کرتا نظر آیا۔ چونکہ اس کی توجہ اب تک فیروز بخت اور اس کے بعد اس سیاہ کار کی طرف تھی۔ اس لیے وہ یہ اندازہ قائم نہ کرسکا کہ ہیلی کاپٹر کس طرف سے آیا تھا۔ ساخت کے اعتبار سے وہ ہیلی کاپٹر تاجکستانی لگ رہا تھا۔ وہ چند ثانیوں تک نگاہ کے سامنے رہا پھر لائبریری کے عقب میں جا کر اوجھل ہوگیا تاہم اس کی گڑگڑاہٹ یہ غمازی کررہی تھی کہ وہ ابھی بھی وہیں موجود ہے۔

باب لوگوں کے درمیان جگہ بناتا ہوا بہ دقت تمام پہلے ہال تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ اس کی چھٹی حس چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ ہیلی کاپٹر کی آمد خالی از علت نہیں۔

برآمدے میں پہنچتے ہی ہیلی کاپٹر اسے لائبریری والے حصے کے اوپر منڈلاتا نظر آیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا پائلٹ اسے فضا میں کسی مخصوص جگہ رکھنا چاہتا ہے۔

تمام لوگوں کی توجہ ہنوز اس طرف مبذول تھی جہاں کچھ دیر پہلے فیروز بخت کھڑے تھے۔ حد یہ تھی کہ عجائب گھر میں متعین محافظ بھی ان پر حملے کی خبر سن کر مضطرب ہوگئے تھے۔ ان میں سے چند ان کی قیام گاہ کی طرف چلے گئے تھے۔

عقب سے آنے والی سیاہ کار صدر دروازے سے داخل ہوکر برآمدے تک پہنچ گئی۔ باب نے اسے دیکھ کر اپنے آپ کو ایک چوڑے سے ستون کی آڑ میں چھپالیا۔ کار کے ٹائر چرچرائے اور اس میں سے دو آدمی اتر کر عجائب گھر کی عمارت کی طرف بڑھے۔

دفعتاً ہیلی کاپٹر کے نچلے حصے میں ایک دروازہ نمودار ہوا اور ایک شخص فولادی رسے سے نیچے اترنے لگا۔

باب جب چھلانگیں لگاتا ہوا استقبالیہ کاؤنٹر پر پہنچا تو اس نے وہاں بہت سے سیاحوں اور عجائب گھر کے محافظین کو اِدھر اُدھر بھاگتے دیکھا۔ وہ سب ایک

دوسرے سے آقائے فیروز بخت کی خیریت معلوم کررہے تھے۔

ان دونوں آدمیوں کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی اور وہ سرعت سے لائبریری کی طرف چلے گئے۔ باب محتاط انداز میں ان کا پیچھا کررہا تھا۔ ویسے تو وہ ان سے آگے تھا اور ان سے پہلے لائبریری تک پہنچ سکتا تھا مگر انہیں آگے جانے کا موقع فراہم کرکے وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ان کے کیا ارادے ہیں اور وہ وہاں کیوں آئے ہیں۔

کچھ وقفہ دے کر اس نے بھی لائبریری کو جانے والی سیڑھیاں طے کیں۔ جب وہ راہداری میں پہنچا تو اس پر پے در پے دو فائر ہوئے۔ وہ ٹھٹھک گیا۔ دونوں فائر لائبریری کی اس سمت سے ہوئے تھے جہاں اس نے وہ قیمتی کاغذات چھپائے تھے۔

باب نے اپنا ریوالور نکال کر دیوار کی آڑ لے لی۔ وہ تھوڑی دور تک سرک کر بڑھا تھا کہ اسے راہداری میں ایک محافظ کی لاش پڑی دکھائی دی۔ اس باوردی محافظ کی کنپٹی سے خون بہہ رہا تھا۔

باب نے اس کی نبض دیکھی اور مایوسی سے سر ہلاتا ہوا لائبریری کے قریب پہنچا۔ لائبریری کا بلند و بالا مہاگنی کا دروازہ اندر سے بند کیا جارہا تھا۔ باب نے کھلے ہوئے حصے میں دو فائر جھونک مارے مگر بے سود۔

مہاگنی کا بڑا دروازہ بند ہوگیا اور اس کے لاک میں چابی گھومنے کی آواز سنائی دی پھر اسی قسم کی آوازیں دوسرے حصے سے بھی سنائی دیں۔ شاید لائبریری کے دوسرے دروازے کو بھی بند کردیا گیا تھا اور اس کے محافظ کو بھی ٹھکانے لگادیا گیا تھا۔

وہ لائبریری جہاں قیمتی نوادرات رکھے تھے۔ اب مکمل طور پر اندر سے بند تھی۔ اس کے اندر کوئی چڑیا کا بچہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔

باب نے اس وقت راہداری میں قدموں کی آہٹ سنی۔ وہ چونک کر مڑا تو اسے تین سیاح ادھر آتے دکھائی دیے۔ ان کی نگاہ جیسے ہی محافظ کی لاش پر پڑی وہ بری طرح سے چیخنے چلانے لگے۔ باب نے انہیں وہاں سے چلے جانے کا مشورہ دیا اور خود اس کھڑکی کی طرف بڑھا جو بائیں جانب دروازے کے قریب ہی واقع تھی۔

اس نے کھڑکی کھول کر جھانکا تو اسے ایک حیران کن منظر دکھائی دیا۔ ہیلی کاپٹر سے اس وقت ایک بہت بڑی فولادی بالٹی لٹک رہی تھی۔ ہیلی کاپٹر کے پائلٹ کی کوشش تھی کہ وہ بالٹی کسی طرح سے اس کھڑکی تک پہنچ جائے جو لائبریری میں کھلتی تھی۔

باب کی سمجھ میں وہ ڈراما مکمل طور پر آ گیا۔ فیروز بخت پر وہ حملہ سراسر جعلی تھا۔ مقصد انہیں ہلاک کرنا نہیں بلکہ لوگوں کی توجہ ادھر مبذول کرانا تھا۔ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی رہے تھے۔ لوگ سراسیمہ ہوکر ادھر بھاگے اور لائبریری کا حصہ سنسان ہوگیا۔

اب اس بڑی بالٹی میں لائبریری کے قیمتی ظروف، زیورات اور سکے لاد کر ہیلی کاپٹر میں پہنچائے جارہے تھے اور انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔

باب کے جسم پر سنسنی طاری ہوگئی۔ شیشے کی وہ صراحی بھی ہیلی کاپٹر میں منتقل ہوسکتی تھی جس میں ایک مہلک ایجاد کے کاغذات رکھے تھے۔

باب کو اپنے عقب میں چاپ سنائی دی۔ وہ مڑا تو اس نے متعدد افراد کو وہاں منہ کھولے کھڑے پایا۔ ان تینوں سیاحوں نے مزید آدمیوں کو اس گڑبڑ سے مطلع کردیا تھا۔

باب نے انہیں ہاتھ ہلا کر وہاں سے جانے کا اشارہ کیا مگر ان میں سے کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ اس نے بے پروائی سے اپنے شانے جھٹکے اور دوڑتا ہوا اس بلند و بالا دروازے کے قریب پہنچ گیا جو اس وقت بند تھا۔ اس نے کی ہول سے اپنا کان لگایا تو اسے اندر سے ایک چھنا کا سنائی دیا۔ شاید شیشے کے کسی برتن کو اٹھانے یا رکھنے میں بے احتیاطی کا مظاہرہ کیا گیا تھا اور وہ ٹوٹ گیا تھا۔ دنیا کے کونے

کونے سے آئے ہوئے تحائف نہایت بے دردی سے اس بالٹی میں جھونکے جا رہے تھے جو ہیلی کاپٹر سے لٹک رہی تھی۔ اس عمل میں جو چیزیں ٹوٹ پھوٹ کر ضائع ہو رہی تھیں ان کی ان لوگوں کو قطعاً پروا نہیں تھی۔

لائبریری کے اندر دفعتاً ایک الارم بجنے لگا۔ شاید وہاں موجود اشخاص سے کسی نے کوئی ایسی قیمتی چیز اٹھائی تھی جس سے الارم سسٹم منسلک تھا۔ وہ الارم دیر تک بجتا رہا مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ پتا نہیں وہ آواز نیچے موجود کسی محافظ کے کانوں تک پہنچی تھی یا پھر انہوں نے اس طرف آنا فضول سمجھا تھا۔ باب کا قیاس تھا کہ وہ لوگ کسی اور طرف سے ہیلی کاپٹر اور ان لوگوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہوں گے جو لائبریری میں موجود ہیں۔

باب نے مڑ کر ایک سیاح سے کہا۔ ”محافظین کو اس طرف لے کر آؤ ورنہ یہ لائبریری خالی ہوتے دیر نہیں لگے گی۔“

”اچھا جناب۔۔۔!“ اس سیاح نے گھبرا کر کہا

”ان سے کہو کہ چور لائبریری میں داخل ہو چکے ہیں۔“

وہ سیاح سرپٹ دوڑتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ دوسرے آدمی جو راہ داری میں موجود تھے اتنے پیچھے ہٹ گئے کہ انہیں کسی قسم کی گزند نہ پہنچ سکے۔

باب نے اپنی جیب سے ماسٹر کی نکال کر دروازے کے لاک پر آزمائی کی مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ کہن رسیدہ تالے کا میکنزم اس قدر پیچیدہ تھا کہ ماسٹر کی کا جادو اس پر اثر انداز نہیں ہو سکا۔ باب نے اسے جیب میں رکھ کر لاک پر فائر کیا۔

پہلے فائر کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ دروازے کی تھوڑی سی لکڑی کٹ کر فرش پر گر پڑی تھی۔ اس نے دوسرا اور تیسرا فائر کیا تو لاک اس طرح سے مڑ گیا جیسے مزید مزاحمت نہیں کر سکے گا۔ چوتھا اور پانچواں فائر ہوتے ہی لاک میں سے دھواں نکلا اور پھر وہ کئی جگہوں سے تڑخ گیا۔

باب نے ایک قدم پیچھے ہو کر مارشل آرٹ تائی کوان ڈو کا ایک داؤ دروازے پر آزمایا۔ اس کی بھرپور لات دروازے پر پڑی تھی۔

مہاگنی کا بھاری دروازہ چرچرایا اور آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔ سیاہ کار سے اترنے والے دس یا پندرہ منٹ پہلے اس لائبریری میں داخل ہوئے تھے مگر دروازہ کھلتے ہی یہ محسوس ہوا تھا جیسے وہ کئی روز سے اندر ہوں۔ اس لائبریری کی ہیئت بالکل بدل چکی تھی۔

تمام قیمتی اشیا شیشے کے شوکیسوں سے اس طرح غائب تھیں۔ جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

نوادرات نہایت بے دردی سے کینوس کے تھیلوں میں بھر کر کھڑکی کے قریب ڈال دیے گئے تھے۔ ایک شخص ان تھیلوں کو فضا میں لٹکی ہوئی بالٹی کے اندر ڈال رہا تھا۔ تین تھیلے بالٹی میں ڈال دیے گئے تھے جب کہ دو ابھی وہیں پڑے تھے اور ایک تھیلا اب بھی بھرا جا رہا تھا۔ فرش پر چاروں جانب شیشہ ہی شیشہ بکھرا ہوا تھا۔ ان ظالموں نے شیشے کی الماریوں کو چکنا چور کر دیا تھا اور ان تمام نوادرات کو وہیں چیخ کر ضائع کر دیا تھا جنہیں انہوں نے بے کار جانا تھا۔

باب نے یہ سارا منظر دروازہ کھلتے ہی ایک نگاہ میں دیکھ لیا تھا۔ جیسے ہی اندر موجود دونوں آدمیوں کو دروازہ کھلنے کا احساس ہوا، ان میں سے ایک نے باب پر فائر جھونک مارا اور چیخ کر اپنے ساتھی کو بھی باب موجودگی سے آگاہ کیا۔

اس کے ساتھی نے بھی تھیلا ایک طرف اچھالا اور ریوالور نکال کر باب پر فائرنگ کرنے لگا۔ باب نے اس پٹ کے پیچھے چھپ کر اپنی جان بچائی جو ہنوز بند تھا اور ابھی اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں تھا۔ گولیاں یا تو اس کے قریب سے گزر کر فضا میں معدوم ہو رہی تھیں یا پھر مہاگنی کے اس دبیز دروازے میں پیوست ہو رہی تھیں۔

باب فائروں کی گنتی کرتا رہا۔ اسے جیسے ہی

احساس ہوا کہ ان کے ریوالوروں کا میگزین ختم ہوگیا ہے اس نے کھلے ہوئے دروازے سے سر اندر کیا اور ان میں سے ایک فائر کردیا۔ اس نے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی مگر گولی اس کے بازو پر پڑی۔ اس شخص کے ہونٹوں سے ایک کربناک آواز نکلی اور اس کا وہ بازو جھول گیا۔ ریوالور اس کی انگلیوں میں لٹک رہا تھا اور وہ لہرا کر ایک قریبی شوکیس پر گرنے کی تیاری کررہا تھا۔

دوسرے آدمی نے میگزین لگانے کے بعد ریوالور کی نال باب کی طرف اٹھائی اور پے در پے دو فائر کردیے۔ باب نے دوبارہ دروازے کے پیچھے چھپ کر اپنی جان بچائی۔ اس نے فوراً جھانک کر دیکھا۔ دوسرا آدمی وہ آخری تھیلا گھسیٹ کر اس تیسرے شخص کے حوالے کررہا تھا جو کھڑکی سے چپکا کھڑا تھا اور ان تھیلوں کو بالٹی میں بھر رہا تھا۔

باب نے موقع ملتے ہی اس کی ٹانگوں پر فائر کیا مگر گولی اس کی ران سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گئی۔

دفعتاً باب کی نگاہ اس کونے پر پڑی جہاں ایک روز پہلے اس نے شیشے کی اس صراحی میں وہ کاغذات ٹھونسے تھے۔ وہ کونا خالی تھا۔ شیشے کی صراحی تو درکنار وہاں پر رکھے ہوئے وزنی مجسمے تک غائب تھے۔

گویا اس کے لیے پریشانیوں کا ایک نیا دبستان کھل گیا تھا۔ باب نے سوچا اگر اس نے ان چوروں کو نہ روکا تو پھر ان کاغذات کے لیے دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ وہ نامعلوم چور ہیلی کاپٹر میں آئے تھے۔ لازماً وہ اس طرح وہاں سے فرار ہوتے کہ ان کا نام ونشان نہ ملتا۔

وہ آدمی جس کی کہنی میں گولی لگی تھی۔ کرب کے عالم میں ایک دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ باب نے اس کی ران پر مزید ایک فائر کردیا تاکہ وہ بالکل ہی ناکارہ ہوجائے۔

فائر ٹھیک جگہ پر لگا اور اس کی پتلون میں ایک لہو رنگ سوراخ بن گیا۔ اس نے ایک کربناک چیخ ماری اور کٹے ہوئے شہتیر کی مانند فرش پر آرہا۔

باب نے اس دوسرے آدمی پر مسلسل فائر کیے جو تھیلا گھسیٹ رہا تھا۔ چونکہ گولیاں اندھا دھند چلائی گئی تھیں چنانچہ وہ ہلاک ہونا تو کجا زخمی بھی نہ ہوسکا۔

اسی شخص نے ایک بار پھر ریوالور نکال کر باب پر جوابی فائرنگ کی۔ باب پھرتی سے فرش پر بیٹھ گیا۔ متعدد گولیاں زناٹے کے ساتھ اس کے سر پر سے گزریں۔

''بھاگو۔'' کھڑکی کے قریب کھڑا ہوا آدمی چیخا۔

وہ آدمی جو زخمی ہوچکا تھا لنگڑاتا ہوا کھڑکی کے قریب پہنچا اور خون کی ایک لکیر بناتا ہوا اس بالٹی میں جا بیٹھا جو کھڑکی کے قریب لٹک رہی تھی۔

فائرنگ برابر ہورہی تھی اس لیے باب ہال میں داخل نہ ہوسکا مگر جب آخری آدمی فائرنگ کرتا ہوا اس بالٹی میں بیٹھا تو باب چھلانگ مار کر ہال میں داخل ہوا اور اڑتا ہوا کھڑکی کے قریب پہنچا۔

لیکن یہ اچھل کود رائیگاں گئی۔ وہ بڑی سی بالٹی اب ہیلی کاپٹر کے نچلے حصے کی طرف جارہی تھی۔ باب نے دانت کچکچا کر دو فائر کیے مگر ان سے بھی کوئی مسئلہ حل نہ ہوا۔

اب ان چوروں کو روکنے کا کوئی طریقہ نہیں رہا۔ باب کھڑکی کے قریب سے ہٹ گیا اور اس ہال سے بھاگتا ہوا باہر پہنچا۔ راہ داری میں ایک سیاح اسے دوربین گلے سے لگائے کھڑا ملا۔ باب نے اس سے نرم لہجے میں کہا۔ ''جناب تھوڑی دیر کے لیے یہ دوربین مجھے عنایت فرمائیے۔''

اس نے دوربین گلے سے اتار کر اس کے ہاتھ میں تھمادی۔ باب نے اس کے لینز سیٹ کیے اور راہ داری میں لگی ہوئی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔

دوربین آنکھ سے لگائے بغیر اسے پتا چل گیا کہ ہیلی کاپٹر سے لٹکی ہوئی فولادی بالٹی وہاں سے غائب ہوچکی تھی اور ہیلی کاپٹر کے نچلے حصے کا پٹ بند ہوچکا تھا۔ باب نے دوربین آنکھوں سے لگا کر

جائزہ لیا مگر ہیلی کاپٹر پر ایسا کوئی نشان دکھائی نہیں دیا جس سے یہ پتا چلتا کہ وہ کس ملک یا خطے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ لائبریری کی چھت سے آگے سرک رہا تھا۔ باب کو اس کے دائیں پہلو میں ایک کھڑکی دکھائی دی۔ اس نے دوربین کے لینز کھڑکی پر سیٹ کردیے۔

ہیلی کاپٹر میں اس طرف بیٹھے ہوئے شخص کو واضح طور پر دیکھتے ہی میجر باب کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ سراسیمگی سے اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔

اس کی بصارت دھوکا نہیں دے رہی تھی۔ وہ اس بھاری جبڑے اور پتلی خم دار ناک والے شخص کو کیسے بھول سکتا تھا جس سے وہ ایک بار پہلے جرمنی کے میزائل ڈیوٹی کنٹرول آفس میں مل چکا تھا۔

وہ شخص بلاشبہ جنرل ایم ڈی مانسکٹر تھا۔

پندرہ سال پہلے باب نے جرمنی کے میزائلوں کے اڈے سے اس کا ریکارڈ چوری کیا تھا تو جنرل مانسکٹر وہاں کا انچارج تھا۔ باب نے میزائلوں کا ریکارڈ اس کے ہاتھوں سے چھین کر امریکا پہنچایا تھا مگر آج وہ ایک مہلک ترین ایجاد کو باب کے ہاتھوں سے نکال لیے جارہا تھا۔ اس کا یہ فعل ارادی نہیں تھا مگر باب کو یقین تھا کہ جب وہ ان کاغذات کو دیکھے گا تو انہیں اپنے حق میں استعمال کیے بغیر نہیں رہے گا۔

☆☆☆

''ناقابل یقین۔'' کرنل ڈیوڈ نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''جب میں نے اسے دیکھا تھا تو میری بھی یہی کیفیت ہوئی تھی۔'' باب ہک بولا۔ ''مگر جناب عالی! یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔''

''حالات بعض اوقات اس طرح سے کروٹ بدلتے ہیں کہ اعتبار نہیں آتا۔'' کرنل ڈیوڈ بولا۔ ''وہ کاغذات تمہارے ہاتھ آگئے مگر جب تم نے ان کی حفاظت کی غرض سے انہیں اس صراحی میں رکھا تو۔۔۔ آہم۔۔۔ خیر ان کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ جنرل مانسکٹر ان کاغذات کو چرانے نہیں بلکہ لائبریری پر ڈاکا ڈالنے آیا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ انہیں نظرانداز کردے۔''

''کاغذات کو محفوظ کرنے کے لیے میں اس عجائب گھر میں گیا تھا۔ اس وقت مجھے کوئی اور مناسب جگہ دکھائی نہیں دی تھی۔''

''باب ہک!'' کرنل ڈیوڈ نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''ان کاغذات کی اہمیت کا اندازہ تم یوں لگا سکتے ہو کہ مجھے ان کے لیے براہ راست وزیر دفاع کو جواب دینا ہے۔ ان سے ہوتی ہوئی جب یہ خبر صدر مملکت تک پہنچے گی تو مجھے مزید عتاب برداشت کرنا پڑے گا۔''

''مجھے افسوس ہے۔'' باب نے آہستہ سے کہا۔ ''ویسے میں اس مشن سے چمٹا نہیں رہنا چاہتا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو کسی اور کو۔۔۔''

''نادانی کی باتیں نہ کرو۔'' کرنل ڈیوڈ نے کہا۔ ''اگر میں اس مشن کے لیے تمہیں مناسب نہ سمجھتا تو پہلے ہی کسی اور کو تاجکستان کی طرف روانہ کرتا۔'' اس نے کچھ توقف سے دوبارہ کہا۔ جب وہ ہیلی کاپٹر وہاں سے چلا گیا تو تم عجائب گھر سے کیسے نکلے؟''

''عجائب گھر میں ایک راستہ بلازمین کے لیے بھی ہے جو عمارت کے عقب میں واقع ہے۔ میں اسی کے ذریعے باہر آگیا۔ کیونکہ لائبریری کے پہلے دروازے کی طرف سے محافظین بھرا مار کر چلے آرہے تھے۔ اگر میں ان کے ہتھے چڑھ جاتا تو یقیناً وہ مجھے شبہ میں گرفتار کرلیتے۔''

''ہم۔۔۔ خوشی ہے کہ ان لوگوں نے تمہیں گرفتار نہیں کیا۔ تو تمہیں یقین ہے کہ وہ جنرل مانسکٹر ہی تھا جس سے تم نے۔۔۔''

''جی ہاں جناب۔'' باب کے ہونٹوں پر شگفتہ سی لکیر کھنچ گئی۔

اسے کرنل ڈیوڈ کی بے چینی کا اندازہ ہوگیا تھا۔

''اس کا چہرہ تو کم از کم جنرل مانکسٹر جیسا ہی تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

وہ اس وقت ٹرنک کال پر کرنل ڈیوڈ سے گفتگو کر رہا تھا۔ یہ اطلاع پا کر کہ کاغذات ہاتھ سے نکل چکے ہیں وہ بہت مضطرب ہو گیا تھا۔ وقتی طور پر یہ نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ جنرل مانکسٹر لائبریری سے تمام ساز و سامان لوٹ کر کہاں لے گیا تھا اور کیوں۔ اس سے اس کی سراسیمگی میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔

''اس بات پر یقین نہیں آتا کہ جنرل مانکسٹر جیسا شخص اس چوری میں ملوث ہوگا۔ باب ہک میرا قیاس ہے کہ یہ کوئی اور معاملہ ہے کوئی ایسا معاملہ جہاں تک ہماری نگاہ نہیں پہنچ رہی ہے۔ ہمیں اسی نکتے کو مرکز بنا کر اپنی تفتیش کا آغاز کرنا ہوگا۔ اب تم نہ صرف یہ کہ ان کاغذات کو حاصل کرو گے بلکہ جنرل مانکسٹر کے عزائم کا سراغ بھی لگاؤ گے۔''

''اگر اس کے ہتھے یہ کاغذات چڑھ گئے تو وہ چین یا بھارت سے ان کی سودے بازی بھی کر سکتا ہے۔'' باب نے خیال آرائی کی۔

''زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ کاغذات کو جرمن یا اس گروہ کے مفاد میں استعمال کرنے کی کوشش کرے گا۔'' کرنل ڈیوڈ بولا۔

''یہ بھی ممکن ہے۔'' باب نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

''چند دیوانے ایک بار پھر دنیا کے امن و سکون کو تہہ و بالا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس فتنے کو جڑ سے کاٹ پھینکنا ہوگا۔''

''ریموٹ کنٹرول کے اصولوں پر بنا ہوا یہ ہتھیار جس ملک کے ہاتھ بھی لگ جائے گا وہ اسے اپنے دشمنوں پر استعمال کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ تم اس سلسلے میں تاجکستان کی پولیس اور سیکرٹ سروس سے مدد لے سکتے ہو۔ وہ تم سے ضرور تعاون کریں گے مگر بہتر ہوگا کہ تم اکیلے ہی اس مشن کو مکمل کرو۔ تاجکستان ایک امن پسند ملک ہے مگر میں نہیں چاہتا کہ یہ منصوبہ ان کے ہاتھ میں دوبارہ جائے۔''

''انٹرپول کے بارے میں کیا خیال ہے۔'' باب بولا۔

''تاجکستان میں مقیم چند افراد سے میرے مراسم بہت اچھے ہیں۔ اگر ان سے مدد لی جائے تو کام میں تیزی پیدا ہو سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے جنرل مانکسٹر کے متعلق کوئی فائل ضرور ترتیب دی ہوگی۔''

''ان سے مدد لینے میں میرا خیال ہے کہ کوئی مضائقہ نہیں۔'' کرنل ڈیوڈ بولا۔ ''کیوں کہ وہ اس بات سے ناواقف رہیں گے کہ تمہارا مقصد کیا ہے یا تم کس چیز کا کھوج لگا رہے ہو۔'' اس نے توقف سے دوبارہ کہا۔

''تم نے لائبریری کو اچھی طرح سے دیکھ لیا ہے، ہو سکتا ہے جنرل مانکسٹر یا اس کے مددگار وہاں اپنا کوئی سراغ چھوڑ گئے ہوں؟''

''میں نے لائبریری ہال پر ایک سرسری نگاہ ڈالی تھی لیکن وہاں ایسی کوئی چیز دکھائی نہیں دی۔'' باب بولا۔

''سرسری دیکھنے پر لازماً بہت سی چیزیں نگاہ میں آنے سے رہ گئی ہوں گی۔''

''مگر میں اب لائبریری ہال میں داخل نہیں ہو سکتا اس لیے کہ وہاں محافظین کی بھاری جمعیت موجود ہے۔''

''آپ کا مطلب ٹاؤن کے پولیس کمشنر سے ہے۔''

''نہیں۔'' کرنل ڈیوڈ بولا۔ ''فیروز بخت سے۔''

''ان کی حیثیت اتنی بلند ہے کہ شاید وہ مجھ سے گفتگو کرنا پسند نہ کریں۔'' باب بولا۔

''میں صدر مملکت سے بات کروں گا۔ وہ فیروز بخت سے گفتگو کریں گے۔ اس طرح سے تمہیں ان کے پاس پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔''

''بہتر ہے جناب۔'' باب نے کہا اور ریسیور کریڈل پر ڈال دیا کیونکہ دوسری طرف سے بھی

سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔

☆☆☆

بارش کا پہلا چھینٹا پڑتے ہی شہر میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک رنگ برنگی چھتریاں کھل گئیں۔ تاجکستان کے باشندے موسم سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے۔ باب نے محسوس کیا تھا کہ وطن عزیز کے لوگوں کی طرح وہاں بارش کی آمد سے بھگدڑ نہیں مچی تھی۔ لوگوں نے دکانوں سے چھتریاں خریدنا شروع کر دی تھیں یا کپڑوں سمیت بھیگنا شروع کر دیا تھا۔

بارش ختم ہونے پر لوگ چھتریاں یا لانگ بوٹ سنبھالنے کے بجائے انہیں راستوں پر اتار کر چلتے بنتے تھے۔

باب کو بارش کے موسم سے پہلے ہی انسیت تھی مگر شہر میں اس نے مزید انبساط محسوس کیا۔ شہر، محلات، مقبروں اور مسجدوں کا شہر تھا۔ ایک گھنٹے مسلسل بارش ہونے کے بعد تمام عمارتیں دھل دھلا کر بالکل نئی ہو گئیں۔ باب کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی نئے شہر میں آ گیا ہو۔

دوسرے روز کے مقامی اخبارات، لائبریری کی چوری کی واردات سے بھرے ہوئے تھے۔ ہر اخبار میں مختلف انداز سے رپورٹنگ کی گئی تھی۔ کسی نے بھی حقیقت بیانی کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ ہر اخبار نے نمک مرچ لگا کر خبر کو سنسنی خیز بنایا تھا۔

باب ایک بک اسٹال پر کھڑا اخبروں کو پڑھ کر ہنستا رہا۔ وہ اس وقت انٹر پول کے ادارے کے دفتر کی طرف جا رہا تھا جہاں اسے اپنے دوست ظاہر خان سے ملاقات کرنا تھی۔

ظاہر خان اس سے پہلے بھی متعدد موقعوں پر اس کے کام آ چکا تھا۔ باب کو اس پر اعتماد تھا کہ وہ اس سے اصل غرض و غایت کے بارے میں استفسار نہیں کرے گا اور دوستی کے ناتے مطلوبہ معلومات فراہم کر دے گا۔

ظاہر خان نے اس کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ ''باب ہک! تمہاری یہاں موجودگی خالی از علت نہ ہوگی۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تم تفریحاً تاجکستان نہیں آ سکتے۔ کیا عجائب گھر کی لائبریری پر تم نے ہاتھ صاف کیا ہے؟''

''چوری یا ڈاکا زنی میری سرشت نہیں ہے۔'' باب نے جواب دیا۔ ''میرے کام دوسری نوعیت کے ہوتے ہیں۔''

''ہاں۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''ان ڈاکوؤں کو گرفتار کرنا اور سماج دشمن عناصر کی سرکوبی کرنا تمہارے فرائض میں شامل ہے مگر تم یہاں کیسے وارد ہوئے۔ کیا میں یہ سمجھ لوں کہ میری محبت سے سرشار ہو کر تم یہاں دوڑے چلے آئے ہو۔''

''پہلی بات تو یہی ہے۔ جس کا اظہار تم نے ابھی کیا ہے۔'' باب نے سنجیدگی سے کہا۔ ''دوسرے یہ کہ اس واردات سے میرا ابھی تعلق ہے لیکن بالکل ہی نئے زاویئے سے۔''

باب کے اس انکشاف پر ظاہر خان کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''وہ کیسے؟''

''اس وقت میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔'' باب بولا۔

''کیوں کہ مجھے ابھی ایک اور ہستی سے ملاقات کرنا ہے۔ میں چاہوں کہ تم جنرل مانسکٹر کا ریکارڈ نکلوا کر رکھو۔ میں اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات چاہتا ہوں۔''

''جنرل مانکسٹر۔'' ظاہر خان نے پھر آنکھیں پھاڑیں۔ ''اس کا اس واردات سے کیا تعلق؟''

''اگر تم اس چکر میں نہ پڑو تو میں تمہارا شکر گزار ہوں گا۔'' باب مسکرایا۔ ''ہو سکتا ہے میں آگے چل کر اس کی وضاحت کر دوں مگر اس وقت مجبوری ہے۔''

ظاہر خان نے منہ بنا کر کہا۔ ''چلو کوئی بات نہیں میرے لیے یہ کوئی بات نہیں ہے۔ تم ہمیشہ سے اپنے ملنے جلنے والوں کے لیے پراسرار رہے ہو۔''

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' باب مسکرایا۔

''مخصوص قسم کے حالات مجھے دوسروں کی نگاہوں میں پراسرار بنا دیتے ہیں ورنہ میں بھی تمہاری طرح سے ایک عام آدمی ہوں۔''

ظاہر خان نے شدت سے نفی میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ نہیں مان سکتا۔ تم سب کچھ ہوسکتے ہو لیکن عام آدمی ہرگز نہیں ہوسکتے۔'' اس نے توقف سے کہا۔ ''اچھا چھوڑو اس قصے کو آؤ چلو لنچ کرتے ہیں کسی اچھے سے ہوٹل میں بیٹھ کر۔''

''میں اس کے لیے بھی معذرت چاہتا ہوں۔'' باب نے جواب دیا۔ ''پہلے فیروز بخت سے مل آؤں پھر تم سے تفصیلی ملاقات کروں گا۔ اس وقت تم سے یوں ملا تھا کہ تم اس دوران میں ریکارڈ نکلوالو۔''

''لیکن تم فیروز بخت سے کیوں ملنے جارہے ہو؟''

''میں لائبریری کو ایک نگاہ دیکھنا چاہتا ہوں۔'' باب بولا۔ ''اور یہ کام کسی بڑے آدمی کی سفارش کے بغیر نہیں ہوسکتا۔''

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تمہاری پہنچ فیروز بخت تک ہوسکتی ہے۔''

''میری حکومت نے اس سلسلے میں خاص طور پر فیروز بخت سے درخواست کی ہے۔'' باب بولا۔ ''آقائے فیروز بخت مجھ جیسے آدمیوں سے کیسے مل سکتے تھے۔'' اس نے توقف سے کہا۔ ''میں اب چلتا ہوں آج شام تک تم سے ملاقات کروں گا۔''

وہ عجائب گھر گیا تو اس نے وہاں کے چپے چپے پر مسلح محافظ کھڑے پائے۔ اس وقت حقیقتاً وہاں کوئی چڑیا کا بچہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ فیروز بخت کی قیام گاہ پر اس سے زیادہ پہرا تھا۔ محافظین کی ایک فوج سے باب کو سامنا کرنا پڑا۔ اس سے نام پوچھا گیا تو اس نے کہا۔ ''فیروز بخت میرا انتظار کررہے ہوں گے۔ تم انہیں میرے نام سے مطلع کردو۔''

محافظ برا سا منہ بنا کر رہ گئے لیکن فیروز بخت کو اطلاع دینے کے لیے بہرحال مجبور تھے۔ اس دوران میں اس کی تلاشی بھی لی گئی۔ اوپری ہال میں جہاں فیروز بخت قیام کرتے تھے۔ باب کو وہاں پہنچتے پہنچتے آدھا گھنٹہ لگ گیا۔

قیام گاہ میں جابجا محرابیں بنی تھیں اور چوڑے ستونوں پر مینا کاری کی گئی تھی۔ ہال کی چھت اتنی اونچی تھی کہ باب کے سر پر اگر ٹوپی ہوتی تو یقیناً نگاہ اٹھانے پر پھسل کر گر پڑتی۔ فرش پر دبیز قالین تھا اور روشنی کے لیے جگہ جگہ شمع دان رکھے تھے۔

باب جب ایک محافظ کے ساتھ اس ہال میں داخل ہوا تو اس نے فیروز بخت کو ایک زرنگار کرسی پر بیٹھے دیکھا۔

ان کے جسم پر لمبی سی عبا تھی اور سر پر وہی مخصوص ٹوپی جو باب اس سے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ ان کے چہرے پر شفقت تھی۔ وہ باب کو دیکھ کر مسکرائے اور انہوں نے مصافحے کرنے میں بھی پہل کی۔

''باب ہک!'' انہوں نے کہا۔ ''تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ آؤ یہاں بیٹھو۔'' ایک قریبی کرسی کی طرف اشارہ کیا گیا جو ان کی ہی کرسی کی مانند سجی ہوئی تھی۔

باب اس پر بیٹھ گیا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ فیروز بخت نے اس سے کسی قسم کا امتیاز نہیں برتا تھا۔

''باب ہک کو صدر امریکا نے آپ کے پاس بھیجا ہے اعلیٰ حضرت!'' محافظ نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

''ہمیں معلوم ہے۔'' انہوں نے شگفتہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''اگر یہ براہ راست بھی ہمارے پاس چلے آتے تو انہیں ہم سے ملاقات کرنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ ان کے کارنامے ہمارے کانوں تک بھی پہنچتے رہتے ہیں۔ اپنی قوم وملک اور امن عالم کے لیے انہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔''

انہوں نے ابرو سے اشارہ کیا تو وہ محافظ الٹے قدموں وہاں سے لوٹ گیا۔

''تمہیں یہاں کی لائبریری کو دیکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی میجر باب!'' انہوں نے

سوال کیا۔ ”کیا تمہارا ملک اس واردات میں کسی طور ملوث ہے۔“

”ایسی تو کوئی بات نہیں ہے اعلیٰ حضرت۔“ باب ادب سے بولا۔ ”ان نوادرات کے ساتھ کچھ ایسے کاغذات بھی چوری ہو گئے ہیں جو اگر واپس نہ ملے تو امن عالم خطرے میں پڑ جائے گا۔“

”وہ کاغذات وہاں تک کیسے پہنچے۔“ انہوں نے پوچھا۔

”دشمن میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے وہ کاغذات ایک شیشے کی صراحی میں ڈال دیے۔ میں نے سوچا تھا کہ انہیں بعد میں وہاں سے نکال لوں گا مگر اس کا موقع نہ مل سکا۔ لائبریری پر ڈاکا پڑ گیا۔“

”ہم۔۔۔ مگر ہماری پولیس نے لائبریری کی اچھی طرح تلاشی لی ہے انہیں وہاں کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے ان لٹیروں کا سراغ لگایا جا سکتا۔“ فیروز بخت بولے۔

”ایک بار اور کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔۔ باب بولا۔ ”اگر آپ مجھے بھی ایک موقع دے دیں تو شاید میں ایسی کوئی بات معلوم کر لوں۔“

”ٹھیک ہے۔ انہوں نے کہا۔ ”میں تمہیں ایک ایسا اجازت نامہ دیے دیتا ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد باب کے ہاتھ میں فیروز بخت کی تحریر تھی جس کی رو سے وہ لائبریری کی تلاشی لے سکتا تھا۔ تحریر کے نیچے ان کی خاص مہر بھی لگی ہوئی تھی۔

لائبریری ہال میں اس وقت تین باوردی مسلح پولیس والے پہرا دے رہے تھے۔ لائبریری کی حالت میں اس وقت کافی تبدیلی آ چکی تھی۔ وہ تمام شیشے کے ٹوٹے ہوئے شوکیس وہاں سے ہٹا لیے گئے تھے تاکہ پولیس ان پر سے نشان انگشت حاصل کر سکے۔

جہاں تک قدموں کے نشانات کا تعلق تھا۔ لٹیروں کے قدموں کے نشانات کے علاوہ وہاں مزید اتنے نشانات بن چکے تھے کہ ان میں کوئی تمیز نہیں کی جا سکتی تھی۔

باب راہداری سے فرش کو دیکھتا ہوا بتدریج آگے بڑھا تاکہ کوئی چیز نگاہ میں آنے سے نہ رہ جائے جہاں حملہ آور ایک روز پہلے ہلاک ہوا تھا۔ وہاں خون ہی خون پڑا دکھائی دے رہا تھا جو اب خشک ہو کر فرش سے چپک گیا تھا۔

لائبریری ہال کے دروازے اب چوپٹ کھلے ہوئے تھے۔ اس کا تالا بھی سابقہ حالت میں تھا۔ باب نے ایک روز پہلے اس پر فائر کر کے اسے توڑ ڈالا تھا۔ باب نے فرش کے قریب بیٹھ کر وہاں کا اچھی طرح جائزہ لیا۔

کھلے ہوئے دروازوں میں تالے کے قریب آنکڑے سے لگے ہوئے تھے اور یہ آنکڑے اس وقت دیواروں میں پھنسے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لٹیروں نے دروازے بند کرنے سے پہلے ان آنکڑوں سے انہیں نکالا ہوگا۔

باب نے وہاں بیٹھ کر بھی نگاہ ماری۔ تھوڑی دیر بعد اسے دائیں آنکڑے کے نیچے ایک جوتے کا نشان دکھائی دیا۔ غور سے جائزہ لینے پر پتا چلا کہ وہ کریپ سول کا نشان ہے جس میں ایڑی کے پاس ایک ہیرے کی شکل بھی بنی ہوئی ہے۔

باب نے اپنی جیب سے ایک ننھا سا کیمرہ نکالا اور جوتے کے اس نشان کے متعدد فوٹو لے لئے۔ ابھی وہ فرش سے کھڑا ہونے ہی والا تھا کہ اسے وہاں پر مٹی کا ٹکڑا بھی دکھائی دیا۔ چنے کے برابر مٹی کے اس ٹکڑے کو اس نے احتیاط سے اٹھا کر اپنے رومال میں لپیٹ لیا۔

وہ وہاں سے کھڑا ہوا تو ایک محافظ نے اس کے قریب آ کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے جناب! کیا آپ کو کوئی نیو کلیو ملا ہے۔“

”نہیں تو۔“ باب نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”فرش پر خون کے دھبے بڑے عجیب سے معلوم ہو رہے تھے۔ میں انہیں دیکھنے بیٹھ گیا تھا۔“

”آں۔“ اس نے احمقوں کی طرح کہا۔ ”ہاں

دھبے تو واقعی بڑے عجیب سے معلوم ہو رہے ہیں۔'' باب نے اس کی طرف مڑ کر کہا۔ ''اس تعاون کا شکریہ اب میں اپنی کتاب آسانی سے مکمل کر سکوں گا۔''

''کتاب۔'' اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

''ہاں، میں دنیا کے تقریباً تمام عجائب گھر دیکھ چکا ہوں۔ ایک یہی عجائب گھر رہ گیا تھا جو میں نے آقائے فیروز بخت کی اجازت سے دیکھ لیا۔'' باب نے کہا اور وہاں سے تیزی کے ساتھ نکل گیا۔

بے چارے محافظ کو اس سے یہ پوچھنے کا موقع بھی نہ مل سکا کہ اس نے عجائب گھر میں کیا دیکھا۔ نوادرات تو ایک طرف وہاں سے وہ شوکیس تک ہٹا دیے گئے تھے جن میں وہ نوادرات رکھے جاتے تھے

☆☆☆

باب نے ظاہر کو ضروری ترامیم کے بعد وہ سب باتیں بتا دیں جو اسے پیش آئی تھیں۔ پھر اس نے کہا۔ ''میں نے جو باتیں تمہارے گوش گزار کی ہیں انہیں عالمی پولیس کے کسی اور فرد کو بتانے کی ضرورت نہیں۔''

''میں اس کا خیال رکھوں گا۔'' ظاہر خان بولا۔ ''ویسے تم مجھ سے جو مدد لینا چاہتے ہو میں اس کے لیے حاضر ہوں۔''

''ایک بات اور ہے۔ جب وہ کاغذات میرے ہاتھ لگ جائیں گے تو ان پر میرا حق ہوگا۔ تمہارے ادارے کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے پائے گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' ظاہر خان بولا۔ ''انٹرپول کو ان کاغذات سے کیا لینا۔ ہم تو ان نوادرات کے حصول کے لیے کوشاں ہیں۔''

باب نے اپنی جیب سے ننھا سا کیمرہ برآمد کرتے ہوئے کہا۔ ''اس میں جو فلم بنی ہوئی ہے دھلنے کے بعد شاید ہماری کچھ رہنمائی کر سکے۔ کیا تم اسے دھلوا کر اس کے پرنٹ نکلوا سکتے ہو؟''

ظاہر خان نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اس آفس میں ایک چھوٹا سا ڈارک روم بھی ہے۔ ہم لوگ اپنی فلمیں وہیں دھوتے ہیں۔ لاؤ میں اسے لیبارٹری کے حوالے کرتا ہوں۔ دوپہر تک اس کے بڑے پرنٹ بھی مل جائیں گے۔''

''گڈ۔'' باب بولا۔ ''پھر اس نے اپنا رومال نکال کر مٹی کا وہ ٹکڑا میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے علاوہ میں یہ معلوم کرنا چاہوں گا کہ یہ تاجکستان کے کس علاقے کی مٹی ہے۔ تمہارے پاس مختلف علاقوں میں پائی جانے والی مٹی کا ریکارڈ یقیناً ہوگا۔''

''یہ قدرے دقت طلب کام ہے۔'' ظاہر خان بولا۔ ''بہرحال میں اسے ادارے کے ماہر ارضیات کے سپرد کیے دیتا ہوں۔ شاید وہ کوئی رپورٹ دینے میں کامیاب ہو جائے۔''

''مگر میرا خیال تھا کہ اس سے پہلے ہم مختلف جگہوں کی زمینوں کے فوٹو دیکھ لیتے۔ تمہارے ادارے کے پاس ایسا کوئی ریکارڈ تو ہوگا۔'' باب نے توقف سے کہا۔ ''ویسے اس آدمی کا تعلق تاجکستان ہی کے کسی علاقے سے ہونا چاہیے۔''

ظاہر خان نے جواب دیا۔ ''اگر اس واردات کے پیچھے جنرل مانکسٹر کا ہاتھ ہے تو یوں سمجھ لو کہ معاملہ لمبا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس نے ان آدمیوں کو اسی علاقے سے چنا ہو۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' باب بولا۔ ''آؤ پہلے کسی کیفے میں جا کر چائے پی لیں۔ شاید کچھ غور و فکر سے کوئی کارآمد بات سمجھ میں آ جائے۔''

انہوں نے کافی وقت ایک قریبی کیفے میں گزارا۔ باب نے اس دوران میں اپنے ذہن کو کھلا چھوڑ دیا تھا تاکہ تر و تازہ ہونے کے بعد وہ یکسوئی سے کچھ سوچ سکے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ انٹرپول کے آفس میں دوبارہ داخل ہوئے۔ باب کے کیمرے کی تصاویر دھوئی جا چکی تھیں اور ان کو آٹھ گنا بڑا بھی کر دیا گیا

تھا۔ ظاہر خان نے انہیں دیکھے بغیر باب کی طرف بڑھا دیا۔

باب نے لفافہ کھول کر تصاویر نکالیں اور ظاہر خان کی توجہ اس طرف مبذول کراتا ہوا بولا۔ ''کریپ سول پر میں نے اس سے پہلے کبھی ایسے نشانات نہیں دیکھے ہیں''

''تم درست کہتے ہو۔'' وہ بولا۔ ''یہ کریپ سول غیر معمولی ہیں۔ شاید یہ کریپ سول کسی نئی کمپنی نے بنایا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد ظاہر خان اور وہ شہر کے تمام تھوک فروش جوتے والوں کے پتے ایک رجسٹر سے نوٹ کررہے تھے۔ باب نے اس کے بعد انہیں فون کرنا شروع کردیا۔ تھوک فروش کے علاوہ انہوں نے جوتے کی تمام کمپنیوں کو بھی فون کیا تھا۔ ایک گھنٹے کی جدوجہد کے بعد وہ اس کمپنی کا پتا معلوم کرنے میں کامیاب ہوگئے جو اس قسم کے کریپ سول بناتی تھی۔ کمپنی کو فون کرکے انہوں نے تھوک فروشوں اور دکان داروں کے پتے لیے جو ایسے جوتے فروخت کرتے تھے۔

اس کمپنی کے شہر میں دو بڑے تھوک فروش دکان دار تھے جن میں سے ایک دیوالہ ہوچکا تھا اور ایک بدستور دکان چلا رہا تھا۔ فون کرنے پر پتا چلا کہ اس کا نام خان اسحاق ہے۔

تفتیش کا دائرہ کار اس وقت مزید سمٹ گیا جب یہ پتا چلا کہ اس قسم کی مٹی تاجکستان اور جرمنی کے بیچ ایک جزیرہ نما علاقے مافیو کی ہے۔''

ظاہر خان کو دفتر کے دوسرے کام بھی نمٹانا تھے اس لیے باب اکیلا ہی اس تھوک فروش دکان دار کی طرف چل پڑا۔

پست قد خان اسحاق نے اس سے مکمل تعاون کیا۔ وہ عام تاجکستانیوں کی طرح دراز قامت نہیں تھا اور اس کی خم دار ناک کے نیچے گھنی مونچھیں تھیں۔ باب کے استفسار پر اس نے کہا

''حال ہی میں صرف تین آدمیوں نے اس قسم کے جوتے خریدے ہیں۔ جن کے نام رسید بک میں درج ہیں۔

''میں ان ناموں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔'' باب بولا۔

خان اسحاق نے ان ناموں کو ایک کاغذ پر تحریر کرکے اس کی طرف بڑھا دیا۔ باب نے انہیں کافی دیر تک دیکھا مگر ان سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ وہ تین نام تھے، احمد افغانی، خان شناوری اور تاج دار باقی۔

باب نے کاغذ کا وہ پرزہ جیب میں ڈالا اور خان اسحاق کا شکریہ ادا کرکے دکان سے باہر آ گیا۔

پولیس ریکارڈ الٹنے پلٹنے پر اس میں احمد افغانی کا نام ملا۔ ریکارڈ بہت پرانا تھا اور اس میں اس کے متعلق بہت کم معلومات تھیں تاہم اس کا فوٹو دیکھنے کے بعد باب کو قدرے اطمینان ہوا کہ اس کی تفتیش صحیح نہج پر چل رہی ہے۔

احمد افغانی وہی شخص ثابت ہوا تھا جس کی ران اور کلائی پر باب نے فائر کرکے اسے زخمی کیا تھا۔

''یقیناً یہ شخص آج کل جزیرے میں ہوگا۔'' باب بڑبڑایا۔

''ظاہر تو یہی ہوتا ہے۔'' ظاہر خان نے جواب دیا۔ ''مگر جزیرہ نما مافیو کوئی چھوٹی سی جگہ نہیں ہے۔ تم اسے کہاں تلاش کرو گے؟''

''میں کوشش کروں گا۔'' باب نے سوچتے ہوئے کہا۔

''تمہاری تمام کوششیں رائیگاں جائیں گی۔'' ظاہر خان بولا۔ ''اس خطے کے لوگ بہت کم گو واقع ہوئے ہیں ہر بات کو پیٹ میں رکھ لیتے ہیں۔ زبان پر نہیں لاتے۔''

''مگر وہاں جانے کے بجائے پہلے اس کے بارے میں یہیں لوگوں سے پوچھ گچھ کیوں نہ کی جائے۔'' باب نے کہا۔

اس کے ذہن میں مرجانہ کا نام گونج رہا تھا جو ٹاؤن کی ایک پیشہ ور عورت تھی۔ باب ایک سے زائد

بار اس کی جان بچا چکا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ احمد افغانی کے بارے میں اس عورت سے بہت کچھ معلوم کر سکے گا

☆☆☆

مرجانہ نے اسے دیکھ کر بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔ وہ اس پر مصر تھی کہ باب کم از کم ایک روز ضرور اس کے ہاں مہمان رہے، مگر باب نے اسے ٹال دیا۔

''مرجانہ تم جانتی ہو کہ میں قانون نافذ کرنے والے ادارے سے وابستہ ہوں اور میری تمام زندگی خیر و شر کی جنگ لڑتے ہوئے گزری ہے اگر میں تمہارے پاس تفریحاً آیا ہوتا تو اور بات تھی، مگر اس وقت میں جس مشن پر ہوں اس کی نوعیت کچھ اس قسم کی ہے کہ ایک ایک لمحہ میرے لیے قیمتی ہے۔ میں کسی اور وقت آ کر ٹھہروں گا۔ اس لمحے میرا دامن نہ تھامو۔''

مرجانہ نے اداس اور دل گیر لہجے میں کہا۔ ''دنیا میں تم جیسی شخصیتیں بہت کم گزری ہیں۔ تمہارے کارنامے سننا تو درکنار میں متعدد کارناموں میں تمہارے ساتھ رہی ہوں۔ تمہاری معیت میں وقت کاٹنے کا تصور بڑا جاں فزا ہے، لیکن میں انہی چند لمحوں پر اکتفا کر لیتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں کوئی بڑی الجھن میرے در پر کھینچ کر لائی ہوگی۔''

''تم نے ٹھیک جانا۔'' باب بولا۔ ''تم جس پیشے سے وابستہ ہو اس میں ہر روز سیکڑوں لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ میں تم سے ایک شخص احمد افغانی کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ تمہیں اس کے بارے میں جو کچھ بھی معلوم ہو مجھے بتا دو۔''

مرجانہ بہت دیر تک بھویں سکیڑ کر غور کرتی رہی پھر مایوسی سے سر ہلا کر بولی۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں آج تک ایسے کسی شخص سے نہیں ملی۔''

''اوہ!'' باب نے پرتشویش انداز میں کہا۔

''مگر ٹھہرو۔'' مرجانہ بولی۔ ''میں ایک ایسی عورت کا پتا جانتی ہوں جو جسم فروشی کا اڈہ چلاتی ہے۔ لوگ اسے وساری کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کے اڈے پر شہر کے تمام اوباش حاضری دیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ احمد افغانی کے بارے میں ضرور کچھ جانتی ہوگی۔''

''اس کے اڈے پر فون کر کے معلوم کرو کہ کیا میں اس سے آج رات ملاقات کر سکتا ہوں۔'' باب بولا۔

''ہر چند کہ مادام وساری سے میرے گہرے تعلقات ہیں مگر اس کے باوجود تمہیں مطلوبہ معلومات مفت فراہم نہیں کرے گی۔''

''وہ اس سلسلے میں جو کچھ طلب کرے گی۔ میں اسے ادا کرنے کو تیار ہوں۔'' باب بولا۔

''اس کی قیام گاہ پر تم اکیلے ہی جانا۔'' مرجانہ بولی۔

''یہ بھی منظور ہے۔'' باب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک باریک لکیر کھنچ گئی۔ ''بلکہ اس کے علاوہ جتنی بھی شرائط ہیں۔ مجھے پیشگی منظور ہیں۔''

مرجانہ نے ٹیلی فون کے قریب جا کر نمبر ڈائل کیے اور پھر سرگوشی میں دیر تک گفتگو کرتی رہی۔ تقریباً دس منٹ بعد اس نے ریسیور رکھا اور باب کے پاس آ کر بولی۔ ''لو تمہارا کام بن گیا۔ تم دس بجے رات کے بعد کسی وقت بھی اس کے پاس جا سکتے ہو۔ وہ تم سے گفتگو کرنے پر تیار ہے۔ میں نے اس آدمی کا نام ظاہر نہیں کیا ہے جس کے بارے میں تم اس سے پوچھنا چاہتے ہو۔ مادام وساری کو ہر لمحہ یہ خوف دامن گیر رہتا ہے کہ کہیں پولیس اس کا فون نہ ٹیپ کر رہی ہو۔''

باب نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ اس وقت دس بجنے میں بیس منٹ تھے۔ اس نے مرجانہ سے اجازت چاہی اور وہاں سے نکل آیا۔

☆☆☆

شاہراہ فرعانہ پر واقع قصر شیبانی تاریکی میں بڑا عجیب سا معلوم ہوا۔ وہ عمارت بہت خستہ حال تھی۔ اس میں جابہ جا شگاف اور درزیں پڑی ہوئی تھیں۔

قصر کے آس پاس دور تک روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا البتہ اس کی ہر کھڑکی میں ایک طاق بنا ہوا تھا جس میں شمع جل رہی تھی۔ پہلی منزل کی تمام کھڑکیوں اور دروازوں پر بھاری پردے پڑے ہوئے تھے اور باہر سے جائزہ لینے پر یہ قیاس دشوار تھا کہ عمارت کے مکین وہاں کیا کرتے ہوں گے۔

باب جب قصر شیبانی کی سیڑھیاں طے کر رہا تھا تو اس نے پھاٹک پر موجود ایک شخص کو حرکت کرتے دیکھا۔ وہ شخص تاریکی کی بنا پر اسی کا جزو لگ رہا تھا۔ باب کا پیچھا کرنے کے بجائے وہ ایک طرف سے دوسری طرف چلا گیا۔

پھاٹک کے بعد ایک راہ داری تھی اور اس کے بعد ایک طویل و عریض ہال تھا جہاں بہت سے مرد و زن دادِ عیش دیتے نظر آئے۔ باب کی آمد پر ان میں سے کچھ نے اس کی طرف دیکھا پھر منہ بنا کر دوسری طرف متوجہ ہو گئے۔ انداز ایسا تھا جیسے باب کی موجودگی انہیں ناگوار گزری ہو۔

باب تھوڑی دیر وہاں کھڑا پلکیں جھپکاتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ایک دراز قامت عورت ملحقہ کمرے سے نکل کر اس کے قریب آئی۔ اس کے جسم پر باریک سنہرے تاروں سے بنا ہوا لبادہ تھا اور شمع کی مدھم روشنی میں بھی اس کے نشیب و فراز عیاں تھے۔ اس نے اپنے موتیوں جیسے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اور سیاہ زلفوں کو ایک مستانہ ادا سے آگے پھینکتے ہوئے کہا۔ ”فرمایئے۔۔۔“

”میں مادام وساری سے ملنا چاہتا ہوں شاید آپ ہی۔۔۔“ اس نے کھلکھلاتے ہوئے باب کی بات کاٹ دی۔

”نہیں میں ان کی خادمہ خاص ہوں۔ اس طرف تشریف لایئے۔ وہ آپ ہی کا انتظار کر رہی ہیں۔“ اس نے ہال کے دائیں جانب واقع سنگی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ باب اس کی راہ نمائی میں سفر طے کر رہا تھا۔ تاریکی اور روشنی کے امتزاج میں اس کے لمبے لمبے سائے دیواروں پر حرکت کرتے تھے تو بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ باب کو اس عمارت کے ہر گوشے سے سیلن زدہ بو آتی محسوس ہوئی تھی۔ تیسری منزل پر پہنچ کر اس خادمہ نے ایک دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک عورت کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس نے باب سے نام پوچھا اور پھر ادب سے جھک کر تعظیم دی۔ ”مادام آپ ہی کا انتظار کر رہی تھیں۔ اندر آجایئے۔“ وہ بولی۔

باب کمرے میں گیا تو اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔ سرخ و سفید موم بتیوں کا دھواں اس کمرے میں چکرا رہا تھا اور اس کی نکاسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

کمرہ شاہانہ انداز میں بیش قیمت چیزوں سے مزین تھا۔ دائیں جانب صوفے پر ایک بوڑھی مگر فربہ عورت براجمان تھی۔ باب کو دیکھتے ہی اس نے کمرے میں موجود خادمہ کو باہر جانے کا اشارہ کیا تھا۔

اس بڑھیا کے جسم پر زریفت کا لبادہ تھا اور گلے میں بیش قیمت ہار۔ باب کو اس کی انگلیوں میں موٹی موٹی انگوٹھیاں دکھائی دیں۔ اس کے چہرے پر میک اپ کی گہری تہیں تھیں۔ باب نے اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی شکن کو دیکھ کر اندازہ لگایا تھا کہ وہ ستر سال کی ضرور رہی ہو گی۔

مادام وساری نے اس سے گفتگو کرنے کے لیے جب اپنا منہ کھولا تو اس کی کرخت اور بھدی آواز سنائی دی۔ باب کو یقین ہو گیا کہ اس کا اندازہ سو فیصد درست تھا۔ اس نے کہا۔

”اگر تم برا نہ مانو تو میں اپنی وگ اتار دوں۔ اس وقت کچھ گرمی سی لگ رہی ہے۔“

گویا اس کے سنہرے چمک دار بال بھی مصنوعی تھے۔“

باب کا جی چاہا کہ وہ اس سے مصنوعی بال ہی نہیں بلکہ بتیسی اور گھنیری پلکیں بھی اتارنے کو کہے مگر وہ ضبط کر کے رہ گیا۔ اس نے نرمی سے کہا۔ ”شوق سے اتار دیجیے آج گرمی واقعی کچھ زیادہ

ہے۔"

مادام وساری نے کانوں کے قریب سے کلپ نکالے اور وگ اتار کر درمیانی میز پر رکھ دی۔ اب اس کا چہرہ اور بھی مکروہ لگنے لگا تھا۔ اس کا سر تقریباً بالوں سے عاری تھا البتہ جب وہ سر کو دائیں بائیں گھماتی تھی تو ایک آدھ رواں اپنی جھلک دکھا جاتا تھا۔"

"یہ درست ہے مادام۔"

"تم مجھے صرف وساری کہہ سکتے ہو۔"

"میری ماں تاجکستانی تھی۔ میجر باب! میں کسی زمانے میں بہت دلکش اور حسین ہوا کرتی تھی۔"

"آپ کو دیکھ کر اب بھی یہ احساس ہوتا ہے۔" باب نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ بڑھیا اپنی عمر کے آخری حصے میں ہوتے ہوئے عہد رفتہ کو آواز دے رہی تھی۔ اجڑی اجڑی سی رنگت مصنوعی چہرہ اور اس کا پوپلا منہ چیخ چیخ کر اس کی شکستہ حالی اور درماندگی کا فسانہ کہہ رہا تھا مگر وہ داد و تحسین کی خواہاں تھی۔ ہر گزرتا لمحہ اس کے لیے عذاب تھا وقت گویا اسے ٹھوکریں مار رہا تھا مگر وہ اسے گرفت میں لینے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

باب کو اس سے کچھ معلومات حاصل کرنا نہ ہوتیں تو وہ برملا کہہ دیتا کہ آئینہ نہ دیکھا کرو، آئینے جھوٹ بولتے ہیں۔"

"میجر باب! میں نے جب سے اس قصر کو نازک اندام پریوں سے آراستہ کیا ہے میرے گرد تاجکستان کے صاحب حیثیت اور ذی جاہ اشخاص منڈلانے لگے ہیں جن میں صنعت کار، اداکار اور متعدد وزرا بھی شامل ہیں۔ میں کسی کا نام نہیں لوں گی کیونکہ میری روزی انہی کے دم سے چلتی ہے۔" اس نے کچھ توقف سے دوبارہ کہا۔ "اس کے علاوہ زیرِ زمین تنظیموں کے شوریدہ سر افراد بھی یہاں اپنا دل بہلانے آتے ہیں۔ ذی حیثیت اشخاص کو ان کی آمد پر اعتراض ہوتا ہے مگر قصر شیبانی کے دروازے کسی پر بند نہیں ہو سکتے۔ یہاں ہر شخص آ سکتا ہے۔ تم شاید کسی بدنام شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرنے آئے ہو۔"

"ہاں۔" باب نے مختصراً کہا۔

"اس کا نام؟"

"احمد افغانی۔" باب بولا۔

مادام وساری کی بھویں سکڑ گئیں جیسے وہ اپنے دماغ پر زور ڈال رہی ہو۔ اس نے چند لمحوں بعد کہا۔

"میں اسے جانتی ہوں۔"

"وہ آج کل کہاں ملے گا۔" باب نے سوال کیا۔

"میں یہ بھی بتا سکتی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "مگر اس کے لیے تمہیں رقم خرچ کرنا پڑے گی۔"

"میری جیب کافی بھاری ہے۔" باب بولا۔

"بیس ہزار ادا کرنا ہوں گے۔" اس نے کہا۔

حالانکہ یہ رقم بہت زیادہ تھی مگر باب اس سے سودے بازی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کرنسی نوٹوں کی دو گڈیاں نکال کر میز پر پھینک دیں۔ بڑھیا نے ایک گڈی اٹھالی اور پھر اس کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ "نہ صرف یہ کہ رقم پوری ہے بلکہ نوٹ بھی اصلی ہیں۔ مجھے تمہاری دیانت داری پر خوشی ہوئی۔" اس نے رقم اٹھا کر ایک قریبی میز کی دراز میں ڈالی اور کہا۔ "احمد افغانی میرے مستقل گاہکوں میں شامل نہیں ہے۔ وہ کبھی کبھار یہاں آتا ہے۔ ایک زمانے میں وہ معمولی سی چوری چکاری کیا کرتا تھا۔ پولیس اسے پکڑ لیتی تھی اور وہ مہینوں جیل میں وقت کاٹتا تھا پھر ایسا ہوا کہ اس نے ایک بڑے گروہ میں شمولیت اختیار کر لی وہ گروہ منشیات اور لڑکیوں کا کاروبار کرتا تھا۔ مجھے یہ خبر اس کے ایک ساتھی سے ملی تھی ورنہ وہ تو اس دوران میں تاجکستان سے بالکل غائب ہو گیا تھا۔ کئی سال بعد جب وہ اس علاقے میں لوٹ کر آیا تو اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا جس کا نام سلطان میرزا ہے۔ تم تو اسے جانتے ہوں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ نہیں۔" باب نے جواب دیا۔ "تم اپنی کہانی جاری رکھو۔"

"مجھے اس بات پر حیرت ہے۔" اس نے منہ پھلا کر کہا۔ "اس سے تو تاجکستان کی پولیس کے تمام جوان واقف ہیں۔ وہ بہت مال دار شخص ہے اور تاجکستان میں اس کی کافی جائیداد ہے۔ اس کی قیام گاہ بہت خوب صورت ہے۔ بظاہر تو وہ باعزت شخص ہے مگر میں جانتی ہوں کہ وہ متعدد زیر زمین تنظیموں کا سرغنہ ہے۔ تمام غیر قانونی کاموں کے پیچھے اسی کا ہاتھ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ بدنام زمانہ عالمی تنظیم مافیا کا بھی کارکن ہے۔ ابھی کچھ مہینے پہلے اس نے قازقستان کے بڑے عجائب گھر پر بھی ہاتھ صاف کیا تھا مگر عدم ثبوت کی بنا پر پولیس اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکی۔"

"بہت خوب۔" باب بڑبڑایا۔ "یہ اطلاع میرے لیے بہت دلچسپ ہے۔"

"جب احمد افغانی تاجکستان لوٹ کر آیا تو اس کی حیثیت سلطان میرزا کے دست راست کی سی تھی۔" مادام وساری بولی۔

"اور یہ آدمی سلطان میرزا مستقلاً تاجکستان میں ہی رہتا ہے۔" باب نے پوچھا۔

"اس کے یہاں اور بیرونی ممالک میں کئی ٹھکانے ہیں۔ بیرونی ممالک کے ٹھکانوں کے بارے میں تو میری معلومات صفر ہیں۔ البتہ میں یہ جانتی ہوں کہ اس کی ایک قیام گاہ ٹاڈن میں بھی ہے مگر وہ یہاں بہت کم نظر آتا ہے۔ شمالی سمت میں ایک علاقہ کیپری ہے جہاں ایک ہوٹل میں اس نے کئی منزلیں کرائے پر لی ہوئی ہیں۔ گزشتہ ایک سال سے سلطان میرزا وہاں زیادہ دیکھا جا رہا ہے۔" مادام وساری نے میز کی دراز سے پرفیوم کی شیشی نکالی اور اپنے جسم پر اس کا اسپرے کیا۔

باب نے اس کی اس حرکت پر کوئی توجہ نہیں دی اور اگلا سوال کیا۔ "تمہیں یقین ہے کہ یہ دونوں آدمی احمد افغانی اور سلطان میرزا اس علاقے میں اسی ہوٹل میں مل جائیں گے۔"

"ہاں۔" بڑھیا نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہوٹل کا نام سادا گوسا ہے۔ اس کا مالک تاجکستانی نہیں قازقستانی ہے۔"

باب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ان معلومات کے لیے شکریہ! ان سے میرے کام میں بہت آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔"

بڑھیا نے اسے کھڑے ہوتے دیکھا تو میز کی سطح پر لگی ہوئی اطلاعی گھنٹی بجائی۔ دور کہیں ارتعاش سا پیدا ہوا اور وہی خادمہ خاص ظاہر ہوئی جو باب کو وہاں چھوڑ گئی تھی۔ باب اس کی راہ نمائی میں عمارت سے باہر آ گیا۔

☆☆☆

ٹیکسی کا اڈا وہاں سے کوئی دو گلیاں چھوڑ کر تھا۔ باب نے قصر شیبانی کے پھاٹک کے پاس کھڑے ہو کر ٹیکسی کا انتظار کرنے کے بجائے مناسب سمجھا کہ وہ اڈے تک چلا جائے۔

وہ سیٹی بجاتا ہوا بے پروائی سے اس طرف گامزن تھا کہ اس نے گلی کے اختتام پر پہنچتے ہی اپنے عقب میں چاپ سنی۔ باب نے مڑ کر دیکھا۔ دو اشخاص تھے جو تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کی طرف آ رہے تھے۔

باب کی چھٹی حس نے خبردار کیا کہ ان لوگوں کے ارادے نیک نہیں ہیں۔ وہ کچھ نہ کچھ کر گزریں گے۔ وہ دونوں جیسے ہی اس کے نزدیک آئے۔ انہوں نے اپنی رفتار سست کر دی۔ باب بے پروائی سے ایک طرف ہو گیا تاکہ وہ نکل جائیں۔ ان میں سے ایک آگے چلا گیا جب کہ دوسرا پیچھے ہی رہا۔

باب نے اگلا قدم اٹھایا ہی تھا کہ آگے نکلنے والا شخص دفعتاً پلٹ پڑا۔ باب کا راستہ بالکل تنگ ہو گیا تھا وہ گلی تنگ تھی اور اس آدمی کو راہ سے ہٹائے بغیر وہاں سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔

"ٹھہرو۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "تم وساری سے ملنے کیوں آئے تھے؟"

ان میں سے ایک کو اس نے پہچان لیا تھا۔ یہ وہی تھا جو مادام وساری کے عشرت کدے میں داخل ہوتے وقت پھاٹک پر ملا تھا۔ اس وقت تو اس نے کچھ نہیں کہا تھا مگر اب وہ رک رہا تھا۔

اس آدمی کا چہرہ اچھا بھلا تھا مگر اس نے ہونٹ بھینچ کر ناک سکیڑ کر اسے بدنما بنا لیا تھا۔ اس کا حلیہ روایتی اوباشوں جیسا تھا۔

''وہ میری پرانی واقف کار ہے۔'' باب نے جواب دیا۔ ''میری اس سے اکثر و بیشتر ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔''

''تم جھوٹ بولتے ہو۔'' وہ غرایا۔ ''میں نے اس سے پہلے تمہیں اس اڈے پر کبھی نہیں دیکھا۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' باب نے جھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ ''میری راہ سے ہٹ جاؤ۔''

''جب تک تم یہ نہیں بتا دو گے کہ تم کس مقصد کے تحت یہاں آئے تھے اس وقت تک ہم تمہیں یہاں سے نہیں جانے دیں گے۔'' اس کے ساتھی نے خشک لہجے میں کہا۔

''میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ اس سے میری پرانی شناسائی ہے۔ میں اس وقت یونہی ادھر آ گیا تھا۔'' باب بولا۔

سامنے والے نے اچانک باب کے ماتھے پر گھونسا مارا۔ باب لڑکھڑا کر پیچھے گرا تو عقب میں کھڑے ہوئے شخص نے گدی پر ہاتھ جما دیا۔

دونوں ہاتھ اچانک پڑے تھے اس لیے باب کو کچھ دیر تک تارے نظر آتے رہے۔ وہ دائیں جانب کی دیوار پر گرا تھا اور اب اسی سے ٹک کر گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ تاریکی میں اسے ایک کا گھونسا اپنی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ باب نے دائیں جانب جھکائی دی مگر وہ مکا اس کے جبڑے پر پڑا۔ باب نے اپنے خون کا ذائقہ زبان پر محسوس کیا۔

شاید اس وقت ستارے اس کے خلاف ہو گئے تھے۔ دو معمولی قسم کے اوباش اسے گھونسوں پر رکھے ہوئے تھے اور وہ ان سے اپنی جان نہیں بچا پا رہا تھا۔

اس نے دیوار کا سہارا لے کر جسم کو سیدھا کیا اور سامنے والے شخص پر چھلانگ لگانے کے لیے اپنے آپ کو تولا ہی تھا کہ پیچھے والے نے جھپٹ کر اس کے بازوؤں تلے ہاتھ ڈالے اور قینچی لگا دی۔

''جلدی سے سب کچھ بتا دو ورنہ میں تمہاری گردن توڑ دوں گا۔'' اس شخص نے خوفناک لہجے میں کہا۔

''بکواس بند کرو۔'' باب نے جواب دیا۔

سامنے والے نے بکواس بند کر دی اور اس کے جبڑے پر ایک اور مکا رسید کر دیا۔ باب کا چہرہ بائیں طرف مڑ گیا۔ اس کے فوراً ہی بعد ناف تلے ایک اور ہاتھ پڑا۔ اس کے حلق سے ''اوغ'' کی سی آواز نکلی۔

''اگر اب بھی تم نے اپنی زبان نہ کھولی تو ہم تمہاری تکا بوٹی کر دیں گے۔''

باب نے اس کی طرف نیم باز آنکھوں سے دیکھا تو اسے ایک تیز دھار چاقو اپنی گردن کے قریب ہی محسوس ہوا۔ اس نے چاقو کی نوک نرخرے پر رکھ کر کہا۔ ''اب بھی اگر تم نے کچھ نہ بتایا تو یہ چاقو تمہارے حلق میں پیوست ہو جائے گا۔''

''بتاتا ہوں۔'' باب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ٹھہرو بتاتا ہوں۔''

پیچھے کھڑے ہوئے شخص نے اسے قینچی سے آزاد کر دیا مگر سامنے والے نے چاقو کی نوک اس کے سامنے سے نہیں ہٹائی۔ باب نے لمبے لمبے سانس کھینچ کر اپنی توانائی مجتمع کی۔ چاقو کا پھل اس کی بائیں آنکھ سے صرف ایک فٹ دور تھا۔

''میں اس سے اس کے پیشے کے متعلق گفتگو کر رہا تھا۔'' باب نے کہا اور اس کے ساتھ ہی قدرے دائیں جانب ہو گیا۔ اس طرح وہ بیک وقت ان دونوں سے ایک قدم پیچھے ہو گیا تھا اور وہ دونوں نگاہ میں آ گئے تھے۔

''مادام وساری کے پیشے کے متعلق۔'' ان میں سے ایک نے حیرت سے کہا۔ ''کیوں؟''

''میں اسے مشورہ دے رہا تھا کہ وہ ایسا ہی

ایک عشرت کدہ تاجکستان کے ساحلی علاقے کیسپری میں بھی کھول لے۔"

"کیا۔۔۔" اس نے احمقوں کی مانند کہا۔

"مادام وساری کو کیا ضرورت۔۔۔"

باب نے برق رفتاری سے جھکائی دی اور دائیں جانب کھڑے ہوئے شخص کا بازو پکڑ کر کھینچا اور اسے سامنے والے پر دھکیل دیا۔ دونوں ایک دوسرے سے ٹکرائے اور چاقو زمین پر گر گیا۔

ان میں سے ایک نے فوری سنبھالا لیا اور باب کی طرف پلٹا۔ اس سے پہلے کہ وہ حملہ کرتا۔ باب کی لات اس کے پیٹ پر پڑی۔ وہ اپنے حلق سے بکرے جیسی آواز نکالتا ہوا دوہرا ہو گیا۔

دوسرے کو باب نے اپنے مکوں پر رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد انہیں احساس ہوا کہ وہ گدھوں کی طرح سے پٹ رہے ہیں۔ انہوں نے باب پر حملہ کرنے کے بجائے مدافعت شروع کر دی۔

پھر یکبارگی وہ موقع ملتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ مدھم روشنی میں باب نے ان کے نقوش سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ جزیرہ نما مافیو کے باشندے ہیں۔

اگر وہ معمولی اوباش ہیں تو کوئی بات نہیں۔ باب نے سوچا لیکن ان کا تعلق سلطان میرزا یا احمد افغانی سے ہے تو ان تک بات منتقل ہوتے دیر نہیں لگے گی۔

☆☆☆

مرجانہ نے اطلاعی گھنٹی سن کر دروازہ کھولا تو باب کو اپنے سامنے پا کر حیران رہ گئی۔ اس نے مسرت سے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم سے اتنی جلدی دوبارہ ملاقات ہو گی۔"

"میں ایک بار پھر اپنی غرض سے تمہارے در تک آیا ہوں۔" باب نے صاف گوئی سے کہا۔

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تم کس لیے یہاں تک آئے ہو۔" مرجانہ بولی۔ "میں تو یہ جانتی ہوں کہ تم اس وقت میری آنکھوں کے سامنے ہو، اندر آ جاؤ۔"

باب نے ڈرائنگ روم کے صوفے پر براجمان ہو کر کہا۔ "تم سلطان میرزا نامی کسی شخص کو جانتی ہو؟"

"ہاں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "میں کئی سال تک اس کی داشتہ رہ چکی ہوں۔"

اس نے اپنے بارے میں یہ انکشاف اس طرح کیا جیسے اس کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ باب جانتا تھا کہ وہ جس پیشے سے وابستہ ہے، اس نے مرجانہ کو بے حس بنا دیا ہے۔ شرم و حیا، عزت و عصمت اب اس کے نزدیک بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔

"تم اس کا پتا جانتی ہو؟" اس نے سوال کیا۔

"ہاں۔" مرجانہ نے جواب دیا۔ "وہ کیسپری میں رہتا ہے اور میں تمہیں وہاں تک لے جا سکتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے، میں اور تم وہاں چلیں گے۔ میرے ساتھ ایک دوست بھی ہو گا۔"

☆☆☆

اسی رات ٹرنک کال پر میجر باب، کرنل ڈیوڈ سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس نے سلطان میرزا کا نام لیا تو کرنل ڈیوڈ نے کہا۔ "جنرل مانکسٹر کی فائل کا مطالعہ کرنے پر پتا چلا ہے کہ سلطان میرزا کافی عرصے سے اس کے ساتھ ہے۔ ایک ملک کے فوجی راز اُڑا کر دوسرے ملک کو بیچنا اس کا شیوہ ہے۔ آخری بار یہ رومانیہ میں دیکھا گیا تھا۔ اپنے ایک دوست کے ذریعے فوجی اہمیت کا راز وہاں سے بھی اڑایا ہے۔ اس کا دوست ملٹری میں جنرل کے عہدے پر فائز تھا۔"

"میری اطلاعات کے مطابق میرزا بدنام ترین تنظیم مافیا میں بھی شامل ہے۔"

"اس پر مجھے قطعی حیرت نہیں ہے۔" کرنل ڈیوڈ نے کہا۔ "مافیا ہر ایسے شخص کو شامل کر لیتی ہے جو ان اوصاف کا مالک ہو۔" اس نے کچھ توقف سے دوبارہ کہا۔ "اب تمہارا کیا ارادہ ہے۔"

"میں کیسپری تک جاؤں گا۔" باب نے جواب

دیا۔

''ٹھیک ہے، اس کے بعد مجھے اطلاع دینا کہ تمہیں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی۔'' کرنل ڈیوڈ نے کہا اور اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

کیپری بالکل ساحل سے لگا ہوا تھا۔ وہاں آبادی اس قدر کم تھی کہ سمندر ہر جگہ سے صاف نظر آتا تھا۔ وہ لوگ شام پانچ بجے وہاں پہنچے تھے۔ آسمان پر اس وقت سرخی چھائی ہوئی تھی اور سورج ڈوبنے کی تیاری کر رہا تھا۔

وہ پوری آبادی پہاڑی سلسلوں پر تھی، جگہ جگہ نشیب و فراز کی وجہ سے آبادی میں دل کشی پیدا ہو گئی تھی۔ کہیں سے مکانوں کی چھتیں دکھائی دینے لگتی تھیں۔ کہیں اتنا نشیب تھا کہ سر اٹھانا پڑتا تھا۔ سارا شہر اس وقت سیاحوں پر مشتمل تھا۔ ہنستے کھیلتے جوڑے جگہ جگہ ریستورانوں میں رقصاں دکھائی دیتے تھے۔ شہر کے وسط میں تفریح گاہ تھی اور وہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔ وہ تینوں وہاں دیر تک ٹہلتے رہے۔ ہوٹل سارگوسا وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

ہوٹل کی عمارت کافی لمبی چوڑی تھی اور اس کے صدر دروازے پر اتنا سبزہ لگا ہوا تھا کہ باغ کا گمان ہوتا تھا۔

''یہی وہ ہوٹل ہے۔'' مرجانہ نے سرگوشی کی۔ ''جہاں سلطان میرزا رہتا ہے یہاں سے تمہیں اس کے کمرے کی بالکونی دکھائی دے رہی ہوگی۔ وہ چوتھی منزل پر رہتا ہے۔ جب سلطان میرزا یہاں قیام کرتا ہے تو دو باڈی گارڈز اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ جن میں سے ایک تو دروازے کے سامنے ہی ٹہلتا رہتا ہے۔ دوسرا گارڈ ڈرائنگ روم سے ملحقہ کمرے میں رہتا ہے اور اجنبیوں کی آمد پر خود کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ ڈرائنگ روم میں ایک فولادی میز ہے جس کی درازیں ہمیشہ بند رہتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سلطان میرزا ضرور اس میں کوئی اہم چیز رکھتا ہے۔'' اس نے کچھ توقف کے بعد پوچھا۔ ''اگر سلطان میرزا وہاں ہوا تو تم کیا کرو گے؟''

''ہم حتی الامکان اس سے اپنی اصلیت چھپائیں گے۔'' باب بولا۔

''میں اس سے زیادہ تر جائیداد کی خرید و فروخت پر گفتگو کروں گا کیونکہ وہ بظاہر اسی کا کاروبار کرتا ہے۔ فی الحال میں اس پر ہاتھ ڈالنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔'' اس نے توقف سے دوبارہ کہا۔ ''تم اس دوران یہیں رہنا۔''

''کیوں میجر۔'' مرجانہ نے حیرت سے سوال کیا۔ ''میرا یہاں ٹھہرنا کیوں ضروری ہے۔ تم اس سے گفتگو کرنے اس کے سوٹ میں جاؤ گے تو راہ داری میں رہوں گی۔''

مرجانہ نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ''میں یہیں تم لوگوں کا انتظار کروں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' مرجانہ نے کہا اور ہوٹل سارگوسا کے صدر دروازے سے واپس چلی گئی۔ وہ تینوں مغربی سمت ایک باغ میں کھڑے گفتگو کر رہے تھے۔ ظاہر خان اس دوران میں خاموش کھڑا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا ان دونوں سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

وہ ہوٹل میں داخل ہو گئے اور کسی طرف نگاہ کیے بغیر سیدھے سلطان میرزا کے سوٹ کے سامنے پہنچ گئے۔ باب نے اطلاعی گھنٹی بجائی اسے کمرے میں سناٹا محسوس ہوا تھا۔ توقع تھی کہ کمرے سے کوئی برآمد نہیں ہوگا لیکن تھوڑی دیر بعد ایک لڑکی نے دروازہ کھولا۔

اس کے بال سنہرے اور آنکھیں نیلی تھیں۔ آنکھوں ہی کی مناسبت سے اس نے ہونٹوں کو بھی رنگا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر برائے نام لباس تھا۔ لڑکی کے ہاتھ میں شراب کا ایک جام تھا۔ شراب کا خمار اس کی آنکھوں ہی میں نہیں پورے جسم پر معلوم ہوتا تھا۔

''جناب سلطان میرزا تشریف رکھتے ہیں۔'' باب نے اس سے سوال کیا۔ ''میں ان سے ملنا چاہتا

ہوں۔''

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''جناب سلطان میرزا اس وقت نہیں ہیں۔''

جواب دیتے وقت وہ لباس کی طرف سے کچھ اور بے پروا ہوگئی تھی۔ باب نے محسوس کیا تھا کہ ظاہر خان اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا ہے۔

''معاف کرنا۔ ہم بہت دور سے آئے ہیں۔'' باب بولا۔ ''یہاں کوئی اور ایسا شخص نہیں ہے جس سے گفتگو کی جاسکے۔''

''گفتگو۔۔۔ گفتگو تو آپ مجھ سے بھی کرسکتے ہیں۔'' لڑکی بولی۔

ظاہر خان نے جلدی سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

لڑکی نے مدہوش کن انداز میں جھومتے ہوئے انہیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ کمروں میں صفائی کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔ جابہ جا شراب اور دوسرے مشروبات کی خالی بوتلیں کمروں میں بکھری ہوئی تھیں۔ شراب کے خالی اور آدھے بھرے ہوئے گلاس بھی میز پر بے ترتیبی سے رکھے نظر آئے۔ راکھ دان سگریٹ کے ٹکڑوں سے پُر تھے اور قالین پر کئی روز کی گرد جمی ہوئی تھی۔ پرانے اخبارات اور رسائل اس طرح سے کھلے پڑے تھے جیسے باقاعدہ ان کی نمائش مقصود ہو۔

لڑکی نے انہیں ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''آپ لوگ شراب پئیں گے؟'' اس نے پوچھا

''نہیں۔''! باب نے مختصراً جواب دیا۔

لڑکی نے شان بے نیازی سے اپنے شانے ہلائے اور ان کے سامنے والے صوفے پر گر کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ شراب کا گلاس اس نے قریبی تپائی پر رکھ دیا تھا۔

باب کی عقابی نگاہ نے محسوس کرلیا تھا کہ اندرونی کمروں میں کوئی شخص نہیں ہے۔ وہاں وہ لڑکی اکیلی ہی ہے۔

''آپ سلطان میرزا سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟'' لڑکی نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔ ''سلطان میرزا مجھ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھتے۔ آپ مجھ سے ہر قسم کی کاروباری گفتگو کرسکتے ہیں۔''

ظاہر خان نے لڑکی کو جواب دیا کہ وہ لوگ اس علاقے میں زمین اور جائیداد خریدنے کے خواہش مند ہیں۔ سلطان میرزا پراپرٹی ڈیلر ہیں اس لیے وہ ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ باب کے کان ان کی گفتگو پر لگے ہوئے تھے مگر نگاہ چاروں طرف چکراتی پھر رہی تھی۔

وہ کمرا دائیں جانب تھا جس کا تذکرہ مرجانہ نے خصوصی طور پر کیا تھا۔ وہاں ایک فولادی میز اور کرسی کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ البتہ میز پر ٹیلی فون موجود تھا۔

''اس علاقے کی تو تمام زمین فروخت ہوچکی ہے۔'' لڑکی بولی۔ ''اب تو یہ ہے کہ کوئی اپنا مکان یا زمین فروخت کرتا ہے تو اس کے دام زیادہ مانگتا ہے آپ لوگوں کے پاس کہاں تک گنجائش ہے؟''

''ہم مہنگے سے مہنگا مکان خریدنے کو تیار ہیں۔'' ظاہر خان نے جواب دیا۔ اس نے اپنے دانتوں کی نمائش اس وقت اس طرح سے کی تھی جیسے وہاں کسی ٹوتھ پیسٹ کی اشتہاری فلم کی شوٹنگ ہورہی ہو۔

باب نے ہولے سے کھنکار کر کہا۔ ''محترمہ۔۔۔!''

''جولیا۔'' لڑکی جلدی سے بولی۔

''جولیا! اس کمرے میں ایک ٹیلی فون دکھائی دے رہا ہے۔ اگر تم اجازت دو تو میرا دوست اپنے ہوٹل فون کرلے۔''

ظاہر خان نے بھویں سکیڑیں۔

''ہاں یقیناً۔۔۔'' جولیا نے جواب دیا اور بل کھا کر بولی۔ ''میں اس کمرے کی بتی جلائے دیتی ہوں۔''

وہ اس کمرے کی طرف گئی تو باب نے ظاہر خان کو آہستہ سے بتایا کہ اسے کیا کرنا ہوگا۔ جولیا کے

واپس آتے ہی ظاہر اس کمرے میں چلا گیا اور اس نے کمرے کا دروازہ بند کرلیا۔

جولیا باب کے صوفے کے قریب آ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے منہ سے شراب کے بھبکے نکل رہے تھے اور آنکھیں خمار سے سرخ تھیں۔ باب بہ خوبی واقف تھا کہ وہ اس سے کیا توقع کررہی ہے۔ اس نے جولیا سے کہا۔ ''کیا اس کاروبار میں سلطان میرزا کے ساتھ کسی اور کی شراکت بھی ہے؟''

جولیا نے مایوسی سے سامنے والی صوفے پر بیٹھ کر کہا۔ ''پتا نہیں مجھے، سلطان میرزا کے گرد تو ہر لمحے کوئی نہ کوئی نیا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ اگر اس نے کسی کے ساتھ شراکت کر بھی لی ہے تو مجھے اس کا علم نہیں۔'' وہ کچھ توقف سے دوبارہ بولی۔ ''مگر کیا آپ لوگ آج اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہیں گے؟''

''ہاں۔'' باب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی پتلی سی لکیر ابھری۔ ''ہمارے پاس وقت کم ہے اس لیے آج صرف کاروباری گفتگو ہوگی۔''

دفعتاً دروازہ کھلا اور ظاہر خان کمرے سے نکلا۔ اس نے باب کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

باب نے صوفے سے اٹھ کر جولیا سے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''سلطان میرزا آئیں تو ان کو بتا دینا کہ ان کے پرانے دوست نادر اور وحید آئے تھے۔ وہ اس علاقے میں مکان خریدنا چاہتے ہیں۔''

''اور۔۔۔'' جولیا نے نیم باز آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اور یہ کہ اب ہم چلتے ہیں پھر کسی وقت حاضر ہوں گے۔'' باب نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ جولیا نشے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ باب کو یقین تھا کہ اس ملاقات کا اس کے ذہن پر ہلکا سا عکس باقی رہ جائے گا۔ وہ بعد میں سلطان میرزا کو کوئی رپورٹ دینے کی کوشش بھی کرے گی تو کامیاب نہ ہوسکے گی۔

وہ دونوں جیسے ہی لابی میں پہنچے، ظاہر خان نے سرگوشی کی۔ ''سلطان میرزا۔''

باب نے استقبالیہ کاؤنٹر پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور لابی میں واقع بک اسٹال کی طرف مڑ گیا۔

سلطان میرزا کے ساتھ اس وقت احمد افغانی بھی تھا۔ ہر چند کہ اس نے اپنا حلیہ تبدیل کررکھا تھا اور چھڑی ٹیک کر چل رہا تھا مگر اس ایک اچٹتی نگاہ میں باب نے اسے شناخت کرلیا تھا۔

کوئی مجھے یہاں آ کر پوچھے تو فوراً مجھے اس کی اطلاع دینا۔'' سلطان میرزا نے استقبالیہ کاؤنٹر پر موجود شخص سے کہا۔ ''میرے سوٹ میں تین آدمیوں کا کھانا بھجوادو۔''

وہ بھاری تن و توش کا ایک بارعب شخص تھا۔ باب نے محسوس کیا تھا کہ احمد افغانی اس کے سامنے دبا دبا سا ہے۔ سلطان میرزا کی رنگت سیاہی مائل تھی اور وہ تقریباً چالیس سال کا تھا۔ وہ دونوں سیڑھیوں کی طرف آنے کے بجائے لفٹ کی طرف چلے گئے تھے۔

دونوں چلے گئے تو باب نے آہستگی سے کہا۔ ''تم نے احمد افغانی کے جوتے دیکھے؟''

''ہاں وہ کریپ سول تھے۔'' ظاہر نے جواب دیا۔

وہ ہوٹل سارگوسا سے باہر آئے تو ظاہر نے کہا۔ ''باب یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ سطان میرزا کا تعلق کچھ نہ کچھ جنرل مانکسٹر سے بھی ہے۔''

''وہ کیسے؟'' باب نے سوال کیا۔

''اس فولادی میز کی دراز میں ایک ڈائری پڑی تھی، جس میں جنرل مانکسٹر کا نام اور پتا درج تھا، جسے میں نے نقل کرلیا ہے یہ دیکھو۔''

باب نے اس کے ہاتھ سے کاغذ کی چٹ لے کر دیکھی۔ اس پر ''جنرل مانکسٹر۔ امپورٹر ایکسپورٹر، کے کے روڈ، جزیرے۔'' لکھا ہوا تھا۔

''یہ یقیناً جنرل مانکسٹر کا وہ ٹھکانا ہے جہاں وہ لوٹ کا مال لے گیا ہے۔'' باب کچھ سوچ کر بڑبڑایا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں ایک نظر اس ٹھکانے پر بھی ڈالنا چاہیے۔'' ظاہر خان بولا۔

''ہاں مگر صرف لوٹ کا مال ہی برآمد ہونے سے یہ مشن مکمل نہیں ہوگا۔'' باب بولا۔ ''اگر وہ کاغذات جنرل مانکسٹر کے ہاتھ لگ چکے ہیں تو اس معاملے کو لمبا ہی سمجھو۔ وہ ان سے فائدہ اٹھانے کی ضرور کوشش کرے گا۔''

''اس تحریر کے نیچے ایک تحریر اور بھی تھی۔'' ظاہر خان نے باب کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ ''مزید لکھا تھا۔ ''تمام سامان الحسیمہ کو۔'' آگے ایک تاریخ بھی درج تھی۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ اس شخص کا نام ہے جس کے ہاتھوں یہ نوادرات فروخت کیے جا رہے ہیں۔'' ظاہر خان بولا۔

''ہوسکتا ہے۔'' باب نے دھیرے سے کہا۔

☆☆☆

کیپری سے اڑتالیس گھنٹے بعد وہ جزیرے پہنچے۔ اس جزیرہ نما پر زیادہ آبادی نہیں تھی اور وہ پہاڑی علاقہ تھا۔ لوگ اپنے آپ میں مست تھے۔ ان سے کوئی سوال کیا جاتا تو وہ کوئی جواب نہ دیتے یا پھر محض ایک ''ہم'' کر کے رہ جاتے۔

جزیرہ ابھی معتمدن یافتہ آبادی میں شمار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مرد مچھلیاں پکڑتے تھے اور اسی سے وابستہ کاروبار کرتے تھے۔ عورتیں گھروں سے نہیں نکلتی تھیں۔ باب کو وہاں شاذ ہی کسی عورت کی جھلک دکھائی دی تھی۔

ظاہر خان نے وہاں گھومنے کے بعد کہا۔ ''اس جزیرہ نما جگہ کی خصوصیات بہت حد تک آکسیجن سے ملتی جلتی ہیں۔''

''وہ کیسے۔۔۔''

''یہ جگہ بے رنگ، بے بو اور بے ذائقہ ہے''

''رنگ اور ذائقے کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' باب بولا۔ ''مگر یہاں بو بہت ہے مثال کے طور مچھلیوں کی بو''

''ہاں یہ تو ہے۔'' وہ سر ہلا کر بولا۔ ''یہاں کے باشندے بھی ایسے ہی ہیں

''ٹھہرو! میں ان بڑے میاں سے گزارش کرتا ہوں۔'' ظاہر نے ایک باریش شخص کی طرف اشارہ کیا جو مخالف سمت سے آرہے تھے۔ شاید یہ ہم سے کچھ تعاون کریں۔

بڑے میاں قریب آئے تو ظاہر نے کہا۔ ''اب آپ ہی سہارا ہیں۔''

''کیا مطلب۔'' وہ چونک پڑے۔

''ڈیڑھ روز سے یہاں پریشان حال گھوم رہے ہیں مگر کوئی ہم سے گفتگو کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔''

''یہاں کے باشندے خاص طور پر سیاحوں سے دور رہتے ہیں۔'' بڑے میاں بولے۔ ''کیوں کہ ان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ یہاں بے راہ روی پھیلاتے ہیں اور ہماری عورتوں پر بری نگاہ ڈالتے ہیں۔''

''ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' ظاہر خان بولا۔ ''اگر ہمیں کے کے روڈ کا پتا چل جاتا اور ہم وہاں پہنچ جاتے تو یہاں نہ دکھائی دیتے۔''

''کے کے روڈ ایک بہت بڑی عمارت ہے جہاں درآمد برآمد کا دفتر بھی چند مہینے پہلے کھلا ہے۔ اس کو جھونکا کمبار کہتے ہیں۔'' بڑے میاں بولے۔ ''یہ سڑک تمہیں جزیرہ نما کے آخر میں ملے گی جو کمبار بالکل ساحل پر واقع ہے۔''

''کے کے روڈ پر اگر ہم سیدھے چلتے جائیں تو جونا کمبار پہنچ جائیں گے۔'' باب نے سوال کیا۔

''ہاں، اس کے سوا وہاں پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ عمارت ایک پہاڑی پر واقع ہے اور اس کے عقبی حصے میں سمندر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرف سے وہاں کوئی نہیں جاسکتا۔'' بڑے میاں نے جواب دیا۔

کچھ دور چل کر باب نے کہا۔ ''جزیرہ نما میں سواریوں کی کمی نہیں ہے، لیکن ہم اس سڑک پر کسی سواری کے ذریعے گئے تو فوراً نگاہ میں آجائیں گے۔''

''تو پھر۔۔۔''

''میرا خیال ہے کہ ہم سمندر والا راستہ اختیار

کریں۔ اس عمارت جونا کمبار میں داخل ہونے کے لیے وہ راہ سب سے بہتر رہے گی اور ہم محافظوں کی نگاہ میں بھی نہیں آسکیں گے

☆☆☆

وہ اس آبادی کی ایک سرائے میں ٹھہرے تھے۔ باب نے دوسرے دن جب ظاہر خان کی طرف ایک ڈانگری جیسا لباس بڑھایا تو چونک پڑا۔

''یہ کیا ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''چمڑے کی ڈانگری۔'' باب نے جواب دیا۔ ''پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے بہترین ہے۔''

''تو کیا تمہیں پہلے سے۔۔۔''

''ہاں۔'' باب اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ''میں نے یہاں آنے سے پہلے گائیڈ بک دیکھی تھی۔ گائیڈ بک نئی تھی اس لیے اس میں جونا کمہار کی پوزیشن بھی دی گئی تھی۔ میں احتیاطاً یہ لباس ساتھ لیتا آیا۔ اب یہ پہاڑی پر چڑھنے میں مدد دے گا۔''

اس چمڑے کی ڈانگری میں جگہ جگہ فولادی ہک لگے ہوئے تھے۔

''دو ہک ہمارے ہاتھ میں بھی ہوں گے۔'' باب بولا۔ ''انہیں اور لباس والے ہکوں کو ہم چٹانوں میں بنی ہوئی دراڑوں میں پھنسا کر پہاڑی پر چڑھتے چلے جائیں گے۔''

''بہت خوب۔'' ظاہر خان بولا۔ ''سائنس نے بہت ترقی کرلی ہے۔''

''یہ کسی سائنس داں کی ایجاد نہیں بلکہ میرا کمال ہے۔'' باب نے اس کی کمر پر دھول جڑتے ہوئے کہا۔

''واقعی باکمال ہے۔'' ظاہر خان تحسین آمیز انداز میں بولا۔

''جونا کمبار کے عقب میں پہنچنے کے لیے ہم کشتی استعمال کریں گے۔'' باب بولا۔

''میں جب کل رات کھانا کھا کر ٹہلنے گیا تھا تو میں نے اسی دوران میں ایک شخص سے بات کرلی تھی۔ وہ مجھے کشتی کرائے پر دینے کے لیے تیار ہوگیا ہے۔''

''وہ کیسے۔''

''میں نے مچھلیاں پکڑنے کا اشتیاق ظاہر کیا تھا اور اسے بھاری رقم کی پیش کش کی تھی۔ وہ رقم اتنی زیادہ ہے کہ شاید وہ اس سے ایک اور کشتی خرید لے۔''

''چلو یہ الجھن بھی دور ہوئی۔'' ظاہر خان بولا۔ ''ورنہ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید ہمیں تیر کر وہاں تک پہنچنا پڑے۔''

وہ کشتی کھیتے ہوئے وہاں تک پہنچے تو انہوں نے سمندر میں عمومی چٹانیں دیکھیں۔ ظاہر خان نے باب کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''کیا خیال ہے، کیوں نہ ہم صدر دروازے سے چلیں؟''

کشتی کو انہوں نے وہیں چھوڑا اور اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے ہکوں کو دراڑوں اور درزوں میں پھنسا کر اوپر اٹھنے لگے۔ باب، ظاہر سے اوپر تھا۔ لباس میں جو ہک لگے ہوئے تھے ان میں چھوٹی چھوٹی زنجیریں بھی تھیں تاکہ ہکوں کو پچھلی درز سے نکال کر آگے کہیں لگایا جاسکے۔ آدھا سفر تو بہ آسانی کٹ گیا مگر اس کے بعد چٹانیں بالکل سیدھی ہوگئی تھیں۔ وہاں پہنچ کر ان کی رفتار بالکل سست ہوگئی۔ ظاہر خان نے متعدد بار باب کو لوٹنے کا مشورہ دیا تھا۔

''قوم و ملک کی خدمت کرتے ہوئے بعض اوقات اس سے بھی مشکل مقامات آتے ہیں۔'' باب بولا۔ ''تم ابھی سے ہمت ہارے دے رہے ہو تو آئندہ کیا کرو گے۔''

وہ مقامات تمہیں ہی مبارک ہوں۔'' ظاہر بولا۔ ''میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔''

''تمہارے کام کی نوعیت دراصل ایسی ہے کہ تم دفتر میں کرسی پر بیٹھنے کے عادی ہوگئے ہو۔ انٹرپول کے سارجنٹ ظاہر خان کے بجائے تمہیں انٹرپول کلرک کہنا چاہیے۔''

''اگر تم مجھے عالمی کلرک کہو گے تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' ظاہر خان بولا۔ ''مگر اب مجھے واپس جانے کی اجازت دے دو۔''

"اب واپسی ناممکن ہے۔" باب نے ہنس کر کہا ر ہاتھ میں دبا ہوا ہک درز میں پھنسا دیا۔ "ذرا سمندر کی طرف نگاہ ڈالو۔"

ظاہر خان نے سمندر کی طرف دیکھا تو خوف کے مارے اس کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکلنے لگیں۔

"نفسیاتی طور پر اس وقت تم مجھے اپنا مددگار سمجھ رہے ہو۔" باب بولا۔ "حالانکہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر رہا ہوں مگر واپسی کے وقت تم اکیلے ہوں گے۔ اس وقت سمندر پر نگاہ ڈال کر تمہیں ہول اٹھے گا اور تم کسی موقع پر ہاتھ پیروں کو زحمت دیے بغیر باقی ماندہ سفر طے کر لو گے۔"

ظاہر خان کچھ نہ بولا اور اپنے حلق سے ڈری ڈری آوازیں نکالتا رہا۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہ ایک ایسی جگہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جہاں ایک چٹان ابھری ہوئی تھی اور دیوار میں اس طرح سے آگے کو نکلی ہوئی تھی کہ ایک قدرتی پائیدان سا بن گیا تھا۔ باب نے وہاں پہنچ کر اپنے کاندھے پر پڑی ہوئی رسی کا مضبوط لچھا اتارا اور اس کے ایک سرے پر ہک باندھ کر اسے اوپر کی طرف اچھالا۔ وہاں سے اوپری سطح کا فاصلہ تقریباً پچاس فٹ تھا۔ ہک اڑتا ہوا اوپر جا کر نگاہ سے غائب ہو گیا۔ باب نے رسی کو پکڑ کر کھینچا تو وہ کھنچتی چلی گئی۔ چند فٹ بعد دفعتاً اسے جھٹکا سا لگا اور وہ تن گئی۔ شاید ہک کسی درز میں پھنس گیا تھا۔

باب نے رسی کو قوت سے کھینچ کر دیکھا۔ پھر ظاہر کی طرف مڑ کر کہا۔ "چلو یہ سفر پہلے ہی کر ڈالو۔"

ظاہر کا چہرہ سفید تھا اور اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ اس نے رسی تھامی تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

باب نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "اگر مجھے پتا ہوتا کہ تم اتنے بہادر ہو تو میں تمہیں اپنے ساتھ کبھی نہ لاتا۔"

ظاہر کچھ نہ بولا اور گرہ دار رسی کو پکڑ کر آہستہ آہستہ اٹھتا چلا گیا۔ ہک پھنسا پھنسا کر اٹھنے کی بہ نسبت یہ طریقہ زیادہ بہتر تھا۔ ظاہر تھوڑی سی دیر میں اوپر پہنچ گیا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر باب کو اوپر آنے کا اشارہ کیا۔

باب اوپر پہنچا تو اس نے پہاڑی پر ایک سفید رنگ کی عمارت کھڑی دیکھی۔ چٹانوں کے آخری کنارے سے اس کا فاصلہ بیس فٹ رہا ہوگا۔ اس کی چار دیواری پر تار نظر آ رہے تھے۔

"ان میں لازمی طور پر کرنٹ ہوگا یا ان میں سے کسی تار کا تعلق خفیہ الارم سے ہوگا۔" باب بولا۔ "اس لیے سب سے پہلے اس کا قصہ ختم کرنا چاہیے۔"

وہ ظاہر کے کاندھوں پر پاؤں جما کر کھڑا ہوا اور کسی نہ کسی طرح سے ان تاروں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر اس نے اپنی ڈانگری کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک وائر کٹر نکالا اور تھوڑی سی دقت کے بعد ان تمام تاروں کو کاٹ دیا۔"

وہ جب دوبارہ زمین پر کھڑا ہوا تو ظاہر نے کہا۔ "تم اپنے ساتھ عمرو عیار کی زنبیل لیے پھر رہے ہو۔"

"ہاں۔" باب مسکرایا۔ "میں نے کل ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ ہمیں کن کن چیزوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ نتیجتاً وہ سب چیزیں میں نے اپنی ڈانگری میں رکھ لیں۔"

ظاہر خان سر ہلا کر رہ گیا۔

اس چار دیواری کی آڑ لے کر وہ اندازے سے عمارت کے صدر دروازے کی طرف بڑھے تو انہوں نے وہاں ایک مسلح محافظ کھڑا دیکھا۔ کار پورچ میں ایک گاڑی بھی کھڑی تھی۔

اس طرف سے عمارت میں داخل ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ نہ تو انہیں عمارت کے بارے میں کچھ پتا تھا اور نہ ہی محافظین کی صحیح تعداد کا علم۔ وہ بے خبری میں مارے جا سکتے تھے۔

اسی چار دیواری کا جائزہ لینے اور اس کے ساتھ ساتھ پیچھے جانے کے بعد انہیں مغربی سمت کی دیوار

میں ایک اور دروازہ دکھائی دیا۔

انہوں نے کافی دیر تک سن گن لی اور پھر اندر چلے گئے۔ اس دروازے پر کوئی محافظ متعین نہیں تھا۔ باب نے اس دروازے کا لاک اپنی ماسٹر کی سے کھولا تھا۔

آہنی دروازہ کھول کر اندر جانے اور اسے دوبارہ بند کرنے میں انہوں نے پوری احتیاط سے کام لیا تھا۔ مجال ہے جو ہلکی سی آواز بھی پیدا ہوئی تھی۔

دروازہ ایک راہ داری میں کھلا تھا۔ وہ اس میں بڑھے تو انہوں نے اپنے قدموں تلے بھنبھناہٹ سنی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہیں کوئی بھاری مشین چل رہی ہو۔

اس راہ داری کا اختتام ایک چھوٹے سے ہال میں ہوا جو صدر دروازے کے بعد ہی پڑتا تھا۔ ایک کونے میں صدر دروازے کی سمت، انگریزی حروف "ایل" کی شکل کا کاؤنٹر بنا ہوا تھا جس کے عقب میں ایک آدمی سفید کوٹ پہنے کچھ کر رہا تھا۔ بادی النظر میں وہ کوئی ٹیکنیشن لگتا تھا۔

کاؤنٹر سے کچھ ہٹ کر ایک محافظ بیٹھا کوئی میگزین دیکھ رہا تھا۔ باب نے ظاہر خان کو اشارہ کیا کہ وہ کاؤنٹر کی سمت جائے وہ خود محافظ کی سمت بڑھا تھا۔

ان دونوں نے اس سلسلے میں اتنی احتیاط کی تھی کہ ان کے قدموں کی چاپ تک پیدا نہ ہونے پائی۔

"اپنے ہاتھ اٹھالو۔" باب اس محافظ کے قریب پہنچ کر غرایا۔

محافظ نے چونک کر اس طرف دیکھا تو اپنے سر کی طرف ایک ریوالور کی نال اٹھی پائی۔ وہ بوکھلا کر اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

سفید کوٹ میں ملبوس شخص بھی اپنا کام چھوڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ظاہر اس کے سر پر ریوالور تانے کھڑا تھا۔

"جنرل مانکسٹر کہاں ہے۔" باب نے اس محافظ سے سوال کیا۔

محافظ نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا اور کہا۔ "تم کیا کہہ رہے ہو۔"

"کاؤنٹر سے نکل آؤ۔" ظاہر اس شخص سے کہہ رہا تھا۔ "میرا ریوالور قطعی شور نہیں مچاتا۔"

وہ مناسب قد و قامت کا آدمی تھا اور اس کی نیلی آنکھوں پر فریم لیس عینک تھی۔

باب نے اس سے سوال کیا۔ "کیا تم صدر دروازے پر متعین محافظ سے رابطہ قائم کر سکتے ہو؟"

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔

"انہیں کچھ نہ بتانا۔" محافظ نے جلدی سے کہا۔ "ورنہ جنرل ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

باب نے اس محافظ کے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر اپنے قبضے میں کیا اور ٹیکنیشن کی طرف مڑتا ہوا بولا۔ "اب اس دوسرے محافظ کو بھی اندر بلالو۔"

"اسے اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔" ٹیکنیشن نے جواب دیا۔

"اس سے کہو کہ اس کے لیے جنرل مانکسٹر کا فون ہے۔ وہ اس سے گفتگو کرنا چاہتا ہے۔"

ٹیکنیشن نے کاؤنٹر کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک ننھا سا ٹرانسمیٹر نکالا اور اس کا بٹن آن کر کے بولا۔ "زمان بیگ تھوڑی دیر کے لیے اندر آجاؤ۔ جنرل مانکسٹر تم سے فون پر گفتگو کرنا چاہتا ہے۔"

صدر دروازے پر کھڑے ہوئے محافظ نے اپنے شانے سے لٹکتی ہوئی طاقتور رائفل کو درست کیا اور دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

اندر کھڑے ہوئے محافظ نے بلند آواز میں کہا۔ "ہوشیار، ان لوگوں کے پاس ریوالور ہیں۔"

دروازے سے اندر آنے والا محافظ پل بھر کے لیے ٹھٹکا، پھر اس نے پھرتی سے اپنی رائفل سیدھی کر لی مگر اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا۔ باب نے اپنے ریوالور کی نال اس کے سینے کی طرف اٹھائی اور ٹریگر دبا دیا۔

گولی اس محافظ کے سینے پر پڑی۔ وہ ایک

گرب ناک چیخ مار کر فرش کی طرف گرتا دکھائی دیا، لیکن گرتے گرتے اس کی انگلی ٹریگر پر دب گئی۔ رائفل کی نال سے ایک شعلہ کوندا اور باب کے پاس کھڑے ہوئے محافظ کے قریب پہنچ کر معدوم ہوگیا۔

اس محافظ نے بھی ایک اذیت ناک چیخ ماری اور فضا میں اچھل کر فرش پر آرہا۔

باب دم بخود رہ گیا۔ رائفل کی گولی بہک کر اسے بھی لگ سکتی تھی۔ محافظ اس سے محض دو فٹ کے فاصلے پر ہی تو کھڑا تھا۔

باب دبے قدموں صدر دروازے کے قریب گیا۔ اس نے دروازہ کھول کر جھانکا تو اسے وہاں کوئی اور شخص نظر نہیں آیا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور ٹیکنیشن کے پاس پہنچا اس کا چہرہ خوف سے زرد پڑا ہوا تھا۔ باب نے خشک لہجے میں کہا۔ ”تمہارے ساتھیوں نے چالاک بننے کی کوشش کی تھی، تم نے اس کا نتیجہ دیکھ لیا۔ بہتر ہوگا کہ اب ہم سے تعاون کرو۔“

ٹیکنیشن کچھ نہ بولا مگر اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ باب نے اسے کسی قسم کی دھمکی بھی دی تو وہ رو پڑے گا۔

”جنرل مانکسٹر کہاں ہے؟“ باب نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں یہاں اکیلا ہوں۔“

”اور خزانہ کہاں ہے؟“ ظاہر خان نے پوچھا۔

”کیسا خزانہ؟“

”عجائب گھر سے لوٹا ہوا خزانہ۔“ ظاہر نے وضاحت کی۔

”تمہارا خیال ہے کہ وہ نوادرات یہاں ہوں گے۔“

باب نے اس کے قریب جا کر ریوالور کی نال اس کی کنپٹی پر رکھی اور غرایا۔ ”جنرل مانکسٹر کا ایسا اور کوئی ٹھکانا نہیں ہے جہاں وہ ان نوادرات کو لے جاسکے۔“

ٹیکنیشن ایک نروس شخص تھا۔ باب کو یقین تھا کہ اسے ڈرا دھمکا کر سب کچھ معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اس کا قیاس صحیح نکلا۔ ریوالور کو اس قدر قریب دیکھ کر اس کی روح فنا ہوگئی۔ اس نے روہانسی آواز میں کہا۔

”مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم البتہ میں نے ایک بار انہیں کسی غار وغیرہ کے بارے میں باتیں کرتے سنا تھا۔“

”کس غار کے بارے میں؟“ باب نے سوال کیا۔

”وہ سانپوں کا غار کہلاتا ہے۔“

”میں اس جگہ سے واقف ہوں۔“ ظاہر بولا۔ ”اس غار کا دہانہ سانپ کے منہ کی مانند ہے۔ اس لیے اسے سانپوں کا غار کہتے ہیں۔“

باب نے ریوالور کی نال اس کی کنپٹی میں چبھوتے ہوئے کہا۔ ”اس ہال کے نیچے کیا ہے۔“

”اس کے نیچے کچھ نہیں ہے۔“ اس نے بلند آواز میں کہا۔

”اگر نوادرات کہیں اور موجود ہیں تو اس ہال کے نیچے کیا ہوسکتا ہے۔“ ظاہر خان بولا۔

”کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔“ باب بولا۔ ”تمہیں یاد نہیں کہ جب ہم یہاں داخل ہو رہے تھے تو ہم نے بھنبھناہٹ سی سنی تھی۔ ہمیں اس کی تحقیق کرنا پڑے گی کہ وہ کیا ہے۔“ اس نے قدرے توقف سے کہا۔ ”اس کے ہاتھ پیر باندھ دو۔ ہم خود نیچے جانے کا راستہ تلاش کرلیں گے۔“

ظاہر نے اس کے ہاتھ پیر مضبوطی سے باندھ دیے اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ وہ اس عمارت میں آگے بڑھے۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد انہیں ایک لفٹ مل گئی۔ باب نے اس کے مختلف بٹنوں پر انگلی رکھی مگر لفٹ اپنی جگہ سے نہ سرکی۔ اس نے پینل بورڈ کا جائزہ لیا تو اسے سفید رنگ کا ایک خفیہ بٹن دکھائی دیا۔ باب نے اسے دبایا تو لفٹ نیچے سرکنے لگی۔

اس نے اور ظاہر نے اپنے ریوالور نکال لیے تھے تاکہ بہ وقت ضرورت انہیں استعمال کرسکیں۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ ٹیکنیشن درست ہی کہہ رہا ہو۔

تہہ خانے میں جا کر ممکن ہے انہیں پوری فوج سے مقابلہ کرنا پڑتا۔

نیچے پہنچ کر باب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ لفٹ ایک عظیم الشان لیبارٹری میں جا کر رکی تھی۔ وہاں متعدد کمرے اور راہداریاں تھیں۔ وہاں کے ساز و سامان کو دیکھ کر باب کو یقین ہو گیا کہ جنرل مانکسٹر یقیناً وہاں ایٹم کو پھاڑنے کے تجربات کرتا رہا ہے۔

آخری حد پر بنے ہوئے ایک کمرے میں انہیں ایک سیف اور ایک فولادی میز کی دراز کو باب نے ماسٹر کی اور اپنی صلاحیتوں کی مدد سے اسے کھولا تو اندر سے چند کاغذات برآمد ہوئے۔

انہوں نے کاغذات کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ اس میں نوادرات کی چوریوں کا باقاعدہ اندراج ہے۔ ظاہر بولا۔ ”یہ تمام چوریاں وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں کے عجائب خانوں میں ہوتی رہی ہیں۔ یہ یقینی طور پر جنرل مانکسٹر اور سلطان میرزا کا کارنامہ ہے۔“

باب نے دوسرے کاغذات کا مطالعہ کر کے کہا۔ ”جنرل مانکسٹر عرصہ دراز سے دوسرے ملکوں کے ایٹمی راز چرا رہا تھا۔ ان کاغذات سے یہی پتا چلتا ہے۔ اگر میرے سمجھنے میں غلطی نہیں ہوئی ہے تو اس نے کوئی نیوکلیئر بم بھی بنا لیا ہے۔“

”شاید نوادرات چرانے کا یہی مقصد تھا کہ انہیں بیچ کر اس منصوبے پر کام کیا جائے۔“ ظاہر بولا۔

☆☆☆

باب نے چاروں طرف نگاہ دوڑا کر کہا۔ ”اتنی بڑی لیبارٹری میں ہمیں ایک شخص بھی دکھائی نہیں دیا۔ یہاں کی خاموشی بڑی غیر فطری سی لگ رہی ہے۔“

”ممکن ہے کہ یہاں کام کرنے والوں کی اس وقت چھٹی ہو۔ وہ سب کسی اور وقت یہاں آتے ہوں۔“

”ہو سکتا ہے۔“ باب پر خیال انداز میں بولا۔ ان کاغذات کو ترتیب سے دیکھنے پر وہ کاغذات بھی مل گئے جن کی باب کو تلاش تھی۔ انہیں دیکھ کر باب کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”تم انہی کاغذات کے لیے پریشان تھے میجر!“ ظاہر نے پوچھا۔

”ہاں۔“ باب نے جواب دیا اور انہیں اپنی جیب میں رکھ لیا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا مشن ختم ہو گیا۔“ ظاہر بولا۔ ”اور میرا مشن اس وقت ختم ہو گا جب وہ نوادرات مل جائیں گے۔“

باب نے اسے متعدد ڈرائینگز دکھا کر کہا۔ ”میرا مشن ابھی نامکمل ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ جنرل مانکسٹر ان کاغذات کو کسی اور ملک کے ہاتھوں فروخت کر دے گا مگر ان سے اس نے خود ہی فائدہ اٹھا لیا ہے۔ ان ڈرائینگز سے پتا چلتا ہے کہ اس نے وہ ہتھیار بنا لیا ہے۔ یہ ماسٹر پرنٹ کی نقلیں ہیں، وہ ماسٹر پرنٹ جو اس وقت میری جیب میں ہے۔“

”کیا یہ کوئی ایٹمی ہتھیار ہے۔“ ظاہر نے پوچھا۔

”ہاں۔“ باب نے جواب دیا۔ ”اگر جنرل مانکسٹر نے اپنی اس لیبارٹری میں ایٹم بم تیار کر لیا ہے تو یوں سمجھو کہ وہ اس ہتھیار کی مدد سے اس بم کو جہاں چاہے پھاڑ سکتا ہے اور یہ تو تم جانتے ہی ہو گے کہ چھوٹے سے چھوٹا ایٹم بم ایک پورے شہر کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔“

”اگر اس نے یہ ہتھیار بنا لیا ہے تو کیا ضروری ہے کہ وہ اسے کہیں استعمال بھی کرے۔“

”یہ انسانی فطرت ہے۔“ باب نے سنجیدگی سے کہا۔

”جب وہ کوئی چیز بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کا مظاہرہ دوسروں کے سامنے بھی کرتا ہے۔“

”اگر اس نے بم بنا لیا ہے تو وہ کہاں ہے۔“ ظاہر بولا۔ ”ممکن ہے کہ جنرل مانکسٹر اس بم کو بنانے کے بعد کہیں لے کر چلا گیا ہو۔“ باب نے خیال

آرائی کی۔

انہوں نے کاغذات کا مزید مطالعہ کیا تو اس بات کا انکشاف ہوا کہ جنرل مانکسٹر ایک میگاٹن طاقت کا بم بنانے میں کامیاب ہو چکا ہے جو تیس میل کے دائرے میں آنے والی تمام چیزیں تباہ و برباد کر سکتا ہے۔

''اوہ خدایا۔'' ظاہر خان بولا۔ ''اس بم کو وہ کہاں استعمال کرے گا۔''

''پتا نہیں۔'' باب بولا۔ ''ابھی سے کوئی بات حتمی طور پر کیسے کہی جا سکتی ہے۔ البتہ یہ ممکنات میں سے ہے کہ وہ اسے اپنی کسی دشمن پڑوسی ملک کے خلاف استعمال کرے۔''

مزید کاغذات دیکھنے پر انہیں تاجکستانی بحری جہاز الحسیمہ کی روانگی کا چارٹ ملا۔ اس چارٹ کے مطابق الحسیمہ ایک روز پہلے تاجکستان کی بندرگاہ سے روانہ ہو چکا تھا۔

الحسیمہ کو جن جن ملکوں کی بندرگاہوں سے روانہ ہونا تھا۔ وہاں وہاں تیروں کے نشانات لگے ہوئے تھے اور سب سے آخر میں امریکا کے نام پر سرخ دائرہ کھینچا ہوا تھا۔

''تمہیں سلطان میرزا کی ڈائری سے یہ تحریر ملی تھی کہ تمام سامان الحسیمہ کے لیے۔'' باب نے پوچھا۔

''ہاں۔'' ظاہر خان بولا۔

''اگر نوادرات یہیں موجود ہیں تو مجھے یقین ہے کہ سامان سے مراد ایٹم بم ہے۔'' باب بولا۔ ''اور یہ بم الحسیمہ کے سامان میں شامل ہو کر امریکا جا رہا ہے''

☆☆☆

عجائب گھر کے نوادرات، سانپ والے غار سے دستیاب ہو گئے۔ ظاہر خان نے پولیس کے ذریعے اس خزانے کو اپنے قبضے میں کیا اور بھاری معیت کے ساتھ جنرل، مانکسٹر کی لیبارٹری پر ریڈ کیا۔ لیبارٹری میں اس وقت پچاس یا ساٹھ کے لگ بھگ افراد کام کر رہے تھے۔ ان سب کو گرفتار کر لیا گیا۔ ظاہر خان نے سلطان میرزا اور جنرل مانکسٹر کے حلیے مشتہر کر دیے اور انہیں بین الاقوامی مجرم قرار دیا۔ ایک حکم نامے کے ذریعے انٹرپول کی تمام شاخوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ دونوں جہاں کہیں بھی دکھائی دیں انہیں گرفتار کر لیا جائے۔

میجر باب، تاجکستان سے اسی روز قازقستان کے لیے پرواز کر گیا تھا۔ بحری جہاز الحسیمہ کو تاجکستان کی بندرگاہ سے روانہ ہونے کے بعد قازقستان کی بندرگاہ پر ٹھہرنا تھا اور اس کے بعد امریکہ کے دارالسلطنت کے ساحل کی طرف بڑھنا تھا۔

دوپہر کے وقت اس کا طیارہ قازقستان کے ہوائی اڈے پر اترا۔ باب نے وہاں سے امریکا کے لیے کال بک کرائی۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہ ڈی سیکشن کے سربراہ کرنل ڈیوڈ سے گفتگو کر رہا تھا۔

جب باب نے یہ بتایا کہ وہ ان کاغذات کو اپنے قبضے میں لے چکا ہے تو وہ بہت خوش ہوا مگر جب اس نے یہ سنا کہ جنرل مانکسٹر ان کاغذات کی مدد سے وہ ہتھیار بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے تو اس کا اطمینان رخصت ہو گیا۔ اس نے سراسیمگی سے پوچھا۔ ''باب تم کیا کہہ رہے ہو۔''

''میرا قیاس ہے کہ وہ ایٹم بم الحسیمہ میں موجود ہے۔'' باب بولا۔

''تمہارا مطلب یہ ہے کہ جنرل مانکسٹر اس بم کو امریکا کے ساحل پر پھاڑنا چاہتا ہے۔'' کرنل ڈیوڈ کا لہجہ تشویش ناک تھا۔

''اس کے علاوہ اور کیا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔'' باب نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر تک لائن بے جان رہی پھر دوسری جانب کرنل ڈیوڈ کے گہرے گہرے سانسوں کی آواز سنائی دیتی رہی۔

آخر کار اس سکوت کو باب نے توڑا۔ اس نے کہا۔ ''لیبارٹری سے حاصل ہونے والے بلیو پرنٹس

سے یہ پتا چلتا ہے کہ جنرل مانکسٹر نے بم تو طاقتور بنا دیا ہے مگر جسامت کے لحاظ سے وہ بہت چھوٹا ہے، اتنا چھوٹا کہ اسے کسی لاکر میں رکھا جا سکتا ہے۔ اب جنرل مانکسٹر کو یہ کرنا ہے کہ وہ ایٹم بم کو امریکا کے ساحل کے قریب، سمندر میں پھینک دے۔ بم تہ میں بیٹھ جائے گا پھر جب وہ اسے تباہ کرنا چاہے گا تو اس ہتھیار میں ریموٹ کنٹرول لگا کر ایک بٹن دبائے گا اور کہیں دور سے اس بم کو بلاسٹ کرے گا۔''

''مگر کیوں۔۔۔؟'' کرنل ڈیوڈ نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔ ''وہ اس قسم کی دیوانگی کا کام کیوں کرنا چاہتا ہے۔''

''میں نے پچھلے کیس میں یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ جرمن کے اقتدار پر پرس ماہلر کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے۔ فوج اور وہ عناصر جو مارشل ڈریلے کے توسیع پسند فلسفے کی حمایت کرتے ہیں، کسی طرح سے حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں۔ جرمن اور امریکہ اور روس کے درمیان وہ کوئی ایسی چنگاری چھوڑنا چاہتے ہیں جو بڑھتے بڑھتے شعلے کی صورت اختیار کر جائے۔ کچھ مہینے پہلے انہوں نے روس کے ایک شخص شیوا کو احمق بنا کر سیاسی بحران پیدا کرنا چاہا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اس بار انہوں نے براہ راست امریکا کو اپنا نشانہ بنانا چاہا ہے۔'' باب بولا۔ ''اس لیے کہ جنرل مانکسٹر ایک بار پہلے بھی میرے ہاتھوں ہزیمت اٹھا چکا ہے۔ ممکن ہے اب وہ مجھ سے بدلا لینا چاہتا ہو۔''

''صرف تم سے انتقام لینے کے لیے وہ دس لاکھ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دے گا۔'' کرنل ڈیوڈ نے حیرت سے کہا۔ ''یہ تو سراسر دیوانگی اور درندگی ہے۔ چارٹ دیکھ کر اور میرین کمپنیوں سے پوچھ کر مجھے بتاؤں کہ الحسیمہ، بھارت کے ساحل پر کب پہنچے گا۔ میں ایسا انتظام رکھوں گا کہ وہ ہمارے نزدیک نہیں پہنچ سکے گا اور اسے سمندر میں ٹھہرنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔''

''بہتر ہے جناب۔'' باب بولا۔

''انتہائی کوشش کرنا کہ جہاز قازقستان رک جائے۔''

''میں پوری کوشش کروں گا کہ یہ قضیہ یہیں نمٹ جائے۔'' باب نے جواب دیا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

ایک گھنٹے بعد جب وہ ہاربر ماسٹر کے آفس میں پہنچا تو اس نے کہا۔ ''الحسیمہ اس پورٹ پر نہیں ہے۔''

''کیا۔۔۔؟'' باب نے تعجب سے کہا۔

باب نے اضطراب میں پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ نکالی اور اسے جلا کر گہرے گہرے کش لینے لگا۔

''جی ہاں۔ میں صحیح کہہ رہا تھا۔'' ہاربر ماسٹر بولا۔ ''الحسیمہ تو دو روز پہلے ہی امریکا کی طرف روانہ ہو چکا ہے۔''

''دو روز پہلے۔'' باب کو اپنا سانس رکتا محسوس ہوا۔ ''اب جہاز کہاں تک پہنچ چکا ہوگا۔''

اس نے اعداد و شمار نکالے۔ پھر بولا۔ ''میرے حساب کے مطابق الحسیمہ نے اب تک آدھا سفر طے کر لیا ہوگا۔''

''شکریہ!'' باب بولا۔ ''آپ کا بہت شکریہ۔'' اس نے کہا اور ہاربر ماسٹر کے آفس سے باہر نکل آیا۔

اس وقت ایک ایک لمحہ اس کے لیے قیمتی تھا۔ اس نے قازقستان میں مقامی ایجنٹ سے رابطہ قائم کیا اور اس سے پوچھا کہ وہ ایئر فورس کے کسی آفیسر سے واقفیت رکھتا ہے۔ مقامی ایجنٹ احمد کمال نے اثبات میں جواب دیا اور ایک ائر کموڈور سے اس کی ملاقات بھی کرا دی۔ باب نے اس سے عالمی امن اور بھائی چارے کا واسطہ دے کر مدد چاہی۔

''مگر آپ نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ آپ ہم سے کس قسم کی مدد کے خواہاں ہیں۔'' ائر کموڈور خلیل جہاں زیب نے کہا۔

خلیل جہاں زیب کی عمر تقریباً چالیس سال تھی اور وہ سنجیدہ شخص تھا جب باب نے اس سے اپنا

ارف کرایا تو وہ بہت گرم جوشی سے ملا تھا۔

"میں تاجکستان کے بحری مسافر بردار جہاں سیمہ کو امریکا کے ساحل تک پہنچنے سے پہلے پکڑنا چاہتا ہوں۔" باب بولا۔

"کیوں۔" اس نے سوال کیا۔

"ایک دیوانہ شخص اس جہاز پر ایٹم بم لے کر سوار ہو گیا ہے۔ میں اسے روکنا چاہتا ہوں۔"

"مگر ایٹم بم سمندر میں گر کر خود بہ خود نہیں پھٹ جائے گا؟" ایئر کموڈور حیرت سے بولا۔ "آپ نے شاید ایٹم بم کی تھیوری نہیں پڑھی۔"

"میں تمام تھیوریاں پڑھ چکا ہوں۔" باب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک باریک لکیر ابھری۔ "اس بم کو وہ سمندر میں غرق کرنے کے بعد کہیں دور سے ریموٹ کنٹرول ہتھیار سے بلاسٹ کر دے گا۔"

"اوہ۔۔۔" خلیل جہاں زیب کے ہونٹ سیٹی بجانے والے انداز میں سکڑ گئے۔ اس نے کچھ توقف سے کہا۔ "میں ایئر مارشل سے اس سلسلے میں گفتگو کر کے آپ کو بتاؤں گا۔ آپ ایک گھنٹے بعد مجھ سے رابطہ قائم کیجیے۔"

وہ ایک گھنٹہ باب نے بہت اضطراب سے گزارا۔ اس کا بس چلتا تو وہ اڑ کر الحسیمہ تک جا پہنچتا۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد خلیل جہاں زیب نے اسے نوید دی کہ ایئر مارشل اس کے لیے ایک طیارہ وقف کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔

"مجھے ایک پیراشوٹ اور لکڑی کے مضبوط تختے کی ضرورت پڑے گی۔" باب بولا۔

"وہ کیوں۔" سوال کیا گیا

"تختے کو مجھ سے پہلے پھینکا جائے گا اور پھر میں پیراشوٹ سے چھلانگ لگاؤں گا۔ الحسیمہ کے کپتان کو بھی مطلع کرنے کا بندوبست ہونا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے، آپ آدھے گھنٹے کے اندر ایئر بیس پر پہنچ جائیں۔ آپ کو تمام چیزیں تیار ملیں گی۔" خلیل جہاں زیب نے جواب دیا اور سلسلہ منقطع کر دیا

☆☆☆

قازقستان کی ایک جہاز راں کمپنی نے الحسیمہ کا تفصیلی روٹ فراہم کر دیا اور حساب لگا کر یہ بھی بتایا کہ کس وقت وہ جہاز کس جگہ ہوگا۔ یہ چارٹ جہاز کی رفتار، ہوا کی تبدیلی اور سمندر کے مزاج کا جائزہ لے کر بنایا گیا تھا۔

قازقستان کے ایک ہوائی مستقر سے باب کی روانگی بے حد خفیہ طریقے سے ہوئی۔

طیارے نے جیسے ہی زمین چھوڑی الحسیمہ سے رابطہ قائم کیا گیا۔ اس سے انسانیت کے نام پر اپیل کی کہ وہ باب سے تعاون کرے اور باب جیسے ہی کھلے سمندر میں پہنچے جہاز کا انجن بند کر دیا جائے۔

پائلٹ نے باب کے استفسار پر بتایا کہ آئندہ پانچ گھنٹوں کے بعد وہ الحسیمہ کے قریب پہنچ جائیں گے۔ باب نے آنکھیں موندلیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "اس کا مطلب ہے کہ میں ایک اچھی نیند لے سکتا ہوں۔"

"کیا مطلب۔" پائلٹ نے حیرت سے پوچھا

"جب طیارہ الحسیمہ سے آدھے گھنٹے کی مسافت پر رہ جائے تو مجھے جگا دینا۔" باب نے مسکرا کر کہا اور چہرہ اس کی طرف سے گھما لیا۔

سہ پہر کے وقت پائلٹ نے باب کو آواز دے کر جگایا اور طیارے کے عقبی حصے میں پہنچ کر پیراشوٹ باندھنے کو کہا۔

باب نے کھڑکی سے نیچے نگاہ کی تو نیلا سمندر دیکھا۔ آسمان کا رنگ سمندر سے اس قدر مماثل تھا کہ دونوں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔

باب عقبی حصے میں جا کر پیراشوٹ باندھنے لگا تو پائلٹ نے الحسیمہ کے کپتان کو اطلاع دی کہ باب اس کے جہاز کے قریب کودنے والا ہے۔

پیراشوٹ باندھ کر باب نے درخت کے تنوں سے تیار شدہ بھاری تختہ دھکیل کر دروازے کے قریب کر دیا۔ پھر پائلٹ کے اشارے پر اس نے طیارے

کا دروازہ کھولا۔ تیز ہواؤں کا کان پھاڑ دینے والا شور طیارے میں گونجا اور سمندر کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔

پائلٹ نے طیارے کو بتدریج اتارنا شروع کردیا اور جیسے ہی وہ ایک مقررہ بلندی پر پہنچے اس نے باب سے سمندر میں کودنے کو کہا۔ طیارہ اس وقت الخسیمہ سے آگے تھا۔

باب نے اس وزنی تختہ کو باہر دھکیلا اور آنکھوں پر ہوا سے محفوظ رکھنے والا چشمہ چڑھاتے ہوئے چھلانگ لگادی۔

وہ بالکل عمودی طور پر پانی میں گرا تھا۔ پہلے تو وہ سمندر میں سیدھا ہی سیدھا ڈوبتا چلا گیا پھر لہروں نے اسے اچھا دیا۔ باب نے خنجر نکال کر پیراشوٹ کی ڈوریاں کاٹیں اور گہرے گہرے سانس لے کر ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ بھاری لباس کی بنا پر تیرنے میں دقت پیش آرہی تھی۔

وہ تختہ جلد ہی مل گیا۔ باب نے اپنے آپ کو اس پر ڈالا اور جہاز کی سمت پانی کو کاٹنا شروع کردیا۔ جہاز کا انجن بند کردیا گیا تھا اور وہ سمندر میں ساکت کھڑا محسوس ہوتا تھا۔

جب باب اس کے قریب پہنچا تو اسے اوپر کھینچ لیا گیا۔ تمام مسافروں نے اسے اس طرح جہاز پر چڑھتے دیکھ کر حیرت سے آنکھیں پھاڑیں تھیں۔ باب جانتا تھا کہ اگر جنرل مانکسٹر واقعی اس جہاز پر ہوا تو اسے دیکھ رہا ہوگا، لیکن باب کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

اسے خشک کپڑے دیے گئے اور پھر جہاز کے ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا جس نے باب کا معائنہ کر کے اسے فٹ قرار دیا۔ معائنے کے بعد جہاز کا ایک آفیسر اسے فرسٹ کلاس کے کیبن کی طرف لے گیا

''جہاز کے کپتان سے میری ملاقات کب ہوگی۔'' باب نے سوال کیا۔

''جلد ہی۔'' اس نے مختصراً کہا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ جیسے ہی انہیں فرصت ملے وہ آپ سے مل لیں۔''

باب سر ہلا کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا سامان بھی اس کے کیبن میں پہنچادیا گیا۔ اپنے لباس کے ساتھ اس نے ریوالور اور خنجر اور ایسی ہی دوسری چیزیں ایک بیگ میں رکھ لی تھیں۔ جب اس نے کپڑے تبدیل کیے تھے تو بیگ وہیں رہ گیا تھا۔

باب نے بیگ کھول کر ریوالور اپنی جیب میں رکھا اور خنجر کو آستین میں چھپالیا۔

وہ آفیسر جب دیر تک واپس نہیں آیا تو باب اپنے بستر سے اٹھا اور کیبن کا دروازہ بند کرتا ہوا باہر آگیا۔ عرشے پر پہنچ کر وہ جہاز کے برج تک جانے کے لیے راستہ تلاش کرنے لگا۔

ایک ملاح اس دوران باب کے قریب سے گزرا تو اس نے پوچھا۔ ''اس جہاز کا کپتان کہاں ملے گا۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔

''کپتان۔۔۔ کپتان سے ملنا ممکن نہیں ہے۔'' اس ملاح نے جواب دیا۔

''وہ میرا انتظار کررہا ہوگا۔'' باب نے اس سے کہا۔ ''تم مجھے اس کے پاس پہنچادو۔''

''آپ کسی اسٹیورڈ کے ساتھ چلے جائیں۔'' وہ اپنی جان چھڑا کر ایک طرف ہوگیا۔

باب نے بہ دقت تمام اس آفیسر کو ڈھونڈا اور پھر اس کے ساتھ کپتان کے کیبن کی طرف گیا۔ وہ آفیسر اپنے کام میں باب کی بات بھول گیا تھا۔

آفیسر نے کپتان کے کیبن پر پہنچ کر دروازے پر دستک دی تو کسی نے اندر آنے کی اجازت دی۔ باب اس آفیسر کے ساتھ کمرے میں گیا تو اس نے ایک لمبے چوڑے سے آدمی کو ڈیسک کے پیچھے بیٹھے دیکھا۔ اس شخص کے بال سفید تھے مگر جسم میں اب بھی مضبوطی تھی۔

اس نے باب سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ بہت ڈرامائی انداز میں جہاز تک پہنچے ہیں۔''

''ہاں۔'' باب مسکرایا۔ ''اس کے سوا کوئی اور

چارہ نہیں تھا۔

اس نے باب کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”کمپنی نے وائرلیس پر خبر دی تھی کہ اس جہاز پر کوئی خطرناک آدمی سوار ہے جسے آپ گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔“

”ہاں۔“ باب نے جواب دیا۔

”کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ جب وہ آدمی جہاز چھوڑ کر امریکا کے ساحل پر قدم رکھے تو اس وقت آپ اسے گرفتار کرلیں۔“ اس نے سوال کیا۔

”پہلی بات تو یہ کہ مجھے ابھی پتا نہیں کہ وہ آدمی کس شکل و شباہت میں ہوگا۔ ہوسکتا ہے اس نے میک اپ کر رکھا ہو۔ دوم یہ کہ میں اسے جہاز پر ہی گرفتار کرنا چاہتا ہوں ورنہ وہ بہت تباہی مچائے گا۔“

اس نے کچھ دیر سوچا پھر سر ہلا کر بولا۔ ”ٹھیک ہے، میں اپنے معاون عمر بیگ اصفہانی کو ساتھ کیے دیتا ہوں۔ آپ الحسیمہ کی تلاشی لے لیجیے مگر جہاز کے ضابطوں کا خیال رکھیے گا۔“

”وہ کیا۔“ باب نے پوچھا۔

”یہ کہ آپ اپنے دفاع کے علاوہ کسی شخص پر گولی نہیں چلائیں گے۔ دوم یہ کہ انہیں بلاوجہ پریشان نہیں کریں گے اور ان کے علم میں لائے بغیر تلاشی نہیں لیں گے۔“

باب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ آپ کو ابھی اصل معاملے کی ہوا نہیں لگی ہے ورنہ آپ اس وقت اتنے سکون سے یہاں نہ بیٹھے ہوتے۔“

”اصل معاملہ۔۔۔“ اس نے بھویں سکیڑیں۔ ”آپ اس شخص کو کیوں گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔“

”مجھے یقین ہے کہ وہ آدمی ایک مہلک ہتھیار لے کر اس جہاز پر چڑھا ہے۔“

”مہلک ہتھیار۔“ کپتان حسن تیموری کا لہجہ سوالیہ تھا۔

”ہاں! شاید کوئی ہائیڈروجن بم۔“ باب نے نہایت سکون سے جواب دیا۔

کپتان حسن تیموری اور اس کا معاون اصفہانی بوکھلا کر اپنی کرسیوں سے کھڑے ہوگئے۔ حسن تیموری کے چہرے پر زلزلے کے آثار دکھائی دیے۔ اس نے پوچھا۔ ”اس کا آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے کہ وہ۔۔۔“

”میرے پاس اس کا کوئی واضح اور ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔“ باب نے اس کا جملہ کاٹ کر کہا۔ ”مگر محض اس بنیاد پر اس تلاش کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔“

”ہوں۔“ تیموری نے سر ہلایا اور کافی دیر تک خاموش رہا پھر اس نے باب سے پوچھا۔ ”اس تلاشی کے لیے آپ کو کتنے آدمی درکار ہوں گے۔“

”کم از کم ایک درجن آدمی۔“ باب نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ یہ جہاز بہت بڑا ہے اور تلاشی کے ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔“

”پورے جہاز کی تلاشی تو ایک مسئلہ بن جائے گی۔“ تیموری بولا۔

”اس تلاشی پر جہاز اور ان تمام آدمیوں کی زندگی کا انحصار ہے۔“

باب نے جواب دیا۔ ”اگر اس سلسلے میں کوئی کوتاہی کی گئی تو پتا نہیں اس کا کیا انجام ہو۔“ اس نے کچھ توقف سے دوبارہ کہا۔ ”مزید یہ کہ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ الحسیمہ کی رفتار کم کردی جائے تاکہ ہمیں زیادہ سے زیادہ وقت مل سکے۔“

”یہ کیسے ممکن ہے۔“ تیموری آہستگی سے بولا۔ ”جہاز کے تمام مسافر شور مچا دیں گے۔ انہیں حقوق حاصل ہیں کہ وہ مجھ سے جواب طلبی کرسکیں۔“

”آپ انہیں کوئی بھی مناسب وجہ بتا کر مطمئن کرسکتے ہیں۔“ باب نے نرمی سے کہا۔ ”دوسری صورت میں اگر جہاز تباہ ہوگیا تو ہم میں سے کوئی آنسو بہانے کے لیے بھی زندہ نہیں بچے گا۔“

☆☆☆

ڈنر کے وقت ایک اعلان کے ذریعے تھرڈ کلاس کے مسافروں کو اطلاع دی گئی کہ وہ اپنے

کیبن سے نکل آئیں۔ ان کے اسباب کی تلاشی لی جائے گی۔
تلاشی تھرڈ کلاس سے شروع کی گئی تھی۔ ایسی کسی تلاشی کا مطلب جنرل مانکسٹر کو ہوشیار کرنا تھا مگر اس کے سوا اور کیا کیا جا سکتا تھا۔
وہ تلاشی آدھی رات تک ہوتی رہی مگر کوئی ایسی چیز ہاتھ نہیں لگی جس پر بم کا شبہ کیا جا سکتا۔
کپتان تیموری نے تھوڑی سی رد و قدح کے بعد اس بات کی بھی اجازت دے دی کہ باب انجن روم کی تلاشی لے سکتا ہے۔ وہاں بھی سامان الٹا پلٹا گیا مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات کی صورت میں ظاہر ہوا۔
دوسرے روز سیکنڈ کلاس اور فرسٹ کلاس کو چھان مارا گیا مگر وہاں بھی کوئی چیز نہیں ملی۔ اس روز شام تک باب نے دوسرے آدمیوں کے ساتھ مل کر وہ تمام فہرست دیکھ ڈالی جس میں مسافروں کے سامان کا اندراج ہوتا ہے لیکن اس میں کسی قابل گرفت چیز کا نام نہیں ملا۔
تیسرے روز باب نے کپتان تیموری سے کہا کہ وہ مسافروں کے کیبن کی تلاشی لینا چاہتا ہے۔''
تیموری نے منہ بگاڑ کر جواب دیا۔ ''میجر باب میرا خیال ہے کہ آپ کو اس سلسلے میں وہم ہوا ہے۔ کوئی شخص اس جہاز میں ہائیڈروجن بم چھپانے ہی کیوں لگا! اسے جہاز تباہ کر کے کیا مل جائے گا۔''
''ضروری نہیں ہے کہ وہ بم جہاز پر ہی پھٹے۔ وہ بم امریکا کے ساحل پر بھی پھینکا جا سکتا ہے۔ اس جہاز پر نہیں تو دس لاکھ کی آبادی والے اس شہر پر ہی کچھ رحم کھائیے۔'' باب بولا۔ ''میں تفریحاً اس جہاز کی تلاشی نہیں لے رہا ہوں۔''
''ٹھیک ہے۔'' تیموری نے جواب دیا۔ ''مگر اس بار میں آپ کے ساتھ رہوں گا تاکہ کوئی مسافر غل مچائے تو میں اسے مناسب جواب دے سکوں۔''
تلاشی شروع ہوئی اور سہ پہر تک اختتام کو پہنچ گئی لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔
تیموری نے باب کو خشمگیں نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب آپ کیا کہتے ہیں۔ کیا آپ کا وہم بے جا نہیں تھا۔''
باب نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''ابھی جہاز کی ایسی کئی جگہیں ہیں جہاں ہم نے جھانک کر بھی نہیں دیکھا۔''
''مثلاً۔۔۔'' تیموری نے تیوریاں چڑھا کر پوچھا۔
''مثال کے طور پر گیلریاں، اسٹورز، کچن اور باتھ رومز وغیرہ۔''
''اصفہانی صاحب!'' تیموری نے معاون کپتان کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ ان کے ساتھ ان جگہوں کی بھی تلاشی لے ڈالیے تاکہ ہم پر عدم تعاون کا الزام نہ آئے۔''
''میرے ساتھ آئیے باب۔'' اصفہانی بولا۔
تیموری کی بہ نسبت وہ ٹھنڈے دماغ کا آدمی تھا اور باب سے مکمل تعاون کر رہا تھا۔
گیلریوں، اسٹوروں، باتھ رومز اور کچن کی تلاشی لی گئی مگر نتیجہ حسب سابق برآمد ہوا۔
''ہو سکتا ہے تیموری صاحب کا خیال درست ہو۔'' اصفہانی تھک ہار کر بولا۔
''میں دل سے یہی چاہوں گا کہ ان کا خیال درست ثابت ہو۔'' باب بولا۔ ''مگر مجھے اب بھی یہ اندیشہ کھائے جا رہا ہے کہ وہ بم اسی جہاز پر ہے۔'' اس نے توقف سے کہا۔ ''کل تک ہم امریکا کے سمندر میں داخل ہو جائیں گے۔''
''ہاں۔'' اصفہانی نے جواب دیا۔
باب مضمحل انداز میں سر ہلاتا ہوا اپنے کیبن کی طرف چلا گیا۔ دوسرے روز صبح اس نے وائرلیس پر کرنل ڈی سے رابطہ قائم کیا اور اسے مکمل رپورٹ دی۔

☆☆☆

دوسرے روز دوپہر کے وقت جبکہ جہاز بندرگاہ سے کافی دور تھا۔ امریکا کے کوسٹ گارڈز نے اکسیم

کو سمندر میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔

''مگر کیوں۔۔۔؟'' کپتان تیموری غصے سے چیخا۔

''اس لیے کہ امریکا کو خطرہ ہے۔'' ان میں سے ایک آفیسر نے جواب دیا۔

''تمام مسافروں میں بے چینی پھیل جائے گی۔'' تیموری بولا۔ ''پھر جب ایک بار تلاشی لی جاچکی ہے تو کیا یہ مذاق ہے۔''

کوسٹ گارڈ اسٹیمر اور لانچوں میں آئے تھے۔ انہی میں سے ایک اسٹیمر پر موجود کرنل ڈی نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ''کیپٹن باب! اس تلاشی سے مطمئن نہیں ہے لہٰذا اس کو ایک موقع اور دیا جائے گا۔''

کرنل ڈیوڈ کے ساتھ باب کو سیکرٹ سروس کے متعدد ایجنٹس اور امریکا کا میئر دکھائی دیا۔ کرنل ڈی اس وقت بھی اپنے مخصوص سیاہ سوٹ میں تھا اور اس کا چہرہ ایک نقاب سے ڈھکا ہوا تھا۔

کوسٹ گارڈز اور جہاز کے مسافروں نے اسے بڑی حیرت سے دیکھا۔ لازماً ان کے ذہن میں یہ بات گردش کر رہی ہوگی کہ ایسے کردار تو ناولوں اور فلموں میں دکھائی دیتے ہیں۔ حقیقی زندگی میں یہ بات ان کے لیے عجیب تھی۔

کپتان تیموری نے تمام افراد کو اپنے کیبن میں آنے کی اجازت دی اور کہا کہ وہ ایک میٹنگ کرنا چاہتا ہے۔ کوسٹ گارڈز کے دو اعلا آفیسرز، میئر اور کرنل ڈی لانچوں اور اسٹیمروں سے اتر کر جہاز پر چلے گئے۔

جہاز جیسے ہی ساحل سے لگا، باب نے لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ وہ سب اپنے عزیز و اقارب یا جہاز کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بے چین تھے۔ پولیس کے جوان انہیں ایک مخصوص حد سے آگے بڑھنے نہیں دے رہے تھے

باب نیچے کھڑا تھا جہاں سیکرٹ سروس کے مزید ایجنٹ موجود تھے۔ ان کی نگاہ ہر مسافر پر جمی ہوئی تھی اور ہر داڑھی والے کو پکڑ رہے تھے۔

شام چھ بجے کے قریب تقریباً تمام مسافر الحسیمہ سے اتر گئے۔ اس وقت باب نے ایک شخص کو کسٹم کے بجائے اس راہ پر جاتے دیکھا جہاں صرف ایک محافظ پہرا دے رہا تھا۔ وہ راستہ عمارتوں کی آڑ میں تھا اور اس پر فوراً نگاہ نہیں پڑتی تھی۔

وہ راستہ پارکنگ لاٹ تک راہ نمائی کرتا تھا۔

باب کو اس کی پشت دکھائی دے رہی تھی، مگر وہ بہ خوبی جانتا تھا کہ وہ آدمی جنرل مانکسٹر ہی ہوسکتا ہے۔ اس شخص کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا جسے اس نے دائیں ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں پر نہ تو رواں تھا اور نہ ہی ان میں گوشت پوست، ہاتھوں کی مانند رگوں اور ہڈیوں کا ابھار محسوس ہو رہا تھا۔

باب اس بات سے واقف تھا کہ ایک سائنسی تجربے میں جنرل مانکسٹر کے دونوں ہاتھ ضائع ہوگئے ہیں اور ان کی جگہ اب وہ مصنوعی ہاتھ استعمال کرتا ہے۔

باب نے اس کا پیچھا کرنا شروع کیا تو اس نے یکبارگی مڑ کر دیکھا اور پھر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ باب کے اور اس کے درمیان سینکڑوں افراد حائل تھے۔ وہ ہر دو قدم کے بعد کسی نہ کسی سے ٹکرا جاتا تھا۔ ایک صاف سی جگہ پہنچ کر باب نے اپنا ریوالور نکالا اور اس پر فائر کرنا چاہا مگر جنرل مانکسٹر اس وقت تک اس جالی دار گیٹ کے قریب پہنچ چکا تھا جس نے پارکنگ لاٹ اور پورٹ کو علیحدہ کر رکھا تھا۔

مانکسٹر نے وہاں کھڑے ہوئے پہرے دار پر اچانک وار کیا اور وہ لڑھک کر زمین بوس ہوتا دکھائی دیا۔

جب باب اس گارڈ کے قریب پہنچا تو مانکسٹر نگاہ سے اوجھل ہو چکا تھا۔ باب نے اسی گیٹ سے نکل کر پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھنا چاہا تو گارڈ نے مزاحمت کی۔ باب کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اس کے سامنے اپنی شناخت کراتا۔ اس نے گارڈ کی

کنپٹی پر ایک بھرپور ہاتھ جڑ دیا۔ گارڈ کے حلق سے ایک عجیب آواز نکلی اور وہ دوبارہ لہرا کر فرش پر گر گیا۔

ٹھیک اسی وقت پارکنگ ایریا سے ایک ٹیکسی نکلی جس کی کھڑکی میں باب کو مانکسٹر کا چہرہ دکھائی دیا۔

باب نے ریوالور، ہولسٹر میں ڈالا اور پارکنگ لاٹ میں کھڑی ہوئی ایک موٹر سائیکل کی طرف بڑھا۔ وہاں دو تین موٹر سائیکلیں اور بھی تھیں۔ ان کے قریب ہی چار پانچ ہپی ٹائپ نوجوان جالیاں پکڑے اپنے عزیز و اقارب کو آوازیں دے رہے تھے اور اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ موٹر سائیکل لازماً انہی میں سے کسی نوجوان کی تھی۔

باب نے اس کا جائزہ لیا تو اسے چابی لگی دکھائی دی۔ شاید جلدی میں وہ وہاں رہ گئی تھی ورنہ امریکا میں موٹر سائیکلوں کی چوری ایک عام بات تھی۔ لوگ گاڑی لاک کرنا ضروری خیال کرتے تھے۔

باب نے چابی گھمائی اور کک مار کر اسے اسٹارٹ کیا۔ ان میں سے ایک نوجوان نے پلٹ کر ادھر دیکھا اور پھر ''ارے، ٹھہرو۔'' کہتا ہوا بھاگا۔

مگر باب اتنی دیر میں گاڑی کو گیئر میں ڈال کر بڑھا چکا تھا۔ اس نے اشارے سے نوجوان کو اطمینان دلایا کہ وہ ابھی واپس آ کر اس کی گاڑی واپس کر دے گا۔ باب نے موٹر سائیکل کا رخ ادھر ہی رکھا تھا جس طرف ٹیکسی گئی تھی۔

تین بلاک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ٹیکسی کی جھلک دکھائی دی۔ وہ اس وقت ہوا میں اڑ رہی تھی۔ باب کو یقین تھا کہ مانکسٹر نے اپنے ریوالور کی نال ٹیکسی ڈرائیور کی کنپٹی پر رکھ دی ہوگی یا پھر اس کی جیب میں بہت سے بڑے نوٹ ٹھونس دیے ہوں گے۔

باب کو اس موٹر سائیکل کی رفتار پر اعتماد تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آئندہ پندرہ منٹ بعد وہ اس ٹیکسی کو پکڑنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

چند بلاک دائیں بائیں مڑنے کے بعد اس کی یہ خام خیالی دور ہو گئی۔ تیز رفتاری کی بنا پر وہ سڑک پر پھیلی ہوئی چکناہٹ کو نہ دیکھ سکا اور اڑتا ہوا ٹرک کی دائیں جانب جا پڑا۔ موٹر سائیکل اس کی ٹانگوں کے نیچے سے نکل کر دوسری طرف جا پڑی۔

شاید ٹیکسی ڈرائیور نے اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے سڑک پر ڈیزل کا ڈبا الٹ دیا تھا۔

حسن اتفاق سے باب ریت کے ایک تودے پر گرا تھا اس لیے اسے زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں۔ اگر وہ اچھل کر سڑک پر ہی گرتا تو شاید اس کی ایک آدھ ہڈی ضرور اپنی جگہ چھوڑ دیتی یا متعدد حصوں میں تقسیم ہو جاتی۔

ریت کے اس تودے سے اٹھتے وقت باب کو احساس ہوا کہ اس کے جسم کا ہر عضو پھوڑا بنا ہوا ہے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا موٹر سائیکل کے قریب پہنچا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ موٹر سائیکل اس طرح ''مجروح'' ہوئی تھی کہ اب اس کے اسٹارٹ ہونے کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ باب نے مایوسی سے اسے چھوڑ دیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک ٹرک وہاں سے گزرا تو باب نے اسے ہاتھ دیا۔ ٹرک رک گیا۔ ڈرائیور نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے تو باب نے سڑک کی اس سمت اشارہ کر دیا جدھر مانکسٹر گیا تھا۔

ابھی انہیں چلے ہوئے دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ باب کو وہ ٹیکسی دوبارہ دکھائی دی۔ باب نے ٹرک ڈرائیور سے کہا۔ ''نوجوان میرا تعلق خفیہ پولیس سے ہے۔ تم اس ٹیکسی کو اوورٹیک کر کے ٹرک اس کے سامنے کھڑا کر دو۔ اس میں بہت بڑا مجرم سوار ہے۔''

ٹرک ڈرائیور نے باب کی طرف مضحکہ خیز نگاہ سے دیکھا۔ ریت پر گرنے سے باب کا حلیہ بگڑ گیا تھا۔ اس کے کپڑے اور جسم ریت میں اٹے ہوئے تھے۔

باب نے مسکرا کر کہا۔ ''شاید اس حلیے کی بنا پر تمہیں میری بات پر یقین نہیں آیا دوست! میں اس کا پیچھا کرتے ہوئے اپنی موٹر سائیکل سے گر گیا تھا۔'' اس نے قدرے توقف سے کہا۔ ''اگر تم نے اس ٹیکسی

والے کو پکڑ لیا تو میں پولیس کے محکمے سے تمہیں انعام دلواؤں گا اور پھر تمہارا فوٹو بھی اخباروں میں شائع ہوگا۔"

ٹرک ڈرائیور نے اس کی طرف بے اعتباری سے دیکھا اور پھر ٹرک کی رفتار تیز کر دی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ٹیکسی سے آگے پہنچ چکا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور اس وقت تک تو کچھ نہیں سمجھا مگر جب اس نے ڈرائیور کے برابر والی سیٹ سے باب کو اتر کر اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو سب کچھ سمجھ گیا۔ وہ اتنی دیر میں ٹیکسی کو ریورس گیئر میں ڈال کر فرار ہو سکتا تھا مگر اس وقت اتنا بوکھلایا ہوا تھا کہ اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی تھی۔

باب نے اس کے قریب پہنچ کر جب ریوالور اس کی کنپٹی پر رکھ دیا تو وہ گھگیانے لگا۔

"صاحب میرا کیا قصور ہے۔"

"تم نے اس آدمی کو کہاں اتارا تھا؟"

"دو بلاک پیچھے لیھم روڈ پر۔" اس نے روہانسی آواز میں جواب دیا۔

"صاحب! کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟"

"نہیں، تم مجھے بھی وہیں چھوڑ دو۔" باب نے اس سے کہا۔ "وہ بہت بڑا مجرم تھا جسے تم نے اپنی ٹیکسی میں سوار کر لیا تھا۔"

"صاحب! میری کنپٹی پر تو اسی طرح اس نے ریوالور کی نال رکھی تھی جس طرح آپ رکھے ہوئے ہیں۔ میں اس کا کہنا کیسے ٹال سکتا تھا۔"

باب نے ریوالور اپنے ہولسٹر میں رکھ لیا پھر اس نے ٹرک ڈرائیور کا نام پتا نوٹ کیا اور اس خصوصی تعاون کے لیے اس کا شکریہ ادا کیا۔

لیھم اس وقت سنسان پڑا تھا۔ وہاں زیادہ تر گودام اور ملیں تھیں۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اسے ایک جگہ اتار کر بتایا کہ وہ آدمی وہاں اترا تھا۔

باب نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی مگر یہ اندازہ لگانے سے قاصر رہا کہ مانسٹر کس طرف گیا ہوگا۔ اس نے ٹیکسی کو وہاں سے رخصت کر دیا اور خود ہی وہاں کا جائزہ لینے لگا۔ سڑک پر ہی ایک جگہ اسے یہ محسوس ہوا جیسے مین ہول کا ڈھکنا ہٹایا گیا ہو۔

ڈھکنے کا گول نشان، دائرے کی صورت میں سڑک پر ہی پڑ گیا تھا۔ باب نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر ڈھکنا وہاں سے اٹھایا اور مین ہول میں گھس گیا۔ اندر سے غلیظ بو کا ایک بھبکا اس کی ناک سے ٹکرایا اور چند لمحوں کے لیے اس کا دماغ سن ہو گیا۔ باب نے باہر آ کر گہرے گہرے سانس لیے اور تھوڑی دیر تک غلیظ ہوا کی نکاسی کا انتظار کرتا رہا۔

تقریباً پانچ منٹ بعد وہ مین ہول میں بنی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ نیچے جا رہا تھا۔ مین ہول کی تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ کہیں نیچے سے چوہوں کی وحشت ناک چوں چوں بھی سنائی دے رہی تھی۔ یہ محسوس کر کے ان کی کمین گاہ میں کوئی "غیر" آ رہا ہے۔ ان میں بے چینی و انتشار پیدا ہو گیا تھا۔

جب باب کے پاؤں مین ہول کی نچلی سطح سے ٹکرائے تو اس نے محسوس کیا کہ چوہوں میں بھگدڑ مچ گئی ہے۔ کچھ نے وہاں سے فرار ہو کر اپنی جان بچانے کی کوشش کی تھی اور کچھ اس کی پتلون پر چڑھ کر اس کے منہ کی طرف آنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

مین ہول میں تاریکی چھائی ہوئی تھی اور غلیظ پانی اس کے پاؤں سے ٹکرا رہا تھا۔ بدبو کی وجہ سے وہاں گھٹن پیدا ہو گئی تھی اور سانس لینے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔

اوپر سے روشنی کا ایک دائرہ تیزی سے نیچے آیا اور پھر مغربی سمت جا کر معدوم ہو گیا۔ شاید اس مین ہول کے قریب سے کوئی گاڑی گزری تھی اور یہ اسی کی ہیڈ لائٹس کا عکس تھا۔

دفعتاً دائیں جانب پانی میں چھپاکے سے محسوس ہوئے۔ ایسا لگا جیسے اس جانب کوئی بھاگ رہا ہو۔ باب نے اندھوں کی مانند ٹٹولا تو اسے راستہ سا محسوس ہوا۔ چھ فٹ چوڑی پائپ لائن اس وقت گلی

کی مانند لگ رہی تھی۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ باب نے منہ کھول کر سانس لینا شروع کر دیا۔

وہاں مسلسل غلاظت بہنے اور صفائی نہ ہونے کی وجہ سے پھسلن تھی۔ باب کا پاؤں بار بار رپٹ رہا تھا۔ تاریکی میں لمبے لمبے بصارت سے عاری کیڑے مکوڑے منہ اور ناک سے ٹکراتے تھے تو باب ٹھٹک جاتا تھا۔ اس کے رگ و پے میں سنسناہٹ دوڑ جاتی تھی کہ کوئی زہریلا کیڑا اس کے کپڑوں میں نہ گھس جائے۔

لال بیگوں کی وہاں اتنی کثرت تھی کہ باب نے اپنا جسم ان سے ڈھکا ہوا محسوس کیا تھا۔ متعدد بار یں اس کے جسم سے ٹکرائیں اور تاریکی میں پھڑ پھڑاتی ہوئی چلی گئیں۔ کئی جگہوں پر کوڑا، کچرا اور مٹی رک گئی تھی۔ اس دلدل نما غلاظت میں باب کے پاؤں پھنس گئے اور وہ کافی قوت صرف کر کے وہاں سے آگے جا سکا۔

آہستہ آہستہ وہ یہ محسوس کرنے لگا کہ اب اسے چلنے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ اگر اس نے اب قدم اٹھایا تو وہ گر پڑے گا۔

دفعتاً ایک دھماکا ہوا اور تاریکی میں ایک شعلہ مخالف سمت سے کوند کر اس کی طرف لپکا۔ قسمت اچھی تھی کہ باب کا پاؤں پھسل گیا یا شاید قدرت کو اس کی جان بچانا مقصود تھی کہ گولی اس کے سر پر سے گزر گئی۔

اس تنگ سی جگہ میں فائر کی آواز کافی دیر تک گونجتی رہی۔ اس ارتعاش کی بنا پر تاریکی میں رہنے والی ننھی مخلوق میں بے چینی سی پھیل گئی تھی۔ چوہے اپنی گول شیشے جیسی آنکھیں چمکاتے ہوئے اس کے پاؤں کے پاس سے سرسراتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔

باب کو یقین تھا کہ ان چوہوں کی جسامت ذرا بڑی ہوتی تو وہ اپنے دانتوں کو اس کے جسم پر آزمانے سے دریغ نہ کرتے۔ ان زمیں دوز پائپوں میں داخل ہوتے ہی چوہے اس کا گوشت بطور تبرک تقسیم کر چکے ہوتے۔

ایک بار پھر دوسری طرف سے فائر کیا گیا مگر گولی باب کو نہ چھو سکی کیونکہ وہ اب جھک جھک کر بڑھ رہا تھا۔ اس طرح سے چلنے میں بے پناہ تکلیف ہو رہی تھی مگر مانکسٹر کی گولیوں سے بچنے کا یہی ایک مناسب طریقہ تھا۔

پندرہ یا بیس قدم فاصلہ طے کرنے کے بعد بائیں جانب ہلکی سی روشنی دکھائی دی۔ وہ ان پائپوں سے نکلنے کا راستہ تھا۔ باب اسی جانب مڑ گیا۔ مانکسٹر ابھی کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔

وہ روشنی ایک کمرے سے آ رہی تھی۔ وہاں ایک ننھا سا بلب جل رہا تھا اور چالیس پچاس ڈھانچے دانت نکالے لیٹے اور بیٹھے ہوئے تھے۔

باب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو چیخیں مارنے لگتا اور خوف سے اس کی گھگھی بندھ جاتی لیکن وہ جانتا تھا کہ ڈھانچے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

جم لینڈ کا "یاک" بے حد قدیم مذہبی فرقہ اپنے مردوں کو زمین میں دفن کرنے کے بجائے قدیم رومیوں کی طرح تہ خانوں میں رکھا کرتا تھا۔ اس فرقے کے بہت سے افراد جم لینڈ سے امریکا میں آ کر آباد ہو گئے مگر انہوں نے اپنے طور طریقے نہیں بدلے۔ امریکا میں انہیں اتنی زمین نہیں ملی کہ وہ اپنے مردوں کو تہ خانوں میں رکھ پاتے تو انہوں نے زیر زمین پائپ لائنوں میں ایسی جگہ پیدا کر لی جہاں انہیں محفوظ کیا جا سکے۔

وہ پچاس ڈھانچے اسی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔

اس کمرے کو عبور کرنے کے بعد مانکسٹر کے تیز تیز سانسوں کی آواز سنائی دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آکسیجن نہ ملنے کی بنا پر اس کا سانس اکھڑ رہا ہو۔ باب جانتا تھا کہ مانکسٹر اب زیادہ عرصے زندہ نہیں رہ سکے گا مگر وہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ مبادا وہ ان پائپوں سے نکل کر دوبارہ مقامی لوگوں میں مل

جائے۔ انسولین کا انجکشن لینے کے بعد وہ بچ بھی سکتا تھا۔

اس کمرے کو عبور کرنے کے بعد ویسا ہی ایک اور کمرا دکھائی دیا۔ باب نے اسے بھی عبور کرنا چاہا تھا کہ دائیں جانب سے انسانی ڈھانچوں کے قریب بھاری سانسوں کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔

وہ چونک کر اس طرف مڑا جنرل مانکسٹر ان ڈھانچوں کے قریب بیٹھا ہوا گہرے سانس لے رہا تھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور ماتھے سے پسینے کی دھاریں پھوٹ رہی تھیں۔ باب نے ایک طویل عرصے کے بعد اسے دیکھا تھا۔ اس وقت مانکسٹر بے حد کم زور اور قابل رحم حالت میں تھا۔ اگر وہ کپڑے نہ پہنے ہوتا تو بادی النظر میں یہی محسوس ہوتا کہ وہ اس ماحول کا جزو ہے جیتا جاگتا ڈھانچا۔

جنرل مانکسٹر جو کبھی ریڈ گلف میزائل ڈیوٹی کنٹرول کا انچارج تھا اس وقت بے کسی سے اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔

اس نے ریڈ گلف پر حکومت کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور مطلق العنان فرماں روا بننے کا خواب دیکھا تھا مگر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ اس کے سانسوں میں گرہیں سی لگ رہی تھیں۔

اس نے ہانپتے ہوئے اپنا ریوالور سیدھا کیا اور گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ ”میجر باب۔۔۔! میں۔۔۔ میں تمہیں۔۔۔ مار ڈالوں گا۔“

باب نے خطرہ محسوس کرتے ہی فرش پر چھلانگ لگائی اور بائیں جانب موجود ڈھانچوں کی آڑ لے لی۔ مانکسٹر کے ریوالور سے شعلہ نکلا اور گولی باب کے جسم سے گزرتی دور دیوار میں پیوست ہو گئی۔

باب نے اپنا ریوالور نکال کر اس کے سینے کا نشانہ لینا چاہا مگر یہ دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی کہ مانکسٹر کانپتا ہوا انہی ڈھانچوں کے درمیان گر گیا۔ اس کی انگلیوں میں دبا ہوا ریوالور فرش پر لڑھک گیا۔ چہرہ بے ہنگم زاویے پر مڑ گیا اور آنکھیں چڑھ گئیں۔

باب نے مانکسٹر کے قریب پہنچ کر نبض دیکھی۔ روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔

ایک ارب کا مطالبہ کرنے والا شخص محض انسولین نہ ملنے کی بنا پر موت کا شکار ہو گیا تھا۔

مسکرائیے

ایک آدمی بھرے مجمع میں چلایا۔ ”مجھے معلوم ہے کل کیا ہوگا۔“

لوگ چونک کر بولے۔ ”کیا ہوگا؟“

وہ آدمی بولا۔ ”آج جمعرات ہے کل جمعہ ہوگا۔“

☆☆☆

باپ (بیٹے سے): ”پانچ اور پانچ کتنے ہوتے ہیں؟“

بیٹا: ”پانچ اور پانچ دس ہوتے ہیں۔“

باپ: ”یہ لو دس روپے۔“

بیٹا: ”اگر مجھے پتا ہوتا تو میں بیس کہتا۔“

☆☆☆

اسکاٹ لینڈ کے لوگ کنجوسی کی وجہ سے دنیا میں مشہور ہیں۔ کہتے ہیں ایک دفعہ ایک اسکاچ اسپتال میں لایا گیا۔ ڈاکٹر نے اس کی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے کے بعد اعلان کیا کہ یہ شخص مر چکا ہے۔ لوگوں نے حیرت سے پوچھا کہ کس طرح؟

ڈاکٹر نے جواب دیا کہ اگر کوئی شخص کسی اسکاچ کی جیب میں ہاتھ ڈالے اور وہ خاموش لیٹا رہے تو سمجھ لینا کہ وہ مر گیا ہے۔

☆☆☆

پاگل: ”ہم آپ کو پہلے ڈاکٹر سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔“

ڈاکٹر (خوش ہو کر): ”وہ کیوں؟“

پاگل: ”اس لیے کہ آپ بالکل ہمارے جیسے ہیں۔“

پہلی دراڑ

رضیہ فصیح احمد

ایک ایسا خاندان جسے اپنے خوب صورت، کلچرڈ، قابل گھرانا ہونے پر انتہائی ناز تھا، جن کی نظر میں اللہ تعالیٰ نے صرف ایک اُن کی ہی پرفیکٹ فیملی بنائی تھی لیکن۔۔۔ کیا اُن کا آپس میں ایک دوسرے کے لیے پیار، خلوص، احساس سب واقعی دل سے تھا یا دکھاوا تھا؟

بناوٹی محبت کی اینٹوں سے بنی اور مصنوعی خلوص کے رنگوں سے سجی دیوار میں پہلی دراڑ پڑتی ہے جب۔۔۔۔

معاشرتی برائیوں کو اُجاگر کرتی ایک سبق آموز کہانی

جب بھی اس واقعہ کا خیال آتا ہے کچھ عجیب سی میری حالت ہو جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یکا یک میرے دل سے خون رسنے لگا ہے جو میرے سینے سے باہر نکلتا۔۔۔ سارے بدن پر بہتا زمین پر گر رہا ہے۔ جب تک میں اپنے آپ کو کسی کام میں غرق نہ کر دوں یہ رستا ہی رہتا ہے۔ لگتا ہے قطرہ قطرہ ٹپکتا لہو سارے کا سارا جسم سے نچڑ جائے گا اور میں خالی ہو کر نعش کی طرح گر پڑوں گا۔

اسی لیے میں اس سارے واقعہ کو بھلائے رکھتا ہوں، لیکن ساری باتیں ہی تو اپنے بس میں نہیں ہوتیں، دنیا والے بھی تو بہت سی باتیں نہیں بھولنے دیتے اور کسی کو خبر بھی کیا کہ انسان کو کس چیز سے کون سی بات یاد آتی ہے۔

اب یہ کون جانتا ہے کہ بیٹھے بٹھائے جب کبھی لائٹ آف ہو جاتی ہے تو میں فوراً امجد کے گھر پہنچ جاتا ہوں۔ پہلے دن جب شام، رات میں بدل رہی تھی گملوں میں لگی اور ستونوں پر چڑھی بیلیں ہولے ہولے ہل رہی تھیں، میں برآمدے کی سیڑھیوں پر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اس لیے کہ تھوڑی دیر پہلے جب میں نے بہت مرتبہ گھنٹی بجائی تھی تو بجائے دروازے کے کھڑکی میں سے ایک چہرہ جھانکا تھا اور ایک شیریں سی آواز آئی تھی۔

''آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

''امجد سے۔۔۔''

''وہ گھر پر نہیں ہیں۔''

یہ اندازہ مجھے ہو گیا تھا کہ گھر پر کوئی مرد یا نوکر نہیں ہے۔ اب اس حسین آواز کی رعایت سے ہو سکتا ہے کوئی بڑی بی کسی کونے میں پڑی ہوں۔ جب شام، رات میں بدل رہی ہو، عمارتوں کے درمیان سے نظر آنے والے آسمان پر شفق پھوٹتی ہو، گملوں میں لگی اور ستونوں پر چڑھی بیلیں ہولے ہولے ہل رہی ہوں اور کوئی نادیدہ چہرہ جھانک کر میٹھی آواز میں یہ کہے کہ جس سے آپ کو ملنا ہے وہ گھر پر نہیں ہے تو اس عمر میں آدمی خوامخواہ رومانی سا ہو جاتا ہے اور کوئی شرارت بھری بات کہنے کو جی چاہتا ہے چنانچہ میں نے کہا۔ ''ظاہر ہے۔۔۔ امجد ہوتے تو مجھے اتنی دیر باہر نہ کھڑا رہنا پڑتا۔''

ہنسی کی ایک کھنکناہٹ سی ابھری اور میرے دل کو بڑی تقویت ہوئی جیسے آدمی بھری محفل میں کوئی لطیفہ سنائے اور اس کا خاطر خواہ اثر ہو۔

''کب تک آئیں گے وہ؟ میں نے بات آگے چلائی۔''

''اب آتے ہی ہوں گے۔ ایرپورٹ پر کسی رشتے دار کو چھوڑنے گئے ہیں سب لوگ، آپ انتظار کریں گے؟''

''کر لوں گا۔''

''کرسی بھجوا دوں؟''

''اگر زمین پر بیٹھا ہوا برا لگ رہا ہوں تو بھجوا دیجیے۔''

ہنسی کی ایک اور کھنکناہٹ، پھر خاموشی۔

میں واپس جا سکتا تھا کچھ دیر گھوم گھام کر بھی آ سکتا تھا اور یوں مجھے امجد سے کون سا ضروری کام تھا۔ صرف نوکری کا ایک اشتہار اسے دکھانا تھا جو بہت ممکن ہے وہ خود بھی دیکھ چکا ہو۔ انجینئرنگ کرنے کے بعد نوکری کی تلاش میں ہم کئی ماہ سے اکٹھے جوتیاں توڑ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو اشتہارات دکھانے، عرضیاں لکھنے لکھانے اور انٹرویو کے لیے ایک دوسرے کی چیزیں مستعار لینے ہم روز ہی تو ملتے تھے۔

پھر نہ جانے کیا وجہ تھی کہ میں سیڑھیوں پر بیٹھا آسمان پر پھیلی شفق کو دیکھتا رہا اور امجد کا انتظار کرتا رہا یا شاید اس موعود کرسی کا۔ امجد کیوں مجھے اپنے گھر آنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ سوال بھی اس وقت میرے ذہن میں اٹھا ہم اب کئی سال سے دوست تھے مگر وہ یا تو میرے گھر آ جاتا یا کہیں اور ملاقات کی جگہ طے کرتا اگر میں اس کے گھر آنے کا ذکر کرتا تو فوراً کسی پکچر کا پروگرام بنا کر وہاں ملنے پر اصرار کرنے لگتا یا کسی دوست کے گھر جانے کو اچانک اس کا دل

اچھلتا، پہلے تو میں نے سوچا چلو نہیں چاہتا تو نہ سہی مگر اب مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔ لعنت ہے ایسی دوستی پر جب آدمی اپنے دوستوں کو اپنے گھر لے جاتے شرمائے وہ ایسے خراب علاقے میں بھی نہیں رہتا یہ مجھے معلوم تھا اور ظاہری حلیے سے بھی فاقہ مستی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے فارم وارم بھرنے کے چکر میں جب مجھے اس کے گھر کا نمبر از بر ہو گیا تو آج میں بغیر اطلاع دیے آیا اور حیران ہوا کہ اس کا مکان میرے گھر سے کئی گنا اچھا تھا۔ عموماً لوگ اپنے گھر یا گھر والوں سے ہی شرماتے ہیں، میں نے چاہا کہ اب آ ہی گیا ہوں تو گھر والوں میں سے کسی کو دیکھتا چلوں۔

دروازے میں کچھ کھڑ بڑ سنائی دی۔ کوئی جالی کا اسپرنگ لگا دروازہ کھولنے اور کرسی نکالنے کی بیک وقت کوشش میں سخت ناکام نظر آ رہا تھا۔ میں شرافت سے نظریں نیچی کیے بیٹھا رہا۔ پھر وہ کرسی ٹیڑھی بانکی دروازے میں پھنسی چھوڑ دی گئی اور آواز آئی۔ ''آپ یہ کرسی لے لیجیے، گھر میں کوئی نوکر نہیں ہے۔''

''جی نہیں شکریہ، میں بڑے آرام سے ہوں۔ جب شام، رات میں بدل رہی ہو، شفق کی سرخی پھیلی ہو، گملوں میں لٹکی اور ستون پر چڑھی بیلیں ہولے ہولے ہل رہی ہوں اور ان میں بسیرا لینے آنے والی چڑیاں چوں چوں کر رہی ہوں تو زمین پر بیٹھنا واقعی اچھا لگتا ہے اور پھر کسی نادیدہ چہرے والی کو خواہ مخواہ چھیڑنے کو جی چاہتا ہے کہ وہ ذرا جل کر کچھ کہے یا غصے میں پاکستانی پکچرز کی ہیروئن کی طرح باہر نکل پڑے اور کمر پر ہاتھ رکھ کر پھنکارے، اے مسٹر! مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں اندھیرے میں بیٹھا رہا اور کرسی وہاں اسی طرح شکنجے میں پھنسی پڑی رہی۔

کچھ دیر میں تاریکی گہری ہو گئی۔ گھر کے اندر اکا دکا بتیاں جلیں، مگر میں اسی طرح اندھیرے میں بیٹھا رہا۔ شاید اس انتظار میں کہ کوئی آ کر برآمدے کی لائٹ جلائے اور میں اسے دیکھ سکوں۔ مگر کوئی نہ آیا۔ میں بھی بیٹھا رہا اس عمر میں قسمت آزمائی یوں بھی اچھی لگتی ہے۔ سڑک پر اِکا دُکا کاروں کے گزرنے کی آواز آتی رہی۔ دور کسی گھر میں ریڈیو پر میرا پسندیدہ نغمہ بج رہا تھا۔ دور سے آتی ہوئی اس کی آواز بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ خصوصاً جب شام رات میں بدل رہی ہو اور آپ کسی انجانے گھر کی سیڑھیوں پر کسی انتظار میں بیٹھے ہوں۔ کس انتظار میں۔۔۔ یہ آپ کو خود بھی معلوم نہ ہو۔

یکا یک آس پاس کے سارے گھروں اور سڑکوں کی بتیاں بجھ گئیں۔ گھپ اندھیرا ہو گیا۔ میں نے سوچا اب چلا جائے کپڑے جھاڑتا کھڑا ہوا تو اسی وقت ہاتھ میں موم بتی لیے کوئی آیا اور دروازے میں الجھی ہوئی کرسی سے الجھنے لگا میں نے ادھر دیکھا۔ وہ نازک سی خوش شکل سی ایک لڑکی تھی۔ موم بتی کی کانپتی لو کی روشنی اور سائے میں وہ پراسرار چینی کہانی سی لگ رہی تھی۔ ایسی کہانی جس میں خوب صورت مردہ لڑکیوں کی روحیں خوب صورت انسانی قالب میں ڈھل کر رات کے اندھیرے میں اکیلے مردوں کو چھیڑنے آیا کرتی ہیں۔ میں نے دوڑ کر اس کی مدد کی اور کرسی نکال کر باہر رکھ دی۔ وہ دروازے میں اسی پراسرار روح کی طرح کھڑی رہی۔ ہلکی روشنی میں ہلکے گہرے سائے اس کے چہرے پر دوڑ رہے تھے۔

''باہر تو بہت اندھیرا ہے۔ آپ چاہیں تو ڈرائنگ روم میں بیٹھ جائیے۔ مگر اندر روشنی نہیں ہے۔''

''تعجب ہے آپ کے ہوتے ہوئے روشنی نہیں ہے۔'' بعض دفعہ گھسے پٹے فقرے بھی کتنے نئے اور خوب صورت معلوم ہونے لگتے ہیں۔ میرے اس گھسے پٹے فقرے نے بھی اپنا کام کیا۔ زیر لب مسکراہٹ ہلکی سی روشنی میں ابھری اور آنکھوں میں چراغ کی لو سی لہرائی۔ اس وقت بجق سے سارے گھروں اور سڑکوں کی بتیاں جل اٹھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر برآمدے کی لائٹ آن کر دی۔

وہ یقیناً نازک خوش شکل اور جامہ زیب سی لڑکی

تھی، متوسط کھلے ہوئے بال جو اس کے چہرے کے تیکھے خدوخال کو نمایاں کررہے تھے۔ بجلی کی روشنی میں چینی کہانی کی پراسراریت غائب ہوگئی تھی، لیکن یہ بات کتنی غنیمت تھی کہ وہ موم بتی کی روشنی ہی میں نہیں بجلی کی روشنی میں بھی اچھی لگ رہی تھی۔

''اب چلوں گا۔'' میں نے کہا۔

''اتنی دیر انتظار کیا ہے، تو۔۔۔''

''بس انتظار کی مدت ختم ہوگئی۔''

''جی۔'' وہ میرے رمز کو سمجھی نہیں یا بن گئی۔

''میں نے سوچا تھا اگر وہ ساڑھے سات تک نہ آیا تو میں چلا جاؤں گا۔'' گھڑی دیکھتے ہوئے یہ فقرہ میں نے فی البدیہہ کہا۔ ''امجد آیا تو بتا دیجیے گا کہ جنید آیا تھا۔''

''جی اچھا۔''

موم بتی بجھاتی وہ اندر چلی گئی اور میں اپنے گھر کی طرف چلا، مگر قدم رک رک کر اٹھ رہے تھے، میں سوچ رہا تھا بظاہر تو کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی کہ امجد اپنے دوستوں کو اپنے گھر آنے سے روکے۔ آج کل تو جوان بہنوں والے بھائی خوامخواہ بھی دوستوں کو اپنے گھروں میں گھسیٹا کرتے ہیں جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہ اشتہار انگلیوں سے چھوا جو امجد کو دکھانے لایا تھا۔

''کیوں نہ یہ اشتہار دیتا چلوں۔''

''کل وہ تمہارے ہاں ضرور پہنچے گا۔''

''ہاں۔ مگر ابھی دے دیا جائے تو کیا حرج ہے۔ اس عمر میں اگر کوئی کسی کو دوسری نظر دیکھنے کو یوں بے تاب ہو تو کوئی ایسی بری بات بھی تو نہیں۔''

گیٹ ابھی تک کھلا ہوا تھا۔ میں اندر چلا گیا برآمدے کی روشنی پھر بند تھی مجھے ذرا سا تعجب ہوا بڑے کفایت شعار لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ پھر یکا یک نظر اٹھی، چھوٹے سے احاطے میں دو سائے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہل رہے تھے۔ دونوں کی پیٹھ اس طرف تھی ایک تو وہی معلوم ہوتی تھی۔ وہی قد ویسا ہی جسم وہی بال دوسرا سایہ مردانہ تھا۔ لمبا کوٹ چغہ یا گاؤن پہنے ہوئے۔ یہ کون ہوسکتا ہے۔ ابھی تو اس گھر میں کوئی نہیں تھا۔ یہ کون آیا اور کہاں سے آیا۔۔۔ برآمدے کی بتی بند۔۔۔ ہاتھ میں ہاتھ۔۔۔ پوری طرح کچھ سوچنے سمجھنے سے پہلے۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ دیوار تک پہنچ کر پلٹیں میں دبے پاؤں مگر پھرتی سے گیٹ سے نکلا اور اپنے راستے پر پڑ لیا۔

☆☆☆

آج کل کچھ کرنے کو نہیں تھا اس لیے میں نے چند دن سے پینٹنگ شروع کردی تھی۔۔۔ رنگ مجھے ہمیشہ سے لبھاتے تھے۔ پینٹنگ کرنے اور آرٹ کے بارے میں کتابیں پڑھنے میں بہت سا وقت گزر جاتا تھا۔ دوسرے دن آس پاس رنگ بکھیرے جب میں اپنے خیال میں ایک تجریدی آرٹ تخلیق کررہا تھا تو مجھے ایک عجیب خیال آیا کہ اگر کوئی آدمی ایک خوب صورت سی پینٹنگ پہلی نظر میں دیکھ کر پسند کرلے اور اسے خریدنے پر آمادہ ہوجائے اور اس وقت پتا چلے کہ وہ پینٹنگ تو پہلے ہی بک چکی ہے تو اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ اسے دھکا سا لگے گا اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ اسے وہ پینٹنگ پہلے سے کہیں زیادہ حسین معلوم ہونے لگے اور وہ اسے ہر صورت میں حاصل کرنا چاہے، لیکن پینٹنگ کا اپنا دل تھوڑا ہی ہوتا ہے اگر آپ خود کسی پینٹنگ کو کسی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دیکھ لیں تو آپ کو اس بات پر راضی بہ رضا ہوجانا چاہیے کہ جب اس پینٹنگ نے اپنا مالک چن لیا ہے تو۔۔۔ مگر یہ تو معلوم کیا جاسکتا ہے کہ وہ مالک کون ہے۔۔۔ پینٹنگ نے اسے کیسے چنا۔ آیا وہ اسے خریدنے کی دسترس بھی رکھتا ہے یا صرف رات کے اندھیرے میں اسے دیکھنے ہی آیا کرتا ہے۔ خدا کا شکر کہ اسی وقت امجد آ پہنچا میں نے اس سے کہا۔

''یار! کل شام میں تمہارے ہاں گیا تھا بہت دیر گھنٹی بجائی۔۔۔''

''ہاں۔۔۔ کل ہم سب ایرپورٹ گئے تھے۔ صرف جمال بھائی گھر پر تھے۔ وہ رات کی ڈیوٹی کے

بعد دن بھر سوتے ہیں اور کوئی انہیں کسی قیمت پر اٹھا نہیں سکتا۔"

جمال بھائی کا ذکر اس نے پہلے بھی کیا تھا۔ وہ اس کے بہنوئی تھے۔ یوں ذکر تو سب ہی بہن بھائیوں کا آتا رہتا تھا مگر میں ان میں سے کسی سے بھی صورت آشنا نہیں تھا۔

"ہاں، بہت دیر بعد کوئی دروازے پر آیا تھا، غالباً تمہاری بہن۔۔۔ مگر کیا تمہاری فرخندہ باجی اتنی دبلی پتلی ہیں۔

"نہیں۔۔۔ وہ تو خوب پلی پلائی ہیں۔ وہ نائلہ ہوگی۔ اس کا کمرا اوپر کی منزل پر ہے اور وہ ہے بھی خاصی ڈرپوک سی، اتنے اتنے سے دل ہمارے گھر والوں کے اور مزے کی بات یہ کہ اس پر فخر کیا جاتا ہے۔"

☆☆☆

امجد میرے شاہکار کو دیکھنے کے بجائے بکھرے ہوئے رنگوں خالی ڈبے، بوتلوں، رنگ سے بھرے چیتھڑوں کو بڑے غور بلکہ حسرت سے دیکھ رہا تھا۔

"یار! تم بڑے خوش قسمت ہو۔" وہ یہ جملہ اکثر کہا کرتا تھا اور جب میں وجہ پوچھتا تو ٹال جاتا یا کوئی ایسی وجہ بتاتا جو بعد میں سوچی گئی ہوتی۔

"کیوں؟" میں نے ہمیشہ کی طرح پوچھا۔

"اب پینٹنگ بھی کر لیتے ہو۔ میں تو بڑا بور ہوتا ہوں۔"

"تو تم بھی شروع کر دو۔"

"نہیں میرے بس کا نہیں اور ہمارے گھر میں ان چیزوں کی اجازت بھی نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں، اب چلوں گا۔ فاخرہ کو وقت دے رکھا ہے۔"

"تمہارے گھر میں لڑکیوں کو وقت دینے کی اجازت ہے۔"

"ارے نہیں، کیوں دکھتی رگ چھیڑتے ہو۔ اب چلتا ہوں۔ اللہ حافظ۔"

وہ چلا گیا۔ نہ اس نے پوچھا کل میرے گھر کیوں آئے تھے نہ میں نے بتایا اور اس کے بعد میں اکثر اس کے ہاں جانے لگا مگر وہ پھر کبھی مجھے تنہا نہ ملی۔ اس کو دیکھ کر جب کبھی دل دھڑکنے کی کوشش کرتا تو دو سائے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ذہن میں ابھرتے اور مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوتا جیسے کوئی بہت اچھی بات یاد آتے آتے رہ گئی ہو۔

اور جب میں اکثر اس کے ہاں جانے لگا تب ہی اس بات کا انکشاف ہوا کہ وہ کیوں دوستوں کو اپنے گھر آنے کی دعوت نہیں دیتا۔ وہ اپنے گھر والوں کو سمجھتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ دوست یہ بات جانیں۔

وہ میرے ہاں آتا، تو دندناتا ہوا میرے کمرے میں چلا آتا، میں ان کے گھر جاتا تو مجھے تکلف سے ڈرائنگ روم میں بٹھایا جاتا اور مجھے کبھی اس سے آگے کی دہلیز پار کرنے کی جرات نہیں ہوئی۔ کوئی جا کر امجد کو اطلاع دیتا امجد آتا تو اس کی یہی کوشش ہوتی کہ مجھے ساتھ لے کر کہیں باہر چلا جائے۔ اگر میں ٹالتا تو مجبوراً بیٹھا رہتا، تکلف سے چائے آتی اس دوران اگر کوئی رشتے دار یا کسی اور بہن بھائی کا دوست آجاتا تو اسے بھی یہیں بٹھایا جاتا، تکلف کی فضا قائم رہتی، گھر والے اطمینان سے آتے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے یہ باور کرنا تو مشکل تھا کہ وہ ہمیشہ ہی شفاف رہتے ہوں گے۔ یہی ہوسکتا ہے کہ وہ مہمانوں کی آمد پر فوری کپڑے تبدیل کرتے ہوں۔

مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے ہمارے ہاں آگ دھیمے دھیمے جلتی ہے، ان کے ہاں بھڑ بھڑ کر کے یہاں کوئی لب گور ہوتا تو پتا نہ چلتا وہاں کسی کو چھینک آتی تو کہرام مچ جاتا، یہاں کوئی برسوں بعد آتا تو ماں یوں ہی برائے نام گلے لگاتی وہاں ہر گھڑی گلے میں باہیں اور پیار کے پھول نچھاور ہوتے مجھے تو یہ سب کچھ عجیب لگتا ہی تھا مگر تعجب ہوتا کہ امجد کو جو اسی ماحول میں پیدا ہو کر جوان ہوا ہے یہ کیوں عجیب لگتا

ہے۔ مجھے تو اس کے گھر والے کسی اناڑی مصور کے بنائے ہوئے ایسے پورٹریٹ لگتے تھے جن پر محنت تو بہت کی گئی ہو مگر ان کو جتنا اصلی دکھانے کی کوشش کی جائے اتنے ہی نقلی نظر آتے ہوں۔ وہ قطعی فلیٹ تھے یعنی ان میں کسی بات کی سخت کمی تھی۔

ایک دن میں نے اس سے کہا۔ ”تم کس کمرے میں رہتے ہو، مجھے اپنے کمرے کی شکل تو دکھاؤ۔“

وہ بولا۔ ”ارے یار! میرا کمرا کہاں ہے، ہم دو بھائی اکٹھے رہتے ہیں۔ اسے کسی اسپتال کا پرائیویٹ وارڈ سمجھو۔ ہر چیز قرینے سے ہونی چاہیے۔ چادریں صاف، میز پوش صاف، کتابیں جگہ پر۔ کوئی چیز کسی مصرف کی نہیں ہے صرف اپنی جگہ پر سجانے کے لیے ہے۔ کچھ مزا نہیں آتا یا ایسی جگہ پر رہنے کا اسی لیے تو میں تمہیں وہاں نہیں لے جاتا۔ مجھے شرم آتی ہے۔“

یہ الٹی منطق بھی عموماً لڑکوں کو اپنے بے ہنگم میلے کمروں میں لے جاتے ہوئے ہچکچاہٹ ہوتی ہے مگر اسے صفائی ستھرائی سے الرجی تھی۔

ایک دن وہ میرے ہاں آیا تو میں بخار میں پڑا تھا، اکیلا اپنے کمرے میں۔ پلنگ کے پاس تپائی پر دوائیں اور پانی کا گلاس رکھا ہوا تھا اسے بڑی حیرت ہوئی اور شاید بے حد خوشی بھی جیسے گھر والوں نے مجھے تنہا ڈال کر مجھ پر احسان عظیم کیا ہو۔ بڑے بشاش لہجے میں بولا۔ ”یار! تم کتنے خوش قسمت ہو۔“

”کیسے؟“

”مزے سے اکیلے پڑے ہو۔ ہمارے ہاں کوئی بیمار پڑ جائے تو اس قدر ہائے ہائے مچتی ہے کہ پوچھو نہیں۔ کوئی نہ کوئی سر پر سوار رہے گا۔ مجال ہے مریض کو ایک منٹ کو سکون مل جائے ہر شخص خاطر مدارات میں لگا رہے گا۔ اس کے علاوہ پورے خاندان میں فوراً بیماری کی اطلاع پہنچائی جائے گی۔ جو شخص عیادت کے لیے نہ آئے اس سے سدا کے لیے رشتے ناتے توڑنے کی دھمکی دی جائے گی۔ ہے معمولی زکام ہی کیوں نہ ہو مگر آنے جانے والوں سے مریض کا ذکر یوں ہوگا جیسے وہ اب چلا کہ چلا۔ یار عجب ”دقسی“ فیملی ہے ہماری بھی۔ ایک دن مکان کا نام تجویز ہو رہا تھا۔ بڑے بڑے روحانی نام لیے جا رہے تھے۔ میں نے کہا اس گھر کا نام ہونا چاہیے ”نسی ہاؤس“ تو لٹھ لے کے سب میرے پیچھے پڑ گئے اور جانتے ہو میرے اس درجہ بگڑ جانے کی وجہ کیا ہے۔

”کیا۔“

”تم اور کون۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ اجڈ دوستوں میں اٹھ بیٹھ کر امجد نازک احساسات و جذبات سے کورا ہو گیا ہے اور بہت جلد انسان سے ڈھگا بن جائے گا۔ یار تھوڑی سی جگہ تو دو۔“ وہ میرے پائنتی ٹھس کر بیٹھ گیا۔ آج وہ بڑی ترنگ میں تھا کہنے لگا۔ ”یار! تم نہیں جانتے اس گھر کی ہر روایت خود ساختہ اور بناوٹی ہے۔ ہماری نانی اماں کو دیکھو دھیلہ بھر پیار نہیں کرتیں ہم لوگوں کو مگر جب کوئی آئے گا تو ایک ایک کو بلائیں گی، بلائیں لیں گی، پیار کریں گی اور حکم دیں گی کہ سامنے بیٹھے رہو کہ دل بھر کے دیکھ لوں۔ یار! اتنی ہنسی آتی ہے ان کی بناوٹ پر مگر حیرت ہے کہ جیسے سب کچھ سمجھتے ہی نہیں چپ چاپ ان کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں میرا تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ ہاں اور دوسروں کے سامنے جو ماں بیٹیوں اور بہنوں بہنوں میں پیار محبت کی باتیں ہوتی ہیں تو ہنسی روکنا دوبھر ہو جاتا ہے جب میں اٹھ کر بھاگتا ہوں تو مجھے اجڈ گنوار اور اکل کھرا کہا جاتا ہے۔ دوسروں کے ہاں دیکھتا ہوں مثلاً اب تمہارے ہاں ڈیموکریسی ہے مگر ہمارے ہاں ڈکٹیٹر شپ ہے اور ڈکٹیٹر شپ بھی کسی ایک آدمی کی نہیں ایک خود ساختہ نظام کی۔ یوں سمجھو کہ ہمارے ہاں جمہوریت نے بھی ڈکٹیٹر شپ کا روپ دھار لیا ہے۔ کچھ باتیں طے ہیں کہ ان کو گھر کا کوئی شخص نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مثلاً گھر کے کسی بھی فرد سے ملنے آنے والا ڈرائنگ روم میں بیٹھے گا کسی کے سامنے بھی آپس کے اختلافات کا ذکر کسی صورت نہیں کیا جائے گا بلکہ دوسروں کے سامنے باہمی اور

دائمی محبت کا ایسا ڈھونگ رچایا جائے گا کہ لوگ اس خاندان کی محبت و مروت پر عش عش کریں گے اگر کوئی ذرا سا بھی بیمار ہو تو اس گھر کے کسی فرد کو کسی پکچر، پکنک یا پارٹی پر جانے کی اجازت نہیں ہوگی مگر وہ ظاہر یہ کرے گا کہ فلاں شخص کی بیماری کی وجہ سے اس کا اپنا دل قطعی کسی تفریح پر آمادہ نہیں جو ایسا نہیں کرے گا سب اس کو نکو بنائیں گے جیسا کہ مجھے اکثر بنایا جاتا ہے۔ میں ہی اس گھر کی ایک ''کالی بھیڑ'' ہوں۔

''مگر یہ سب کیوں ہے۔'' میں مارے تجسس کے بخار ہی میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آج وہ موڈ میں ہے، ذرا پتا تو چلے۔

''یار اس فیملی کی ہسٹری بڑی دلچسپ ہے۔ میں نے بڑی تحقیق کی ہے اس پر اور ایک ایک شخصیت کا تجزیہ کیا ہے قصہ یہ ہے کہ ہمارے نانا کی ہماری نانی سے کہیں دور کی رشتے داری تھی۔ ہماری نانی ہوا کرتی تھی بڑی حسین و جمیل۔ وہ تو تم اب بھی انہیں اور امی کو دیکھ کر اور اس فقیر کے حسن بے مثال کا اندازہ کر کے سمجھ سکتے ہو۔ قصہ مختصر، ہمارے نانا کا ان پر دل آ گیا اور کہا کہ شادی کروں گا تو یہیں ورنہ کچھ کھا کر سو رہوں گا۔ سنتے ہو، وہی انیسویں صدی والا عشق بلاخیز۔ چنانچہ جب رستہ ہو گیا تو ہمارے پرنانا مرحوم نے بڑے نخرے دکھائے، پاندان کا خرچ الگ بندھوایا اس سستے زمانے میں ایک لاکھ مہر، گھر داماد اور جانے کیا کیا کچھ۔ ہمارے نانا نے ہر بات منظور کی چنانچہ اس دن سے اس خاندان کو ایسا احساس برتری ہوا کہ بچے بچے کے پر لگ گئے۔ انہوں نے خود کو دنیا بھر سے اونچا سمجھنا شروع کر دیا بدقسمتی سے ہمارے ابا بھی شروع ہی سے ان کے قابو میں آ گئے اور زندگی بھر امی ہی کے نہیں، ساری سسرال کے بے دام غلام رہے جہاں چاہا بٹھایا جب چاہا اٹھایا اور اب تو ان کی وہ حالت ہو گئی ہے، اتنے مانوس ضیاد سے ہو گئے کہ رہائی ملے گی تو بھی مر جائیں گے کئی دفعہ ابا سے بات کرنا چاہتا ہوں اس سلسلے میں مگر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے سوچنے سمجھنے کی قوت سلب ہو گئی ہے یعنی انہیں صحیح معنوں میں برین واش کر دیا گیا ہے اور وہ انہی باتوں کو ٹھیک سمجھتے ہیں جو سدا سے اس گھر میں ہوتی آئی ہیں۔ یاد ہے تم نے ایک مرتبہ پوچھا تھا کہ تمہارے ہاں صرف فرخندہ باجی کی اب تک شادی ہوئی ہے باقی بہن بھائی اب تک کنوارے کیوں ہیں؟ ارے بھائی کوڑھ مغز! اتنے دن سے ہمارے ہاں آ جا رہے ہو اتنی سی بات نہیں سمجھے کہ ہمارے جوڑے ملیں گے کہاں؟'' اس کے لہجے میں بلا کا طنز تھا جسے وہ تمسخر میں ڈھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ارے ہم سا خوب صورت، کلچرڈ، قابل گھرانا کوئی ہو تو وہاں جوڑ ڈھونڈنے جائیں نا، ابھی تک تو اللہ تعالیٰ نے صرف ایک ہی پرفیکٹ فیملی بنائی ہے۔'' وہ ہنستا ہنستا دوہرا ہو گیا۔ ''مگر یار! اس سلسلے میں، میں بھی ان لوگوں کو وہ دھکا پہنچانے والا ہوں جس سے شاید ہی کوئی جاں بر ہو۔۔۔'' وہ میرے گلاس کا بچا کھچا پانی غٹا غٹ پی گیا اور گلاس کو زور سے میز پر پٹخ کر بولا۔

''میں فاخرہ سے شادی کر رہا ہوں۔''

''فاخرہ۔۔۔'' مجھے واقعی تعجب ہوا کیونکہ وہ ہر طرح اس گھرانے کے لیے ایک پروڈی تھی، کالی موٹی دھم دھم چلنے والی چپڑ چپڑ چیونگم کھاتے ہوئے، زور زور سے بولنے والی منہ پھٹ لڑکی پہلے تو میں مذاق ہی سمجھا مگر امجد نے مجھے یقین دلایا کہ وہ بالکل سنجیدہ ہے اس نے تو جیسے اس گھرانے کے ہر مان کو توڑنے کا عزم کر رکھا تھا۔

اس کا کہنا تھا کہ جب سب سے پہلے اس نے فاخرہ کو دیکھا تو اسے یقین ہی نہ آتا تھا کہ لڑکیاں ایسی بھی ہو سکتی ہیں۔ پڑھی لکھی تو اس کی اپنی بہنیں بھی کم نہ تھیں پردہ بھی نہیں کرتی تھیں مگر وہ انہیں پردے کی بو بو میں ہی کہا کرتا تھا۔۔۔ اور کبھی۔۔۔ بننے والی جاپی کی گڑیاں۔۔۔ مجھے اس کی یہ بات ناپسند تھی کیونکہ مجھے ایک ایسی ہی لڑکی اچھی لگتی تھی۔

''اچھا یار! چلتا ہوں۔ فاخرہ کو وقت دے رکھا

ہے۔ مزے سے اکیلے پڑے رہو اور یاد رکھو اگر اب کے بھی میں بیمار پڑوں نا تو میرے حال پر رحم کھا کے مجھے اپنے گھر لے آنا۔"

وہ بھدر بھدر سیڑھیاں اتر کر چلا گیا۔

چند دن بعد اسے نوکری کا پروانہ ملا مگر بیرون ملک۔ وہ بتاتا گھر والے کس قدر فس (FUSS) مچا رہے ہیں جیسے وہ چاند پر جا رہا ہو۔ امی کو دن رات غشی کے دورے پڑتے رہتے ہیں اور انہوں نے صاف کہہ دیا ہے کہ انہیں ایسی نوکری نہیں چاہیے جو ان کے لاڈ کے پالوں کو ان کی نظروں سے اوجھل کردے وغیرہ۔

جتنا گھر والے زور دیتے کہ وہ اس نوکری پر نہ جائے اتنا ہی اس کا ارادہ پختہ ہوتا جاتا۔ گھر والوں کی شدت پسندی نے اسے بھی انتہا پسند بنا دیا تھا۔ ادھر وہ نہ صرف فاخرہ سے شادی کا پختہ عزم کیے بیٹھا تھا بلکہ چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے اس سے نکاح کرلے تاکہ غیر ملک میں جب وہ جم جائے تب آسانی سے فاخرہ کو بلا سکے اور اس وقت اس کے گھر والوں کو اس شادی کی اطلاع ہو۔ فاخرہ کی امی اس شادی کے لیے تیار تھیں مگر امجد کے گھر والوں سے وہ بھی ڈرتی تھیں چنانچہ امجد کا خیال تھا کہ یہ نکاح ہمارے گھر پر ہو۔ میں نے ڈرتے ڈرتے یہ بات امی سے کی تو وہ بگڑ گئیں۔

"میرے آگے بھی لڑکیاں ہیں کل کو شازیہ، تازیہ بھی کسی کے گھر جا کے نکاح پڑھوا آئیں گی تو میں کیا کروں گی۔"

معاملہ بے ڈھب تھا۔ امجد کا اصرار تھا کہ وہ خود امی سے بات کرے گا۔ میں نے کہا چلو ٹھیک ہے نمٹ لینے دو آپس میں دونوں کو۔

بڑی زوردار بحث ہوئی۔ امجد کا کہنا تھا کہ اس کے گھر والوں کو قیامت تک وہ لڑکی پسند نہیں آئے گی جو اس کی پسند پر پوری اترے گی اور وہ ہرگز ہرگز اس لڑکی سے شادی نہیں کرے گا جو اس کے گھر والوں کے معیار پر پوری اترے گی۔

آخر امی نے کہا کہ وہ خود اس کے گھر جا کر گھر والوں کو فاخرہ سے شادی کرنے پر راضی کریں گی۔

اس پر وہ ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

"یہ میں کبھی نہیں ہونے دوں گا۔ میں اس خاندان کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اگر آپ وہاں میری وکالت کرنے گئیں تو وہاں آپ کی اتنی توہین ہوگی کہ میں برداشت نہیں کرسکوں گا۔۔۔ آپ نہیں جانتیں وہ بے حد بے رحم لوگ ہیں۔ خود شیشے کے گھر میں رہتے ہیں لیکن دوسروں پر پتھر پھینکنے سے باز نہیں آتے کیا آپ یہ پسند کریں گی کہ آپ کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کی شکل دیکھنے سے بھی جائیں۔" اس نے امی کو بے حد زچ کیا۔ آخر میں امی نے فیصلہ سنا دیا کہ پہلے وہ گھر والوں سے فاخرہ کا ذکر کرے انہیں اپنے ارادے کی پختگی کا احساس دلائے اور دیکھے کہ کیا ہوتا ہے۔

ہوا وہی جب اس نے فاخرہ سے شادی کا خیال ظاہر کیا تو گھر میں ایک طوفان اٹھا۔ وہ آ کر بتاتا کہ گھر میں اس کا بائیکاٹ ہو رہا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے اسے بتایا جاتا ہے کہ وہ ناہنجار ہے، نافرمان ہے، بڑے بھائیوں کے ہوتے ہوئے اپنی شادی کی فکر میں پڑا ہے۔ امی سے وہ کہتا۔ "خالہ جان! بڑا مزا آ رہا ہے، یوں معلوم ہوتا ہے بھونچال آ گیا ہے یا کوئی بم پھٹ گیا ہے۔ سارا گھر گتے کے مکان کی طرح لرز رہا ہے۔ فاخرہ سے شادی۔۔۔! اتنی بدشکل لڑکی سے۔ ایسی لڑکی سے جس کا گھرانا ابھی کل تک کرسچن تھا، معمولی لوگ۔ ان کے ہاں برات لے جانا بھی شان کے خلاف ہے، مگر مزے کی بات یہ ہے کہ اس طوفان کی لہریں باہر بالکل نہیں جا رہیں۔ باہر سے کوئی آئے، تو اسے ذرہ بھر بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ ابھی سارا گھر لٹھ لیے میرے اوپر پلا کھڑا تھا۔" اور وہ ٹھیک کہتا تھا، کیونکہ جب کبھی میں جاتا، اس کا گھر قطعی تامل نظر آتا۔ اس کی شادی کی کوئی بات میرے سامنے نہ کی جاتی۔ تنہائی میں وہ مجھ سے کہتا۔ "سنتے ہو، کہا جاتا ہے کہ برے لڑکوں کی صحبت نے مجھے اس

قدر آوارہ بنا دیا ہے کہ اپنے منہ سے شادی کی بات کر رہا ہوں ، ورنہ بڑے بڑے لڑکے لڑکیاں تو اس قدر معصوم ہیں کہ اس لفظ کے معنی تک نہیں جانتے۔ یار! یہ عجیب اسٹنٹ ہے۔ کئی دفعہ میں نے امی کو کہتے سنا کہ میرے بچے اس قسم کی باتوں کو سمجھتے ہی نہیں۔ خدا قسم دل چاہا کہوں امی کون بھلا ہے اور کس قسم کی بات نہیں سمجھتا، یہاں تو سب کے پیٹوں میں داڑھیاں ہیں۔ مگر ہوتا کیا۔ ایک دم کائیں کائیں میرے خلاف مچ جاتی اور پیٹوں میں داڑھیوں والے واقعی معصوم بن جاتے۔

روز کی یہ رام کہانی سن کر آخر امی کا دل پسیج گیا اور انہوں نے یہ اجازت دے دی کہ امجد کا نکاح ہمارے گھر ہو جائے، مگر اس کے باہر جانے کے صرف ایک دن پہلے۔۔۔

جس دن نکاح تھا، اپنی اپنی جگہ ہم سب گھبرائے ہوئے تھے۔ امی کو اپنے سفید چونڈے کا خیال تھا۔ مجھے یہ کہ میری وجہ سے یہ سب کچھ میرے گھر میں ہو رہا ہے اور سب سے زیادہ بدلا ہوا تھا امجد۔ وہ بے حد ملگجے کپڑے پہنے صبح سے ہمارے ہاں چلا آیا تھا اور نکاح ہو جانے سے پہلے کسی طرح گھر جانے کو آمادہ نہ تھا جب کہ نکاح شام کو ہونا طے پایا تھا۔ تنہا فیصلہ کرنے والوں پر ایک وقت آتا ہے جب وہ سوچتے ہیں کہ کہیں انہوں نے غلط فیصلہ تو نہیں کیا۔

دوپہر کو وہ منہ لپیٹے میرے بستر میں پڑا رہا۔ اس کے گھر والے یہی سمجھتے رہے ہوں گے کہ باہر جانے سے پہلے کے ہزاروں کام نمٹا رہا ہے۔ سہ پہر کو میں نے زبردستی اسے بستر سے نکالا اور کپڑے بدلنے کی تاکید کی۔ تیار ہوتے وقت بھی اس کا دماغ سخت غیر حاضر تھا۔ جو موزہ اتارتا، اسے ہی دوبارہ چڑھا لیتا۔ قمیص کے بٹن کھولنے میں اسے گھنٹوں لگے اور پھر وہ بغیر قمیص اتارے اسٹول پر بیٹھ گیا اور مجھ سے بولا۔ ''جنید! ایک بات کہوں۔''

''فرماؤ۔'' میں نے مذاقاً کہا، مگر دیکھا تو اس کے چہرے پر ضرورت سے زیادہ ہی سنجیدگی تھی۔ کیا یہ آخری وقت میں نکاح سے واک آؤٹ ہوا چاہتا ہے۔ میں نے سوچا۔

''تم میرے سب سے عزیز دوست ہو۔ میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ گے۔''

''میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ جو کچھ کہوں گا، سچ کہوں گا اور سچ کے سوا۔۔۔'' میں نے بات کو پھر مذاق میں اڑانے کی کوشش کی۔

''تم نائلہ کو پسند کرتے ہو؟''

''اب میری سنجیدہ ہونے کی باری تھی اور میں ایک لخت سنجیدہ ہو گیا۔ جب بھائی بہن کے بارے میں کسی سے ایسا سوال کرے، تو معاملہ گمبھیر ہوتا ہے۔ میں نے تھوڑی دیر سوچا اور کہا۔ ''ہاں۔''

''کیا تم اس سے شادی کرنا چاہو گے۔''

میں خاموش رہا۔ اس سے پہلے دن کے بعد نائلہ پھر کبھی مجھے تنہائی میں نہیں ملی تھی اور روز بروز مجھے یہ اندازہ ہوتا جا رہا تھا کہ یہ بڑا مشکل گھرانا ہے۔ ان کے گھر کی کسی لڑکی کی تمنا کرنا مشتری وشرپا پر ہاتھ ڈالنے کے برابر ہے۔ یہ ضرور ہے کہ میں کبھی کبھی اس آگ میں ہاتھ تاپنے سے باز نہ آتا جو دور تھی، مگر جس کی آنچ کبھی کبھار مجھ تک پہنچ جاتی تھی۔ وہ جب سامنے ہوتی، میں اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا۔ کیچر کا پروگرام بنتا، تو میں اسے ساتھ چلنے کی پیش کش کرتا جو ہمیشہ ٹھکرا دی جاتی۔ وہ چائے کی پیالی دیتی، تو بڑے تکلف سے کھڑے ہو کر لیتا اور اخلاق سے صوفے کی طرف اشارہ کر کے کہتا ''بیٹھیے۔'' مگر وہ مسکراتی ہوئی چلی جاتی۔ شاید یہ سب کچھ امجد بغور دیکھتا رہا ہوگا۔ لیکن وہ پہلی رات کا مردانہ سایہ ابھی تک میرے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر امجد پریشان ہو گیا۔ ''فار گٹ اٹ۔'' اس نے کہا اور ازسرنو قمیص کے بٹن کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''امجد! تم نے صاف گوئی سے کام لیا ہے، تو مجھے بھی کیا اس کی اجازت دو گے۔۔۔ میرے دل میں ایک کانٹا سا

کھٹک رہا ہے۔'' اور میں نے اس رات کی وہ سائے والی بات اسے بتادی۔

وہ خاموش رہا۔ کچھ سوچتا رہا جیسے کش مکش میں ہو۔ پھر کہنے لگا۔ ''یہ ہمارا خاندانی راز تھا۔ تمہیں اس کا کچھ اشارہ مل گیا ہے، مگر میں نائلہ کو اس میں ملوث نہیں ہونے دوں گا۔ سنو، میں تمہیں بتاتا ہوں۔ تم نے میری دوسری بہن سائرہ کو دیکھا ہے۔''

اس وقت تک میں اسے دیکھ چکا تھا۔ وہ کبھی آکر ڈرائنگ روم میں نہیں بیٹھتی تھی، لیکن آتے جاتے اس کی جھلک نظر آئی تھی۔ یہی بات میں نے امجد کو بتادی۔

''اس دن تم نے جسے دیکھا، وہ سائرہ ہوگی۔''

''مگر تمہاری جن بہن کی شادی ہوئی ہے، اس کا نام تو۔۔۔''

''ہاں، یہی تو بتا رہا ہوں۔ وہ فرخندہ باجی ہیں۔ مگر ہمارے بہنوئی صاحب کچھ اچھے کردار کے مالک نہیں ہیں اور سائرہ۔ بہت دن ہوئے کہ ہر طرح کے اخلاقی بندھن توڑ چکی ہے۔ جب وہ انگلینڈ میں تھی، تو اس نے ایک غیر ملکی سے شادی کی اور پھر اسے بھی چھوڑ کر چلی آئی۔ وہ کہتی ہے کہ وہ فری لو کی قائل ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم نے اس دن جسے دیکھا، وہ سائرہ تھی، کیونکہ وہ ہمارے ساتھ کہیں نہیں جاتی۔ اس کے آنے جانے، کھانے پینے، ہر کام کے اوقات الگ ہیں۔ نوکری کرنے کی وجہ سے وہ یوں بھی زیادہ وقت باہر ہی رہتی ہے۔ اس دن وہ کہیں گئی ہوئی تھی یا گھر میں تھی، مجھے کچھ معلوم نہیں، مگر یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ نائلہ نہیں ہوگی۔ اس دن تم نے جو دو سائے دیکھے ان میں ایک ہمارے بہنوئی کا کردار تھا اور دوسرا فری لو کا تصور۔ سائرہ کے بگڑنے میں اس گھر کے ماحول کا کتنا ہاتھ ہے، یہ الگ بات ہے۔ میں تمہیں یہ بتاتا ہوں کہ اس سب کو ہمارے گھر میں برداشت کیا جاتا ہے، اس لیے کہ کسی پر بھی سختی کی گئی تو بات باہر نکل جائے گی، دنیا میں تھوتھو ہو جائے گی۔ گندگی کو ڈھانک کر رکھنا اس کو تو کہتے ہیں۔ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ایک دن تو اس کی بو نکلے گی ہی اور دور دور تک پھیلے گی۔ ممکن ہے یہ راز جاننا تمہارے حق میں بہتر ہو، کیونکہ اس راز داری کے ناتے وہ تمہیں اپنوں میں ملانا چاہیں گے تاکہ تم بھی یہ بات کسی اور کو نہ بتا سکو، مگر میں چاہتا ہوں کہ تم ہر طرح یہ اطمینان کرلو کہ وہ نائلہ نہیں تھی۔''

''ٹھیک ہے، اگر تم کہتے ہو، تو مجھے یقین ہے۔'' اتنی دیر میں سائرہ اور نائلہ کی ظاہری ہیئت اور ان کی شخصیتوں کے فرق پر غور کر کے میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ امجد غلط نہیں کہہ رہا۔

''دونوں میری بہنیں ہیں اور مجھے کسی سے کوئی پرخاش نہیں ہے۔ نائلہ پر ابھی رنگ گہرا نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ جلد اس جیل خانے سے نکل جائے ورنہ اسے بھی غلط تصورات، غلط آئیڈیل دے کر گمراہ کر دیا جائے گا، لیکن یہ اسی صورت میں ہونا چاہیے کہ تم نائلہ کو واقعی پسند کرتے ہو۔ اس معاملے میں صاف گوئی سے کام لینا ضروری ہے۔ بی فرینک وود می۔ کیا تم سچ مچ اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔''

میں نے پھر اپنے دل سے پوچھا اور کہا۔ ''ہاں'' باوجود ان تمام باتوں کے جو میں نے تمہیں بتائی ہیں۔

''یعنی۔''

''یعنی۔ یہ کہ ہمارا گھر ایک وادی پرخار ہے۔ جو باہر سے جیسا پرسکون نظر آتا ہے اندر سے ویسا نہیں ہے۔ قدم قدم پر اختلافات ہیں، کدورتیں ہیں۔ یہ صفائی ستھرائی جو تمہیں نظر آتی ہے صرف اوپری ہے۔ یہ وکٹورین مارلز جن کا ذکر تم نے ہمارے ڈرائنگ روم میں اکثر سنا ہوگا محض دکھاوا ہے۔ جیسے وکٹورین عہد کے لوگ صرف اوپری شرافت کے قائل تھے اور حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کیے رکھتے تھے۔ اگر تم نائلہ سے شادی کرو، تو میں تمہیں رائے دوں گا کہ تم اس شہر سے دور کہیں رہو اور نائلہ کو کم سے کم اس گھر میں آنے کی اجازت دو۔''

''مگر اس میں صرف میری ہی پسند تو نہیں،

اوروں کی پسند اور ان کی مرضی بھی تو ہوگی۔ خود نائلہ کی۔ تمہارے والدین کی۔ اور دوسروں کی۔'' میں نے کہا۔

''وہ تو ہوگی ہی اور بھی بہت کچھ ہوگا۔'' وہ آئینے کے سامنے ٹائی باندھتے ہوئے بولا۔ ''مگر تمہیں بہت نرم رہنا ہوگا۔ یاد رکھنا میں تمہارے ساتھ ہوں گا اور تمہیں گائڈ بھی کروں گا۔ ایک دفعہ شادی کی بات طے ہوجائے تو پھر تم سخت ہو سکتے ہو۔ تم ہم لوگوں کی کوئی شرط نہیں مانو گے، ہمارے ہاں گھر دامادی کا جو سلسلہ چل نکلا ہے تمہیں اس کو بھی توڑنا ہے اور ہماری انا کو بھی۔۔۔ سمجھے۔ یہ بہت ضروری ہے۔ لیکن یہ سب ابھی نہیں ہوسکتا۔ قلعے میں پہلے دراڑ تو مجھے ہی ڈالنی ہے۔ سمجھو کہ آج قلعے کے محاصرے کا پہلا دن ہے۔ جس دن میری شادی کا اعلان ہوگا، اس دن قلعے میں پہلی دراڑ پڑے گی۔'' رفتہ رفتہ اس کا موڈ بہتر ہوگیا۔

''دیکھو، جب فاخرہ میرے پاس پہنچ جائے گی، تو میں اس کی اور اپنی ایک مشترکہ تصویر تمہیں بھیجوں گا۔ اس وقت تم میرے گھر جا کر اس شادی کا اعلان کرنا اور تماشا دیکھنا۔''

دروازے پر دستک ہوئی۔ امی نے بتایا فاخرہ اور اس کی امی آگئی ہیں۔ بظاہر وہ دونوں ملاقات کے لیے آئی تھیں۔ فاخرہ بالکل سادہ کپڑوں میں تھی۔ آج وہ بھی پھٹے بانس کی طرح بننے کے بجائے سوکھی ترئی کا سا منہ لیے پھر رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہمارے دو مشترکہ دوست مولوی صاحب کو لے کر آگئے اور یہ رسم بڑی سادگی سے ادا ہوگئی۔ امی نے چائے میں تھوڑا تکلف کیا۔ جلد ہی فاخرہ اور اس کی امی رخصت ہوئیں۔ مولوی صاحب اور دوست سدھارے اور پھر امجد بھی اپنے گھر چلا گیا۔

قلعے کا محاصرہ تو ہوگیا تھا، مگر مجھے قلعے میں پہلا شگاف ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ امجد نے یہی کہا تھا کہ اپنی شادی کا طوفان گزر جانے کے بعد وہ یہ معاملہ اٹھائے گا۔

دوسرے دن ایئرپورٹ پر میں جان بوجھ کر امی کو لے کر گیا۔ فاخرہ بھی آئی ہوئی تھی۔ امجد کے دوسرے دوست بھی، مگر امجد کے گھر والوں نے کسی کو پلٹ کر نہ دیکھا۔ انہیں اپنے چونچلوں سے اتنی فرصت ہی نہ تھی، سب امجد پر جان نچھاور کررہے تھے، بلائیں لیتے لیتے نانی کی انگلیاں ٹوٹی جارہی تھیں۔ ماں اور خالاؤں نے اس کا ماتھا چوم چوم کر سرخ کردیا تھا۔ بہنیں الگ گلے کا ہار بنی ہوئی تھیں۔ اس کے دونوں بازوؤں پر یہاں سے وہاں تک بندھے ہوئے امام ضامن کسی مزار پر لگے ہوئے رنگیں جھنڈوں کا سماں پیش کررہے تھے۔

اسے ڈھنگ سے اپنے دوستوں کو اللہ حافظ کہنے کا وقت بھی نہ ملا اور فاخرہ سے تو شاید آنکھوں آنکھوں ہی میں گفتگو ہوئی ہو۔ ہم سے ہو کر جہاز تک پہنچتے پہنچتے اس کے گھر والوں میں سے اکثر کو غشی کے دورے پڑ چکے تھے۔ کئی ایک کو طبی امداد پہنچائی گئی۔ جس وقت جہاز اڑا، سب دل پکڑے نڈھال پڑے تھے۔ بمشکل سب کو کاروں تک پہنچایا گیا۔ دیکھنے والوں کو یہی اندازہ ہورہا تھا کہ یہ پورا کنبہ اب امجد کی جدائی کی تاب نہ لاکر سیدھا قبرستان کا رخ کرے گا۔

میں چاہتا تھا امی ایک نظر نائلہ کو دیکھ لیں، مگر شروع میں ان کی دکھائی اور بعد میں اس ٹریجک سین نے اس کی اجازت نہ دی۔ گھر آکر جو پہلی بات امی نے کی وہ یہ تھی، خدا بچائے ایسے نخرے پیٹے لوگوں سے۔ امجد ٹھیک کہتا تھا۔ مگر میں تو کہوں گی اس نے اچھا نہیں کیا۔ فاخرہ کبھی ایسے گھر میں خوش نہیں رہ سکتی۔

مجھے محسوس ہوا جیسے قلعے کا محاصرہ کمزور پڑ رہا ہو۔

امجد چلا گیا، تو میں نے اس کے گھر جانے کے بہت سے بہانے سوچے، مگر کوئی بھی دل کو نہ ٹھکا، یا میں اتنا بزدل تھا کہ امجد کی غیر حاضری میں اس وادی پرخار میں جانے سے گھبراتا تھا۔ بار بار یاد آتا اس

نے کہا تھا وہ بہت بے رحم لوگ ہیں۔ خود شیشے کے گھر میں رہتے ہیں، مگر دوسروں پر پتھر پھینکنے سے باز نہیں آتے۔ پھر میں نے وہاں جانے کا خیال چھوڑ دیا، یہ دیکھنے کے لیے کہ اگر میری شادی نائلہ سے نہ ہو سکی جس کا امکان بہت کم تھا، تو میں اس کی جدائی میں مر تو نہ جاؤں گا۔ میں مرا تو قطعی نہیں، مگر کبھی دل میں ایک کسک سی ضرور اٹھتی اور یوں بھی ہوتا کہ میں خود کو عین اس حالت میں پکڑ لیتا۔ جب غیر شعوری طور پر کسی بہانے وہاں جانے کا منصوبہ بنا رہا ہوتا۔

کبھی کبھی میں فاخرہ کے ہاں چلا جاتا اور کبھی بھولے بھٹکے وہ بھی ٹپک پڑتی۔ معلوم ہوتا امجد کے خط برابر اس کے پاس آ رہے ہیں۔ وہ ہر طرح ہشاش بشاش ہے اور جلد ہی اسے بلانے والا ہے۔ میرے پاس بھی اس کے خط آتے جس میں وہ برابر اطلاع دیتا کہ اتنی دور سے بھی اس کی فاخرہ سے شادی کی درخواست بڑی بے دردی سے ٹھکرائی جا رہی ہے اور گھر والوں میں کسی قسم کی کوئی لچک پیدا ہونے کا امکان نظر نہیں آتا۔

ادھر میں ایک اور کٹھن دور سے گزر رہا تھا۔

جب آنکھ کھول کر آپ نے چاروں طرف آپا دھاپی دیکھی ہو جب آپ کے بزرگ بھی ساری پرانی قدروں کو بالائے طاق رکھ کر کاراور کوٹھیوں کی راہ پر چل نکلے ہوں اور نفس امارہ کو مارنے کے بجائے دولت کے جن کو رام کرنے کا مشورہ دینے لگے ہوں، جب تعلیم کا مقصد محض نوکری ہو اور ہر بچہ اچھی سی نوکری کو زندگی کی معراج سمجھتا ہو، اس وقت چار سال انجینئرنگ کالج میں جھک مارنے، فیسوں، موٹی موٹی کتابوں پر روپیہ پھینکنے کے بعد آپ کو بہت بھاگ دوڑ اور سفارشوں سے پریس میں ایک معمولی سی ملازمت ملے جس کا آپ کی تعلیم سے کوئی واسطہ نہ ہو تو آپ کی ذہنی کیفیت کیا ہو گی۔۔۔ اور جب آپ کے ذہن پر یہ بوجھ بھی ہو کہ آپ کو جہاں رشتہ کرنا ہے، وہ آپ سے زیادہ امیر لوگ ہیں اور جہاں ظاہری معیار خواہ شرافت ہی کیوں نہ ہو، اصل معیار وہی ہے جو ہر جگہ ہے اور پھر آپ کے کندھوں پر اس گھرانے کی روایات توڑنے اور ان کی انا کو کچلنے کا بھاری کام بھی ہو۔ بڑی ہمت سے میں اپنے کندھے سیدھے کرتا اور کہتا دنیا میں دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ زندگی کی اعلا قدریں بھی تو ہیں۔ مثلاً سچائی، ایمانداری، سمپل لونگ اینڈ ہائی۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر فقر دل کے غنا کا نام ہے۔ فقر کی منزلیں بے کاری کے ہاتھوں طے نہیں ہوتیں۔ ایسی بے کاری جس کے ساتھ رنج رائیگاں اور دولت کے زیاں کا احساس ہو، جس کے ساتھ دوستوں، رشتہ داروں اور پڑوسیوں کی دل جلانے والی ہمدردیاں ہوں، صرف احساس کمتری ہی دے سکتا ہے، چنانچہ میں بھی احساس کمتری کا شکار ہوتا گیا۔ ایک صبح جا کر جب رات گئے ایک ایسے کام سے واپس آتا جس میں میرا دل قطعی نہیں لگتا تھا، تو مجھے اپنے جسم کے ساتھ ذہن بھی کچلا ہوا محسوس ہوتا۔ لیونارڈو ڈاونچی اور مائیکل انجلو دیواروں پر سے میرے اوپر ہنستے مانے، مونے اور پکاسو کی نقلیں گرد کے پردے میں سے میرا منہ چڑاتی نظر آتیں۔

اس احساس کمتری کے ہاتھوں امجد کے ہاں جانا اور بھی دوبھر ہو گیا اور میں نے بھی دوسرے لڑکوں کی طرح ملک سے باہر جانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے۔

آخر ایک دن امجد نے فاخرہ کو بلوا بھیجا۔ فاخرہ کے جانے کے سلسلے میں جو بہت سے کام تھے، ان میں بھی میں نے مدد کی۔ اس کے جانے کے کوئی پندرہ دن بعد امجد کا خط اور دونوں کی تصویر آئی۔ اس میں ایک چھوٹا سا خط اس کی امی کے نام تھا جس میں اس نے اپنی شادی کی اطلاع دی تھی۔ انہیں تاثر یہی دیا تھا کہ شادی پردیس میں ہوئی ہے۔ امجد کا اصرار تھا کہ یہ خط میں خود لے کر جاؤں۔

میں گیا۔ ایسی خبر لے کر جانے پر میں قدرتی طور پر گھبرایا ہوا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ خبر سب سے پہلے کس کو اور کیسے سناؤں۔ دل ہی دل میں

مختلف منصوبے بناتا اور انہیں رد کرتا میں امجد کے ہاں پہنچا۔ ایسے موقعوں پر ایک ذرا سی بات پر سارے منصوبے دھرے رہ جاتے ہیں۔ میری بدقسمتی کہ اس وقت کوئی بزرگ رشتے دار اٹھ کر جا رہے تھے اور گھر کے بہت سے لوگ انہیں گیٹ تک چھوڑنے آئے تھے۔ مجھے دیکھ کر سب کو تعجب سا ہوا۔ اب چونکہ امجد نہیں تھا اور اس کے جانے کے بعد میں پہلی مرتبہ آیا تھا، تو شاید انہیں کچھ تجسس بھی تھا یا ہو سکتا ہے کہ ان کے حساس ذہنوں نے میرے چہرے کے تاثر سے کچھ تاڑ لیا ہو۔ ان کے چہرے پر خاموش تجسس تھا۔ ادھر گھبراہٹ میں میرے منہ سے وہی بات نکلی جو میں نہیں کہنا چاہتا تھا یعنی میں ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔ شاید غیر شعوری طور پر میں اپنے آنے کی صفائی پیش کرنا چاہتا تھا چنانچہ وہ سب میرے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ صرف امجد کے والد اپنے ایک بھتیجے کے ساتھ جو ابھی آیا تھا، باتیں کرتے اندر چلے گئے۔

صوفوں پر بیٹھنے کے بعد جب کسی نے کوئی بات شروع نہ کی جیسے وہ مجھ ہی سے کچھ سننا چاہتے ہوں، تو جھجکتے ہوئے میں نے کہا امجد کا خط آیا ہے۔ اس نے۔۔۔ لکھتا ہے کہ میں۔۔۔ آپ لوگوں کو اطلاع دے دوں کہ اس نے فاخرہ سے شادی کر لی ہے۔ اور یہ کہتے کہتے ثبوت کے طور پر میں نے امجد کا خط اور تصویر بڑھائی۔ تصویر کو کس کس نے دیکھا مجھے نہیں معلوم، لیکن میرے ہاتھ سے کسی نے نہ لی۔ بس ایک دم ایک کہرام سا مچا جیسے واقعی زلزلہ آ گیا ہو۔ کچھ چیاؤں چیاؤں ہوئی۔ کچھ سسکیاں سنائی دیں۔ یک لخت کچھ عجیب سی چیخیں۔ لمحہ بھر میں امجد کی امی قالین پر پڑی تھیں اور چاروں طرف آہ و بکا اور نالوں کی سی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ایک دم بھگدڑ سی مچی۔ کوئی چلایا۔ پانی۔۔۔ کوئی پکارا۔ عرق گلاب۔۔۔ کسی نے کہا۔ ڈاکٹر۔۔۔ کسی نے کہا ٹیلی فون۔۔۔ کچھ لوگ باہر بھاگے۔ کچھ امجد کی امی پر جھکے رہے۔ یکا یک میں نے امجد کی نانی کو ننگے پاؤں، ننگے سر باہر کی طرف بھاگتے دیکھا۔ وہ بین کرنے کے انداز میں چلا رہی تھیں۔ ''ہائے آخر میری بیٹی کو مار ڈالا اس لڑکے نے۔ ختم ہو گئی وہ۔ مجھے معلوم تھا یہ ہی ہو گا۔ ہائے کیا بری خبر لے کر منحوس صورت گھر میں گھسا تھا۔ خدا اس سے سمجھے۔'' آخری جملہ میری شان میں کہا گیا تھا۔ میں سن ہو گیا۔

پھر کچھ اور بھگدڑ مچی۔ سب ایک دوسرے کے کمرے کی طرف بھاگنے لگے۔ پھر کسی نے ڈاکٹر کو فون کرنے کی کوشش کی۔ ایک بھائی بھاگتا ہوا باہر گیا۔ اس نے کار نکالی۔ اس وقت میں بھی ہوش میں آیا۔ بغیر کچھ کہے سنے اٹھا۔ بھاگتا ہوا دروازہ کھول کر کار میں بیٹھ گیا۔

جب تک ہم ڈاکٹر کو لے کر آئے مجھے اصل قصہ معلوم نہ تھا۔ ڈاکٹر کو سیدھا ایک بیڈ روم میں لے جایا گیا۔ میں صحن میں کھڑا رہ گیا۔ بہت سے لوگ ایک دوسرے سے لپٹے چمٹے کھڑے رہے تھے کوئی ستون سے لگا رو رہا تھا۔ کوئی پیشانی کوٹ رہا تھا۔ کوئی سینے پر دوہتڑ مار رہا تھا۔ کچھ عجیب عالم تھا۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب ہوتی جا رہی تھیں۔

جس وقت ڈاکٹر سر ہلاتا ہوا باہر نکلا اور ایک دم شور پہلے سے زیادہ ہوا جس میں ''ہائے ابا۔ ہائے ابا'' کی صدائیں بلند تر تھیں، تو یکا یک مجھ پر انکشاف ہوا کہ امجد کے والد کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔

مجھے اپنے اوپر بے حد غصہ آیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے میں خونی اور قاتل ہوں اور ان رونے والوں میں سے کوئی میرا گلا دبا دے، تو قطعی غلط نہ ہو گا۔ ایک نظر میں نے نائلہ پر ڈالی جو غم سے بے حال بستر پر اوندھی پڑی تھی۔ اپنے آپ کو اس روح فرسا احساسِ جرم سے بچانے کے لیے میں چپکے سے باہر نکلا۔

لوگ جوق در جوق اسی گھر کی طرف آ رہے تھے۔ محلے دار اور رشتے دار۔ چند لوگ ٹولیوں میں باہر کھڑے تھے۔ ایک جگہ میں نے مرحوم کے اس بھتیجے کو کھڑے دیکھا جو آخری وقت میں ان کے پاس

تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''بیٹے کی شادی کی خبر تو ان بے چارے کے کانوں تک پہنچی ہی نہیں۔ انہوں نے تو صرف اتنا سنا کہ بیوی ختم ہوگئی۔ رونا چلانا اور چیخنا پیٹنا تو ہو ہی رہا تھا انہیں یقین آ گیا اور وہ جیسے بیٹھے تھے ویسے ہی دل پکڑ کر گر پڑے۔ ان کے گرنے کی خبر سنتے ہی بیوی جھٹ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ مگر وہ ختم ہو چکے تھے۔''

''ہائے ہائے۔۔۔ اس عمر میں بھی ایسا عشق تھا بیوی سے۔ اس کے بعد وہ جینے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔'' یہ صاحب غالباً مرحوم کے رشتے کے بھائی تھے۔

والد کے انتقال کی اطلاع میں نے امجد کو دی۔ امجد اور فاخرہ آئے مگر ان کو اس گھر میں گھسنے کی اجازت نہ ملی۔ بیس دن وہ اپنی سسرال میں رہا، مگر اس کی ماں اور نانی جن کے دل چڑیا کے تھے ذرا نہ پگھلیں۔ بہن بھائی جن کے جگرے کبوتر کے تھے، کوئی اسے دیکھنے نہ آیا اور جتنی مرتبہ بھی وہ تنہا یا فاخرہ کے ساتھ گھر گیا اسے گھر کے دروازے بند ملے اور نوکر سے ایک ہی جواب۔ ''آپ کو اندر آنے کی اجازت نہیں۔''

جس دن وہ واپس گیا، جہاز پر اسے اور فاخرہ کو چھوڑنے صرف میں گیا اور فاخرہ کی امی۔ فسی (fussy) فیملی میں سے کوئی وہاں نہ تھا اور آج تک اس گھرانے میں امجد کا شمار باپ کے قاتلوں میں ہے، حالانکہ سب جانتے ہیں کہ امجد کی شادی کی خبر واقعی ان کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔

امجد کے بعد کوئی بھی تو نہیں جو انہیں یہ بتائے کہ انہیں امجد نے نہیں آپ لوگوں کے بے انتہا۔۔۔ نے مارا ہے۔

قلعے میں شگاف کیا پڑا، سارا قلعہ ہی اڑا اڑا دھم کر کے زمین پر آ رہا جس کے نیچے امجد اور فاخرہ تو دبے ہی، میری تمام آرزوئیں بھی کچلی گئیں۔ میں ہی تو وہ قدم تھا جس نے قلعے کے فیتے کو آگ لگائی تھی۔

ہنسی علاج غم ہے

استاد (شاگرد سے)۔ ''دنیا میں شرح اموات کیا ہیں؟''

شاگرد: ''سو فیصد۔''

استاد: ''وہ کیسے؟''

شاگرد: ''اس لیے کہ جو یہاں پیدا ہوتا ہے ایک دن مرتا ضرور ہے۔''

☆☆☆

باپ (اپنے بیٹے سے): ''تم باقاعدہ اسکول جایا کرو ورنہ تمہیں بھی جمعدار کی طرح کوڑے کی ٹوکری اٹھانا پڑے گی۔''

ایک دن اتفاق سے ان کے ہاں جمعدار کوڑے اٹھانے نہ آیا تو باپ نے کہا۔ ''نہ جانے آج جمعدار کیوں نہیں آیا۔''

بیٹا فوراً بولا: ''ابا جان اسکول گیا ہوگا' شاید اس نے آپ کی بات سن لی ہے۔''

☆☆☆

امریکا کا ایک جج اپنے دوستوں کو اپنا ایک واقعہ سنا رہا تھا اس نے بتایا۔

''ایک مرتبہ میں سڑک پر چلا جا رہا تھا کہ ایک نوجوان مجھ سے ٹکرا گیا۔ جب وہ آگے نکل گیا تو میں نے اپنی جیب ٹٹولی تو میرا پرس غائب تھا۔ میں اس کے پیچھے لپکا اور اسے جا پکڑا۔

میں نے غرا کر کہا۔ ''پرس نکالو شیطان کے بچے۔''

نوجوان نے فوراً پرس نکال کر دے دیا اور خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلا۔

جب میں گھر پہنچا تو دیکھا کہ میرا پرس تو میری میز پر ہی رہ گیا تھا۔

بیوی پرست

روشن آرا

"ہماری بیویاں جیون ساتھی ہیں۔ ہماری محبت اور دکھ درد کی ساتھی ہیں۔ ہم نے ان کی ہر بات مان کر اس پر عمل کرلیا تو اس میں بے عزتی اور ہتک کی کیا بات ہے۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ اس طرح ہماری ازدواجی زندگی پر خوش گوار اثرات مرتب ہوں گے....."

تین دوستوں کی مختصر مگر دلچسپ کہانی

موہن، بھوپت اور رام لعل بار کے ایک کونے میں بیٹھے کسی موضوع پر زور و شور سے گفتگو کررہے تھے۔ اس وقت رات کے ایک بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ یہ صرف آج ہی نہیں بیٹھے تھے بلکہ برسوں سے ان کا روز کا معمول تھا۔ بار کے منیجر نے ان کے لیے یہ میز مخصوص کی ہوئی تھی۔ وہ نو بجے بار میں داخل ہوتے اور رات ایک بجے تک بیٹھے رہتے۔ پینے پلانے کا دور چلتا۔ وہ مختلف موضوعات پر بحث کرتے۔ بڑے جذباتی اور سنجیدہ ہوجاتے۔ بعض اوقات آپس میں بچوں کی طرح لڑنے لگتے لیکن کبھی کبھار چھوٹی موٹی شرطیں بھی لگاتے۔ اس کے باوجود ان کی دوستی اور اس معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

لیکن آج صورت حال یکسر مختلف تھی۔ ان سب

پر سنجیدگی سی طاری تھی۔ وہ کسی نازک، اہم اور پیچیدہ مسئلے پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ پھر وہ گفتگو میں اتنے محو ہوئے کہ انہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ دو بج گئے، انہیں اس وقت کسی بات کی پروا تھی اور نہ گھر جانے کی فکر تھی۔ وہ آج ایک فیصلے اور نتیجے پر پہنچ کر اٹھنا چاہتے تھے۔

آج وہ تینوں اپنی ازدواجی زندگی کے ان ناآسودہ پہلوؤں پر روشنی ڈال رہے تھے جنہوں نے ان کی زندگی میں تلخیاں گھول دی تھیں۔ ان کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی تھی جس سے وہ بہت پریشان اور متفکر ہو گئے تھے۔ اس کا حل تلاش کرنا چاہتے تھے۔

''دوستو!'' بھوپت نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''ہمارے روزانہ کے اس معمول سے ہماری بیویاں بے زار اور تنگ آ چکی ہیں۔ وہ بہت نالاں بھی ہیں جس کی وجہ سے اس سلسلے میں ہماری اپنی بیویوں سے روزانہ ہی لڑائی ہوتی جا رہی ہے۔ آخر یہ سلسلہ کب تک اس طرح چلتا رہے گا۔ ہمیں اس کے مداوے کے لیے سنجیدگی سے کچھ سوچنا چاہیے۔ جتنا جلد ہو سکے اس مسئلے کا حل تلاش کرنا چاہیے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سدا کے لیے ہم سے روٹھ کر اور ہمیں چھوڑ کر چلی جائیں۔''

''ہاں...... مجھے تمہاری بات سے اتفاق ہے'' موہن نے کہا۔

''اگر ہماری بیویاں روٹھ کر سدا کیا کچھ دنوں کے لیے میکے چلی گئیں تو بہت برا ہو گا۔ یہ بہت بے چین اور حیران ہیں۔ ان سے ایک دن ایک رات کی جدائی ہی ناقابل برداشت ہو گی۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو'' رام لال نے سر ہلایا۔ ''میں تو ایک رات بھی اپنی بیوی کے بغیر سو نہیں سکتا۔ جب کبھی وہ دو ایک دن کے لیے میکے چلی جاتی ہے تو میں راتوں کو انگاروں پر لوٹنے لگتا ہوں۔ جب تک وہ پاس نہ ہو۔ نیند نہیں آتی۔''

''ایک تمہارا ہی نہیں ہم سب کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔'' بھوپت نے کہا۔

''اب میری بیوی دو تین دن سے دوسرے کمرے میں سونے لگی ہے۔ اندر سے دروازہ بند کر لیتی ہے۔ جب میں اس کے پاس جاتا ہوں تو مجھے بری طرح جھنک دیتی ہے۔''

''کل رات میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا بتاؤں؟'' موہن نے کہا۔

''جب میں کل گھر میں داخل ہوا تو وہ اس وقت ٹی وی پر میرے انتظار میں ایک انگریزی جذباتی فلم دیکھ رہی تھی۔ اس وقت ایک ایسا منظر دکھایا جا رہا تھا جس نے میرے جذبات میں ہل چل مچا دی۔ جب وہ ٹی وی آف کر کے اٹھی تو میں نے اسے دبوچ لیا۔ میں نے پروا نہیں کی اور میں فاتح بن کر رہا۔ جس پر اس نے مجھ سے کہا کہ...... تم ہوس پرست ہو۔ تمہیں مجھ سے نہیں صرف میرے جسم سے غرض ہے۔''

''یہ صورت حال بڑی تشویش ناک ہے۔'' رام لعل نے کہا۔

''میرے ساتھ بھی ایک دو مرتبہ ایسا ہو چکا ہے۔''

''میری بیوی کہتی ہے کہ میں تمہاری بیوی ہوں، کوئی طوائف نہیں ہوں۔ جب دل چاہا دل بہلانا شروع کر دیا۔'' بھوپت نے کہا۔

''میرے ذہن میں ایک تدبیر آ رہی ہے۔'' موہن نے کہا۔ ''اس پر عمل کر کے ہم اپنی بیویوں کے دل موم کر سکتے ہیں۔''

''وہ کیا......؟'' رام لعل نے اشتیاق آمیز لہجے میں دریافت کیا۔

''کیا یہ قابل عمل بھی ہے کہ نہیں؟''

''قابل عمل کیوں نہیں ہے۔'' موہن نے جواب دیا۔

''ہم آج ایسا کرتے ہیں کہ جب رات گئے گھر میں داخل ہوں گے تو ہماری بیویاں کچھ بھی کہیں گی ہم اس کی تعمیل کریں۔ ان کے حکم کی بالکل بھی سرتابی نہ کریں۔''

"تم چاہتے ہو کہ ہم جورو کے غلام بن جائیں.....؟" رام لعل نے تیز لہجے میں کہا۔

"میرے دوست اس میں جورو کا غلام بننے والی کیا بات ہے؟" موہن نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"ہماری بیویاں جیون ساتھی ہیں۔ ہماری محبت اور دکھ درد کی ساتھی ہیں۔ ہم نے ان کی ہر بات مان کر اس پر عمل کرلیا تو اس میں بے عزتی اور ہتک کی کیا بات ہے۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ اس طرح ہماری ازدواجی زندگی ہر خوش گوار اثرات مرتب ہوں گے اور پھر ان کی محبت خود سپردگی اور وہی نہ سہی شادی کے ابتدائی دنوں جیسی شدت پیدا ہوجائے گی۔"

"مجھے تمہاری اس بات سے سو فیصد اتفاق ہے۔" بھوپت نے خوش کن لہجے میں کہا۔

"بلکہ میں بھگوان کی سوگند کھا کر یہ عہد کرنا چاہیے کہ آج سے ہم بھی رات گئے گھر میں داخل ہوں تو ہماری بیویاں جو کچھ کہیں گی ہم اس پر عمل کریں گے۔"

"تمہاری یہ تجویز میری کھوپڑی میں آرہی ہے۔" رام لعل نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔

پھر ان تینوں دوستوں نے بار سے روانہ ہونے سے پہلے بھگوان اور بارہ کروڑ دیوتاؤں کی سوگند کھا کر یہ عہد کیا کہ آج سے وہ اس بات کو معمول بنالیں گے کہ جب وہ رات گئے اپنے گھر میں داخل ہوں گے تو اس وقت ان کی بیویاں جو کچھ بھی کہیں گی وہ اس پر آنکھیں بند کرکے عمل کریں گے۔ سرتابی نہیں کریں گے۔

اگلے روز موہن اور رام لعل حسب معمول مقررہ وقت پر پہنچ گئے تھے وہ بہت خوش اور سرشار تھے جیسے انہوں نے اس تدبیر پر عمل کرکے اپنی بیویوں کا دل جیت لیا ہے۔ بھوپت ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ وہ اس کی موجودگی میں اپنی رپورٹ سنانا چاہتے تھے۔ وہ دونوں بے چینی سے اس کا انتظار کررہے تھے اور اور ان کی نگاہیں بار بار داخلی دروازے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ وہ کل رات کی روداد سنانے کے لیے سخت بے چین تھے۔ ان کا یہ انتظار جلد ہی ختم ہوگیا۔

بھوپت بڑے پراسرار اور محتاط انداز سے بار میں داخل ہوا۔ وہ ادھر ادھر اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کسی بات سے سخت پریشانی اور متفکر ہو۔ اس نے اپنے اوور کوٹ کے کالر اس طرح سے اونچے کرلیے تھے کہ جیسے چہرہ چھپا رہا ہو۔

"بھوپت! کیا بات ہے۔" موہن بولا۔ "تم نے یہاں پہنچنے میں آدھے گھنٹے کی تاخیر کردی؟"

"کوئی بات ہے" بھوپت نے کہا۔ "تم لوگ انہیں اپنی بپتا سناؤ۔ پھر میں سناتا ہوں۔"

"سب سے پہلے میں اپنی رپورٹ پیش کروں گا۔" رام لعل نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"کل رات جب میں جیسے ہی انٹرلاک کھول کر گھر میں داخل ہوا تو برآمدے میں ایک کرسی سے ٹکرا گیا۔ اس وقت وہاں نیم اندھیرا تھا کرسی پر ٹین کا ایک خالی ڈبا رکھا ہوا تھا جو ننگے فرش پر گر گیا۔ اس کے شور سے میری بیوی بیدار ہوگئی۔ اس وقت وہ لحاف میں دبکی بڑی گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ کمرے سے برآمدے میں آئی اور اس نے لائٹ آن کی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ برافروختہ ہوگئی۔

"تمہارا انتظار کرتے کرتے ابھی تو میری آنکھ لگی تھی' اب اس طرح شور کرکے سارے محلے کو جگادو۔"

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوا تو موہن نے پوچھا۔ "پھر تم نے کیا کیا.....؟ کیا بیوی سے معافی مانگی؟"

"کرتا کیا ..... بیوی کی بات ماننا بھی بہت ضروری تھا۔ کیونکہ ہم نے سوگند کھائی تھی۔ میں نے ڈنڈا اٹھایا اور باہر نکل کر بجلی کے کھمبے کو زور زور سے پیٹنا شروع کردیا۔ محلے کے ہر گھر کی بتیاں جل اٹھی اور کھڑکیاں کھلنے لگیں۔ اس نے بدحواس ہوکر پوچھا کہ "یہ تم کیا کررہے ہو؟" میں نے اس سے کہا کہ میں تمہارے حکم کی تکمیل کررہا ہوں۔ پھر اس نے ہاتھ جوڑ کر بھگوان کا واسطہ دیا کہ میں ایسا نہ کروں۔ میں

نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور اندر آ گیا۔ کیونکہ تم لوگوں سے کیا ہوا عہد بھی نبھانا تھا۔ میری بیوی نے بھی کہا کہ میں راتوں کو اتنی دیر سے نہ آیا کروں۔ سرد راتوں میں تمہاری بڑی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس نے سہاگ کی پہلی رات کی یاد تازہ کر دی۔''

''اچھا..... اب میری بپتا سنو۔'' موہن کہنے لگا۔ ''جب میں گھر میں داخل ہوا تو میری بیوی جاگ رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا کہ تم روز رات ایک بجے گھر آ جایا کرتے تھے لیکن آج تو تم نے حد کر دی۔ جانتے ہو اس وقت کیا بجا ہے؟ اس وقت پونے تین ہو رہے ہیں۔ تمہاری سزا یہ ہے کہ یوں ہی برآمدے میں سردی میں ٹھٹھرتے رہو۔ یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔''

''پھر تم نے کیا کیا.....؟ کیا ساری رات سردی میں ٹھٹھرتے رہے؟'' بھوپت نے پوچھا۔

''میں بے چون و چرا وہیں برآمدے میں پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ منت سماجت بھی نہیں کی۔ کیونکہ میں تم دونوں سے یہ عہد کر کے گیا تھا کہ بیوی کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔ رات کسی قدر شدید سردی پڑ رہی تھی۔ برآمدے میں چونکہ سرد ہوائیں سنسنا رہی تھیں جس کے باعث سردی ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ میں چاہتا تو دروازہ پیٹ کر اسے بھی سونے نہیں دیتا۔ میں نے جان لیا کہ میں سردی سے اکڑ کر مر جاؤں گا تھوڑی دیر بعد میری بیوی کو مجھ پر رحم آ گیا۔ وہ دروازہ کھول میرے پاس آئی۔ میرا ہاتھ تھام کر بڑے پیار سے بولی کہ اندر چلو..... جب میں اندر پہنچا تو اس نے میری کسی خواہش کو رد نہیں کیا اور ہم دونوں کیف و سرور کے جہانوں میں کھو گئے۔''

''دیکھا..... میں نہ کہتا تھا کہ بیوی کی بات ماننے میں کتنا فائدہ ہے؟'' موہن نے کہا۔

''ہاں'' رام لعل نے سر ہلایا۔ ''اب اس بات سے کیا انکار کیا جا سکتا ہے۔''

''بھوپت! تم خاموش کیوں ہو؟ اپنی بپتا نہیں سناؤ گے کیا.....؟'' موہن نے اس سے کہا۔

بھوپت کی نگاہیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے اوور کوٹ کے کالر اور اونچے کر لیے اور سر کو جھکا کر ان میں اسے چھپا لیا۔ پھر اس نے سرگوشی میں نہایت آہستگی سے کہا۔

''دوستو! کیا بتاؤں..... میں عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔''

''کیسی مصیبت؟'' موہن نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا تم نے اپنی بیوی کے حکم سے سرتابی کی۔''

''نہیں..... یہ بات نہیں..... میں نے اس پر عمل کیا.....'' بھوپت نے جواب دیا۔

''اگر ایسی بات نہیں ہے تو پھر اس قدر پریشان اور ہراساں کیوں نظر آ رہے ہو؟'' رام لعل بولا۔

''جب میں گھر پہنچا تو میری بیوی ٹیٹا جاگ رہی تھی۔'' وہ کہنے لگا۔

''یہ کوئی وقت ہے اتنی دیر سے آنے کا' رات کے تین بج رہے ہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ اتفاق سے پہلی بار دیر ہوئی۔ اس نے کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ تم..... تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔ میں جانتی ہوں تم باہر عیاشی کرتے ہو..... کیا تم چاہتے ہو کہ میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں..... اس سے تو بہتر ہے کہ تم مجھے مار ڈالو..... تاکہ میری وجہ سے تمہاری روز روز کی آوارہ گردی میں کوئی فرق نہ پڑے۔ ایسے جینے سے مر جانا بہتر ہے۔ تم مجھے اس عمارت سے نیچے پھینک دو۔ میں نے لپک کر وہ دروازہ کھولا جو بالکنی میں کھلتا تھا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آ گئی۔ پھر اس نے اپنی دھان پان سی بیوی کو اٹھا کر باہر پھینک دیا..... تم لوگ جانتے ہو..... میرا فلیٹ چھٹی منزل پر ہے' دوستو! میں اس کے علاوہ کیا کر سکتا تھا کیونکہ میں نے تم سے سوگند کھائی تھی کہ اپنی بیوی کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔''

تصفیہ

عبدالقیوم شاد

قوانین اس لیے بنائے جاتے ہیں کہ حقوق وفرائض کا تعین کیا جاسکے۔ ہر تمدن اسی سے پروان چڑھتا ہے اور تحفظ کا احساس بھی اسی سے پیدا ہوتا ہے۔
ایڈورڈ ڈی ہاک کی اس بے مثل کہانی کا مرکزی خیال یہی ہے۔

ایک ایسے شخص کی کہانی جو "انصاف کا تقاضا" پورا کیا کرتا تھا

لاش چند ماہی گیروں نے دریافت کی تھی۔ اُسے لہروں نے دھکیل کر کنارے پر پہنچا دیا تھا۔ چند گھنٹوں کے اندر حکام نے اُس کی شناخت بھی کر لی تھی۔ وہ زوجیک کی لاش تھی۔ میں نے شام کے اخبار میں بڑی دلچسپی کے ساتھ اُس خبر کو پڑھا کیونکہ کسی زمانے میں زوجیک میرا بہترین دوست تھا۔ جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تو اس وقت زوجیک آرمی میں سارجنٹ تھا اور یہ ملاقات ٹھیک پندرہ سال قبل کوریا میں ہوئی تھی۔

میں اُن دنوں نوجوان اور صحت مند تھا لیکن ایک اجنبی ملک میں ہونے کی وجہ سے کسی قدر خوف زدہ بھی تھا۔ میں رات کے وقت سیول کی گلیوں میں نہیں نکلتا تھا اِس خوف سے کہ نہ جانے کب کسی تاریک گوشے سے کوئی سر پھرا نکل کر حملہ کر دے لیکن جب مضبوط اور قوی الجثہ سارجنٹ زوجیک سے دوستی ہوئی تو میری خود اعتمادی میں کئی گنا اضافہ

ہوگیا۔ زوجیک دوسرے فوجیوں سے بہت مختلف تھا۔ اُس نے کبھی اُن رنگین مزاج لڑکیوں میں دلچسپی نہیں لی تھی جو شہر کے ہوٹلوں میں اچھلتی مٹکتی نظر آتی تھیں۔

''سنو کارپول!'' ایک روز اُس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اُس وقت ہم شہر کے ایک بہترین ہوٹل میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔

''یہ جو رنگ برنگی لڑکیاں تتلیوں کی طرح تھرکتی پھر رہی ہیں اِن سے دُور ہی رہنا۔ یہ اوپر سے جتنی خوب صورت ہیں، اندر سے اُتنی ہی بھیانک ہیں۔ ہم یہاں جنگ کرنے آئے ہیں تاکہ انصاف کی بالادستی حاصل ہو۔ ہمارا مقصد جنگ اور انصاف ہے۔ مظلوموں کی مدد اور ظالموں کا مقابلہ!''

''تم کسی مذہبی رہنما کی طرح باتیں کرتے ہو سارجنٹ!'' میں نے کہا۔ ''سچ پوچھو تو بیشتر فوجی اِس جنگ سے خوش نہیں ہیں کیونکہ اُنہیں زبردستی اِس جنگ میں دھکیلا گیا ہے۔''

''انصاف اور امن!'' اُس نے کہا۔ ''ہم یہاں انصاف اور امن قائم کرنے آئے ہیں۔ جب تک انصاف اور امن قائم نہیں ہوگا ہم واپس نہیں جائیں گے۔''

''واپس جانے کے بعد تمہارا کیا پروگرام ہے؟''

''واپس جانے کے بعد میں دولت کمانا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آج کل سب سے زیادہ دولت پُرانی کاروں کے کاروبار میں ہے۔''

''بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جنگ طوّل پکڑ جائے گی۔ تمہارا کیا خیال ہے سارجنٹ؟''

وہ سگار کا دھواں اُڑاتا ہوا بولا۔ ''فرض بہرحال فرض ہے۔ جنگ کو جب تک میری ضرورت ہے میں واپس نہیں جاؤں گا۔''

اِس گفتگو کے ٹھیک دو ہفتے بعد ہم ایک ساتھ میدانِ جنگ میں لڑ رہے تھے۔ جس علاقے میں ہمیں پیش قدمی کا حکم ملا تھا وہ ایک پہاڑی علاقہ تھا جہاں تھوڑے فاصلے پر کھیت اور ویران فارم ہاؤس دیکھے جاسکتے تھے۔ ہماری پیش قدمی سے تھوڑی دیر پہلے بمبار طیاروں نے اُس علاقے میں زبردست تباہی مچائی تھی۔ بیشتر فارم ہاؤس کی چھتیں تباہ ہوچکی تھیں۔ مارٹر توپیں ہمیں گور کیے ہوئے تھیں اور ہم دشمن کے بچے کچے سپاہیوں کا صفایا کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ دوپہر کے قریب ہم ایک ویران اور تباہ شُدہ فارم ہاؤس کے قریب پہنچے۔ موسم گرم تھا اور چاروں طرف چمک دار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہمارے ساتھیوں نے فارم ہاؤس کی چھان بین کرکے رپورٹ دی کہ وہاں دشمن کا کوئی سپاہی نہیں تھا۔

تقریباً گھنٹے بھر بعد ہمیں ایک گڑھے میں چھپا ہوا ایک شخص نظر آیا۔ ایک فوجی نے اُسے گھسیٹ کر گڑھے سے نکال لیا۔ وہ ایک کمزور اور بوڑھا شخص معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور کپڑے خستہ و خراب تھے۔ لباس سے وہ کوئی کسان معلوم ہوتا تھا۔ بظاہر وہ خاصا بے ضرر اور مظلوم نظر آتا تھا۔ ہم اُسے فارم ہاؤس میں لے آئے۔ وہاں دیوار کے ساتھ کسی سپاہی کی رائفل رکھی ہوئی تھی۔ ہمارا قیدی برقی سرعت سے آگے بڑھا، رائفل اٹھائی اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایک سپاہی کو بھون کے رکھ دیا۔ میں جلدی سے آگے بڑھا اور رائفل کا کُندا مار کر اُسے نیچے گرادیا۔ سارجنٹ زوجیک نے اُس کے ہاتھ سے رائفل چھین لی۔

''یہ شمالی کوریا کی فوج کا آدمی ہے۔'' میں نے اُس کا گریبان چاک کرتے ہوئے کہا۔ اُس نے دیہاتی لباس کے نیچے یونیفارم پہن رکھی تھی۔ ''غالباً اِسے بھاگنے کا موقع نہیں مل سکا۔''

سارجنٹ زوجیک خوں خوار نظر سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ''یہ دشمن کا جاسوس ہے۔'' اُس نے کہا۔ ''ہماری جاسوسی کرنے کے لیے پیچھے رہ گیا تھا۔''

قیدی کی کنپٹی سے خون بہنے لگا۔ وہ رحم طلب

نظر سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو ہمیں اُس پر ترس آجاتا لیکن جنگ انسان کو سنگ دل بنا دیتی ہے۔

''سارجنٹ! اِسے یہاں رکھنا مناسب نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اِسے ایک فوجی کے ساتھ پیچھے بھیج دیا جائے۔''

''ہمارا ایک جوان پہلے ہی کم ہو چکا ہے۔'' سارجنٹ مُردہ سپاہی کی طرف دیکھتے ہوا بولا۔ ''ہم اِس کے لیے ایک اور آدمی کی کمی نہیں برداشت کر سکتے۔''

''تو پھر ایک ہی صورت ہو سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہم اِسے باندھ کر فارم ہاؤس میں چھوڑ جاتے ہیں۔ کل صبح یہاں پہنچنے والا پہلا دستہ اِس کا بندوبست کر دے گا۔''

سارجنٹ زوجیک نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کیا تم چاہتے ہو کہ یہ ایک اور فوجی کو ہلاک کر ڈالے! نہیں، اِس کا صرف ایک ہی علاج ہے۔''

وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور اپنی رائفل کندھے سے لگا لی۔

''یہ جنگی قیدی ہے سارجنٹ!''

''جنگی قیدی!'' سارجنٹ زوجیک نے حقارت سے کہا۔ ''یہ قاتل ہے قاتل! اِس نے ہمارے سامنے ایک سپاہی کو قتل کیا ہے۔ یہ فوجی نہیں جاسوس ہے۔ ہم اِسے موقع ہی پر سزا دیں گے۔''

''سارجنٹ! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ جنگ میں لڑنے والوں کو قاتل نہیں کہا جا سکتا۔ ہمیں اِس پر مقدمہ چلائے بغیر کوئی کارروائی نہیں کرنی چاہیے۔ اِسے صفائی کا ضرور موقع دینا چاہیے۔''

سارجنٹ نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے رائفل سیدھی کی اور دو فائر کر دیے۔ قیدی اُچھلا اور لمبی لمبی گھاس پر تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اُس کی موت کے ساتھ ہی بحث ختم ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہم آگے بڑھ گئے اور کوریائی قیدی کی موت ایک بھولی بسری بات ہو گئی۔

چند ماہ بعد ہماری مدّت پوری ہو گئی اور ہم واپسی کی تیاریاں کرنے لگے۔ ہمارا خیال تھا کہ سارجنٹ زوجیک مزید دو سال کے لیے دستخط کر دے گا مگر جب وہ ہمارے ساتھ واپس جانے پر تیار ہو گیا تو ہم سب کو تعجب ہوا۔ سان فرانسسکو پہنچ کر ہمیں باقاعدہ فارغ کر دیا گیا۔ میں نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے اوہائیو یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

دو سال بعد میں ایک کالج پارٹی کے ہمراہ سان فرانسسکو گیا تو وہاں سارجنٹ زوجیک سے ملاقات ہو گئی۔ وہ بڑی گرم جوشی سے ملا اور بتایا کہ پروگرام کے مطابق وہ پُرانی کاروں کا کاروبار کر رہا ہے اور خوب دولت کما رہا ہے۔

چھ ماہ بعد میں نے تعلیم مکمل کی اور پھر شادی کر لی۔ زوجیک بھی میری شادی میں شریک ہوا۔ اُس نے ہمیں سان فرانسسکو میں ہنی مون منانے کی دعوت دی جو ہم نے باخوشی قبول کر لی۔ زوجیک نے بتایا کہ وہ ایک چھوٹے سے ساحلی قصبے میں سکونت اختیار کرنا چاہتا ہے۔ وہیں رہائش پذیر ہونے کے بعد وہ شادی کا ارادہ رکھتا تھا لیکن چند ماہ بعد پتا چلا کہ اُس کی منگیتر ایک حادثے میں ہلاک ہو گئی ہے۔

زوجیک اپنی منگیتر این کو اُس کے گھر چھوڑنے گیا تھا۔ جب دونوں کار سے اُتر رہے تھے تو ایک شخص نے اچانک فائرنگ شروع کر دی۔ وہ شخص کچھ عرصے قبل پاگل خانے میں زیرِ علاج رہ چکا تھا۔ فائرنگ کی آواز سن کر این حواس باختہ ہو گئی اور بے تحاشہ ایک طرف بھاگنے لگی۔ اُس دیوانے نے این کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ این موقع ہی پر ہلاک ہو گئی۔ جب تک پولیس نے اُس دیوانے پر قابو پایا وہ مزید دو افراد کو ہلاک اور تین کو زخمی کر چکا تھا۔

یہ افسوس ناک خبر سنتے ہی میں زوجیک کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مجھے ایرپورٹ پر لینے آیا تھا۔

''فلپ! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں!'' اُس نے بجھی بجھی آواز میں کہا۔ ''این بہت پیاری

لڑکی تھی۔ میں اُسے زندگی بھر نہیں بھلا سکتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں وحشی درندوں کے جنگل میں راستہ بھٹک گیا ہوں۔ این ایک نرس تھی اور زخمیوں کی خدمت کر کے خوش ہوتی تھی۔ اگر میں اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے بھاگنے سے روک لیتا تو یہ سانحہ پیش نہ آتا۔ میری توجہ اُس ملعون کی طرف ہوگئی اور این نے بھاگنا شروع کر دیا۔"

"جو ہونا تھا وہ ہو چکا!" میں نے کہا۔ "اب میں یا تم اُسے نہیں بدل سکتے۔"

"اوہ فلپ! ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ جب تک گورڈن جیسے وحشی گلیوں میں آزاد پھر رہے ہیں کسی انسان کی زندگی محفوظ نہیں۔ یہ شہر نہیں جنگل ہے، جنگل۔ دیکھ لینا گورڈن سزا سے بچ جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ عدالت اُسے چند ماہ کے لیے پاگل خانے بھجوا دے گی۔ اِس ریاست میں موت کی سزا بھی منسوخ ہو چکی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اُسے عمر قید ہو جائے گی۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ وہ چند سال پاگل خانے میں رہے گا، اُس کے بعد اُسے دوبارہ انسانوں کا خون بہانے کے لیے آزاد کر دیا جائے گا۔"

میں زوجیک کے پاس ایک ہفتہ رہ کر واپس آ گیا۔

گورڈن کے بارے میں اُس کا خیال بالکل صحیح نکلا۔ عدالت نے اُسے پاگل خانے بھجوا دیا۔ دو سال بعد مجھے زوجیک کا خط ملا۔ اُس نے اپنی خیریت کی اطلاع دی تھی۔ خط کے ساتھ اخبار کا ایک تراشہ بھی تھا۔ میں دلچسپی کے ساتھ اُسے پڑھنے لگا۔

جارج گورڈن نامی ایک شخص جسے حال ہی میں پاگل خانے سے فارغ کیا گیا تھا، ایک مبینہ ڈکیتی کے دوران گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا۔ قاتل ابھی تک گرفتار نہیں کیا جا سکا۔

خبر کے نیچے زوجیک نے یہ جملہ لکھا تھا۔ "یہ انتقام نہیں انصاف ہے۔"

اُس فقرے کو پڑھ کر میں نے جو اندازہ لگایا وہ کچھ خوش گوار نہیں تھا۔

چند ماہ بعد میں نے ایک نئی جگہ ملازمت کر لی۔ مجھے سپلائی سیکشن میں کام ملا تھا۔ میرے فرائض میں دوسرے شہروں کے دورے بھی شامل تھے۔ میں مہینے میں ایک مرتبہ اُس قصبے میں بھی جاتا تھا جہاں میرا دوست زوجیک مقیم تھا۔ یوں ہماری ملاقات ہو جاتی تھی۔ میں نے ایسے ہی ایک موقع پر اُس سے پوچھا۔ "تمہارا کاروبار کیسا چل رہا ہے؟"

"اچھا چل رہا ہے۔" اُس نے بتایا۔ "لیکن آج کل میں ریس پر زیادہ توجہ دے رہا ہوں۔"

"لیکن میں تمہیں ریس سے دُور ہی رہنے کا مشورہ دوں گا۔ اِس میں کسی کو ہنستے نہیں دیکھا گیا۔" قدرے توقف کے بعد میں نے کہا۔ "زوجیک! میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"پوچھو۔"

"تم نے مجھے وہ اخبار کا تراشہ کیوں بھیجا تھا؟ وہی جس میں جارج گورڈن کے بارے میں خبر چھپی تھی۔"

اُس نے بے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔

"کیا میں یہ سمجھ لوں کہ۔۔۔"

"میں تمہاری مشکل آسان کر دیتا ہوں۔" اُس نے کہا۔ "اور یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں۔ تم نے بائبل میں پڑھا ہوگا کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ! لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ اِس ریاست میں موت کی سزا نہیں ہے۔ انصاف کا تقاضا پورا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جو کسی کو قتل کرتا ہے اُسے قتل کیا جائے۔"

میرے بدن میں ایک سرد لہر سرایت کر گئی۔

"لیکن زوجیک! میں سمجھتا ہوں کہ کسی شخص کو قانون اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے۔"

اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مُسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ "مجھے یاد ہے ایسی ہی بات تم نے کوریا میں بھی کہی تھی۔" وہ بولا۔ "جب قوم انصاف کے بنیادی

ہنسی علاج غم ہے

ہوٹل کے مالک نے ایک آدمی کو بل ادا نہ کرنے پر خوب مارا، اسے دھکے دے کر ہوٹل سے باہر نکالا۔ اچانک بیرا دوڑتا ہوا آیا اور دو چار گھونسے اس نے بھی جڑ دیئے۔ مالک غصے سے بولا۔

"جب میں نے اسے اتنا پیٹ لیا تھا تو تمہیں مارنے کی کیا ضرورت تھی۔"

بیرا بولا۔ "جناب آپ نے بل وصول کیا اور میں نے ٹپ۔"

☆☆☆

ایک آدمی ٹھیلے والے سے: "بھائی جان ایک مالٹا کتنے کا ہے۔"

ٹھیلے والا: "پانچ روپے کا۔"

آدمی: "3 روپے کا دے دو۔"

ٹھیلے والا: "3 روپے میں تو اس کا چھلکا آئے گا۔"

آدمی: "یہ لو 2 روپے چھلکا اتارو اور مالٹا مجھے دے دو۔"

اصولوں سے منحرف ہو جائے تو قانون اپنے ہاتھ میں لینا ہی پڑتا ہے۔ این کو قتل کیا گیا تھا لیکن اُس کی جان کے بدلے کوئی جان نہیں لی گئی۔ تم خود سوچو ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے تھا!"

میں نے جواب نہیں دیا۔ نہ ہی میں جواب دینا چاہتا تھا۔ اُس روز کے بعد میں نے اُس سے ملنا کم کر دیا۔ میں اُس کے قصبے میں جاتا اور اپنا کام مکمل کر کے واپس آجاتا۔ قصبے میں لگے ہوئے اُس کی کمپنی کے سائن بورڈز میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اُس کا کاروبار خوب چمک رہا ہے۔

گورڈن کو قتل ہوئے ایک سال گزرا تھا کہ زوجیک کے قصبے میں ایک تیرہ سالہ لڑکی کو کسی نے نہایت سنگ دلی کے ساتھ قتل کر دیا۔ اُس کی لاش ایک کار کی ڈگی میں پڑی ہوئی پائی گئی۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق قتل سے پہلے اُسے بے آبرو کیا گیا تھا۔ پولیس نے ایک ہفتے کی تلاش کے بعد قاتل کو سان فرانسسکو سے گرفتار کر لیا۔ اگلے روز اُسے مسلح گارڈز کی نگرانی میں قصبے بھجوایا گیا۔ قاتل ایک تیس سالہ شخص تھا۔ اُس کا نام آسکر تھا۔ اُس نے اقبال جرم کر لیا تھا۔ جب اُسے پولیس ہیڈ کوارٹر میں لے جایا جا رہا تھا تو اُسے دیکھنے کے لیے سو ڈیڑھ سو تماشائی جمع ہو چکے تھے جن میں فوٹو گرافرز اور اخباری نمائندے بھی شامل تھے۔ جیسے ہی قاتل نے دو محافظوں کی نگرانی میں سیڑھیوں پر قدم رکھا کسی طرف سے ایک فائر کیا گیا اور قاتل نے سیڑھیوں پر گر کر دم توڑ دیا۔ فائر قرب و جوار کی عمارتوں سے کیا گیا تھا۔ پولیس کوشش کے باوجود گولی چلانے والے کا سراغ نہیں لگا سکی۔

اُس روز میں کاروباری دورے پر وہاں گیا ہوا تھا۔ یہ خبر سنتے ہی میرا خیال زوجیک کی طرف چلا گیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اُس سے ملنے چلا گیا۔ رسمی بات چیت کے بعد میں نے پولیس ہیڈ کوارٹر میں ہونے والی واردات کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "انتہائی سنسنی خیز واردات ہے۔"

"سنسنی خیز واردات تو اُس بچی کا قتل تھا۔" اُس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "وہ بچی معصوم اور بے گناہ تھی۔"

"ہاں! لیکن آسکر کو صفائی پیش کرنے کا موقع نہیں ملا۔"

"صفائی کی کیا ضرورت تھی! اُس نے اقبال جرم کر لیا تھا۔ ویسے بھی عدالتی کارروائی کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ اُسے عمر قید ہو جاتی، انصاف کا تقاضا تو پورا نہ ہوتا۔"

میں نے سگریٹ کا کش لینے کے بعد کہا۔ "گویا تمہارے خیال میں اُسے ٹھیک ہی قتل کیا گیا تھا؟"

"یقیناً!"

"جس طرح جارج گورڈن کو قتل کیا گیا تھا؟"

"ہاں!" اُس نے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ سزائے موت کی منسوخی کا فیصلہ

کس نے کیا تھا؟ صرف گورنر اور لیجلیٹو کونسل نے! عوام نے اِس فیصلے میں ووٹ نہیں دیا تھا۔"

"ایسے اہم معاملات کے فیصلے عوام نہیں کر سکتے۔ بیشتر لوگ انصاف کے موٹے موٹے اصول بھی نہیں جانتے۔ اُن پر اتنے نازک کام کی ذمے داری نہیں ڈالی جا سکتی اور نہ ہی وہ اِس کے اہل ہیں۔"

"عوام کی قسمت کا فیصلہ چند افراد کے سُپرد نہیں کیا جا سکتا۔"

"زوجیک! آج میں صاف صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آسکر کو تم نے قتل کیا ہے؟"

اُس نے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "انصاف کا تقاضا پورا کیا گیا ہے۔"

"زوجیک! تمہیں..... تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"مجھے کچھ نہیں ہوا۔" اُس نے لاپروائی سے کہا۔ "یہ دیکھو کہ قوم کو کیا ہوا ہے! لوگ اخلاقی قدروں کو بھولتے جا رہے ہیں اور جنسی عزائم میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جدھر دیکھو لُوٹ مار مچی ہوئی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ رحم کے نام پر سزاؤں میں نرمی کر دی گئی ہے۔ عجیب تماشا ہے۔ اگر معصوم لڑکی قتل ہو جاتی ہے تو کسی کو افسوس نہیں ہوتا لیکن جب قاتل کو سزا دینے کا وقت آتا ہے تو لوگوں کا جذبۂ رحم بے دار ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ قانون کا بنایا ہوا قانون ہے۔ ایسا قانون صرف وہی بنا سکتا ہے جو خود قاتل ہو یا قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔"

اُس وقت ہم ایک ساحلی ریستوران میں بیٹھے تھے۔ کافی ختم کرنے کے بعد زوجیک نے بل ادا کیا اور ہم ساحل کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ زوجیک نے دوستانہ انداز میں ایک بازو میرے کندھے پر رکھ لیا۔

"دیکھو زوجیک! یہ میدانِ جنگ نہیں ہے۔ تمہیں اپنے خیالات میں تبدیلی پیدا کرنی چاہیے۔"

"یہ گوریا سے زیادہ وسیع میدانِ جنگ ہے۔" اُس نے کہا۔ "میں انصاف کی جنگ لڑ رہا ہوں اور اِس جنگ کا سپاہی ہوں۔"

"تم احمق ہو زوجیک!" میں نے اپنا غصہ دباتے ہوئے کہا۔ "تم کب تک یہ جنگ لڑ سکتے ہو؟ آخر ایک دن تم قانون کی گرفت میں آجاؤ گے۔"

اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ میرے کندھے پر ہاتھ مارتا ہوا بولا۔ "تم میرے پُرانے دوست ہو فلپ! میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا اور مجھے یقین ہے کہ تم مجھے دھوکا نہیں دو گے تاہم اگر تم پولیس کے پاس گئے بھی تو کچھ ثابت نہیں کر سکو گے۔ اِس سال کُل پانچ افراد میری فہرست میں تھے۔ دو ریاست کے دوسرے علاقوں میں تھے۔ اُن کی موت کا اخباروں میں زیادہ چرچا نہیں ہوا۔"

"پانچ آدمی!" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"وہ سب کے سب مجرم اور قاتل تھے۔ قانونی خامیوں کے باعث سزا سے بچ نکلنے والے!"

میرے بدن میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور ہم خلیج کے پُل پر چل رہے تھے۔ پُل پر اُس وقت ہمارے سوا کوئی نہیں تھا۔ میں نے خوف زدہ نظر سے زوجیک کی طرف دیکھا۔

"زوجیک! کیا تم واقعی خود کو راہِ راست پر سمجھتے ہو؟ پانچ آدمیوں کا قتل انتہائی ہولناک جُرم ہے۔"

"یقیناً ہولناک جُرم ہے۔" وہ تاریکی میں گھورتا ہوا بولا۔ "لیکن تم نے اُن پانچ آدمیوں کے بارے میں غالباً کچھ نہیں سوچا جو اُن قاتلوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے!" پھر اُس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "میری فہرست میں ابھی تین آدمی اور ہیں۔"

"اوہ! کیا تم مزید تین آدمیوں کو قتل کرو گے؟"

"ہاں! جب تک میرے جسم میں طاقت ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا یعنی انصاف کے تقاضے پورے کرتا رہوں گا۔"

اچانک میں نے اُسے پوری قوت سے اُٹھا لیا اور ریلنگ کے اُوپر سے پانی میں پھینک دیا۔

مسز ایلس کے شب خوابی کے کمرے میں پہنچ کر آرتھر نے اطراف کا جائزہ لیا اور پھر تیزی کے ساتھ مختلف اشیا کو اُلٹ پلٹ کر قیمتی اشیا کی تلاش شروع کردی۔ وہ ابھی زیورات کا بکس کھولنے کی ترکیب سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اُسے چوکنا ہونا پڑا۔ وہ تیزی سے مُڑا اور جیسے اُس کا دل بیٹھ گیا۔ مسز ایلس دروازے میں کھڑی اُسے نفرت انگیز نظر سے گھور رہی تھی۔

''خوب!'' وہ بلند آواز میں بولی۔ ''یہ ہے صلہ اِس بات کا کہ میں نے تم پر اعتبار کیا تھا! تم جیسے لوگوں پر کبھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔'' یہ کہہ کر وہ فون کی طرف بڑھی۔

''تم فون نہیں کرسکتیں!'' وہ بولا۔ اُسے اُمید نہ تھی کہ مسز ایلس اِس قدر جلد واپس آجائے گی۔

کھلونا

ثریا صغیر صدیقی

بیوہ عورتیں عموماً بڑی گداز دل ہوتی ہیں جسے کچھ لوگ ان کی کمزوری بھی کہتے ہیں اور اُن کی اِس کمزوری سے مستقل طور پر فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔

ایک ایسے شاطر نوجوان کا قصہ جو بیوہ عورتوں ہی پر جال پھینکتا تھا

''فون کرنے کی صورت میں خواہ مخواہ تمہاری بدنامی ہوگی۔''

''ہونے دو!'' مسز ایلس نے سرد انداز میں مسکرا کر کہا۔ ''میری عمر اب وہ نہیں رہی کہ میں اسکینڈل سے ڈروں۔'' وہ نمبر ڈائل کرنے لگی۔

''رُک جاؤ!'' آرتھر دہاڑا۔ لیکن مسز ایلس اپنے کام میں مصروف رہی۔

معاً آرتھر نے قریب رکھے ہوئے وزنی گل دان کو اُٹھایا اور پوری قوت سے مسز ایلس کی سمت پھینکا۔ گل دان سیدھا مسز ایلس کے سر سے ٹکرایا اور وہ ہلکی سی کراہ کے ساتھ زمین بوس ہوگئی۔

آرتھر جلدی سے اُس کے پاس پہنچا اور اُس پر جھک گیا مگر مسز ایلس مر چکی تھی۔ اُس کے دل کی دھڑکنیں بالکل ساکت تھیں۔ اُس نے گل دان سے اپنی اُنگلیوں کے نشانات صاف کیے اور اُسے وہیں رکھ دیا جہاں پہلے رکھا ہوا تھا، پھر وہ مُڑ کر لاش کی سمت دیکھنے لگا۔ ''بے وقوف عورت!'' وہ بڑبڑایا۔

پورے گھر میں وہ اُس عورت کے ساتھ تنہا تھا۔

اُس نے اپنے آئندہ اقدام کے بارے میں سوچا۔ اُسے بہرحال اُس بوڑھی مسز ایلس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اِس قسم کی کسی بھی اَدھیڑ عمر عورت سے کوئی دلچسپی نہ رکھتا تھا۔ چند ہفتوں قبل مسز ایلس سے اُس کی ملاقات ایک تھیٹر میں ہوئی تھی اور وہیں اُس سے پینگیں بڑھائی تھیں۔

عورتیں خصوصاً بیوہ، مطلقہ، تنہا اور خودمختار قسم کی عورتیں آرتھر کا ذریعۂ معاش کہی جاسکتی تھیں۔ دراصل ایسی عورتیں اُس میں بڑی کشش پاتی تھیں۔ یہ بات نہ تھی کہ وہ کوئی بہت خوش شکل آدمی تھا، نہ ہی وہ اُن میں سے تھا جو تعلقات بڑھانے کے لیے تحفے تحائف وغیرہ کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ ایک پچیس سالہ نوجوان تھا۔ اُس کا قد بھی زیادہ اونچا نہ تھا۔ اُس کا چہرہ معصومیت کی بہرحال ایک مثال کہا جاسکتا تھا۔ سنگین، بھولا بھالا اور سادہ لوح سا! یہی وہ ہتھیار تھا جس کے سہارے وہ جلد ہی ادھیڑ عمر عورتوں کو قابو کرلیا کرتا تھا۔ اگر کوئی عورت اُس کی جوانی سے متاثر نہیں ہوئی تھی تو فوراً ایک بے سہارا اور اکیلے نوجوان کا کردار ادا کرنے لگتا تھا۔ عموماً اس کے لیے عورتوں کی مامتا کا جذبہ اُبھر ہی آتا تھا اور وہ اُسے سہارا دینے کے لیے آگے بڑھ آتی تھیں۔

آرتھر چند لمحوں تک سوچتا رہا، پھر اُس نے پورے گھر کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ تمام قیمتی اشیا ایک چھوٹے سوٹ کیس میں ڈالنے کے بعد وہ گیراج کی سمت گیا جہاں اُس کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی وہ اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوچکا تھا۔

راستے میں اُس نے مسز ایلس کے بارے میں سوچا۔ آرتھر سے اُس کے تعلقات کچھ اچھے ثابت نہیں ہو رہے تھے۔ مسز ایلس خاصی کنجوس عورت ثابت ہوئی تھی اور اُس نے اِس عرصے میں اُسے کوئی اچھا تحفہ تک نہ دیا تھا جبکہ ماضی میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ عورتیں عموماً اِس کا خیال رکھتی تھیں۔ رہا دنگا فساد کا معاملہ تو اِس سے قبل سوائے ایک واقعے کے اور ایسی کوئی بات کبھی نہیں ہوئی تھی اور یہ واقعہ مسز ہاورڈ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ دراصل مسز ہاورڈ میں مامتا کا جذبہ بہت ہی زیادہ تھا۔ آرتھر کی دل پسند اور دُکھ بھری کہانی مسز ہاورڈ پر کچھ زیادہ ہی اثر دکھا گئی تھی۔

''میں اکیلا ہوں۔'' اُس نے اپنی معصوم آواز میں کہا تھا۔ ''ماں باپ کا اکیلا بچہ عموماً خود کو اکیلا ہی محسوس کرتا ہے۔ آپ کو اِس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔''

اُس نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا تھا۔ ''مجھے آج بھی اپنا بچپن یاد ہے۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اِس طرح بولنے کا کیا اثر ہوتا ہے۔ ''میں عموماً اپنے خیالوں میں گم تنہا تنہا سا بیٹھا رہتا تھا۔ میرا کوئی دوست بھی نہ تھا جس کے ساتھ میں کھیل سکتا اور جب میری ماں دنیا سے رخصت ہوگئی تو.....'' یہ کہتے ہوئے اُس کی آواز بھاری ہوگئی تھی اور وہ چُپ ہوگیا تھا، پھر اِس طرح مسکرانے لگا تھا جیسے وہ رو پڑے گا۔

مسز ہاورڈ پر اِس کا بے حد اثر پڑا تھا۔ اُس کی

آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ آرتھر کا شانہ دباتے ہوئے اُسے تسلیاں دینے لگی تھی اور پھر اُن کے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ مسز ہاورڈ تنہا رہتی تھی اور خاصی مال دار بھی تھی۔ آرتھر کے چند دن بہت اچھے گزرے تھے۔ مسز ہاورڈ اِس دوران میں اُسے کئی اچھے تحفے بھی دیے تھے لیکن آرتھر میں چند بُرائیاں بہرحال تھیں اُن کے باعث فساد ہو ہی گیا۔ تکرار کی ابتدا اُس وقت ہوئی تھی جب مسز ہاورڈ کے چند قیمتی زیور اچانک غائب ہو گئے تھے۔ بُڑھیا کا خیال تھا کہ یہ حرکت آرتھر کی تھی۔ آرتھر نے اُسے بھی ایک گل دان کھینچ مارا تھا اور بھاگ نکلا تھا۔ وہ تو اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ بُڑھیا صرف بے ہوش ہوئی تھی کیونکہ اخباروں میں یہی خبر آئی تھی۔

آرتھر ہفتوں تک بھاگتا رہا تھا۔ وہ جائے حادثہ سے کافی دُور نکل گیا تھا کہیں شاید معاملہ زیادہ آگے نہیں بڑھایا گیا تھا۔ اب اُسے یہ تجربہ ہو گیا تھا کہ ایسی عورتیں اِن معاملات میں عموماً چُپ ہی رہتی ہیں۔ پھر وہ کچھ زیادہ ہی نڈر ہو گیا تھا۔ اُس نے کئی عورتوں کو ڈرا دھمکا کر اُن سے کافی مال وصول کیا تھا۔

اُسی وقت آرتھر کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا کہ وہ جائے حادثہ سے ممکنہ حد تک دُور چلا جائے۔ وہ کئی روز سفر کرتا رہا اور پھر اُس نے لاس اینجلز میں رُکنے کا فیصلہ کیا۔ یہ جگہ اُس کی جانی پہچانی بھی تھی۔ اُسے علم تھا کہ کن ہوٹلز میں اَدھیڑ عمر بیوائیں اور مطلقہ عورتیں عموماً قیام پذیر ہوتی ہیں۔ اُس نے پھر ایسے ہی ایک ہوٹل کا انتخاب کیا۔

کاؤنٹر کلرک نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ شاید اُسے تعجب تھا کہ ایک جوان آدمی کو ٹھہرنے کے لیے ایسا بے رنگ ہوٹل کیوں پسند آیا ہے۔

''یہ جگہ خاصی خاموش سی ہے جناب!'' اُس نے کارڈ لے کر پڑھتے ہوئے کہا۔

''اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' آرتھر نے جواب دیا اور مُڑ کر لابی کی سمت دیکھا جس میں ایک جانب لاؤنج تھا اور دوسری سمت ڈائننگ روم۔ ''میں بالکل ایسی ہی جگہ چاہتا تھا۔'' وہ بولا۔ ''میں ذرا آرام اور سکون چاہتا ہوں۔''

''اِس لحاظ سے یہ جگہ موزوں ہے۔'' کلرک نے کہا۔ ''یہاں زیادہ تر ادھیڑ عمر عورتیں قیام پذیر ہیں اور وہ دس بجے ہی کمروں میں چلی جاتی ہیں۔''

رات کے کھانے کے دوران ہی میں وہ تیزی کے ساتھ ایک موٹی اَدھیڑ عمر عورت کے ساتھ دوستی گانٹھنے میں کامیاب ہی ہو گیا۔ دراصل عورت کو وہ تبصرہ بہت متاثر کر گیا تھا جو آرتھر نے عورت کے حُسن کے بارے میں کیا تھا لیکن ابھی یہ ملاقات دوسرے مرحلہ میں داخل بھی نہیں تھی کہ اِس میں رخنہ پڑ گیا۔ ہوا یوں کہ اُسی وقت عورت کا جوان لڑکا اپنی ماں سے ملنے آ گیا۔ آرتھر کا ہمیشہ سے یہ اصول رہا تھا کہ ایسی عورتوں سے ربط و ضبط نہ بڑھایا جائے جن کے قریبی رشتے دار موجود ہوں۔

آئندہ چند شامیں وہ عموماً لاؤنج میں بیٹھ کر مختلف عورتوں کی رفاقت میں گزارتا رہا۔ اُس وقت تک اُسے کوئی کام کی عورت نظر نہیں آئی تھی لیکن ایک شام اُس کا تعارف مسز اینگل سے ہوا تو اُسے راستہ ہموار نظر آنے لگا۔ وہ عورت کوئی خاص شکل کی نہ تھی اور عمر میں بھی خاصی تھی۔ اُس کا جسم دُبلا پتلا تھا لیکن بدن پر لباس مہنگا تھا اور انگلیوں میں قیمتی انگوٹھیاں بھی تھیں۔ اُس شام کے اختتام تک آرتھر اِس قابل ہو گیا کہ اُس کے خاصا نزدیک بیٹھ سکے۔ وہ خاصی مہربان معلوم ہو رہی تھی۔

وہ آرتھر کو اپنا خاندانی پس منظر بتا رہی تھی۔ ''ہم لوگوں کا گھرانہ پورے لاس اینجلز میں مشہور ہے۔'' وہ اینگل خاندان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن اُسے یہ نام کچھ شناسا سا لگتا تھا۔ اُس نے سوچا کہ شاید اخبار میں اُس خاندان کے بارے میں پڑھا ہو۔ بہرحال وہ عورت دلچسپ تھی۔

دوسری شام لائبریری سے فارغ ہو کر وہ مسز اینگل سے دوبارہ لاؤنج میں ملا۔ اُس شام بھی مسز اینگل زیادہ تر اپنے خاندان کے بارے میں بولتی

رہی۔ آرتھر کو پتا چلا کہ وہ ایک کافی دولت مند بیوہ عورت ہے اور اُس کے پاس شہر کے نواحی علاقے میں ایک بڑا قطعۂ زمین ہے۔

''آپ کی کوئی اولاد بھی ہے؟''

''کوئی نہیں!'' اُس نے سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں ایک لڑکا تھا جو.....'' وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی اور اُس کے چہرے پر کرب کے اثرات اُبھر آئے لیکن وہ جلد ہی مسکرانے لگی۔ ''میں ماضی میں جینے کی کوشش نہیں کرنا چاہتی۔'' اُس نے آہستہ سے کہا اور چُپ ہوگئی۔

''میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کی جائیداد کے بارے میں کہیں اخبار میں پڑھا ہے۔'' آرتھر نے کہا۔

''پڑھا ہوگا۔'' عورت نے کہا۔ ''میری زمین، شہر کی کارپوریشن، پارک کے لیے خریدنا چاہتی ہے لیکن میں اُسے بیچنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ میں اُسے جذباتی تعلق کی بنا پر بیچنا نہیں چاہتی۔ مجھے رقم کی ضرورت نہیں۔ میرا شوہر میرے لیے بہت کچھ چھوڑ کر مرا ہے۔''

''آپ پھر بھی ہوٹل میں رہتی ہیں؟'' آرتھر نے کہا۔ ''سمجھ میں نہیں آئی یہ بات!''

''میرا مکان بہت ہی بڑا ہے۔ جب تم دیکھو گے تو سمجھ لو گے۔ وہاں تنہا رہنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ وہاں میرا وجود سمندر میں قطرہ لگتا ہے۔ میں وہاں صرف کبھی کبھی جاتی ہوں مگر چھوڑو اِن باتوں کو، کچھ تم بھی تو اپنے بارے میں بتاؤ۔''

عورت کے باتوں کے دوران آرتھر برابر سوچ رہا تھا کہ اُسے قابو میں کرنے کے لیے کون سا طریقہ مناسب ہوگا؟ عورت کافی دولت مند تھی اور اُس کی سمت جُھک بھی رہی تھی۔ اُس کے سامنے سب سے عمدہ بات یہی تھی کہ وہ اُس عورت کے لڑکے کا سہارا لے کر بات آگے بڑھائے۔ اُسے یقین تھا کہ بوڑھی عورت کی ممتا کسی ایسے ہی نوجوان کی تلاش میں ہو جس پر وہ اپنے جذبے کو نچھاور کر کے تسکین حاصل کر سکے۔

اُس نے اپنے پتے ہوشیاری سے استعمال کرنے کی ٹھان لی۔ ایک شرابی باپ اور ایک مظلوم ماں کی کہانی تو اُس کے پاس پہلے ہی تھی اور پھر اُس نے اپنی لڑکھڑاتی اور رُکتی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔ ''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں ایک تنہا بچہ تھا جس کا باپ شرابی تھا اور ماں ایک بے زبان عورت! میں گھنٹوں ایک ٹوٹے ہوئے اسٹول پر تنہا بیٹھا رہتا تھا اور کوئی میرے پاس نہیں آتا تھا۔ میرا کوئی دوست نہ تھا، کوئی ساتھی نہ تھا جس کے ساتھ میں کھیل سکتا۔'' یہ کہتے ہوئے آرتھر کو خوشی ہوئی تھی کہ مسز انیگل اُس کی جانب دلچسپی کے ساتھ جُھک آئی تھی۔

''اوہ تم کس قدر دُکھی لڑکے ہو!'' وہ بولی تھی۔ ''دُکھی اور اکیلے!''

پھر دوسرے ہی روز وہ اُسے اپنے ساتھ اپنی جائیداد اور زمین دکھانے لے گئی۔ یہ زمین شہر کے نواحی حصے میں تھی۔ مکان دو منزلہ تھا جس کے ساتھ ہی ایک وسیع باغیچہ تھا۔ اُس عقبی باغیچے کے وسعتوں میں چھوٹے چھوٹے رہائشی مکانات بھی بنے ہوئے تھے جو خالی تھے۔ وہ وہ قطعۂ زمین کئی ایکڑ پر محیط تھا اور اُس کے گرد خاردار تار لگے ہوئے تھے۔ قریب سے ایک سڑک گزرتی تھی۔ اُن کی کار ایک بڑے سے آہنی پھاٹک پر رُکی۔ مسز انیگل نے قفل کھولا اور پھر وہ اندر چلے گئے۔ جب وہ عمارت کے پاس پہنچے تو اُنھیں سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر جانا پڑا۔ آرتھر کو وہ جگہ بے حد سنسان اور آسیب زدہ محسوس ہوئی۔ وہ اُس جگہ کی وسعت میں خود کو تنہا محسوس کرنے لگا تھا حالانکہ مسز انیگل اُس کے ساتھ تھی۔ عمارت کے اندر بہت سی کھڑکیاں تھیں تاکہ اُن کے ذریعے اندر روشنی جا سکے۔ اندر کے کمروں میں جا بجا مختلف اشیا بکھری ہوئی تھیں۔

''میں نے کچھ ضروری اور قیمتی سامان عقبی اسٹور میں لاک کر دیا ہے۔'' مسز انیگل نے کہا۔ ''مجھے یاد نہیں کہ وہاں میں نے کیا کیا رکھ دیا ہے اور

کیا کیا رکھنا ابھی باقی ہے!''

آرتھر سوچنے لگا کہ واقعی وہ جگہ اُس کی مرضی کے مطابق ہے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اِدھر اُدھر رکھے ہوئے متعدد ظروف جو بظاہر بے کار سمجھ کر ڈال دیے گئے تھے، اچھے خاصے قیمتی تھے۔

''میرے پاس اتنی کنجیاں ہیں کہ مجھے یاد نہیں رہتا کہ کون سی کنجی کہاں رکھ دی ہے!'' مسز انیگل نے کہا۔ ''ہاں مجھے یہ ضرور یاد ہے کہ میں نے چابیوں کا ایک گچھا اُدھر دراز میں رکھ دیا ہے۔'' مسز انیگل نے ایک طرف اشارہ کیا۔

وہ بات آرتھر نے گرہ میں باندھ لی۔ اُسے اُمید تھی کہ بڑھیا اسٹور روم بھی دکھائے گی لیکن جب وہ اُدھر نہیں گئی تو آرتھر نے دوسرا منصوبہ مرتب کرلیا۔ بہانے سے وہ ٹہلتا ہوا اُدھر گیا جہاں وہ میز تھی جس میں کنجیوں کا فالتو گچھا رکھا تھا۔ اُس نے پھرتی سے وہ گچھا جیب میں ڈال لیا۔

دو چار روز کے بعد ایک دن اُس نے اپنے منصوبے کو عملی شکل دینے کی ٹھانی۔ اُس نے ایک صبح مسز انیگل سے کہا کہ وہ ذرا اپنے ایک کام سے جارہا ہے۔ دراصل اُس کا ارادہ تھا کہ وہ مکان کے اسٹور پہنچ کر دیکھے کہ مسز انیگل کے پاس کیا کیا ہے! وہ بہرحال کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جس کے باعث مسز انیگل سے اُس کے تعلقات بگڑ جائیں۔ وہ صرف اپنا استعجاب دُور کرنا چاہتا تھا۔

آرتھر وہاں سے روانہ ہوگیا لیکن کچھ دُور جا کر ہی وہ پھر لوٹ آیا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ مکان کے اندر پہنچ کر کچن کی سمت بڑھ رہا تھا جس کا دروازہ جس کا دروازہ عقب میں ایسی جگہ کھلتا تھا جہاں سے سیڑھیاں شروع ہوتی تھیں۔ زینے کے اختتام پر ایک چوکور سی عمارت اور تھی۔ اُس عمارت کی کھڑکیاں کسی قدر پھیلی ہوئی تھیں۔ آرتھر نے اندر جھانک کر دیکھا لیکن اُسے فرنیچر کے سوا کچھ نظر نہ آسکا۔ سامنے کے دروازے سے ملحق ایک کھڑکی تھی جو نچلے حصے میں کُھلتی تھی۔ اُس نے کنجیوں کو آزمانا شروع کیا۔ آخر کار ایک کنجی قفل میں لگ ہی گئی۔ اُس نے دروازہ تھوڑا سا کھول کر اندر جھانکا جہاں اب کچھ روشنی باہر سے پہنچ رہی تھی۔ ابھی وہ ٹھیک سے کچھ دیکھ بھی نہیں سکا تھا کہ اُسے اپنے عقب میں ایک ہلکی سی آواز سنائی دی۔ دروازہ کسی طرح بند ہوگیا تھا۔

چند لمحے بعد ہی اُس کی سماعت سے ایک نسوانی آواز ٹکرائی۔ اُس نے آواز کی سمت دیکھا تو اُسے سامنے والی کھڑکی کے باہر مسز انیگل کھڑی ہوئی نظر آئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''مجھے اُمید تھی کہ تم چارے پر مُنہ ضرور مارو گے اور وہی ہوا بھی!''

وہ سلاخوں دار کھڑکی کی سمت بڑھا۔ ''تمہارا کیا مطلب ہے اِس سے؟'' وہ سختی سے بولا۔ ''یہ تم نے مجھے اندر کیوں بند کردیا ہے؟''

''بھلا تم یہ کیسے بھول سکتے تھے کہ فالتو کنجیاں کہاں رکھی ہوئی ہیں!'' وہ ہنسی۔ ''میرے بھولے بچے! میں نے تمہیں جان بوجھ کر کنجیوں کے بارے بتایا تھا۔ آج جب تم نے کہا کہ کام سے جارہے ہو تو میں سمجھ گئی کہ تمہیں کون سا کام ہوگا!''

''لیکن میں تو صرف اپنا استعجاب دُور کرنے آیا تھا۔ میں نے کچھ لیا نہیں ہے اور نہ ہی کچھ لینے کی میری نیت تھی۔''

مسز انیگل نے اُس کی بات سنی اَن سنی کردی اور بولی۔ ''تم شاید مسز ہاورڈ کا نام بھول چکے ہوگے کیونکہ اُس کے بعد تمہیں یقیناً دوسری عورتیں بھی ملی ہوں گی۔ بہرحال تم مسز ہاورڈ کا سر پھاڑ دیا تھا اور وہی مسز ہاورڈ میری چھوٹی بہن ہے جو ابھی تک مفلوج ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کھڑکی سے کچھ اور قریب ہوگئی۔ ''میں تمہاری تلاش میں تھی۔ میں نے سوچا تھا اگر تم مل گئے تو تمہیں کوئی فوری سزا دوں گی مگر اب میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔ میں نے تمہارے لیے اب ایک اور بات سوچی ہے اور تمہارے لیے وہی موزوں بھی ہے۔'' مسز انیگل یہ

کہہ کر سامنے سے ہٹ گئی۔

آرتھر کو پتا نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے! اُسے کسی بٹن کے دبنے کی آواز سنائی دی اور اِس کے ساتھ ہی اُس کا کمرا روشنی سے منور ہوگیا۔ اُس کمرے میں صرف چند کرسیاں اور ایک میز تھی۔ دیواروں پر جانوروں اور بچوں کی کئی تصاویر آویزاں تھیں۔ فرش کسی ربڑ جیسے میٹریل کا بنا ہوا لگتا تھا۔ معاً آرتھر نے مسز انیگل کا قہقہہ سنا اور پھر وہ دوبارہ کھڑکی میں نظر آئی۔

''یہ کمرا دراصل ایک بچے کے کھیلنے کا ہے۔ سامنے کی الماری میں بے شمار کھلونے رکھے ہوئے ہیں۔'' مسز انیگل کہہ رہی تھی۔ ''تمہارے بارے میں مجھے صحیح علم نہیں تھا مگر جب تم نے اپنی درد بھری داستان سنائی تو مجھے یقین ہوگیا کہ میرے سامنے کون ہے! میری بہن مجھے یہ کہانی سنا چکی تھی۔''

آرتھر کو اب غصہ آرہا تھا۔ وہ چلایا۔ ''مجھے باہر آنے دو ورنہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ گی۔''

''چیخنے کی ضرورت نہیں!'' بڑھیا نے اطمینان سے کہا۔ ''تمہارے لیے میرے پاس ایک اچھی خبر ہے۔ میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا کہ میرا کوئی بچہ نہیں۔ میرا ایک بچہ ہے جو اسی عمارت میں تمہارے ساتھ موجود ہے۔''

آرتھر نے پریشانی اور غصے کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھا۔

''تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں! وہ اِس وقت عقب کے رہائشی کوارٹرز میں ہوگا۔ اِس سے قبل کہ میں بٹن دبا کر دروازہ کھولوں اور اُسے اندر آنے دوں، اُس کے بارے میں تمہیں کچھ بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں۔ وہ ٹھیک تمہاری عمر کا ہوگا، یہی کوئی پچیس سال کا! میرا ارادہ تھا کہ اُسے کسی اسپتال وغیرہ میں داخل کرادوں لیکن میرا دل اِس پر آمادہ نہ ہوا۔ وہ دراصل ذہنی طور پر ابھی بچہ ہے اور بعض اوقات قطعی غیر متوقع حرکات کر بیٹھتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ خطرناک نہیں البتہ یہ دوسری بات ہے کہ اُسے چڑا دیا جائے تو ممکن ہے وہ خطرناک ہوجائے۔''

''مجھے یہاں سے نکالو!'' آرتھر نے کھڑکی کی سلاخوں پر زور صَرف کرتے ہوئے کہا۔

''تم صرف میری بات غور سے سنو! اِسی میں تمہاری بہتری ہے۔'' مسز انیگل نے کہا۔ ''یاد رکھو لڑکے! اگر تم نے ناخوش کیا یا اُسے غصہ دلایا تو تم کہیں کے نہیں رہو گے۔''

اُسی لمحے کمرے کا دوسرا دروازہ کھلا اور ایک بھاری بھرکم مضبوط جثے کا نوجوان اندر آگیا۔ چند لمحے وہ آرتھر کو دیکھ کر ٹھٹکا اور خاموش کھڑا رہا۔ اُس کی آنکھوں میں حیرت تھی اور وہ کسی قدر خوف زدہ بھی لگ رہا تھا۔ کچھ دیر وہ اِسی حالت میں رہا، پھر جیسے اُس کی کیفیت بدلنے لگی۔ وہ مسکرایا اور پھرتی سے اُس الماری کی سمت بڑھا جس میں کھلونے تھے۔ وہاں سے اُس نے ایک ربر کی گیند نکالی۔ اُس نے گیند کو فرش پر مار کر اُچھالا اور ہاتھ میں روک لیا۔ پھر یہی عمل کئی بار دُہرایا۔ یکا یک اُس نے گیند، آرتھر کی سمت اچھال دی اور چلایا۔ ''کھیلو!..... میرے ساتھ کھیلو!'' یہ کہتے ہوئے اُس نے گیند ایک بار پھر آرتھر کی سمت اُچھال دی۔

آرتھر نے اُسے لپک لیا اور دوبارہ نوجوان کی سمت اُچھال دیا۔ اُسی لمحے مسز انیگل کی آواز سنائی دی جو خوشی سے لبریز تھی۔ ''اچھے جا رہے ہو! ابتدا میں تمہیں خاصی تھکن محسوس ہوگی لیکن مجھے اُمید ہے کہ تم جلد ہی اِس کے عادی ہوجاؤ گے۔ میرا بچہ بہت اکیلا پن محسوس کرتا تھا۔ وہ اکلوتا ہے نا، تمہاری طرح بچپن سے اُسے کوئی ایسا ساتھی نہیں ملا جو اُس کے ساتھ کھیل سکے۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ تمہیں تنہائی کا احساس نہیں ہونے دے گا۔''

تکمیل آرزو

عطیہ زاہرہ

ایک ایسے ڈاکٹر کا قصہ جسے پُراسرار باتوں اور پُراسرار علوم سے دلچسپی تھی، جو جانوروں کے جذبات و محسوسات بھی ان کی آنکھوں میں جھانک کر جان لیتا تھا۔

ایک کہانی جس کی ابتدا ایک پراسرار بلی سے شروع ہوتی ہے اور انتہا۔۔۔۔

ایک پُراسرار معاشرتی کہانی، عمران ڈائجسٹ کے آخری صفحات کے لیے

ایم بی بی ایس کرنے کے بعد میں نے نفسیات میں ایم اے کی ڈگری بھی حاصل کی لیکن مجھے بچپن سے ہی پراسرار باتوں اور پراسرار علوم سے دلچسپی تھی۔ اس سلسلے میں مجھے خود اپنے اندر کئی مخفی صلاحیتوں کا تجربہ ہوتا رہتا تھا۔ مثلاً میں عموماً صرف دوسروں کو نگاہ بھر کے دیکھنے سے ہی ان کے خیالات سے واقف ہوجاتا تھا۔ ہمیشہ نہیں، کبھی کبھی۔ اس طرح جانوروں کے جذبات و محسوسات بھی ان کی آنکھوں میں جھانک کر جان لیتا تھا۔ یہ بھی عام طور پر نہیں بلکہ گاہے بگاہے۔ اپنی اسی صلاحیت کے باعث مجھے ٹیلی پیتھی اور ہپناٹائزم کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا اور میں نے اپنی تعلیم کے دوران ہی ان دونوں علوم کے بارے میں بھی کتابوں کا مطالعہ اور ریاضی مشقوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ جس میں وقت گزارنے کے ساتھ ساتھ مجھے کافی عبور حاصل ہوتا گیا۔ یوں میں نے ایم بی بی ایس پاس کرنے کے بعد جب ذاتی پریکٹس شروع کی تو میرے اندر اتنی قوت اور صلاحیت پیدا ہوچکی تھی کہ میں اپنی آنکھوں کی طاقت سے لوگوں کو تنویمی کیفیت میں مبتلا کرکے ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتا تھا۔ بے جان چیزوں میں حرکت پیدا کرنا، حرکت کرتی ہوئی بنیاد کو ساکت کردینا، انہیں غیر معمولی طور پر ٹھنڈا یا ناقابل برداشت حد تک گرم کردینا اور ایسی ہی کئی اور بظاہر مافوق الفطرت حرکات پر مجھے کافی قدرت حاصل ہوگئی تھی۔ اسی طرح میں دوسروں کے خیالات جاننے اور پڑھنے میں بھی عام طور پر کامیاب ہوجاتا تھا، سوائے اس صورت کے کہ دوسرے شخص کی قوت ارادی معمول سے کچھ زیادہ طاقتور ہو۔

میں نے قدرت کی عطا کردہ اور پھر خود کو حاصل کردہ ان صلاحیتوں کو کبھی کوئی چرچا نہیں ہونے دیا تھا اور نہ ہی ان سے کبھی کوئی غلط یا ناجائز کام لینے کی کوشش کی تھی۔ ڈاکٹر بننے سے قبل جب کبھی مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہوجاتی تھی تو لوگ اس پر تعجب ضرور کرتے تھے۔ مگر وہ اسے محض اتفاق یا میری ہوشیاری اور ذہانت خیال کرتے تھے اور میں خود بھی کچھ منطقی دلائل پیش کرکے ان کے اس تصور کو قائم رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اپنی پریکٹس شروع کرنے کے بعد میں نے ان صلاحیتوں کو بطور علاج و معالجہ کے استعمال کیا اور بڑی کامیابی حاصل کی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ڈاکٹر صاحب صرف نبض پر ہاتھ رکھ کر سب کچھ معلوم کرلیتے ہیں۔ اسی طرح جب میں ان پر ہپناٹزم کے ذریعے تنویمی عمل کرکے ان سے کہتا کہ وہ صحت یاب ہوچکے ہیں اور پھر جب وہ حقیقت میں صحت یاب ہوجاتے تھے تو اسے میری صداقت خیال کرتے اور کہتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں اللہ نے شفایابی کی بڑی صلاحیت دی ہے۔ وہ فوراً مرض پہچان لیتے ہیں اور ان کی دوا کی چند خوراکیں پی کر صحت حاصل ہوجاتی ہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ مجھ میں اسرار واقعات سے دلچسپی تھی، میں لوگوں کی عجیب الجھنیں اور دلچسپ مسائل حل کرنے میں خاصی دلچسپی لیتا تھا لیکن میں نے اپنے شوق کو صرف اپنے طبی میدان تک ہی محدود رکھا تھا۔ کئی پولیس افسران میرے دوست تھے، وکلاء سے بھی خاصی واقفیت تھی مگر کبھی میں نے ان کے معاملات میں دخل اندازی کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میں بہت خاموشی سے اپنی خداداد صلاحیتیں خلق خدا کے مفاد میں صرف کرنا پسند کرتا تھا۔ مجھے کسی بھی قسم کی پبلسٹی اور شہرت کی آرزو نہیں تھی اور نہ ہی میں عوام و خواص کی توجہ کا مرکز بننا چاہتا تھا، ہمیشہ ویسا ہی نہیں ہوتا۔ ایک معمولی سے واقعے نے میری زندگی کا انداز بھی بدل دیا۔ کوئی ارادہ اور خواہش نہ رکھتے ہوئے بھی مجھے ایک عجیب و غریب کیس میں ملوث ہونا پڑا یہ گویا ابتدا تھی۔ اس کے بعد سے تو یوں ہونے لگا کہ میں خواہ کچھ بھی کروں، کہیں بھی جاؤں، کوئی نہ کوئی واقعہ کسی نہ کسی انداز میں میری راہ روک لیتا ہے اور مجھے ناچار مداخلت کرنا پڑتی ہے۔

وہ پہلا واقعہ کچھ اس طرح شروع ہوا کہ میں گرمیوں کے موسم میں اپنے معمول کے مطابق کچھ دن مال گلی کے پرفضا مقام پر گزارنے پہنچا۔ میں نے ایک چھوٹا سا خوب صورت مکان لے رکھا تھا جو کئی سال سے میرے پاس تھا۔ میں گرمیوں کے سیزن میں مہینے دو مہینے کے لیے مال گلی جاتا۔ اس گھر میں قیام کرتا۔ کھانا ہوٹلوں میں کھاتا۔ ناشتا خود کر لیتا اور ایک دو ماہ ٹھہر کر واپس آ جاتا۔ کبھی کبھی کسی ملازم باورچی کا بھی انتظام کر لیتا جو گھر کی صفائی ستھرائی بھی کرتا اور کھانا و ناشتا بھی تیار کرتا اس سال بھی میں نے ایک پہاڑی باورچی نوکر رکھ لیا تھا جس کا نام اللہ رکھا تھا۔ اتفاق سے اس سال میری روانگی کچھ تاخیر سے ہوئی تھی۔ اتنی تاخیر سے کہ برسات کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ مال گلی کی دلچسپیاں، کھیل تماشے، ٹورنامنٹس برسات کے موسم سے پہلے ہی ختم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، جو رنگینی وہاں مئی جون میں نظر آتی تھی وہ جولائی اگست میں ماند پڑ جاتی تھی۔ نصف سے زیادہ سیاح اور میدانی شہروں سے آنے والے واپس چلے جاتے تھے۔ میرا ارادہ زیادہ سے زیادہ ایک ماہ قیام کرنے کا تھا۔

میں علی الصبح فجر کی نماز کے بعد ہمیشہ سے دو تین میل چہل قدمی کا عادی تھا۔ اس روز بھی حسب معمول سیر کے لیے نکلا۔ میں بازار سے گزرتے ہوئے جھیل تک آیا اور بازار کی سائڈ چھوڑ کر جھیل کے دوسرے کنارے کی پگڈنڈی نما سڑک پر صبح کی تروتازہ ہوا میں گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ میرے داہنے ہاتھ کی جانب ڈھلوان پہاڑی تھی جو سرسبز درختوں اور خودرو پہاڑی پودوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں تقریباً ایک دو فرلانگ ہی چلا تھا کہ اچانک پہاڑی سے ایک سیاہ بلی کود کر میرے راستے میں آ گئی۔ بلی بڑی خوب صورت اور ایرانی نسل کی معلوم ہو رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں چھڑی ہونے کے باوجود اس نے کسی خوف کا اظہار نہیں کیا اور ہلکی سی میاؤں کے ساتھ وہ میری طرف غور سے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کی چمک دار آنکھوں کو غور سے دیکھا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھ سے کسی قسم کی امداد کی طالب ہو۔ میں نے اس کی دماغی لہروں کو پڑھنے کی کوشش کی مگر کچھ اور معلوم کرنے سے قاصر رہا۔ میں نے سوچا شاید وہ بھوکی ہے اور وہ کچھ کھانے کی خواہش مند ہے۔ مجھے کتوں، بلیوں سے کچھ زیادہ لگاؤ نہیں ہے، ویسے بھی اس وقت میرے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں تھی جو اسے دے سکتا۔ اس لیے میں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی اور آگے بڑھ گیا۔

لیکن میں نے پلٹ کر دیکھا کہ بلی میرے ساتھ آ رہی ہے۔ میں نے پھر بھی کوئی خیال نہیں کیا۔ تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کر کے میں نے اپنی رسٹ واچ دیکھی، ناشتے کا وقت قریب تھا۔ میں واپس لوٹ پڑا۔ بلی بھی واپس گھوم گئی۔ وہ مجھ سے پانچ چھ قدم پیچھے یوں چل رہی تھی جیسے میری پالتو بلی ہو۔ بڑے بازار سے گزر کر جب میں اپنے گھر کی طرف جانے والی سڑک پر پہنچا تو بلی اس وقت بھی میرے ساتھ تھی۔ میں نے سوچا چلو آنے دو۔ گھر پہنچ کر اسے تھوڑا دودھ دے دوں گا، مگر میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ ایسی قیمتی بلیاں یقیناً سڑکوں پر آوارہ نہیں پھرتیں یقیناً یہ کسی بڑے آدمی کی پالتو بلی ہوگی جو کسی وجہ سے گھر سے بھاگ آئی ہے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ دودھ پی کر اگر یہ جانا چاہے گی تو چلی جائے گی ورنہ میں اسے اپنے پاس رکھ لوں گا۔ ممکن ہے دو چار دن میں اس کے مالک کا پتا چل جائے گا۔

اللہ رکھا ناشتہ لایا تو اس نے بلی کو دیکھ کر کسی حیرت یا تجسس کا اظہار نہیں کیا۔ نہ ہی اس کے بارے میں کوئی سوال کیا۔ وہ بہت خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی تھا اور مجھے اس کی یہ بات بہت پسند تھی۔ اس نے خاموشی سے ناشتا میز پر رکھا اور چلا گیا۔ میں نے ڈبل روٹی کا اک توس دودھ میں بھگو کر ایک پلیٹ میں رکھ کر بلی کو دے دیا۔ اس نے توس کھا تو لیا مگر اس طرح جیسے وہ محض میرا

دل رکھنے کو کھا رہی ہو ورنہ حقیقت میں اسے کوئی خواہش نہ ہو۔ میں نے کچھ تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور ایک مرتبہ پھر اس کی ذہنی لہروں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ یہ واضح تھا کہ مجھ سے کسی قسم کی امداد چاہتی تھی مگر کیسی مدد؟ یہ میں اب بھی سمجھنے سے قاصر رہا۔

ناشتے کے بعد کچھ دیر تک اخبار پڑھتا رہا۔ بلی خاموشی سے ایک جانب بیٹھی رہی۔ مجھے کچھ ضروری کام تھا۔ تقریباً دس بجے میں لباس تبدیل کر کے باہر جانے لگا تو بلی نے میرے ساتھ آنے کی کوشش کی۔ اب ظاہر ہے کہ میں اسے اپنا دم چھلا تو نہیں بنا سکتا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ دماغی لہروں کے ذریعے اسے حکم دیا کہ وہ گھر میں رہنا چاہے تو رہ سکتی ہے ہر جگہ میرے ساتھ نہیں جا سکتی۔ وہ میری بات سمجھ گئی اور دوبارہ خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ میں نے جاتے ہوئے اللہ رکھا سے کہہ دیا کہ میں اب رات کو واپس آؤں گا اگر بلی گھر میں رہے تو اسے کچھ کھانے کے لیے دے دے۔

دن میں اپنی مصروفیات کے دوران بلی کا خیال میرے ذہن سے بالکل نکل گیا۔ رات کو تقریباً گیارہ بجے واپس آیا تو اسے اپنے کمرے میں ایک اضطراب کے عالم میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتے دیکھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے میری طرف دیکھا اور پھر مجھے وہی احساس ہوا کہ جیسے وہ کسی اہم ضرورت کے سلسلے میں میری مدد کی طالب ہو۔ میں تھکا ہوا تھا۔ کپڑے بدل کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ اللہ رکھا نے بتایا کہ اس نے دوپہر اور شام کو خاص طور سے بلی کو گوشت، دودھ اور روٹی کھلانے کی کوشش کی مگر بلی نے تھوڑا دودھ پینے کے علاوہ کسی چیز کو منہ نہیں لگایا۔ دن بھر وہ بے قراری کی کیفیت میں سارے گھر میں چکر لگاتی اور بار بار میرے کمرے میں آتی رہی جیسے میری واپسی کا انتظار کر رہی ہو اور پھر مغرب کے بعد سے تو میرے کمرے میں ہی گھس کر بیٹھ گئی۔ میں نے ایک بار پھر غور سے بلی کی آنکھوں میں جھانک کر اس کے محسوسات کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن اس کی ایک بات کے علاوہ وہ کسی مخصوص کام میں میری مدد کی طلب گار ہے، کچھ اور معلوم نہیں کر سکا، میں نے اسے اپنی دماغی لہروں سے ہدایت کی کہ رات زیادہ ہو چکی ہے میں تھکا ہوا بھی ہوں۔ وہ رات بھر صبر کرے، صبح اٹھ کر میں اس کی مشکل کو سمجھنے کی اور ممکن ہوا تو مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔ بلی کچھ مطمئن ہو کر کمرے کے ایک گوشے میں جا کر بیٹھ گئی۔ میں نے لباس تبدیل کیا اور کچھ دیر مطالعہ کرنے کے بعد جو کہ رات کو سونے سے قبل میری ایک تقریباً مستقل عادت ہے، خود بھی سو گیا۔

دوسری صبح میں حسب معمول چہل قدمی کے لیے جانے لگا تو مجھے محسوس ہوا جیسے بلی میرے ساتھ آنا چاہتی ہو اور میں نے اسے آنے کی اجازت دے دی۔ راستے میں، میں نے اسے بتایا کہ چونکہ اب ایسا لگتا ہے کہ میرا اور اس کا ساتھ کچھ عرصے کے لیے مقدر ہو چکا ہے اس لیے بہتر ہے کہ اس کا کوئی نام رکھ دیا جائے، چنانچہ میں اسے سمجھایا کہ میں اسے آئندہ مونا کہہ کر پکاروں گا۔ بلی نے اس کا جواب ایک ہلکی سی میاؤں سے دیا۔ گویا اسے اس نام پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ میرے ساتھ قدم بہ قدم چلتی رہی لیکن جب میں جھیل کے پاس پہنچ کر اسی پتلی پگڈنڈی کی جانب گھومنے لگا تو وہ رک گئی اور مخالف سمت میں اس جانب دیکھنے لگی جہاں سے پہاڑی سڑک بارہ سری کی طرف جاتی تھی۔ میں اس کا مقصد سمجھ گیا اور اسی راستے کی طرف چل دیا۔ مونا کو میری اس حرکت سے خوشی ہوئی۔ وہ جوش کے عالم میں بھاگ کر کچھ دور جاتی پھر رک کر میرے پہنچنے کا انتظار کرتی۔ میں قریب پہنچتا تو وہ پھر بھاگ کر آگے بڑھ جاتی۔ اس پہاڑی راستے پر بھی تھوڑے تھوڑے فاصلے سے میسر آنے والی کشادہ جگہ کے اعتبار سے چھوٹے بڑے مکانات اور بنگلے بنے ہوئے تھے۔ راستے میں ملنے والا تیسرا بنگلہ ڈاکٹر عرفان کا تھا۔ جو ایک مشہور ڈاکٹر سرجن اور ساتھ ہی ساتھ مال گلی

میونسپل کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ میں ان سے خاصی اچھی طرح واقف تھا۔

مونا، ڈاکٹر عرفان کے بنگلے کے گیٹ کے سامنے رک گئی، میں آگے بڑھ گیا مگر وہ اپنی جگہ سے آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ تھی۔ میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا، مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ چاہتی ہے کہ میں ڈاکٹر عرفان سے ملاقات کروں۔ ڈاکٹر صاحب سے میری ملاقات گزشتہ سال ہوئی تھی۔ اس سال میں جب سے آیا تھا ان سے ملنے کے لیے وقت نہیں نکال سکا تھا اور نہ ہی شام کے اوقات میں کسی تفریح گاہ میں ان سے مڈبھیڑ ہوسکی تھی۔ میں نے بھی سوچا کہ چلو اس بہانے ان سے ملاقات ہوجائے گی۔ شاید مونا انہیں پہچانتی ہو یا وہ جانتے ہوں کہ یہ کس کی بیٹی ہے تو یہ مسئلہ بھی حل ہوجائے گا۔ چنانچہ میں نے گیٹ پر لگا ہوا کال بیل کا بٹن دبادیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ڈاکٹر عمران کا کنبہ مختصر ہے۔ یعنی وہ ان کی بیگم اور ایک بیٹی پنکی۔ بس اتنے ہی افراد بنگلے میں رہتے تھے ان کا بڑا لڑکا ڈاکٹری کی اعلا تعلیم کے لیے امریکا گیا ہوا تھا۔

گھنٹی کے جواب میں خود ڈاکٹر صاحب ایک اونی گاؤن پہنے ہوئے نمودار ہوئے، مجھے دیکھ کر بڑے تپاک اور گرم جوشی کا اظہار کیا اور ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے۔ معلوم ہوا کہ بنگلے کے پیچھے چھوٹے سے لان میں وہ اس وقت ہلکی پھلکی ورزش کرتے ہیں۔ اس سے تقریباً فارغ ہوچکے ہیں۔ مجھ سے انہوں نے کہا کہ میں اطمینان سے بیٹھوں وہ لباس تبدیل کر کے ابھی آتے ہیں۔ انہوں نے مونا کو میرے ساتھ دیکھ کر کسی حیرت یا تجسس کا اظہار نہیں کیا۔ غالباً وہ سمجھ رہے تھے کہ میری پالتو بلی ہے۔ اس سے مجھے قدرے مایوسی ہوئی کیونکہ میں تو یہ توقع کررہا تھا کہ شاید وہ مونا کے بارے میں کچھ بتاسکیں۔ بہرحال میں بیٹھ گیا۔ اسی وقت مسز عمران آگئیں۔ وہ بہت خوش اخلاق اور مہمان نواز خاتون تھیں۔ میں ان سے باتیں کرنے لگا مونا صوفے کی آڑ میں خاموش بیٹھی تھی۔ اس لیے میرا خیال تھا کہ ان کی نظر نہیں پڑی ورنہ وہ اس کے بارے میں ضرور کوئی سوال کرتیں۔

کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب آگئے۔ مسز عمران ناشتا لانے چلی گئیں۔ میں نے مونا کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ اضطراب آمیز انداز سے میری طرف متوجہ تھی۔ میں ڈاکٹر صاحب سے باتیں کرنے لگا دفعتاً میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا کہ میں ان سے ان کے کسی دلچسپ یا پیچیدہ کیس کے بارے میں پوچھوں۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے مونا کی طرف دیکھا، مونا مطمئن نظر آرہی تھی ایسا لگتا تھا جیسے وہ بھی اس امر سے واقف ہوگئی ہے کہ میں اس کے خیالات سمجھ سکتا ہوں۔

میں نے ڈاکٹر صاحب سے یہ ہی سوال پوچھ لیا۔ جواب میں بلا تامل انہوں نے بتایا کہ وہ آج کل ایک نوجوان لڑکی کے کیس کے سلسلے میں کافی پریشان اور فکرمند ہیں۔

''ان کا تعلق چند واسطوں سے نواب خان سے تھا۔ برٹش گورنمنٹ نے ان کی خدمات کے صلہ میں انہیں خان بہادر کا خطاب بھی دیا تھا۔'' تقریباً ایک سال پہلے ان کا انتقال ہوگیا اور خاندان کی، جو کہ اب بہت مختصر رہ گیا ہے، سربراہی ان کے اکلوتے بیٹے محسن علی خان کے ورثے میں آئی۔ وہ انگلینڈ میں بیرسٹری کی تعلیم مکمل کررہے تھے۔ خان بہادر مرحوم نے دو شادیاں کی تھیں۔ ان کی پہلی بیوی ان کے خاندان سے ہی تعلق رکھتی تھیں۔ شادی کے پانچ برس بعد جب بہت منتوں اور مرادوں سے انہیں اولاد کی امید ہوئی تو بدقسمتی سے کیس بگڑ جانے کی وجہ سے نومولود بچہ چند گھنٹوں کے بعد مرگیا اور جسم میں زہر پھیل جانے کے باعث خود بیگم صاحبہ بھی دوسرے دن دنیا سے سدھار گئیں۔ ان کی وفات کے دو برس بعد خان بہادر نے اپنی پسند سے ایک طوائف سے شادی کرلی جو ان کے بقول حالات کی مجبوری سے کوٹھے تک پہنچ گئی تھی۔ اس خاتون کا نام روشن آرا تھا

جسے شادی کے بعد خان بہادر نے روشن آراء کا خطاب دیا۔ روشن آرا کا ایک لڑکا اجمل شاہ پہلے سے موجود تھا جس کے بارے میں کہا گیا کہ وہ ان کے پہلے شوہر سے تھا۔ حقیقت کیا تھی؟ یہ خدا بہتر جانتا ہے۔ بہرحال روشن آرا نے واقعی شریف بیگمات کی طرح خان بہادر صاحب کے اجڑتے اور بکھرتے ہوئے گھر کو سنبھال لیا۔ ان سے خان بہادر کے یہاں دو بچے ہوئے۔ پہلا لڑکا جس کا نام محسن علی رکھا گیا اور دوسری ایک لڑکی جسے زرینہ بیگم کا نام دیا گیا۔ محسن علی خان بچپن سے ہی، بہت ذہین، ہوشیار اور سمجھ دار لڑکا تھا۔ اس نے لاہور یونیورسٹی سے ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری لی اور مزید تعلیم کے لیے انگلینڈ چلا گیا۔

انگلینڈ جانے سے قبل اس کی شادی خاندان ہی کے ایک شریف، نیک سیرت و خوبصورت لڑکی دردانہ خاتون سے کر دی گئی۔ محسن علی خان کا سوتیلا بھائی اجمل شاہ ہزار کوشش کے باوجود مڈل سے زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ مگر تعلیم سے قطع نظر وہ بہت چالاک، موقع شناس اور انتظامی امور میں فطرتاً مہارت رکھنے والا نوجوان تھا۔ خان بہادر صاحب نے اپنی جائیداد، زمینوں اور باغات وغیرہ کا نظم و نسق اس کے سپرد کر دیا جسے اس نے بڑی خوش اسلوبی سے سنبھال لیا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے، خان بہادر مرحوم کو کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ مگر محسن علی خان سے اس کے تعلقات کبھی اچھے نہیں رہے اور چونکہ روشن آرا بھی اپنی نمک خوری یا معاملہ فہمی کی وجہ سے محسن علی خان کو ہی فوقیت دیتی رہی تھیں، اس لیے اجمل شاہ اپنی سگی ماں سے بھی خوش نہیں رہا۔

خان بہادر کے انتقال کے بعد جب ان کا وصیت نامہ پڑھا گیا تو جیسی کہ توقع تھی انہوں نے اپنی جملہ املاک و مال و جائیداد اور خطاب کا وارث محسن علی خان کو قرار دیا تھا لیکن اسے پابند کر دیا گیا کہ وہ اپنی والدہ روشن آراء کے علاوہ گھر کے اخراجات کے لیے دس ہزار روپیہ ماہانہ وظیفہ دے گا۔ اسی طرح دس ہزار روپیہ کا وظیفہ اپنی بہن زرینہ بیگم کو اور پانچ ہزار روپیہ ماہانہ وظیفہ اجمل شاہ کو تاحیات دیتا رہے گا اور اگر یہ سب یا ان میں سے کوئی ایک وظیفے کا خواہش مند نہ ہو تو اس کے عوض جائیداد میں سے مکان یا زمین جس کو نام بنام خود خان بہادر صاحب نے مقرر کر دیا تھا ان کے افراد کو دے دی جائے گی۔ اور پھر ان کا ہر حق ساقط ہو جائے گا۔ میرا اندازہ ہے کہ اجمل شاہ کو وصیت نامہ کی یہ شرائط پسند نہیں تھیں۔ مگر بظاہر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور حسب سابق جائیداد کا انتظام سنبھالتا رہا۔ محسن علی خان نے خود زیر تعلیم ہونے کے باعث اسے اس منصب پر برقرار رکھا تھا۔

محسن علی خان اپنے والد کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے انگلینڈ سے آیا تھا۔ اس کی واپسی کے دو ماہ بعد تھی۔ معلوم ہوا کہ اس کی بیوی دردانہ خاتون حاملہ ہیں خاندانی دستور کے مطابق ہر طرح ان کی احتیاط اور نگہداشت کی جانے لگی مگر کسی نامعلوم وجہ سے دردانہ خاتون کی صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے ابتدا میں اسے زمانہ حمل کی فطری کمزوری پر معمول کیا اور ان کے لیے مقوی ادویات، ٹانک اور حیاتین و پروٹین سے بھرپور غذائیں تجویز کیں لیکن اس تمام علاج و معالجے کے باوجود دردانہ کی صحت گرتی چلی گئی۔ ایک رات جب اس پر کمزوری کے سبب غشی کا دورہ پڑا اور اسے کئی گھنٹے کی کوشش کے بعد ہوش میں لایا جا سکا تو ڈاکٹروں نے اس کے لیے تبدیلی آب و ہوا تجویز کی۔ مال گلی میں خان بہادر کے تین بنگلے ہیں۔ اپریل کے ابتدائی ہفتے میں روشن آرا نے دردانہ کو گھر کے ایک پرانے خاندانی نمک خوار ملازم رحیم بابا اور اپنی بیٹی زرینہ کے ہمراہ یہاں بھیج دیا۔ جس سے وہ مسلسل میرے زیر علاج ہے۔ وہ خود اجمل شاہ کے ساتھ فیصل آباد میں ہی ٹھہری رہیں کیونکہ دردانہ کی بیماری کا تار محسن خان کو انگلینڈ بھیجا گیا تھا جس کے جواب میں اس نے بذریعہ تار ہی اطلاع دی تھی کہ وہ

خود دردانہ کی حالت دیکھنے اور ضروری انتظامات کرنے کے لیے فیصل آباد پہنچ رہا ہے مگر اس کا قیام زیادہ طویل نہ ہوگا۔ روشن آرا اور اجمل شاہ فیصل آباد میں محسن علی خان کی آمد کے منتظر تھے۔ اسے خلاف توقع آنے میں تاخیر ہوگئی۔

وہ جون کے آخری ہفتہ میں فیصل آباد پہنچا۔ ایک رات اپنی آبائی حویلی میں قیام کیا۔ دوسرے دن روشن آرا بخیریت یہاں پہنچ گئیں مگر اجمل شاہ اور محسن علی خان نہ پہنچ سکے۔ جب وہ دوسرے دن بھی غائب رہے تو ان کی تلاش شروع ہوئی۔ اطراف کے کھڈوں میں دیکھ بھال شروع ہوئی اور آخر چوتھے دن ایک بہت ہی گہرے اور عمودی سطح کے کھڈ میں بڑے انعام کے لالچ میں بھی کسی نے اترنے کی ہمت نہیں کی ویسے ہی دوربین کی مدد سے کار کی جو حالت دیکھی گئی تھی اس سے سو فیصد یقین تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بچا ہوگا۔

یہ جانکاہ حادثہ روشن آرا اور ان سے کہیں زیادہ دردانہ کے لیے خطرناک ثابت ہوا۔ اس کی حالت ایک دم بگڑ گئی۔ ایک ہفتے کی مسلسل کوشش اور خدا کی مہربانی سے وہ سردست مرنے سے بچ گئی مگر اب وہ زندہ درگور ہے۔ جینے کی اگر اس کے اندر کوئی خواہش تھی تو وہ بالکل ہی ختم ہو چکی ہے۔ اگرچہ جنم دینے کے لیے زندہ رہنا ہے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس کا مرض ابھی تک کسی ڈاکٹر کی سمجھ میں نہیں آسکا ہے۔ مال گلی کی صحت بخش آب و ہوا میں اس کا بہترین علاج ہو رہا ہے۔ قیمتی دوائیں انجکشن اور وقت پہنچانے والی بہترین غذا استعمال کرائی جارہی ہے۔ مگر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس پر کسی دوا اور کسی غذا کا اثر ہی نہیں ہو رہا ہے۔ جتنی رپورٹس ممکن ہو سکتی ہیں سب لے لی گئی ہیں۔ اسٹول ٹیسٹ، یورین ٹیسٹ، بلڈ ٹیسٹ، ایکسریز مگر کسی سے کوئی بیماری معلوم نہیں ہوتی۔ ہر چیز نارمل ہے۔ ان رپورٹس کے اعتبار سے اسے مکمل طور پر صحت مند ہونا چاہیے تھا مگر نہیں ہے۔ تم چونکہ ایسے پراسرار معاملات سے دلچسپی رکھتے ہو، اس لیے میں نے اس کا کیس اپنے تمام پسِ منظر کے ساتھ تمہارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اب بتاؤ تم ان حالات کی بنا پر کیا رائے قائم کرتے ہو؟''

''آپ نے خان بہادر صاحب کے خاندانی پس منظر اور ان کے وصیت نامے کا ذکر غالباً اسی لیے کیا۔۔۔'' میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''کہ آپ کے خیال میں دردانہ کی بیماری کا اس سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ خاص طور ایسی صورت میں جبکہ ان کے صاحبزادے محسن علی خان بھی بظاہر ایک حادثے کا شکار ہو چکے ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ محسن علی خان نے بھی کوئی وصیت نامہ چھوڑا ہے یا نہیں؟''

''خان بہادر صاحب کے یہاں خاندانی روایت رہی ہے کہ ایک سربراہ کے انتقال اور دوسرے کی جانشینی کے وقت ہی نیا سربراہ اپنا وصیت نامہ تحریر کر دیتا ہے۔ اگرچہ وہ آخری نہیں ہوتا۔ اپنی زندگی کے دوران وہ جب چاہے اس میں اپنی مرضی کے مطابق ردوبدل کر سکتا ہے۔ چنانچہ تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ محسن علی خان کا وصیت نامہ یقینی طور پر موجود ہے۔ اس میں جائیداد کا سربراہ اور وارث اس بچے کو قرار دیا گیا ہے جو دردانہ کے بطن سے پیدا ہونے والا ہے خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ اس کی موت کی صورت میں محسن علی خان کی بہن زرینہ اور دردانہ مشترکہ وارث ہوں گی تاکہ دردانہ دوسری شادی نہ کرلے اور روشن آرا کا وظیفہ وہ ہی رکھا گیا ہے جو خان بہادر مرحوم نے طے کیا تھا اور باقی تفصیلات بھی کم و بیش وہ ہی ہیں جو بہادر خان کی وصیت کا جز ہیں۔''

''اور اس بنا پر آپ کا خیال غالباً یہ ہے کہ کوئی فرد دردانہ اور اس کے بچے کی زندگی کے درپے ہے؟''

ڈاکٹر صاحب نے زبان سے کچھ نہیں کہا صرف اثبات میں سر ہلا دیا ہے۔ وہ کسی سوچ میں گم

معلوم ہورہے تھے۔
"لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا کوئی فرد وہی ہوسکتا ہے جسے دردانہ اوراس کے بچے کی موت سے فائدہ پہنچ سکتا ہو۔ محسن علی خان کی حیات میں تو صورت حال بالکل مختلف تھی، دردانہ یا اس کے بچے کی موت کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی تھی جبکہ آپ کے بقول اس کی بیماری کئی ماہ سے یعنی محسن علی خان کی حادثاتی موت کے قبل سے جاری ہے۔"
"میں اس پہلو پر سوچ رہا تھا۔" ڈاکٹر عمران نے جواب دیا۔
"اور سچ پوچھو تو اس وقت میرا شبہ یہ تھا کہ کوئی شخص باقاعدہ پلاننگ کے تحت خان بہادر کی وسیع جائیداد کے وارثوں کو ایک ایک کر کے ختم کرنا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں اس کا پہلا نشانہ وہ بچہ ہے جو عنقریب پیدا ہونے والا ہے لیکن اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا سمجھوں۔ کیونکہ جو شخص میری نظر میں مشکوک تھا وہ اب خود بھی اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔"
"آپ کا اشارہ اجمل شاہ کی طرف تھا۔"
"ہاں۔۔۔ زرینہ اور دردانہ کے بقول وہ بہت خودغرض، سنگ دل اور اذیت پسند آدمی تھا۔ اس نے بظاہر کبھی کھلم کھلا خان بہادر یا محسن علی خان کے خلاف کوئی کام نہیں کیا مگر وہ بارہا ان سب سے بلکہ اپنی حقیقی ماں روشن آرا سے بھی اپنی نفرت کا اظہار کرتا رہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ صرف حالات کی مجبوری نے اسے خان بہادر کی چاکری اور ملازمت پر مجبور کردیا ہے اور اسے جب بھی موقع ملا، وہ اس قید و بند سے آزاد ہوجائے گا۔ اسے اپنی ماں سے یہ شکایت تھی کہ انہوں نے اول تو اس کی ولدیت مشکوک کردی پھر ایک بیٹے کو جنم دے کر خان بہادر کو وارث فراہم کردیا۔ وہ چاہتیں تو پیدا ہوتے ہی محسن علی خان کو موت کے گھاٹ اتار سکتی تھیں، اس کے بعد صرف زرینہ رہ جاتی اور عین ممکن تھا کہ خان بہادر، زرینہ سے اس کی شادی کر کے اسے جائیداد کا وارث بنادیتے حالانکہ اس کی اور زرینہ کی عمر میں کم و بیش بیس سال کا فرق تھا۔"
"اجمل شاہ نے اگر کوئی سازشی منصوبہ سوچا بھی تھا۔۔۔" میں نے کہا۔
"تو وہ اس کی موت کے ساتھ ختم ہوگیا چنانچہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی موت کے بعد دردانہ کی صحت بہتر ہونا چاہیے تھی۔ یعنی یہ اس صورت میں کہ اجمل شاہ کسی بھی طرح اس کی خرابی صحت کا ذمہ دار سمجھا جائے تب۔ تو اب اس کی حالت کیوں خراب ہوئی جارہی ہے، اس کا ذمہ دار کون ہے؟"
"یہ اپنے شوہر کی موت کا صدمہ بھی ہوسکتا ہے۔" ڈاکٹر عمران نے کہا۔
"ویسے میں سوچ رہا تھا کہ تم سے ملاقات ہوجائے تو کہوں کہ ایک بار تم بھی دردانہ کو دیکھ لو شاید تمہارا ہپناٹزم اس کی کچھ مدد کرسکے۔"
"ڈاکٹر عمران ان چند گنے چنے افراد میں شامل تھے جو میری ان صلاحیتوں سے واقف تھے۔ اگرچہ شاید انہیں یقین نہ تھا۔"
میں نے مونا کی طرف دیکھا، وہ اس صورت حال سے کافی مطمئن نظر آتی تھی۔ غالباً اسی وقت ڈاکٹر عمران نے بھی پہلی بار اسے کچھ توجہ کا مستحق سمجھا۔
"یہ تمہاری بلی ہے؟" انہوں نے پوچھا۔
"نہیں۔ میری تو نہیں۔ بس اتفاقاً مل گئی ہے۔" میں نے جواب دیا۔
"بہت خوبصورت ایرانی بلی ہے۔" وہ بولے۔
"روشن آرا کو بھی ایرانی بلیوں کا بڑا شوق ہے بلکہ کہنا چاہیے تھا کہ میں نے ہمیشہ ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی بلی ضرور دیکھی۔ مگر اس مرتبہ وہ مال گلی آئی ہیں تو ان کی بلی جسے وہ سوئٹی کہتی ہیں ان کے ساتھ نہیں تھی۔ میں نے پوچھا تو انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بات ٹال دی۔ اچھا خیر تم بتاؤ کہ دردانہ کو دیکھنے کب چل رہے ہو؟"
"جب آپ کہیں۔" میں نے جواب دیا۔

''میں تقریباً روزانہ ایک چکر لگاتا ہوں۔ ہمہ وقت دیکھ بھال کے لیے میں نے ایک اچھی نرس کا انتظام کردیا ہے۔ اس کا نام فرزانہ ہے۔ ایک غریب گھر کی لڑکی ہے اور خود اپنی محنت سے میٹرک کر کے نرسنگ کا کورس پاس کیا ہے۔ وہ بہت اچھی طرح دردانہ کی دیکھ بھال کررہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم آج شام کو میرے ساتھ چلو۔ خان بہادر صاحب کا خوب صورت بنگلہ زیادہ دور نہیں۔ سڑک بھی اچھی ہے، چھوٹی کار جیسی کہ میرے پاس ہے یا خان بہادر صاحب کی اپنی کار ہے۔ آسانی سے آجاسکتی ہے۔''

''بہتر ہے۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''تو اب اجازت دیں۔ میں شام کو حاضر ہوجاؤں گا، آپ کس وقت جائیں گے؟''

''یہ ہی کوئی آٹھ ساڑھے آٹھ بجے۔'' ڈاکٹر عمران بھی میرے ساتھ ساتھ کھڑے ہوگئے۔

میں دن بھر ڈاکٹر عمران کے بتائے ہوئے حالات پر غور کرتا رہا اور شام کو مغرب کے بعد جب گھر گیا تو میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ میں واقعی کوئی مفید خدمت انجام دے سکوں تو خان بہادر صاحب کے بنگلے میں (جس کا نام انہوں نے لال حویلی رکھا تھا) میرے مستقل قیام کی گنجائش پیدا کریں۔ میں اس داستان کے ہر کردار کو، اس کے ہر رنگ اور ہر موڑ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ یہ کوئی مشکل بات نہیں، وہ میرا تعارف ڈاکٹر سلطان علی کی حیثیت سے تو کرائیں گے ہی'' ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیں گے کہ انہوں نے مجھے خاص طور سے دردانہ کے علاج میں مشورہ دینے کے لیے طلب کیا ہے، اس لیے میں بنگلے میں ہی قیام کروں گا۔''

ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کی کار میں تقریباً آٹھ بجے روانہ ہوئے۔ مونا میرے ساتھ تھی۔ وہ خود بھی ساتھ آنا چاہتی تھی اور میں نے بھی اس کی موجودگی کو بہتر خیال کیا تھا۔ راستہ دس منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا۔ بنگلے کے گیٹ پر بوڑھے ملازم رحیم بابا نے ہمارا استقبال کیا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا وہ ایک ایمان دار، مخلص اور وفادار معلوم ہوتا تھا۔ ڈاکٹر عمران کار سے اترے تو اس نے ان کا بیگ سنبھال لیا میں اور ڈاکٹر صاحب آگے چلے، برآمدے کے پہلے کمرے کے دروازے پر ایک طویل قامت چوڑے چکلے، تندرست جسم کی مالک خاتون، بہت قیمتی مگر سادہ تراش کا شلوار قمیص کا سوٹ پہنے کھڑی تھیں۔ جسم کی مناسبت سے چہرہ بھی بھاری اور پھیلا ہوا تھا۔ سر کے بال نصف سے زیادہ سفید ہوچکے تھے۔ پیشانی کشادہ، گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں۔ آنکھیں قدرے چھوٹی مگر روشن اور چمک دار تھیں۔ میں نے اندازہ کرلیا تھا کہ یہ ہی روشن آرا ہوسکتی ہیں۔ ڈاکٹر عمران نے تعارف کرایا تو اس اندازے کی تصدیق ہوگئی۔

''یہ ڈاکٹر سلطان علی ہیں۔'' ڈاکٹر عمران نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بہت قابل ڈاکٹر ہیں، پیچیدہ نفسیاتی کیسوں کا خاص تجربہ رکھتے ہیں۔ میں نے دردانہ بیٹی کے علاج کے سلسلے میں انہیں خاص طور سے بلایا ہے۔ آپ بنگلے میں ان کی رہائش کا انتظام کرادیں۔ یہ یہیں رہیں گے۔''

روشن آرا نے غور سے میری طرف دیکھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرے ذہن میں جھانکنے کی کوشش کررہی ہیں۔ میں نے فوراً حفاظتی طور پر اپنے خیالات کے گرد ایک حصار بنالیا اور پھر روشن آرا کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر کچھ معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ اتنا اندازہ بہرحال ہوگیا کہ وہ مضبوط قوت ارادی کی مالک ہیں اور شعوری یا غیر شعوری طور پر انہیں بھی یہ قدرت حاصل ہے کہ دوسروں کو اپنے خیالات کا پتا چلنے نہ دیں۔

''قیام کا انتظام تو ہوجائے گا۔'' وہ بولیں۔

''مگر کیا یہ ضروری تھا؟''

''میرے خیال میں بہت ضروری تھا۔'' ڈاکٹر

عمران نے جواب دیا۔

''میں ہر قیمت پر دردانہ کو صحت مند دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''ہم بھی یہ ہی چاہتے ہیں۔'' روشن آرا کی آواز بھی مردانہ اور سخت تھی۔ ''خاص طور سے اس لیے کہ اب اس کی صحت سے اس خاندان کا مستقبل وابستہ ہے۔ ہمیں اس سے خان بہادر کا نیا وارث ملنے کی امید ہے۔''

وہ اور ڈاکٹر عمران باتیں کرتے ہوئے آگے چلے، میں ایک قدم پیچھے تھا۔ رحیم بابا واپس جا چکے تھے۔ مونا جو نہ جانے کیوں ایک پلر کی آڑ میں ہوگئی تھی اب بہت خاموشی سے پیچھے آ رہی تھی۔

ہم ایک بہترین کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے کے ایک گوشے میں خوب صورت مسہری پر ایک بہت ہی خوب صورت لڑکی لیٹی ہوئی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ خوبصورت کتابی چہرا جو کبھی سرخ و سفید رہا ہوگا اس وقت بجلی کی روشنی میں پھیکا اور زرد نظر آ رہا تھا۔ گال پچک گئے تھے اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نظر آ رہے تھے۔ قدموں کی آہٹ سن کر اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور کتاب ایک طرف رکھ کر اٹھنے کی کوشش کی۔

''آرام سے لیٹی رہو بیٹی!'' ڈاکٹر عمران نے جلدی سے قدم بڑھا کر مسہری کے قریب پہنچتے ہوئے کہا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے سے روک دیا۔

''اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

''بس جیسی روز ہوتی ہے۔'' دردانہ نے پھیکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا اور میری طرف دیکھا۔

''یہ ڈاکٹر سلطان علی ہیں۔'' ڈاکٹر عمران نے بتایا۔

''لوگ انہیں جادو گر کہتے ہیں، ایسے پیچیدہ کیس جو کسی کی سمجھ میں نہ آتے ہوں، ایسے مریض جو اپنی صحت سے مایوس ہو جاتے ہوں، یہ انہیں دوبارہ صحت مند، تندرست و توانا بنانے میں کمال رکھتے ہیں۔ میں نے انہیں خاص طور سے تمہارے علاج کے لیے بلایا ہے۔''

دردانہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے ہماری نظریں ملیں، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی انجانی بات سے بہت خوف زدہ اور اپنی زندگی سے مایوس ہے مگر بڑی مخلص اور محبت کرنے والی وفادار لڑکی ہے۔ میں نے اسے اپنی ذہنی لہروں سے تسکین دینے کی کوشش کی۔

''واقعی۔'' اس مرتبہ اس کی مسکراہٹ قدرے زندگی کی حامل تھی۔

''آپ نے سچ کہا۔ ان سے مل کر ہی مجھے ایک سکون کا احساس ہوا ہے۔''

روشن آرا قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔ اچانک ان کی نظریں دروازے کی طرف گئیں اور انہوں نے مونا کو دیکھ لیا۔ میں دردانہ کو مخاطب کر کے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ان کی کرخت آواز کمرے میں گونجی۔

''یہ بلی کس کی ہے؟ یہاں کیسے آئی ہے؟'' وہ صوفے پر کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔ سب لوگ چونک پڑے۔ دردانہ کچھ اور خوف زدہ ہوگئی تھی۔

''یہ میری بلی ہے روشن آرا صاحبہ!'' میں نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

''مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ کو ایرانی بلیاں پسند ہیں۔ اس لیے اسے اپنے ساتھ لے آیا کہ آپ پسند کریں تو اسے بطور تحفہ آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔''

''پسند ہیں نہیں، پسند تھیں۔'' روشن آرا نے چلا کر کہا۔

''مگر یہ منحوس ہوتی ہیں۔ یہ کالی بلیاں ہیں۔ انہوں نے پہلے میرا سہاگ لوٹا پھر میرے بیٹے کو کھا گئیں۔ جس رات خان بہادر صاحب کا انتقال ہوا ہے، میری بلی سوئی ایسی خوف ناک آواز میں چیخ رہی تھی جیسے ساری شیطانی روحیں ایک ساتھ ماتم کر رہی ہوں۔ اور۔۔۔ اور جس کار میں میرا بیٹا محسن مال گئی

آرہا تھا اسی کار میں سوئٹی بھی اس کے ساتھ تھی۔ اب مجھے ان کالی بلیوں کی صورت سے نفرت ہوگئی ہے۔ آپ اسے لے جائیں۔ اس کو واپس کر دیں۔''

''مجھے افسوس ہے بیگم صاحبہ!'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ نہ معلوم مجھے کیوں بیگم صاحبہ کی باتیں من گھڑت معلوم ہو رہی تھیں۔

''میں اسے ڈاکٹر عمران کے ساتھ واپس بھیج دوں گا۔''

''نہیں ڈاکٹر سلطان علی!'' دردانہ اچانک بول اٹھی۔

''امی جان کو بلاوجہ وہم ہوگیا ہے۔ سوئٹی مجھے بہت پسند تھی۔ محسن صاحب بھی اسے بہت چاہتے تھے۔ آپ کی یہ بلی بالکل سوئٹی کی طرح معلوم ہو رہی ہے، یہاں کتابوں کے علاوہ میرا دل بہلانے والا کوئی نہیں ہے۔ آپ اسے یہیں رہنے دیں۔ میں اسے اپنے ساتھ رکھوں گی۔ میرا کچھ وقت اچھا گزر جائے گا۔''

عجیب بات تھی۔ مونا خود کمرے میں آتے ہی اچک کر دردانہ کی مسہری پر چڑھ گئی تھی اور اب دردانہ اٹھ کر اسے پیار کرنے لگی تھی۔

''میرا خیال ہے بیگم صاحبہ!'' ڈاکٹر عمران نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ کو واقعی بلاوجہ وہم ہوگیا ہے۔ دردانہ بیٹی ٹھیک کہہ رہی ہے، بلی کو اسی کے پاس رہنے دیں۔''

روشن آرا نے غصے سے دردانہ کی طرف اور پھر مونا کی طرف دیکھا اور تیز قدموں سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

''آپ نے اس کا نام کیا رکھا ہے ڈاکٹر سلطان علی!'' دردانہ نے پیار سے پوچھا۔

''میری سمجھ میں تو کوئی نام نہیں آیا اس لیے میں اسے مونا کہتا ہوں۔''

''میں اسے سوئٹی کہوں گی۔'' دردانہ نے جواب دیا اور بڑے پیار سے بلی کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

لال حویلی میں رات کا کھانا نو بجے میز پر لگتا تھا۔ ڈاکٹر عمران تو دس پندرہ منٹ ٹھہر کر چلے گئے تھے۔ روشن آرا کی ہدایت پر مجھے عقبی حصے کا ایک کمرا دے دیا گیا تھا۔ میں نے اپنا مختصر سامان کمرے کی الماری میں رکھا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ اتنی دیر میں رحیم بابا نے آ کر کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ میں ڈائننگ روم میں پہنچا تو پہلی مرتبہ زرینہ اور نرس فرزانہ سے ملاقات ہوئی۔ زرینہ ایک صحت مند، دراز قد، متناسب جسم کی حسین لڑکی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو نہ معلوم کیوں اس نے نظریں چرانے کی کوشش کی۔ نرس فرزانہ سانولی سلونی رنگت کی ایک جاذب نظر نوجوان لڑکی تھی۔ ہوشیار اور ذہین معلوم ہوتی تھی۔ جس وقت ڈاکٹر عمران اور میں بنگلے پہنچے تھے تو وہ تین گھنٹے کی چھٹی لے کر اپنی بوڑھی ماں سے ملنے گئی تھی جو مال گلی کے علاقہ میں لکڑی کے ایک چھوٹے سے کیبن نما مکان میں رہتی تھی۔ روشن آرا نے ان دونوں سے میرا تعارف کرایا۔ دردانہ بھی کھانے کی میز پر موجود تھی۔

کھانے کے دوران ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی جس میں روشن آرا اور زرینہ نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ میں دردانہ اور فرزانہ بھی باتیں کرتے رہے، میں نے خاص طور پر کوشش کی کہ دلچسپ باتوں اور چٹکلوں سے ماحول کو شگفتہ رکھا جائے۔ جواباً فرزانہ نے بھی کچھ لطیفے سنائے۔ وہ کافی باتونی لگتی تھی۔ اس کی دماغی لہروں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ لڑکپن سے اب تک مسلسل محنت اور جدوجہد سے تنگ آ چکی ہے اور چاہتی ہے کہ اب اسے کوئی ایسا موقع حاصل ہو جائے جس سے وہ آرام دہ اور محفوظ زندگی گزار سکے۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ اخلاقیات کی بھی کچھ ایسی زیادہ قائل نہیں۔ کوئی چاہے تو اسے خوش گوار مستقبل کا جھانسہ دے کر اپنا آلہ کار بنا سکتا ہے۔

دو تین دن میں ہی مجھے نگرانی اور بنگلے کے افراد کی حرکات و سکنات کے جائزے سے یقین ہوگیا کہ اگر دردانہ کے خلاف کوئی سازش کام کر رہی ہے اور

اسے آہستہ آہستہ کوئی زہر دیا جارہا ہے تو اس کا ذریعہ کسی بھی قسم کی خوراک نہیں ہوسکتی۔ سب کا کھانا اور ناشتا ایک جگہ تیار ہوتا تھا اور لوگ خواہ ایک ساتھ کھانا کھائیں یا اپنے اپنے کمروں میں کھائیں یا ڈائننگ روم میں، کھانے میں زہر کی آمیزش کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ رحیم بابا، جو خود ہی کھانا تیار کرنے میں بھی ماہر تھے، بہت محتاط اور صفائی پسند انسان تھے اور ان کی موجودگی میں کسی کو اپنے ہاتھ کی صفائی دکھانا مشکل تھا۔ پھر چونکہ کسی کے لیے کوئی مخصوص کھانا یا ناشتا الگ سے تیار نہیں ہوتا تھا اور دردانہ کے علاوہ کسی پر کوئی مضر اثرات ظاہر نہیں ہورہے تھے اس لیے قرین قیاس یہ ہی تھا کہ اگر کوئی زہر استعمال کیا جارہا ہے تو اس کا طریقہ کچھ اور ہوگا۔ دوائیں اور پھل جو خصوصی طور پر دردانہ کے لیے آئے تھے، میں نے پوشیدہ طور پر یہ چیزیں کچھ پالتو جانوروں کو کھلا کر دیکھیں اور کوئی خراب اثر نوٹ نہیں کیا۔ پھر جیسا کہ ڈاکٹر عمران نے بھی کہا تھا کہ اگر کسی سازش کا وجود تسلیم کر بھی لیا جائے تو آخر یہ سازش کون کررہا تھا؟ ہر جرم کا کوئی مقصد، کوئی فائدہ ہوتا ہے۔ یہاں دردانہ یا اس کے بچے کی موت سے کسے فائدہ پہنچ سکتا تھا؟ بنیادی طور پر اجمل شاہ کو، مگر وہ خود ایک حادثے کا شکار ہوچکا تھا۔ دوسرے نمبر پر زرینہ تو لیکن میرا تجربہ تھا کہ عورت کی پشت پر جب تک کوئی مرد نہ ہو وہ کوئی ایسی سازش خاص طور سے ایسی کم عمری میں بہ مشکل ہی کرسکتی تھی۔ روشن آراء کو بھی فائدہ پہنچ سکتا تھا بشرطیکہ جائیداد کے تمام ورثا راستے سے ہٹ جائیں لیکن جس شرافت اور وفاداری سے انہوں نے خان بہادر مرحوم کا ساتھ دیا تھا اور پھر عمر کے جس دور میں وہ داخل ہوچکی تھیں اس کے پیش نظر ان سے یہ لالچ متوقع نہیں معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس بات میں شک نہیں تھا کہ وہ بہت مضبوط قوت ارادی کی مالک تھیں۔ میں نے کئی مرتبہ ان کی ذہنی لہروں کو پڑھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ زرینہ نہ معلوم کہاں زیادہ تر اپنے کمرے میں گھسی رہتی تھی۔ میں نے ایک دو مرتبہ اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے اس کا موقع ہی نہیں دیا البتہ اتنا اندازہ میں بہرحال کرچکا تھا کہ دردانہ کی طرح وہ بھی اس بات سے خوف زدہ ہے اگرچہ ان دونوں باتوں کی نوعیت مختلف ہوسکتی تھی۔

دردانہ کا علاج میں نے دوسرے دن ہی شروع کردیا تھا۔ میں نے کوئی دوا تجویز نہیں کی۔ اس کے لیے ڈاکٹر عمران کا نسخہ ہی بہت کافی تھا۔ میں نے اس پر تنویمی کیفیت طاری کرکے اس کے شعور اور تحت الشعور دونوں کو یہ ہدایت دینا شروع کردی کہ وہ صحت یاب ہورہی ہے۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ ظاہر ہوا اور ایک دو بار کے عمل کے بعد ہی اس کی مجموعی کیفیت بہت بہتر اور صحت پذیر نظر آنے لگی۔ ظاہر تھا کہ گھر والوں پر اس کا ردعمل یہ ہی ہونا چاہیے تھا۔ کہ وہ میری صداقت سے متاثر اور میرے ثناخواں بن جائیں۔ خاص طور سے رحیم بابا تو گویا جیسے میرا کلمہ پڑھنے لگے۔ عمل کے دوران میں اور دردانہ کمرے میں تنہا ہوتے تھے اور کسی کو بھی اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ کام میں رات کو اس کے سونے سے قبل کرتا تھا۔ غالباً چوتھے دن کی بات ہے کہ میں جب کمرے میں داخل ہوا تو دردانہ نے کتاب جو اس کے ہاتھ میں تھی قریبی چھوٹی میز پر یونہی کھلی حالت میں رکھ دی۔ میں حسب معمول مسہری کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا اور ضروری ہدایات دینے لگا۔ مثلاً یہ کہ جسم کو ڈھیلا اور پرسکون حالت میں چھوڑ دو۔ ذہن سے ہر خیال نکال دو۔ آنکھیں بند کرلو اور سوچو کہ تمہیں نیند آرہی ہے وغیرہ وغیرہ میں اپنے مخصوص فقرے پوری ذہنی توجہ کے ساتھ ادا کررہا تھا۔ دردانہ پر غنودگی طاری ہوچکی تھی۔ بیمار ہونے کی وجہ سے وہ بہت آسانی کے ساتھ ہپناٹائز ہوجاتی تھی۔ اچانک میری نظریں کھلی کتاب پر پڑیں۔ نہ جانے کہاں سے کوئی پتنگا اڑتا ہوا آیا اور کتاب کے کھلے صفحے پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے رینگنا شروع کیا۔ ورق کے کنارے پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ ایک لمحہ ہی بیتا ہوگا کہ میں نے اسے تڑپ

دیکھا اور دوسرے ثانیے وہ مرچکا تھا۔

دردانہ کی زہر خورانی کا ذریعہ واضح ہوگیا اور یہ بھی ثابت ہوگیا کہ کوئی اسے واقعی زہر دے رہا تھا۔

میں نے اس تنویمی کیفیت میں اس سے پوچھا کہ جو کتابیں وہ پڑھتی ہے انہیں کون لاکر دیتا ہے؟ اس نے فوری جواب دیا۔ ''سسٹر فرزانہ'' میں نے دردانہ کو ہدایت کہ کہ وہ آئندہ کسی کی بھی لائی ہوئی کوئی کتاب نہیں پڑھے گی۔ اس کے مطالعے کے لیے میں اسے کتابیں لاکر دوں گا۔ اس نے وعدہ کیا۔ میں نے اسے آرام سے سونے اور صبح فطری انداز میں نیند سے جاگنے کی ہدایت کی اور کمرے سے باہر آگیا۔

میں چاہتا تھا کہ کم از کم ایک کتاب حاصل کر کے کسی اچھی سائنس لیبارٹری سے اس کا تجزیہ کراؤں گا لیکن اول تو اس اقدام سے مجرم کو شبہ ہوسکتا تھا، دوسرے مال گلی میں ایسی کوئی مکمل سائنس لیبارٹری موجود نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے اتنا ہی کافی سمجھا کہ دردانہ وہ زہریلی کتابیں پڑھنا بند کردے۔ خود میرے پاس مختلف موضوعات پر کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود تھا۔ چنانچہ میں اسے اپنے گھر سے کتابیں لاکر دینے لگا۔ میرے علاج کے ساتھ زہر خورانی بند ہونے کا اثر حیرت انگیز تھا۔ دو ہی دن میں دردانہ کے زرد چہرے پر ہلکی سرخی آگئی۔ ڈاکٹر عمران بھی حیرت زدہ تھے۔ مگر میں نے انہیں بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں یہ گتھی سلجھانے میں مصروف تھا کہ نرس فرزانہ یہ حرکت خود کررہی تھی یا کسی کے اشارے پر یا کہ وہ اس حرکت سے بالکل انجان تھی۔ یہ تو ظاہر تھا کہ لائبریری سے جاری کراتے وقت کتاب زہریلی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کے صفحات پر زہر کا اسپرے بعد میں کیا جاتا ہوگا تو یہ حرکت کون کرتا تھا؟ میں نے کئی مرتبہ فرزانہ کا ذہن پڑھنے کی کوشش کی اور صرف اتنا معلوم کرنے میں کامیاب ہوسکا کہ یہ کام وہ کسی مرد کے اشارے پر کررہی تھی۔ زہر کا اسپرے بھی وہ مرد ہی کرتا تھا۔ فرزانہ شام کو کتابیں لاکر اپنے کمرے میں رکھ دیتی تھی اور دوسری صبح دردانہ کو دے دیتی تھی۔ کارروائی جو بھی ہوتی تھی، وہ رات میں ہوتی تھی اور کب ہوتی تھی؟ اس کا پتا فرزانہ کو بھی نہیں تھا۔

مجھے بنگلے میں آئے غالباً چھٹا دن تھا۔ سب لوگ رات کا کھانا کھارہے تھے۔ دردانہ روشن آرا کی ناراضی کے خیال سے سوئٹی کے بارے میں بہت احتیاط رکھتی تھی، اسے اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلنے دیتی تھی۔ اس روز صبح سے ہی بادل چھائے ہوئے تھے۔ شام ہوتے ہوتے خاص تیز بارش شروع ہوچکی تھی۔ ہم سب کھانا کھاتے ہوئے باتیں کررہے تھے کہ اچانک دردانہ کے کمرے سے سوئٹی کے خوف ناک انداز میں کرب ناک آوازیں نکالنے کی صدائیں سنائی دیں۔ میں تیزی سے اٹھ کر کمرے کی طرف لپکا۔ دوسرے لوگ بھی میرے پیچھے آئے۔

میں نے جلدی سے دروازے کا پٹ کھولا۔ سامنے سوئٹی فرش پر بڑے تکلیف آمیز انداز میں اِدھر سے اُدھر لوٹ رہی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر وہ پلیٹ رکھی تھی جس میں اسے دودھ یا کھانا دیا جاتا تھا۔ پلیٹ میں کچے گوشت کی ایک دو بوٹیاں نظر آرہی تھیں۔ سوئٹی دیکھتے دیکھتے ساکت ہوگئی۔ اس کی پلیٹ میں گوشت کی بوٹیاں کہاں سے آئیں، کسی کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ دردانہ نے بتایا کہ وہ رات کو سوئٹی کو صرف دودھ پلاتی تھی۔ کھانا یا گوشت جو کچھ بھی ہوتا تھا وہ اسے دوپہر کو دیا جاتا تھا۔

اس حادثے سے فطری طور پر دردانہ افسردہ ہوگئی۔ روشن آرا نے حکم دیا کہ سوئٹی کی لاش اٹھا کر باہر پھینک دی جائے۔ دردانہ نے کہا کہ اس وقت رات اور بارش میں باہر کون جانے کی ہمت کرے گا۔ صبح رحیم بابا اسے کسی کھڈ میں ڈال آئیں گے۔

بات بظاہر ختم ہوگئی۔ رحیم بابا نے سوئٹی کا بے حس و حرکت جسم ایک کپڑے میں لپیٹ کر بنگلے کے عقبی برآمدے کے ایک گوشے میں رکھ دیا۔

مگر دوسری صبح ناشتے کے وقت لوگوں کے حیرت و تعجب کی حد نہ رہی جب انہوں نے سوئٹی کو

بالکل چاق و چوبند حالت میں عقبی برآمدے سے گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔ دردانہ خوشی سے اچھل پڑی۔ سب نے یہ ہی سوچا کہ غالباً گوشت کھا کر سوئی کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ تکلیف سے وہ بے ہوش ہوگئی اور سب نے اسے مردہ سمجھ لیا۔ میں نے بھی یہ ہی سوچا کہ غالباً گوشت کھا کر سوئی بے ہوش ہوگئی تھی۔ میں نے فرزانہ کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر حیرت کا تاثر تھا۔ زرینہ کی آنکھوں سے خوف ظاہر ہو رہا تھا اور روشن آرا نے دیکھا تو دہشت کے عالم میں ان کے ہاتھوں سے وہ چھری گر پڑی جس سے وہ اپنے توس پر مکھن لگا رہی تھیں۔

دردانہ کی صحت اب کافی بہتر ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر عمران بہت خوش اور بہت پرامید تھے کہ اب بچے کی ولادت بھی، جس میں اندازاً صرف ایک ماہ باقی رہ گیا تھا، نارمل طریقے پر بخیر و خوبی ہو جائے گی۔ وہ بار بار مجھ سے پوچھتے تھے کہ میں نے کیا جادو کیا ہے، کون سا عمل پڑھا ہے کہ دردانہ کی گویا کایا پلٹ گئی؟ میں سردست انہیں کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا اس لیے ٹال جاتا تھا۔ اس روز جب کہ سب لوگ ماسوائے روشن آرا، جو سر میں درد کے عذر کے ساتھ اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھیں، سہ پہر کے وقت بنگلے کے لان میں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔ اتفاق سے ڈاکٹر عمران بھی موجود تھے اور وہ اسی موضوع پر بات کر رہے تھے کہ میں نے کیا پڑھ کر پھونکا ہے جو دردانہ صحت مند ہوتی جا رہی ہے۔ ہم لوگ عقبی برآمدے کے قریب گھاس پر کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے کہ میری کرسی تو بالکل دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ برآمدے کی دیوار کے ساتھ ٹکی ہوئی کارنس پر مختلف خوب صورت پھولوں کے چھوٹے گملے ایک قطار کی صورت میں رکھے ہوئے تھے۔ روشن آرا چونکہ کمرے میں تھیں اس لیے سوئی کو بھی دردانہ ساتھ لے آئی تھی اور وہ اس وقت گھاس پر ایک چھوٹی چڑیا کی تاک میں بیٹھی تھی جو اِدھر اُدھر پھدکتی پھر رہی تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے سوئی نے ایک جست لگائی اور چڑیا کو دبوچ لیا۔ میں ایک دم سے اپنی کرسی سے اٹھ کر سوئی کی طرف لپکا تاکہ چڑیا کو اس کی گرفت سے آزاد کرا دوں۔

ابھی میں ایک قدم ہی بڑھا ہوں گا کہ میرے پیچھے ہلکا سا دھماکا ہوا، میں نے پلٹ کر دیکھا برآمدے کی دیوار پر رکھا ہوا ایک گملا میری کرسی کی پشت سے ایک دو انچ کے فاصلے پر ٹوٹ کر بکھرا ہوا تھا۔ دھماکے کی آواز سن کر سوئی نے نہ جانے کیوں خود ہی چڑیا کو چھوڑ دیا تھا اور چڑیا، جسے ذرا سا بھی زخم نہیں آیا تھا۔ ہوا میں پرواز کرتے ہوئے نظروں سے غائب ہوگئی۔

سب لوگ اس حادثے پر تبصرہ کرنے لگے۔ وہ شکر کر رہے تھے کہ گملا گرتے وقت کرسی پر میں نہ تھا، ورنہ وہ میرے سر پر گرتا اور میرا نہ جانے کیا حال ہوتا۔ شکر میں بھی ادا کر رہا تھا مگر میرے نزدیک یہ حادثہ نہیں تھا۔ کوئی مجھے دانستہ ہلاک کرنا چاہتا تھا۔

گملے کے حادثے سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ مجرم، جو کوئی بھی ہے، احمق نہیں ہے۔ وہ جان چکا ہے کہ اس کی سازش میری نظروں میں آ چکی ہے۔ غالباً پہلے وہ سوئی بلی کی نحوست کو اس کی وجہ سمجھ رہا تھا لیکن نرس فرزانہ کے ذریعے کتابوں کا بند کرانا اب اس کے نزدیک ایک اتفاقی امر نہیں رہا۔ چنانچہ اس نے مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے یہ چال چلی تھی۔ اب سوال صرف یہ ہی تھا کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ چائے کی میز سے روشن آرا بھی غیر حاضر تھیں اور نرس فرزانہ بھی۔ فرزانہ پہلے ہی دانستہ اس کی آلہ کار بن چکی ہے۔ گملے کو اس طرح رکھ دینا کہ وہ ذرا سے اشارے سے گر پڑے، کوئی مشکل کام نہ تھا۔ بظاہر روشن آرا سے اس کی توقع نہیں تھی۔ یہ کام فرزانہ کا ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے طے کیا کہ رات کے کھانے کے بعد میں کچھ زیادہ توجہ سے فرزانہ کے خیالات پڑھنے کی کوشش کروں گا۔

لیکن فرزانہ کھانے کی میز پر موجود نہیں تھی۔ پوچھنے پر روشن آرا نے بتایا کہ اس کی طبیعت خراب

ہے۔ سردست وہ اپنے کمرے میں ہے لیکن اس نے چھٹی کی درخواست کی ہے، اس لیے وہ کل ڈاکٹر عمران سے کسی دوسری نرس کا انتظام کرنے کے لیے کہیں گی۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں فرزانہ کے کمرے میں گیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے دستک دی اور کہا کہ اگر اس کی طبیعت خراب ہے تو مجھے دیکھنے کا موقع دے۔ میں اسے ایسی دوا تجویز کروں گا جس سے اس کی طبیعت بحال ہو جائے گی۔ مگر اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے دوبارہ دستک دی تو فرزانہ ایک دم چیخ کر بولی۔

''خدا کے لیے آپ چلے جائیں ڈاکٹر سلطان علی! میں اس وقت بہت اپ سیٹ ہوں، آپ میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔'' میں مجبوراً اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

رات کو سونے سے پہلے میں کافی دیر تک اس مسئلہ پر غور کرتا رہا کہ وہ دشمن کون ہو سکتا ہے جو خان بہادر کے تمام وارثوں کو ختم کر کے خود ان کی دولت و جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ بظاہر جو نام سامنے تھے ان میں سے کوئی بھی یقینی طور پر اس پوشیدہ دشمن کی پہچان پر پورا نہیں اترتا تھا۔ میں اس امکان پر غور کر رہا تھا کہ ممکن ہے خان بہادر صاحب کے خاندان کے کچھ دوسرے دور کے عزیز رشتے داروں سے کوئی اس سازش کا بانی ہو۔ زرینہ کا طرز عمل ابھی تک میرے نزدیک بالکل واضح نہ تھا۔ وہ عجیب قسم کی خاموش اور پر اسرار لڑکی معلوم ہوتی تھی اس کے تعلقات دردانہ سے بھی بس واجبی سے تھے۔ وہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں زیادہ تر اپنے کمرے میں گھسی رہتی تھی۔ معلوم نہیں کس وقت یہ ہی سب کچھ سوچتے سوچتے میں سو گیا اور یہ بھی اندازہ نہیں کہ کتنی دیر سویا ہوں گا کہ اچانک ایک خوف ناک چیخ نے مجھے بے دار کر دیا۔ میں تیزی سے اٹھا۔ قریب ہی کرسی پر رکھا ہوا اونی گاؤن پہن کر باہر نکلا۔ میں نے دیکھا کہ زرینہ اور روشن آرا بھی اپنے اپنے کمروں سے نکل کر اس طرف جا رہی ہیں جس جانب فرزانہ کا کمرا تھا۔ رحیم بابا بھی ایک لاٹھی ہاتھ میں لیے موجود تھے۔ میرا اپنا اندازہ بھی یہ ہی تھا کہ چیخ کی آواز فرزانہ کے کمرے کی جانب سے آئی ہے۔ میں دوڑتا ہوا اس کے کمرے کی طرف چلا۔ دروازہ اب بھی اندر سے بند تھا۔ روشن آرا آوازیں دے رہی تھیں مگر کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ تاخیر کا موقع نہیں تھا۔ میں نے فوراً روشن آرا کو ایک طرف ہٹایا اور پوری قوت سے ایک لات دروازے پر ماری۔ شاید اندر سے چٹخنی نہیں لگی تھی صرف قفل ہی بند تھا کہ اس کا کھٹکا اس ضرب کو نہ سہہ سکا اور دونوں پٹ ایک دھماکے سے کھل گئے۔

ایک حیرت انگیز، المناک منظر ہمارے سامنے تھا۔ فرزانہ کی گردن میں رسی کا پھندا پڑا تھا اور وہ چھت میں لگے ہوئے ایک کنڈے کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ پیروں کے پاس ایک اسٹول گرا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے اسٹول سیدھا کیا جیب سے چاقو نکالا (میں ایسی ضروری چیزیں گاؤن میں رکھنے کا عادی تھا) اور رسی کاٹ دی۔ فرزانہ کو بازوؤں سے سہارا دے کر نیچے اتار کر فرش پر لٹا دیا۔ گردن سے پھندا کھولا اور پوری ذہنی توجہ اس کی طرف مرکوز کر دی اس کے دل کی دھڑکن ابھی بند نہیں ہوئی تھی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

''کیا بات ہے فرزانہ؟'' روشن آرا نے اپنی سخت آواز میں پوچھا۔

''تم خودکشی کیوں کرنا چاہتی تھیں؟''

''میں خودکشی نہیں کرنا چاہتی تھی روشن آرا!'' فرزانہ نے کمزور آواز میں جواب دیا۔

''تو پھر یہ سب کیا ہے؟'' روشن آرا کا لہجہ اور سخت ہو گیا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' فرزانہ کا جواب تھا۔ میری نظریں اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔

''میری طبیعت صبح سے ٹھیک نہیں تھی۔ میں بستر پر لیٹی ہوئی سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اچانک کسی نے کھڑکی پر دستک دی اور اس کے ساتھ ہی دونوں

پٹ خود بہ خود کھل گئے میں نے چونک کر دیکھا۔ کھڑکی میں سے دو خوفناک آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ میں ہمت کر کے اٹھی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ آدمی کون ہے۔ جو یوں بنگلے میں رات کے وقت گھس آیا ہے۔

وہ ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ ایک لمحہ کے لیے میری نظریں اس کی نظروں سے ملیں اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی سرگوشیوں میں کہہ رہا ہے کہ میں چھت کے کنڈے سے رسی باندھ کر اس کا پھندا اپنے گلے میں ڈال لوں، اسٹول پر کھڑی ہو جاؤں اور پھر پیر مار کر اسٹول گرا دوں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس حکم کی تعمیل پر مجبور ہوں۔ میں کھڑکی سے واپس پلٹی تو خدا جانے کہاں سے ایک رسی میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں نے اسے چھت کے کنڈے میں ڈال کر باندھ دیا۔ اسٹول پر کھڑے ہو کر دوسرے سرے پر پھندا بنایا اور اسے اپنے گلے میں پہن لیا پھر میں نے پیر مار کر اسٹول گرا دیا۔ مجھے ایک جھٹکا لگا۔ ساتھ ہی اس طرح جیسے سوتے ہوئے میری آنکھ کھل گئی ہو۔ مجھے ایک دم سے احساس ہوا کہ میں کیا کر گزری ہوں اور یہ کہ اب میری موت یقینی ہے۔ خوف سے میری چیخ نکل گئی اور پھر مجھے معلوم نہیں کیا ہوا۔ شاید میں بے ہوش ہو گئی تھی۔''

روشن آراء کے چہرے پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی مگر صرف ایک لمحہ کے لیے۔

''پھندا ڈال کر لٹکنے سے اس کے ذہن پر اثر ہو گیا ہے۔'' وہ بولیں۔

''معلوم نہیں کیا ہذیان بک رہی ہے۔''

''کوئی جلدی سے ڈاکٹر عمران کو فون کر دے۔'' دردانہ بولی۔ اتنی دیر میں وہ بھی آ گئی تھی۔

اسی لمحہ فرزانہ کے جسم میں حرکت ہوئی۔ وہ بری اینٹھ کر اکڑ گیا اور پھر فوراً ہی ایک جھٹکا سا لگا۔ جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

''یہ مر گئی ہے۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

''میں ڈاکٹر عمران کو فون کرتی ہوں۔'' روشن آرا کمرے سے نکل گئیں۔

مگر چند منٹ بعد ہی انہوں نے واپس آ کر بتایا کہ بنگلے کے دونوں فون ڈیڈ پڑے ہیں۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ باہر بارش بدستور ہو رہی تھی۔ اب نہ ڈاکٹر عمران کو بلانے سے کوئی فائدہ تھا اور نہ پولیس کو فون کیا جا سکتا تھا۔ روشن آرا کے حکم پر فرزانہ کی لاش اسی کمرے میں چھوڑ کر کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔

میں نے دردانہ کو خواب آور دوا کی دو گولیاں دے دیں، اس لیے وہ تو سکون سے سو گئی تھی مگر گھر کے باقی افراد صبح تک ہی جاگتے رہے۔ یہ میرا اندازہ تھا کیونکہ روشن آرا اور زرینہ دونوں ہی اپنے اپنے کمروں میں تھے اور میں ان کے ساتھ نہیں تھا لیکن جب وہ صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ اپنے کمروں سے نکلیں تو ان کی آنکھوں میں نیند کا خمار اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ جاگتی رہی تھیں۔ رحیم بابا نے ناشتا تیار کر لیا تھا مگر اس ماحول میں کسی کا دل کچھ کھانے پینے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر بھی میں نے زور دے کر انہیں کافی کی ایک پیالی اور ایک ہاف بوائل انڈا کھانے پر مجبور کر دیا۔ تقریباً ساڑھے آٹھ بجے رحیم بابا کار لے کر پولیس اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ فون اس وقت بھی ڈیڈ تھا اور یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ خرابی بارش کا نتیجہ تھی یا کسی نے دانستہ کہیں سے فون کے تار کاٹ دیئے تھے۔ بظاہر گھر میں ایسی کوئی حرکت نوٹ نہیں کی گئی۔

نصف گھنٹے کے اندر ہی مقامی پولیس کا ایک انسپکٹر آفتاب خان دو کانسٹیبلوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ میری اس سے کوئی واقفیت نہیں تھی۔ مگر ایسا لگتا تھا جیسے وہ روشن آرا اور خان بہادر مرحوم سے بخوبی واقف تھا اور ان کے مرتبے کا احترام کرتا تھا۔ گھر کا بزرگ ہونے کی حیثیت سے روشن آرا نے ہی انسپکٹر

کو رات کے حادثے کی تمام تفصیلات بتائیں۔ انہوں نے اپنے بقول فرزانہ کے آخری ہذیانی بیان کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ یہ بیان دینے کے فوراً بعد وہ مر گئی۔ اسی وقت پولیس اور ڈاکٹر عمران سے رابطہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی مگر فون کی لائن خراب تھی اور ڈاکٹر شہاب بہرحال ایک ڈاکٹر تھے۔ جو اس کی موت کی تصدیق کر چکے تھے۔ پھر بارش بھی ہو رہی تھی اس لیے یہ ہی فیصلہ کیا گیا کہ لاش کمرے میں بند کر دی جائے اور صبح ہونے پر پولیس میں رپورٹ کی جائے۔ انسپکٹر آفتاب خان نے کوئی مزید سوال یا جرح کرنے سے پہلے لاش دیکھنا چاہی۔ دردانہ ابھی تک سو رہی تھی۔ زرینہ نے کہا کہ وہ دوبارہ اس خوف ناک منظر کا نظارہ نہیں کرنا چاہتی۔ اس لیے میں اور روشن آرا ہی انسپکٹر کے ساتھ چلے۔ میں نے آگے بڑھ کر لگی ہوئی کنڈی کھول دی اور پیچھے ہٹ گیا۔ میرا مطلب تھا کہ پہلے انسپکٹر کمرے میں داخل ہو۔

چنانچہ پہلے آفتاب خان، اس کے پیچھے میں اور آخر میں روشن آرا نے کمرے میں قدم رکھا مگر! ہمارے حیرت و تعجب کی کوئی حد نہ رہی۔ کمرا بالکل خالی تھا۔ فرزانہ کی لاش غائب ہو چکی تھی۔

پورے بنگلے میں ایک ایک فرد کے کمرے میں دیکھا گیا۔ بنگلے کے باہر بھی دور تک تلاش کی گئی۔ بنگلے کی دیوار کے ساتھ ہی کافی گہرے کھڈ کا بھی دوربین کی مدد سے جائزہ لیا گیا مگر فرزانہ کی لاش یوں غائب ہو چکی تھی جیسے کبھی وہاں تھی ہی نہیں۔ انسپکٹر آفتاب خان نے ایک ایک فرد پر اچھی طرح جرح کی۔ دو تین گھنٹے سب کے ساتھ مغز ماری کرنے کے بعد آخر انسپکٹر آفتاب خان ایک عجیب الجھے ہوئے کیس کا بوجھ اپنے ذہن پر لیے واپس چلا گیا۔ چیکنگ سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ کسی نے بنگلے کے باہر فون کا تار کاٹ دیا تھا۔

فرزانہ کی بوڑھی ماں کے لیے یہ حادثہ بڑا جانکاہ تھا۔ روشن آرا نے اسے بلا کر تسلی دی اور کہا کہ جب تک وہ زندہ ہے اسے ہزار روپیہ ماہانہ ملتا رہے گا۔ بڑھیا روشن آرا کو دعائیں دیتی واپس چلی گئی۔

پولیس کا نظریہ یہ تھا کہ فرزانہ کے کسی سے ناجائز تعلقات تھے۔ جس کے نتیجے میں وہ ایک بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اس کا عاشق راتوں کو ملنے آتا تھا۔ اس رات وہ آیا تو فرزانہ نے اسے یہ خبر سنائی۔ عاشق اسے ٹھکرا کر چلا گیا۔ اس صدمے سے فرزانہ نے خودکشی کر لی۔ عاشق کو غالباً بعد میں اندیشہ ہوا ہوگا کہ فرزانہ اسے بدنام نہ کر دے، وہ اسے سمجھانے یا کسی طرح زبان بند کرنے آیا تھا اس کی۔ اس نے فرزانہ کی لاش دیکھی اور اس ڈر سے کہ لوگ فرزانہ کی موت کا ذمہ دار اسے نہ ٹھہرانے لگیں، لاش اٹھا کر لے گیا۔ یہ پولیس کا نظریہ تھا مگر حقیقت میں یہ انسپکٹر آفتاب خان کے دماغ کی اختراع تھی۔ اسے اردو انگریزی کے جاسوسی ناول خاص طور سے منشی تیرتھ رام فیروز پوری کے تراجم پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اسی نظریے کی روشنی میں فرزانہ کے چال چلن اور اس کے دوستوں کے بارے میں تحقیقات کرتا پھر رہا تھا۔ اسے تو خیر حالات بھی معلوم نہیں تھے۔ حیرت تو مجھے ڈاکٹر عمران کے خیالات سن کر ہوئی۔ وہ بھی اسے فرزانہ کی نجی زندگی کا کوئی راز تصور کر رہے تھے۔ انہیں بھی یہ گمان نہیں گزرا کہ اس واقع کا تعلق بھی دردانہ کے خلاف سازش سے ہو سکتا ہے۔

فرزانہ کی موت اور اس کی لاش کی پراسرار گم شدگی کو تین دن گزر چکے تھے۔ ڈاکٹر عمران نے کسی دوسری نرس کا انتظام کرنے کے لیے کہا مگر دردانہ نے منع کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اب اس کی صحت بالکل ٹھیک ہے اس لیے اسے کسی نرس کی ضرورت نہیں ہے۔ روشن آرا نے بھی اس کی رائے سے اتفاق کیا چنانچہ کوئی اور نرس نہیں آئی۔ چوتھے دن میں، روشن آرا اور دردانہ سہ پہر کے وقت لان میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے مختلف باتیں ہو رہی تھیں۔ سہ پہر کی چائے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ سوئٹی اب دردانہ کے کمرے تک محدود نہیں رہی تھی بلکہ جب بھی اسے موقع مل جاتا وہ کمرے سے نکل کر سارے بنگلے میں

گھومتی پھرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ ہم لوگوں سے کچھ فاصلے پر پھولوں کی کیاریوں کے پاس گھاس پر آرام سے بیٹھی تھی۔ دفعتاً اس نے ایک عجیب سی آواز میں میاؤں کہا اور اپنی جگہ اچھلنے کودنے لگی جیسے کسی چیز کو اپنے جسم سے جھاڑنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں لپک کر اس کے قریب گیا تو دیکھا کہ تین چار انتہائی زہریلے بچھو، کافی بڑے اور بالکل سیاہ، اس کے اوپر چڑھے ہوئے ہیں اور برابر ڈنک مار رہے ہیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے سوئٹی ان کے زہر سے نیم جان ہو کر گھاس پر گر پڑی۔

بچھوؤں کی موجودگی اتنی حیرت انگیز نہیں تھی لیکن ایک دم سے چار پانچ بچھو کہاں سے نکل کر اسے لپیٹ گئے؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اپنے بھاری بوٹ سے ان تمام بچھوؤں کو کچل کر مار دیا۔ مگر سوئٹی ابھی تک لب دم معلوم ہوتی تھی۔ وہ گھاس پر تکلیف سے اِدھر اُدھر لوٹ رہی تھی۔ یہاں تک کہ کچھ ہی دیر میں بالکل بے حس و حرکت ہو گئی۔

اس حادثے نے دردانہ کو افسردہ کر دیا۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں بھی اٹھ گیا۔ روشن آرا نے رحیم بابا سے کہا کہ وہ سب کی چائے ان کے کمروں میں پہنچا دے۔

لیکن رات کو جب سب لوگ کھانے کی میز پر جمع ہوئے تو ہماری حیرت کی حد نہ رہی جب ہم نے سوئٹی کو بھی بڑے پُرسکون انداز میں چلتے ہوئے کھانے کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ سوئٹی جس کو ہم مردہ سمجھ چکے تھے، دوبارہ زندہ سلامت ہماری نظروں کے سامنے موجود تھی۔

دردانہ کچھ خوش اور کچھ خوف زدہ معلوم ہو رہی تھی۔ روشن آرا کی کیفیت عجیب تھی، وہ اس طرح آنکھیں پھاڑے سوئٹی کو گھور رہی تھیں جیسے انہیں اپنی نظروں پر اعتبار نہ رہا ہوں۔ میں نے ماحول کو بدلنے کے لیے مزاحیہ لہجے میں کہا کہ بلی کے بارے میں یہ بات بطور روایت صدیوں سے مشہور چلی آ رہی ہے کہ قدرت نے اسے نو زندگیاں دی ہیں۔ یعنی وہ آٹھ مرتبہ مر کر زندہ ہو سکتی ہے۔ اب تک ہم یہ بات صرف کتابوں یا بلی سے متعلق کسی قسم کے اشتہاروں میں پڑھتے آئے تھے، اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ معلوم نہیں دوسروں پر میری بات کیا اثر ہوا مگر روشن آرا ایک دم چیخ کر بولیں۔

”یہ بلی نہیں ہے، کوئی بدروح ہے۔ جب تک یہ اس گھر میں موجود ہے، گھر کا ہر فرد خطرے میں ہے۔ رحیم بابا تم اسے ابھی پکڑ کر کہیں دور پھینک آؤ۔ ایسی جگہ جہاں سے یہ پھر واپس نہ آ سکے۔“

دردانہ بھی کچھ اتنی سہمی سی تھی کہ اس نے روشن آرا کے حکم پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ لیکن رحیم بابا سوئٹی کی جانب بڑھے تو وہ ایک جست لگا کر بھاگ نکلی۔ اس نے انہیں پورے بنگلے میں خوب گھمایا اور اسی آنکھ مچولی میں نامعلوم کہاں غائب ہو گئی کہ شام تک ہر کمرا، برآمدہ، لان، پلنگوں اور الماریوں کے نیچے دیکھنے کے باوجود کہیں نظر نہیں آئی۔

سوئٹی دوسرے دن بھی غائب تھی۔ مجھے ایک ضروری کام سے چند گھنٹوں کے لیے اپنے گھر جانا پڑا۔ واپسی پر پولیس اسٹیشن میں آفتاب خان سے ملنے چلا گیا مگر فرزانہ کی لاش یا اس کے قاتل کا کوئی پتا نہیں چلا تھا اور نہ ہی آفتاب خان یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا کہ فرزانہ کے دوران تعلیم کے بعد، زمانہ تربیت میں یا پھر ملازمت کے دو برسوں میں کسی سے بھی کوئی غیر معمولی نوعیت کے تعلقات رہے ہوں۔

میں بنگلے میں واپس پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ رحیم بابا باورچی خانے میں رات کے کھانے کی آخری تیاریوں میں مصروف تھے۔ روشن آرا کے بارے میں معلوم ہوا کہ ان کے سر میں درد ہے، یہ درد اکثر ان کے سر میں رہتا تھا۔ عموماً شام یا رات کو ہوتا تھا اور وہ اس درد کے باعث کئی کئی گھنٹے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے خاموش لیٹ جاتی تھیں، اس دوران بنگلے کے ہر شخص کو ہدایت تھی کہ وہ کسی قیمت پر انہیں پریشان نہ کرے۔ دردانہ کے متعلق پوچھا تو

رحیم بابا نے بتایا کہ وہ بنگلے کی چھت پر گردوپیش کے مناظر سے لطف اندوز ہونے گئی ہیں۔ جیسا کہ میں نے شاید پہلے کسی جگہ بتایا ہے کہ بنگلے کے ایک جانب کافی گہرا کھڈ واقع تھا جس کی ڈھلان بالکل سیدھی تھی۔ اس کھڈ میں چند گز نیچے اترنا بھی انتہائی مشکل تھا۔ میں چھت پر گیا مگر زینے سے ہی یہ دیکھ کر لوٹ آیا کہ دردانہ ریلنگ کے سہارے کھڑی ہوئی یا تو کسی گہری سوچ میں گم ہے یا آس پاس کے خوب صورت نظارے بڑی محویت سے دیکھ رہی ہے۔ سورج غروب ہوتے ہی پہاڑیوں پر واقع مکانات، بنگلوں اور کیبنوں میں جب بجلی کے بلب جلتے تھے تو سرسبز درختوں کے درمیان یہ رنگ برنگی روشنیاں بہت خوبصورت نظر آتی تھیں۔ میں اسے محفوظ پا کر مطمئن انداز میں چپ چاپ نیچے اتر گیا، اسے ڈسٹرب کرنا ضروری نہیں سمجھا۔

زرینہ کا کمرا میرے کمرے کے سامنے دوسرے برآمدے کے انتہائی آخری کنارے پر واقع تھا۔ اسی جانب دو تین کمرے درمیان میں چھوڑ کر روشن آرا کا کمرا تھا۔ میں نجانے کس خیال کے تحت درمیانی صحن سے گزر کر برآمدے میں پہنچا۔ زرینہ کے کمرے پر آیا غور سے سنا۔ اندر سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ آواز آہستہ ہونے کے باوجود میں نے پہچان لیا کہ دوسری آواز کسی مرد کی ہے۔ گفتگو کے موضوع نے میرے کان کھڑے کردیئے۔ میں بالکل دروازے سے لگ کر سننے کی کوشش کرنے لگا۔ کئی باتیں سمجھ میں آگئیں مگر ذہنی لہروں سے کام لینے کے باوجود یہ معلوم نہیں کرسکا کہ وہ مرد کون ہوسکتا ہے۔ وہ زرینہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ اب زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ کی بات اور ہے، اس کے بعد آخری رکاوٹ بھی دور ہوجائے گی۔ یہ کم بخت ڈاکٹر سلطان علی نہ معلوم کہاں سے آمرا۔ یہ نہ آیا ہوتا تو اب تک سبھی کا قصہ ختم ہوچکا ہوتا۔ میں نے کارلس سے ٹکرا کر اسے مارنے کی کوشش کی مگر اس کی زندگی ابھی باقی تھی کہ وہ بچ گیا۔

زرینہ نے کہا کہ وہ مہینوں سے ایسی ہی تسلیاں دیتا آرہا ہے۔ مگر اب پانی سر سے اونچا ہونے والا ہے۔ وہ کمرے میں بند رہتے رہتے تنگ آچکی ہے اور زیادہ وقت لگا تو کمرے میں بند رہنے سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ لوگ پہچان لیں گے، جس کے بعد اس کے لیے مرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔ مرد نے پھر اطمینان دلایا کہ وہ پریشان نہ ہو۔ یہ اس کا آخری وعدہ ہے۔ ایک ہفتے کے اندر سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔

مجھے زیادہ سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ کم و بیش تمام پیچیدگیاں واضح ہوچکی تھیں۔ جو دو چار باتیں وضاحت طلب تھیں انہیں بھی حل کرنے کے لیے میں نے ایک طریقہ سوچ لیا تھا۔ مجھے آج رات کسی نہ کسی طرح زرینہ کے کمرے میں داخل ہو کر ایک اور کوشش کرنا تھی۔ جس کے لیے دس پندرہ منٹ سے زیادہ وقت درکار نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے بعد کوئی راز، راز نہیں رہے گا۔

دردانہ کچھ دن سے شام اور رات کا ابتدائی حصہ بنگلے کی چھت پر گزارنے لگی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ شام کے بعد چاروں طرف کے دل فریب نظاروں کے علاوہ اسے بنگلے کی چھت کی یہ پرسکون خاموشی اور تروتازہ ہوا میں بیٹھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کھڈ کی طرف دیکھتی ہے تو اگرچہ یہ وہ کھڈ نہیں تھا جہاں محسن علی خان کی کار کا حادثہ ہوا تھا پھر بھی اسے ایسا لگتا ہے جیسے اس کے مرحوم شوہر کی روح اس کے اردگرد گھوم رہی ہے اور اس احساس سے بڑی تسکین ہوتی ہے۔ اسے یہ بھی محسوس ہوتا ہے جیسے محسن علی خان کی روح اس سے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ کوئی پیغام دینا چاہتی ہو۔

روشن آرا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ چھت کی یہ سیڑھیاں اترنا چڑھنا اس کے لیے مناسب نہیں۔ پھر یوں اکیلے بیٹھنا بھی اچھا نہیں ہوتا۔ وہ سوئٹی کی نحوست سے خائف ہیں۔ خدا خدا کر کے وہ اب کچھ صحت یاب ہوئی ہے۔ اگر کسی بدروح

نے اسے تاک لیا تو یہ بڑا المیہ ہوگا۔ جب اس پر بھی دردانہ چھت پر جانے پر مصر رہی تو آخر روشن آرا نے بھی اس کے ساتھ جانا شروع کر دیا مگر دردانہ انہیں وہاں زیادہ دیر ٹھہرنے نہیں دیتی تھی۔ اس بہانے سے واپس بھیج دیتی کہ بس وہ بھی اب نیچے آنے والی ہے۔ حالانکہ کبھی کبھی وہ اس کے بعد بھی گھنٹہ گھنٹہ بھر نہ اترتی تھی۔ کسی شام میں بھی ان دونوں کے ساتھ چھت پر چلا جاتا تھا اور پھر دس پندرہ منٹ ٹھہر کر چلا آتا تھا۔

اسی رات دردانہ کھانے کے وقت بھی نیچے نہیں اتری۔ رحیم بابا کئی مرتبہ اسے بلانے گئے۔ وہ خود بھی چند روز سے کافی فکرمند نظر آرہے تھے۔ کھانے کے دوران جب دردانہ کہنے کے باوجود نہیں آئی تو شاید ان سے صبر نہیں ہوسکا اور وہ بول اٹھے۔

''بیگم صاحبہ! میرا خیال ہے کہ آپ یہ بنگلا چھوڑ دیں۔ بہو بیگم اب بالکل ٹھیک ہیں یا تو فیصل آباد واپس چلیں یا یہاں ٹھہرنا ہی ہے تو کسی اور جگہ قیام کریں۔''

''ایسی کیا بات ہوگئی بابا؟'' میں نے خفیف سی مسکراہٹ سے پوچھا۔

''کہ تم بنگلہ چھوڑنے کا مشورہ دینے لگے۔''

''اب کیا بتاؤں ڈاکٹر صاحب!'' بابا کے رویہ سے ہچکچاہٹ نمایاں تھی۔

''آپ کہیں گے رحیم بابا سٹھیا گیا ہے مگر میں وہمی نہیں ہوں۔ نہ ہی میری بینائی میں کچھ نقص پیدا ہوگیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بنگلے پر بدروحوں نے اپنا قبضہ کرلیا ہے اور ہم نے بنگلہ نہ چھوڑا تو وہ بدروحیں ضرور کوئی بڑا نقصان پہنچا کر رہیں گی۔''

''تمہیں یہ خیال کیسے ہوا بابا؟'' میں نے پوچھا۔

''کہ بنگلے پر بدروحوں نے قبضہ کرلیا ہے؟''

''میں نے۔۔۔ میں نے کئی بار روحوں کو بنگلے میں اِدھر سے اُدھر آوارہ پھرتے دیکھا ہے۔'' رحیم بابا نے جواب دیا۔

''یہ سب اس کم بخت سوئٹی کی نحوست کے اثرات ہیں۔'' روشن آرا بھی بول اٹھیں۔

''مجھے یقین ہے کہ اس کے اندر ضرور کوئی بدروح تھی۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' زرینہ نے بھی تائید کی۔ اگرچہ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی سر جھکائے خاموشی سے کھانے میں مصروف تھی۔

''میں نے بھی اکثر راتوں کو کسی کے قدموں کی آوازیں سنی ہیں۔''

''میرا دل ڈر رہا ہے۔'' روشن آرا نے کہا۔

''خدا خیر کرے، یوں لگتا ہے جیسے کوئی بڑا حادثہ ہونے والا ہو۔''

''تم نے جو روحیں دیکھیں بابا!'' میں نے رحیم کو مخاطب کیا۔

''کیا وہ جانے پہچانے افراد کی تھیں؟''

بابا نے اثبات میں سر ہلایا اور جیسے کچھ نگلتے ہوئے بولے۔

''ان میں سے تو ایک روح صاحب زادے صاحب کی ہے۔ میں اسے بہت پہلے سے دیکھ رہا ہوں۔''

''صاحب زادہ صاحب کون۔؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ اجمل شاہ کو صاحبزادہ کہا کرتا تھا۔'' روشن آرا نے وضاحت کی۔

''جی ہاں۔'' بابا نے پھر تائید میں سر کو جنبش دی۔

''کھڈ میں کار کے گرنے کے تین چار دن بعد سے ہی میں نے ان کی روح کو بنگلے میں گھومتے دیکھ لیا تھا مگر میں اسے اپنا وہم سمجھا مگر اس نرس کی لاش غائب ہونے کے بعد سے میں ایک دو مرتبہ اس کی روح کو بھی دیکھ چکا ہوں اور کل رات تو مجھے سوئٹی بھی نظر آئی تھی۔ وہ بھی کوئی روح ہی تھی کیونکہ میں نے رات کو بھی اور آج دن میں بھی بنگلے کا کونہ کونہ دیکھ لیا تھا لیکن سوئٹی کہیں دکھائی نہ دی۔''

روشن آرا بھی بابا کی باتیں سن کر کچھ چونکی اور حیرت زدہ نظر آ رہی تھیں۔

"اگر تم سچ کہہ رہے ہو بابا۔۔۔!" وہ بولیں۔

"تو میں دو تین دن میں ہی یہ بنگلہ چھوڑ دوں گی۔"

انہوں نے اپنے دائیں جانب دردانہ کی کرسی کی طرف دیکھا جو خالی تھی۔

"دیکھو یہ ضدی لڑکی ابھی تک نہیں آئی ہے" وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

"میں خود اسے جا کر لاتی ہوں اور بس کل سے اس کا چھت پر چڑھنا بالکل بند۔"

وہ چلیں تو میں بھی ان کے پیچھے چل دیا۔ رات کے وقت پورا بنگلہ روشن رکھا جاتا تھا۔ کم از کم اس وقت تک جب تک سب لوگ، خاص طور سے رحیم بابا سونے کے لیے نہ لیٹ جائیں۔ برآمدہ، زینہ اور چھت پر جگہ جگہ دودھیا بلب اور ٹیوب لائٹس روشن تھیں۔ ہم لوگ اوپر پہنچے تو دردانہ چھت کے اردگرد حفاظت کے لیے لگے ہوئے لوہے کے پائپ کی ریلنگ کے سہارے کھڑی کھڈ کی گہرائیوں میں نہ معلوم کیا تلاش کر رہی تھی۔

روشن آراء نے سخت لہجے میں اسے پکارا۔

"دردانہ کتنی بار تم سے۔۔۔"

مگر ان کا فقرہ مکمل نہ ہو سکا۔ دردانہ ان کی آواز سن کر بری طرح چونکی ۔وہ جھکی کھڑی تھی۔ چونکنے سے اس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا اور نہ معلوم کیسے لوہے کا پائپ اپنے ساکٹ سے نکل گیا۔ دردانہ نے ایک چیخ ماری، اپنا توازن سنبھالنے اور خلا میں جیسے کسی چیز کو پکڑنے کی کوشش کی تو دوسرے لمحے وہ نظروں سے غائب ہو چکی تھی۔

اتنی دیر تک میں جست لگا کر میں ریلنگ تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ مجھے دردانہ کے کپڑے پھڑپھڑاتے نظر آئے۔ میں نے اپنی پوری ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ اس پر نظریں گاڑ دیں چند لمحے بعد تیزی سے گھوما، روشن آرا ایک سکتے جیسے عالم میں ٹوٹے ہوئے ریلنگ کو دیکھ رہی تھیں۔

"میں نیچے جا رہا ہوں۔" میں چیخ کر بولا۔

"شاید وہ کسی درخت کی شاخوں میں الجھ کر بچ گئی ہو۔"

ان کے جواب یا کسی ردعمل کا انتظار کیے بغیر میں تیزی سے دو دو تین تین سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اترا اور پوری رفتار سے بھاگتے ہوئے بنگلے سے باہر نکل گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد میں واپس لوٹا تو بنگلے کے بڑے کمرے میں روشن آرا، زرینہ اور رحیم بابا کے علاوہ انسپکٹر آفتاب خان بھی دو کانسٹیبلوں کے ساتھ موجود تھا۔ بہت تھکا ہوا تھا میں گہری سانس لیتے ہوئے ایک قریبی کرسی پر بیٹھ گیا۔ روشن آرا ہی نہیں سب کی نظریں متوقع انداز میں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

"کوئی پتہ چلا؟" روشن آرا نے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے مایوسی سے جواب دیا۔

"میں نے نیچے جہاں تک اتر سکتا تھا جا کر تلاش کیا مگر وہ نہیں ملی۔"

روشن آرا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

"یا خدا!" وہ بولیں۔

"خان بہادر حسن علی خان کے خاندان کا یہ انجام ہونا تھا۔"

"آپ تقریباً ایک گھنٹہ غائب رہے ہیں۔" آفتاب خان نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے بتایا نا کہ میں نیچے اتر کر دردانہ کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"پہلے محسن علی خان صاحب اور اجمل شاہ کا کھڈ میں کار سمیت گر کر ہلاک ہونا۔" آفتاب خان بولا۔

"پھر دردانہ کی پراسرار بیماری اور اب یوں چھت سے گر کر ہلاکت۔ یہ تو واقعی کوئی سازش معلوم ہوتی ہے بلکہ عین ممکن ہے نرس فرزانہ کی موت اور

لاش کی گمشدگی بھی اس سلسلہ کی کوئی کڑی ہو۔ میں نے چھت پر جا کر ریلنگ کا معائنہ کیا ہے، کسی نے اس کے ساکٹ کی چوڑیاں کھول کر اسے اس طرح ڈھیلا کر دیا تھا کہ ریلنگ کا پائپ ذرا سے دباؤ سے نکل جائے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دردانہ خاتون کو ہلاک کرنا چاہتا تھا۔''

''بہت تاخیر سے آپ اس نتیجے تک پہنچے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

آفتاب خان نے دانستہ میری بات نظر انداز کر دی۔

''بیگم صاحبہ! آپ بتا سکتی ہیں۔'' اس نے روشن آرا کو مخاطب کیا۔

''کہ خان بہادر مرحوم کے خاندان میں کوئی ان کا دشمن تو نہیں تھا؟''

''دشمن کس کے نہیں ہوتے۔'' روشن آرا نے جواب دیا۔

خان بہادر صاحب کے اپنے خاندان کے دوسرے اعزا سے تعلقات کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے۔ یقیناً کچھ لوگ ان کے دشمن ہوں گے مگر میں کسی کا نام نہیں لینا چاہتی اگر کوئی۔۔۔

مجرم ہے تو اسے تلاش کرنا اور قانون کے حوالے کرنا پولیس کا کام ہے۔''

''آپ درست کہتی ہیں۔ میں کل ہی فیصل آباد پولیس سے رابطہ قائم کروں گا۔'' آفتاب خان نے کہا۔

''مگر بتائیے کہ اب خان بہادر صاحب کی جملہ املاک کا وارث کون ہے؟''

''ان کی بیٹی زرینہ۔ یا پھر آخری درجے میں۔۔۔میں'' روشن آرا نے جواب دیا۔

انسپکٹر آفتاب خان تو اپنی رسمی کارروائی کر کے اور روشن آرا، زرینہ، رحیم بابا اور میرے بیانات لے کر چلا گیا مگر وہ رات ''لال حویلی'' کے مکینوں کے لیے ایک انقلاب انگیز رات تھی۔ روشن آرا کا ارادہ دردانہ کے سوئم سے فارغ ہو کر فوراً ہی مال گلی چھوڑ دینے کا تھا وہ رحیم بابا جو اس حادثے کے بعد اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھے نظر آنے لگے تھے، زرینہ سے انتظامات کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ تقریباً سوا بارہ بجے سب لوگ آرام کرنے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ ہر طرف ایک اداس خاموشی مسلط تھی مگر ابھی نصف گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ نہ جانے کہاں سے سوئی کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ بڑی دردناک آواز میں میاؤں میاؤں کر رہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ شاید روشن آرا غصے میں بڑبڑاتی اپنے کمرے سے نکلیں گی اور رحیم بابا کو بلا کر سوئی کو تلاش کرنے کی ہدایت کریں گی مگر ایسا نہیں ہوا۔

کم و بیش پندرہ منٹ تک بولنے کے بعد سوئی کی آواز آنا بند ہو گئی اور اسی کے ساتھ بنگلے کی بجلی چلی گئی۔ ہر طرف گہری تاریکی چھا گئی۔ ایک منٹ نہ گزرا تھا کہ زرینہ کے کمرے سے چیخنے کی آوازیں آئیں۔ میں اپنے کمرے سے باہر آ گیا۔ اسی لمحہ زرینہ انتہائی خوف زدہ حالت میں ایک دھماکے کے ساتھ اپنے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکلی۔ وہ بری طرح چیخیں مار رہی تھی اور بابا رکھے جا رہی تھی۔

''مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ مگر وہ۔۔۔وہ سب مل کر مجھے مارنے آئے ہیں۔''

اس کی کانپتی ہوئی انگلی کمرے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ میں ہاتھ میں شمع دان لیے کھڑا اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ابھی اس کا فقرہ پورا ہی ہوا تھا کہ کمرے سے دو عجیب طرح کے ہیولے سے برآمد ہوئے۔ وہ سر سے پاؤں تک ایک سفید لبادے میں ملبوس تھے۔ یہ لباس تاریکی میں عجیب پراسرار نیلی روشنی سے چمک رہے تھے۔ چہرے کی جگہ تین سوراخ تھے۔ دو آنکھوں کی جگہ اور ایک منہ کے مقام پر اور ان سوراخوں کے پیچھے بہت ہی خوف ناک آنکھیں روشن نظر آ رہی تھیں۔

اچانک ایک ہیولا بول اٹھا۔ خیرت انگیز طور پر اس کی آواز زردانہ سے مشابہت رکھتی تھی۔

''آج تمہیں اپنے انجام سے کوئی نہیں بچا سکتا زرینہ!'' اس نے کہا۔

''تم نے دولت کے لالچ میں تین بے گناہوں کا خون کیا ہے۔''

''خون۔'' زرینہ چیخی۔

''نہیں، میں نے کسی کا خون نہیں کیا۔ یہ سارا کچھ اجمل شاہ کا کیا دھرا ہے۔''

اسی وقت روشن آرا بھی شمع دان ہاتھ میں لیے اپنے کمرے سے باہر آ چکی تھیں۔

''ہوش میں آؤ زرینہ۔'' انہوں نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔

''یہ کیا بکواس کر رہی ہو۔''

''امی! مجھے بچایئے۔'' زرینہ ان کی طرف لپکی۔

''یہ روحیں مجھے مار ڈالیں گی''

''یہ روحیں نہیں، کسی طرح کی شرارت ہے۔'' روشن آرا بولیں اور گھور کر میری طرف دیکھا۔

''روشن آرا! اب تمہارا انجام بھی قریب آ پہنچا ہے۔'' دوسرے ہیولے نے کہا۔

''تم نے اپنے بیٹے کی سازش میں اس کا ساتھ دیا ہے۔''

''روشن آرا چونک گئیں۔ پہلی مرتبہ ان کے چہرے پر حیرت اور قدرے خوف کے تاثرات ظاہر ہوئے کیونکہ دوسرے ہیولے کی آواز ہو بہو فرزانہ کی آواز لگ رہی تھی۔

''اجمل شاہ کو ذمہ دار ٹھہرا کر تم اپنے آپ کو نہیں بچا سکتیں زرینہ!'

پہلا ہیولا بدستور زرینہ کو گھور رہا تھا۔

''وہ تمہاری آمادگی اور تعاون کے بغیر اتنی بڑی سازش نہیں کر سکتا تھا۔''

''میں مجبور ہو گئی تھی۔'' زرینہ جیسے کراہ کر بولی۔

''مجھے اس سے کوئی لگاؤ نہیں تھا مگر اس نے دھوکے سے میری آبرو برباد کر دی۔ میرے فوٹو کھینچے اور پھر مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے اس کا ساتھ نہیں دیا تو وہ مجھے ساری دنیا میں ذلیل کر دے گا۔ میری کہیں شادی نہ ہو سکے گی۔ اس کے برعکس اگر میں اس کا ساتھ دوں تو وہ راستے کی تمام رکاوٹیں دور کر کے مجھ سے شادی کر لے گا اور پھر ابا جان کی لاکھوں کروڑوں کی جائیداد کے ہم تنہا مالک ہوں گے۔ اسی نے مجھے وہ زہر لا کر دیا تھا جو فیصل آباد میں، میں تمہیں دیتی رہی مگر بھائی جان کی موت کے بعد میں ڈر گئی۔ مجھ سے تمہاری حالت نہ دیکھی گئی اور میں نے مزید زہر دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر اجمل شاہ نے نرس فرزانہ کو لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ یہ تمہارے ساتھ اگر فرزانہ کی روح ہے تو تم اس سے پوچھ سکتی ہو کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں یا سچ۔''

''مگر اجمل شاہ تو محسن علی خان کے ساتھ کار کے حادثے کا شکار ہو چکا تھا۔''

''نہیں، وہ زندہ ہے اور ہر دوسرے تیسرے دن رات کو ایک دو بجے کے درمیان مجھ سے ملنے آتا ہے۔'' زرینہ بولی۔

''اس نے مجھے بتایا تھا کہ حادثے کے وقت وہ کار میں نہیں تھا، اسے صرف بھائی جان اکیلے ہی چلا رہے تھے مگر مجھے یقین ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ اس نے بھائی جان کو مار کر ان کی لاش کار میں رکھ کر کار کو گہرے کھڈ میں گرا دیا تا کہ ایک طرف بھائی جان کو ختم کر دے اور دوسری طرف خود بھی پولیس کی نظروں میں آنے سے بچا رہے۔ نرس فرزانہ کو بھی اسی نے گلے میں رسی کا پھندا ڈال کر چھت سے لٹکایا تھا۔ فرزانہ اپنی خاموشی کے لیے بہت بڑی رقم کا مطالبہ کر رہی تھی اور مجھے شک ہے کہ اسی نے فرزانہ کی لاش بھی غائب کر دی ہے۔ آپ شروع سے اس کا ہدف تھیں مگر نہ معلوم کس طرح ڈاکٹر سلطان علی کو زہر دینے کا طریقہ پتا چل گیا اور ان کی وجہ سے آپ کی جان بچ گئی لیکن پھر اجمل شاہ نے آخر کار چھت

پر لگے ہوئے ریلنگ کے پائپ کو ساکٹ سے ڈھیلا کر کے آپ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وہ۔۔۔"

"میں کہہ رہی ہوں بکواس بند کرو۔" روشن آرا اتنی دیر میں خود پر قابو پا چکی تھیں۔

"اجمل شاہ کار کے حادثے میں مر چکا ہے، فرزانہ اور دردانہ بھی اس دنیا میں نہیں ہیں۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، ڈاکٹر سلطان علی کی سازش ہے۔ غالباً یہ خان بہادر کے خاندانی دشمنوں کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں اور وہ لوگ ایک مدت سے اس کوشش میں ہیں کہ خان بہادر کی اپنی اولاد میں کوئی باقی نہ بچے تو ساری جائیداد اور بے شمار دولت ان کے ننھیالی عزیزوں میں منتقل ہو جائے۔"

"روشن آرا صاحبہ! اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔" میں نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"مجھے اعتراف ہے کہ اس پورے منصوبے میں، میں ابھی تک یہ معلوم نہیں کر سکا کہ اس میں آپ کا حصہ کس قدر تھا اور کب سے تھا لیکن اجمل شاہ زندہ ہے، یہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔ میں نے اسے راتوں کو دو تین مرتبہ آپ کے کمرے سے نکلتے دیکھا۔ رہا دردانہ اور فرزانہ کا معاملہ تو خدا کا شکر ہے کہ میں ان کی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ نقاب پوش روحیں نہیں، خود دردانہ اور فرزانہ ہیں۔ ان کے اس بھیس میں آنے کا مطلب زرینہ سے اعتراف کرانا تھا اور وہ مقصد حاصل ہو گیا۔ مجھے یقین ہے کہ اجمل شاہ زیادہ دیر قانون سے نہیں بچ سکتا۔"

میں نے ابھی اپنی بات پوری کی ہی تھی کہ راہ داری میں، جہاں ہم اس وقت موم بتیوں کی روشنی میں اس داستان کا آخری ایکٹ پیش کر رہے تھے۔ دفعتاً سوئٹی کی میاؤں گونجی اور اس کے ساتھ ہی وہ نہ معلوم کس طرف سے نکل کر ہمارے سامنے آ گئی۔ اس کا رخ روشن آرا کی طرف تھا۔ روشن آرا صاحبہ اسے دیکھتے ہی گھبرا کر یوں پیچھے ہٹ گئیں جیسے کسی نے ان پر مہلک ہتھیار سے وار کیا ہو مگر سوئٹی اس وقت غیظ و غضب کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ وہ غرا رہی تھی اور اس کے جسم کے سارے بال کھڑے ہوئے تھے۔

ہمارے دیکھتے دیکھتے اس نے ایک زوردار جست لگائی اور ٹھیک روشن آرا کے سر پر گری۔ وہ انہیں پنجوں سے بری طرح نوچ رہی تھی۔ روشن آرا صاحبہ چیخیں مارتی جا رہی تھیں اور اس سے بچنے کی کوشش بھی کر رہی تھیں۔ شمع دان ان کے ہاتھ سے گر چکا تھا۔ اسی لمحہ سوئٹی نے ایک پنجہ ان کے سر پر مارا تو ہم سب کو یوں لگا جیسے ان کی کھوپڑی ٹوٹ کر سوئٹی کے پنجوں میں آ گئی ہو۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ صرف ان کے سر پر مضبوطی سے جمی ہوئی مصنوعی بالوں کی وگ ہی گری ہوئی تھی۔ ٹھیک اس وقت بجلی واپس آ گئی اور راہ داری میں جلتے ہوئے تیز بلبوں کی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ ہمارے سامنے اجمل شاہ انتہائی خوف زدہ عالم میں کھڑا ہوا پلکیں جھپکا رہا تھا۔ دوسروں کے جذبات اور ردعمل کے بارے میں صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے مگر میں اپنے طور پر زیادہ حیران نہیں تھا۔ مجھے کسی ایسے ہی انکشاف کی توقع تھی۔ میں نے بلند آواز سے کہا۔

"انسپکٹر آفتاب خان! اب آپ اپنی کمین گاہ سے نکل کر قاتل کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال سکتے ہیں۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔"

آفتاب خان دو مسلح کانسٹیبلوں کے ساتھ ایک قریبی کمرے میں پوشیدہ تھا وہ اور اس کے ساتھی اب تک کا تمام ڈرامہ دیکھتے اور سنتے رہے تھے۔

ڈاکٹر سلطان علی نے ہی انسپکٹر آفتاب خان کو کہا تھا کہ دردانہ کے حادثے کی تحقیقات کے لیے وہ بارہ بجے بنگلے پہنچ کر اس کمرے میں چھپ کر بیٹھ جائے تو یقین ہے کہ وہ چند گھنٹوں کے اندر حقیقی مجرم کو پکڑ سکے گا۔ وہ بڑی مشکل سے آمادہ ہوا تھا مگر اس وقت اجمل شاہ کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالتے ہوئے اس کی ساری برہمی کافور ہو چکی تھی، وہ اتنی پھرتی سے کام لے رہا تھا جیسے کم از کم وقت میں مجرم کو ہتھکڑی پہنانے کا ریکارڈ قائم کرنا چاہتا ہو۔

دوسرے دن کا سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی اجمل شاہ نے اپنی مکمل سازش کا اعتراف کرلیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی بات سے اتنا خوف زدہ نہیں جتنا سوئی سے ہے۔ جب سے اسے گرفتار کیا گیا تھا تو وہ مسلسل یہ ہی چیخ رہا تھا کہ خدا کے لیے اس شیطانی بدروح کو یہاں سے لے جاؤ۔ اس سے میرا پیچھا چھڑادو۔ میں سب کچھ بتانے کے لیے تیار ہوں۔

پھر اس نے اپنے اقبالی بیان میں اعتراف کیا کہ اسے خان بہادر مرحوم اور ان کے پورے خاندان سے نفرت تھی۔ وہ اپنی ماں سے بھی نفرت کرتا تھا جس کی جوانی کی لغزشیں اسے کوٹھے تک لے گئیں اور اس نے اپنا مستقبل بچانے کے لیے اسے اپنے سوتیلے باپ کا خدمت گار بنادیا۔ اس نے اپنی ماں سے بارہا کہا کہ وہ خان بہادر کے وارث جائیداد کو بچپن ہی میں زہر دے دے، کہیں پھنکوادے تاکہ خان بہادر اسے اپنی جائیداد کا وارث بنانے پر مجبور ہوجائیں۔ یوں نہ سہی تو زرینہ کے ساتھ اس کی شادی کردے۔ لیکن اس کی ماں نے اس کی بات نہیں مانی۔ اس پر اس نے خود ہی تمام مال و جائیداد پر قبضہ کرنے کی اسکیم بنائی۔ اس کا ارادہ تھا کہ جب محسن علی خان تعلیم کے لیے انگلینڈ روانہ ہوگا تو وہ کہیں راستہ میں اس کا کام تمام کردے گا مگر خان بہادر نے انگلینڈ روانگی سے قبل محسن علی خان کی شادی کردی اور اس کے نتیجے میں دردانہ کی کوکھ میں ایک اور وارث جائیداد پر پرورش پانے لگا اب محسن علی خان کو قتل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے ایک خاص ذریعے سے حاصل کردہ بہت ہی نایاب زہر کی مدد سے دردانہ کو آہستہ آہستہ قبر میں پہنچانے کا انتظام کرلیا۔ اس دوران اس نے زرینہ کو بھی اپنے قابو میں کرلیا تھا۔ یہاں اس کی ماں ایک بار پھر آڑے آئی اور اس نے صحت یابی کے لیے دردانہ کو مال گلی روانہ کردیا۔ محسن علی خان کو بھی تار دے دیا۔ ماں کی اس حرکت سے سے بہت غصہ آیا اور اس نے رات جبکہ محسن علی خان انگلینڈ سے فیصل آباد پہنچا۔ اپنی ماں، رازدار ملازمہ اور محسن علی خان تینوں کو قتل کردیا۔ اس نے سوئی بلی کو بھی زہر دے دیا تھا۔ لیکن جب وہ ان سب کی لاشیں حویلی کے پائیں باغ میں دفن کرنے لگا تو سوئی کی لاش غائب ہوگئی۔ تب ہی سے اس کے دل میں وہم بیٹھ گیا تھا مگر اس نے اس پر کچھ زیادہ توجہ نہیں دی۔

صورت و شکل اور قدوقامت میں وہ اپنی ماں سے بہت مشابہ تھا۔ حد یہ کہ آواز بھی بڑی حد تک ملتی تھی۔ چنانچہ اس نے بالوں کی وگ لگا کر خود اپنی ماں کی شخصیت اختیار کرلی۔ کار میں مال گلی روانہ ہوا۔ پھر خالی کار کو ایک گہرے کھڈ میں گرا کر، جہاں اسے معلوم تھا کہ نیچے جا کر تحقیق حال کرنا ناممکن ہوگا اور خود روشن آرا بن کر مال گلی آ گیا۔ یہاں زرینہ محسن علی خان کی موت سے اس قدر خوف زدہ ہوگئی کہ اسے دردانہ کو برابر زہر دیتے رہنے کے لیے نرس فرزانہ کو رازدار بنانا پڑا۔ البتہ اس نے یہ بات زرینہ کو بھی نہیں بتائی کہ اپنی ماں کے میک اپ میں وہ خود موجود ہے۔ سب کچھ بہت اچھی طرح ہو رہا تھا کہ اس کی بدقسمتی سوئی کو دیکھ کر ڈر گیا تھا پھر بھی اس نے اسے دو مرتبہ مارنے کی کوشش کی۔ وہ دونوں مرتبہ مرگئی۔ لیکن چونکہ شیطانی روح تھی اس لیے مرکر زندہ ہوتی

ہنسی علاج غم ہے

ماسٹر نے بچوں سے کہا: ''کل میں تم سے ایک سوال کروں گا' تیاری کر کے آنا۔''

دوسرے دن ماسٹر نے بچوں سے پوچھا: ''بتاؤ تمہارے سر پر کتنے بال ہیں؟''

ایک لڑکے نے کہا۔ ''دو کروڑ' ساٹھ لاکھ' پانچ ہزار دو سو بیالیس۔''

''یہ تم نے کیسے گنے؟'' ماسٹر نے کہا۔

''جناب! یہ دوسرا سوال ہے میں نے ایک ہی سوال کی تیاری کی تھی۔'' لڑکے نے جواب دیا۔

رہی فرزانہ نے اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی چنانچہ اس نے اسے رسی سے گلا گھونٹ کر مار دیا۔ دردانہ کو چھت سے کھڈ میں گرا دیا اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ یہ دونوں بچ کس طرح گئیں، فرزانہ کی لاش غائب ہونے پر وہ گھبرا گیا تھا مگر چونکہ پولیس نے اس سلسلہ میں کوئی خاص سرگرمی نہیں دکھائی اس لیے بعد میں وہ قدرے مطمئن ہو گیا تھا اگرچہ اس کے ذہن میں خوف بری طرح جاگزیں ہو چکا تھا جو کچھ ہو رہا ہے وہ سوئٹی کی بددروح کر رہی ہے لیکن اتنی دور آنے کے بعد اس کے لیے واپسی ممکن نہیں رہی تھی۔ اس نے تختہ یا تختہ جان کر دردانہ کو ٹھکانے لگا دیا مگر وہ بددروحوں سے کیسے لڑ سکتا تھا۔ وہ ہار گیا اور اب ظاہر ہے کہ اس کے نصیب میں پھانسی کے تختے کے علاوہ کچھ اور نہیں رہ گیا ہے۔

اجمل شاہ کے اقبالی بیان سے تمام گتھی بڑی حد تک صاف ہو چکی تھی مگر میں جانتا تھا کہ دردانہ، ڈاکٹر عمران، زرینہ اور سب سے زیادہ انسپکٹر آفتاب خان ابھی کئی باتوں سے مطمئن نہیں ہیں۔ خاص طور سے اس پورے واقعے میں میرے رول کے بارے میں۔ چنانچہ اس دن صبح جبکہ دردانہ، زرینہ اور رحیم بابا واپس فیصل آباد روانہ ہو رہے تھے، مجھے ان سب کے سامنے کچھ وضاحتیں کرنا پڑیں، میں نے انہیں بتایا کہ مجھے تھوڑا بہت ہپناٹزم میں دخل ہے (اس کی تائید ڈاکٹر عمران نے کی) اپنی اسی صلاحیت سے کام لے کر مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ فرزانہ، اجمل شاہ کا فراہم کردہ زہر کتابوں کے اوراق پر لگا کر دردانہ کو پڑھنے کے لیے دیتی ہے۔ چنانچہ میں نے فرزانہ کو ہپناٹزم سے مسحور کر کے اس سے وہ بیان دلوایا جس سے آپ سب واقف ہیں۔ اجمل یہ سمجھا کہ موت کے قریب پہنچ کر فرزانہ ہذیان بک رہی ہے چنانچہ وہ بھی مطمئن رہا۔ جب فرزانہ یہ بیان دے چکی تو میں نے ہپناٹزم سے اس پر مصنوعی موت طاری کر دی۔ اجمل شاہ پہلے ہی فون کے تار بنگلے کے باہر سے کاٹ کر رابطے کا یہ ذریعہ بے کار کر چکا تھا۔ چنانچہ فرزانہ کی لاش صبح تک کے لیے کمرے میں بند کر دی گئی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وہ زندہ ہے، اس لیے سب کے سونے کے بعد کمرے سے اس کی لاش نکال کر روشن آرا کی کار میں ڈال کر اپنے گھر لے گیا۔ شکر ہے کسی نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میرے پاس روشن آرا کی کار کی چابیاں کہاں سے آ گئیں، ظاہر ہے چابیاں میرے پاس نہیں تھیں کار کا اسٹارٹ ہو جانا میری ذہنی اور بصری قوت کا کمال تھا جہاں وہ اپنے نمودار ہونے تک رہی اور میرا وفادار ملازم اللہ رکھا اس کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ میں نے فرزانہ کو بتا دیا تھا کہ اس کی سلامتی اسی بات میں ہے کہ وہ اصل مجرم کو پکڑنے میں میرا ساتھ دے اس طرح شاید قانون اس کے ساتھ نرمی کا سلوک کرے۔ مجھے امید ہے کہ جب اجمل شاہ پر مقدمہ چلے گا تو فرزانہ کو عدالت کوئی کڑی سزا نہیں دے گی۔

رہا دردانہ خاتون کا معاملہ تو ابھی ان کی قسمت میں موت نہیں تھی۔ حسن اتفاق سے وہ اوپر سے گریں تو کھڈ کی ڈھلان پر آگے لگے ہوئے ایک درخت میں الجھ کر گہرائی میں گرنے سے بچ گئیں۔ چنانچہ میں فرزانہ کی طرح انہیں بھی گھر لے گیا۔ اس سے قبل ایک رات کو میں اجمل اور زرینہ کی باتیں سن چکا تھا۔ اجمل کے جانے کے بعد میں نے زرینہ کو ہپناٹزم کیا اور اس پلان میں جو کچھ اس کا کردار رہا تھا، وہ معلوم کر لیا۔ اس سے پہلے وہ چونکہ زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی تھی اس لیے مجھے اس پر عمل کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ جب انسپکٹر آفتاب خان بنگلے سے واپس چلے گئے تو میں سیدھا اپنے گھر پہنچا۔ دردانہ کو بھی تمام حالات بتائے اور کہا کہ آج کی رات ہی اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہونا چاہیے۔ میں نے ان دونوں کو روحوں کا کردار ادا کرنے پر آمادہ کر لیا۔ انسپکٹر آفتاب خان کو میں پہلے ہی بارہ بجے آنے کی دعوت دے چکا تھا اور اس کے بعد جو کچھ ہوا اس سے آپ سب بخوبی واقف ہیں۔